مکتبہ جامعہ دہلی

ہندوستانی کھیل

مصنفہ الطاف علی صاحب، نگرانِ تربیت جسمانی جامعہ

ہمارے ملک میں بچے کی جسمانی تندرستی سے نہایت افسوس ناک حد تک بے اعتنائی برتی جاتی ہے اور اس کی تفریحی ضروریات کی طرف تو سرے سے توجہ نہیں دی جاتی۔ عام طور پر ہمارے ملک کے بچے جسمانی لحاظ سے کمزور ہوتے ہیں اور ان کی چال ڈھال میں وہ مستعدی نہیں پائی جاتی جو اُن بچوں میں ملتی ہے جنھیں کثرت سے کھیلنے کے مواقع ملتے ہیں۔ بچوں کو ۱ سے ۲ گھنٹے تک ہر روز آزادی کے ساتھ کھیلنے کا موقع دینا چاہیئے تاکہ وہ اپنے اعصاب کی تربیت کر سکیں۔ جو بچہ ایسے ماحول میں تربیت پائے گا وہ ملک و ملت کے لئے سرمایۂ افتخار ہوگا اور زندگی کے تمام نشیب و فراز میں اس پر اعتماد کیا جا سکے گا۔ مصنف نے انھیں باتوں کو پیش نظر رکھ کر تقریباً ڈیڑھ سو ہندوستانی کھیل اس کتاب میں درج کئے ہیں جو مختلف عمر کے بچے کھیل سکتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

مکتبہ جامعہ
دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی ۳

جامعہ

زیرِ ادارت :۔ نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۴۳ نمبر (۱) | بابتہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ ۵ صرف فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی

اُردو کی لائبریری

آپ بھی اپنی تیار کر سکتے ہیں طریقہ بہت آسان ہے

صرف اُردو اکادمی کے ممبر ہو جائیے دو چار سال میں

آپکی بہترین اُردو کی کتابوں کی لائبریری تیار ہو جائے گی

اکادمی کے قواعد و ضوابط ذیل کے پتہ سے طلب کیجئے

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

اسلامی ہندی تمدن

(گذشتہ سے پیوستہ)

اسلامی ہندی تمدن کے خط و خال واضح کرنے کے لئے آخر میں ہم اس کا مقابلہ صرف ایک اور تمدنی تحریک سے کرنا چاہتے ہیں اور وہ ہمارے اہل وطن ہندوؤں کی قومی تمدنی تحریک ہے۔ اس وقت ہم ہندوؤں کی تمام تحریکات کی طرف اشارہ نہیں کرنا چاہتے بلکہ صرف ایک دو ان تحریکات کی طرف اشارہ کریں گے۔ جنھوں نے ہندو قوم کے ذہن کو واقعتاً بہت متاثر کیا ہے۔ ایک تو وہ تحریک ہے جو آج سے ہزارہا برس کے ہندو مذہب اور تمدن کا بعینہٖ احیا کرنا چاہتی ہے۔ اس کی حامل ہندو مہاسبھا، آریہ سماج جیسی جماعتیں ہیں ہندو جماعت کی تشکیل ذات پات پر ہوئی ہے۔ جو جمہوریت کے سخت خلاف ہے ظاہر ہے کہ ہندوؤں کی یہ تحریکیں ہندوؤں کو ایک ایسے زمانہ کی طرف لیجانا چاہتی ہیں جن کا بڑھتے ہوئے جمہوریت کے زمانہ میں کوئی مستقبل نہیں ہوسکتا۔ اگر ان تحریکات کا ہندوؤں پر واقعتاً اثر ہوا ہے تو ہندو بحیثیت قوم و ملک اور انسانیت کی راہ میں صرف ایک سنگ راہ ثابت ہوں گے۔ اس قسم کی تحریکات سے اسلامی ہندی تمدن کا میل تو کجا کسی قسم کا تعاون بھی نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ان تحریکات میں باہم تصادم ہونا ایک لازمی امر ہے۔

ان دقیانوسی تحریکات کے بالکل خلاف ہندوؤں میں اشتراکیت کی تحریک ہے جس کے سب سے مشہور رہنما پنڈت جواہر لال نہرو ہیں۔ اشتراکئین ہندوؤں کی نہ صرف ذات پات کو ختم کر دینا ہیں بلکہ ان کے رسم و رواج اور ان کی ہر قسم کی تاریخی روایات کو بھی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اشتراکیت کا فروغ ہندو تمدن کی قطعی موت کے مترادف ہے۔ ہندو قوم کا مذہبی محدود تصور، نہ ان کا سماجی ڈھانچہ، اور نہ ان کی تاریخی روایات اس بات کی کفیل ہوسکتی ہیں کہ وہ ایک اجتماعی، معاشی انقلاب کی حامل ہوسکیں۔ اشتراکیت کی ترقی کے ساتھ ہندو تمدن چاہے نام میں باقی رہے لیکن وہ عملاً ختم ہو جائے گا۔ اسلامی تمدن کی ماہیت نہ سمجھنے کے باعث اشتراکئین اسلام کی بھی اسی طرح مخالفت شروع کر دیتے ہیں جس طرح ان کی تعلیمات کے بڑھانے کیلئے

انھیں ہندومت کی مخالفت کرنا پڑتی ہے جس کا تمام نظام سرمایہ داری اور ذات پات کے بندھنوں پر استوار ہے۔ اس قسم کی سطحیت سے وہ مسلم عوام کو بھڑکا دیتے ہیں اور اس طرح خود اپنے معاشی انقلاب کے کام میں مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ اس قسم کے اشتراکیین کے ساتھ معاشی انقلاب پیدا کرنے کے لئے تعاون کی راہ میں اسلامی تمدن حائل نہیں ہوتا لیکن ہمیں ہمیشہ محتاط رہنا چاہئے کہ معاشی مسائل کے ساتھ ساتھ کہیں وہ الحاد و دہریت کا زہر بھی مسلمانوں میں سرایت کرنے کی کوشش نہ کریں۔ مسلمانوں کو یہاں اپنے تمدن کی بقا کی پوری کوشش کرنی چاہئے کیونکہ اشتراکیت صرف ایک معاشی حل ہی نہیں ہے بلکہ ایک مکمل تصور زندگی ہے جو مادیت و الحاد پر مبنی ہے اور جس کو جبر سے رائج کرنا اشتراکیین کے نزدیک بالکل جائز ہے۔

عہد جدید میں ہندؤں کی سب سے زبردست قومی و تمدنی تحریک وہ ہے جس کی رہنمائی مہاتما گاندھی کر رہے ہیں یہ ہندومت کی ایک زبردست اصلاحی تحریک ہے۔ روحانیت اور اخلاق پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اسلامی ہندی تمدن سے یہ تحریک جہاں تک اس پہلو کا تعلق ہے بہت قریب ہے۔ مسلمانوں کی بھی کوئی تحریک جب تک کہ وہ روحانی اور اخلاقی نہ ہو تحریک اسلامی نہیں کہی جا سکتی ملک کی آزادی بغیر تفریق قوم و ملت ایک مشترکہ حکومت کا قیام اس کا مقصد ہے جس میں تمام اہل ہند کے ساتھ انصاف و رواداری برتی جائے۔ مسلمان ان امور میں بھی اس تحریک کے عاملین کے ساتھ پورا پورا اتحاد عمل کر سکتے ہیں اور کر بھی رہے ہیں۔ اس تحریک میں مہاتما گاندھی دیہاتوں کے سدھار پر بہت زور دے رہے ہیں مسلمانوں کو اس سے بھی مکمل اتفاق کرنا چاہئے۔ اور چونکہ یہ عوام الناس کی خدمت ہے اس لئے ان کی عین روایات کے مطابق ہے۔ سادگی، ضبط نفس اور ایثار پر اس تحریک کی بنیادیں استوار کی گئی ہیں۔ رسول اللہ صلعم کا اسوۂ حسنہ اور خلفاء راشدین کی مثال سامنے رکھتے ہوئے کون مسلمان ان اخلاقی خوبیوں کے پیدا کرنے پر زور نہ دے گا۔

بہت سے امور میں اتفاق کرتے ہوئے بھی اس تحریک کے بعض ایسے پہلو بھی ہیں جو اسلامی ہندی تمدن کے منافی ہیں۔ مثلاً یہ تحریک ہندوں کی قدیم ہزاروں برس کی پرانی تہذیب کو زندہ کرنا چاہتی ہے

گو کہ اس میں بعض اصلاحات بھی کرنا چاہتی ہے۔ اس قسم کی رجعت پسندی نہ مفید ہے نہ ممکن۔ تہذیب و تمدن اپنی بہترین بنیادوں پر آگے بڑھنے کا نام ہے پیچھے ہٹنے کا نہیں۔ باوجود ادعیٰ کے یہ تحریک اس قدر جمہوری نہیں ہے جس قدر کہ حالات کا تقاضا ہے کیونکہ یہ ہندو سماج کی بنیادوں کو بدستور باقی رکھنا چاہتی ہے جو ذات پات کے تصور پر مبنی ہے۔ عملاً یہ ہریجنوں کو ہندوؤں میں ملانے کی کوشش کر رہی ہے اور انہیں حقوق بھی دے رہی ہے لیکن یہ کوششیں کس حد تک بارآور ہوں گی یا ہوں گی بھی یا نہیں۔ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔ کروڑوں انسانوں کو ذلت و نکبت سے صرف ایک زبردست انقلاب کے ذریعہ آزاد کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی اصلاحات سے شاید ہی کوئی دیرپا نتیجہ مرتب ہو۔ اسلام اس کے مقابلہ میں اس مسئلہ... کے لئے ایک زبردست انقلابی پروگرام پیش کرتا ہے جو جمہوریت اور مساوات کی روح کا حامل ہے۔ گاندھی جی کو ہندوستان کی غربت کا بڑا احساس ہے اور انہوں نے اپنی زندگی اور جدوجہد سے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا ہے وہ کسی بھی ہندوستانی نے سینکڑوں برس میں نہیں کیا ہے لیکن وہ اس مسئلہ کا حل صرف ایک نفسی انقلاب کے ذریعہ کرنا چاہتے ہیں۔ بے شک ہر انقلاب کے لئے نفس انسانی میں تبدیلی کی ضرورت ہے لیکن خارجی طور پر انقلاب اس وقت تک موثر اور مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ایک قانونی اجتماعی شکل اختیار نہ کر لے۔ گاندھی جی کے پاس اس قسم کا کوئی منظم معاشی پروگرام نہیں ہے جس کی بنیادیں ایک اجتماعی قانونی نظام کے ذریعہ استوار کی جا سکیں۔ اسلامی تمدنی روح کا تقاضا ہے نہ صرف نفوس انسانی میں غریبوں کے لئے احساس پیدا کر دیا جائے بلکہ ایک اس قسم کا اجتماعی قانونی نظام بھی بنا دیا جائے کہ اس میں سرمایہ داری کے لئے گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ وہ صاف صاف دولت کے سرچشموں کو عوام الناس کے قبضہ میں حکومت کے ذریعہ دیدینا چاہتا ہے۔ اگر یہ انقلاب پر امن ذرائع سے ہو سکتا ہے۔ تو بہت اچھا ورنہ وہ کم از کم طاقت کے استعمال کو اس کے حصول کے لئے گناہ نہیں سمجھتا بلکہ اخلاقی طور پر جب کوئی دوسرا راستہ باقی نہ رہے اسے مستحسن قرار دیتا ہے۔

اہنسا گاندھی جی کی تعلیمات کی جان ہے وہ کسی صورت اور کسی حالت میں بھی اعلیٰ سے اعلیٰ کام کیلئے طاقت کے استعمال کو جائز نہیں سمجھتے ان کے نزدیک طاقت کا استعمال ہر حالت میں جبر ہے اور

جبر لازماً جبر کو پیدا کرتا ہے اور اس طرح جبر کا کبھی خاتمہ ہی نہیں ہونے پاتا۔ اسلامی تصور اس میں ان سے کلیتاً متفق نہیں ہے۔ تشدد اور طاقت کو اسلام بھی برا سمجھتا ہے۔ ایک ایسا نظام جماعت جس میں ظلم و جبر جدل نہ ہو اسلام کا نصب العین ہے لیکن وہ فطرت انسانی سے جو ملکوتی انسانی ہونے کے علاوہ حیوانی بھی ہے چشم پوشی نہیں کرنا چاہتا اور اجتماعی برائی کو دور کرنے کے لئے کم از کم طاقت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ اسے ڈر ہے کہ کلیتاً طاقت کے استعمال کو ناجائز قرار دے دیا جائے گا تو پھر انسان کی فطرت حیوانی اس قدر عود کر آئے گی کہ جماعت کو یہ موقع ہی نہ مل سکے گا کہ وہ اپنے انسانی اور ملکوتی عناصر کی نشو و نما کر سکے بہ صورت اس نصب العین کی طرف اسلام ضرور رہنمائی کرتا ہے اور وہ بدی کا بدلہ نیکی سے دینے کو اچھا سمجھتا ہے اور اسے احسان سے تعبیر کرتا ہے۔ انفرادی اعمال میں تو وہ یقیناً عفو و احسان کو انتقام اور سزا پر ترجیح دیتا ہے لیکن وہ ایک قانونی حکومت کا قیام طاقت ہی کی بنیاد پر کرنا چاہتا ہے تاکہ ہیئت اجتماعیہ کسی قسم کے خطرہ میں مبتلا نہ ہو جائے۔

اسلامی ہندی تمدن کے عناصر کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم نے اس کا دنیا کے چند مشہور ترین تمدنی تصورات سے اس لئے مقابلہ کیا ہے کہ اس کے خط و خال اس تقابل کے باعث کلیتاً واضح ہو جائیں۔ ہم اب اس تصور کا ایک صحیح تصور اپنے پیش نظر رکھ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بھی صرف اس کی ماہیت کا ہی جاننا کافی نہیں ہے بلکہ ان عظیم الشان تاریخی اثرات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو اس تمدن نے ہندوستان کی زندگی پر مرتب کئے ہیں۔ اس کی بنیادی توحید کی تعلیم نے ہندوؤں میں توحید کی ایک زبردست تحریک شروع کر دی جس نے کہیں تو بھگتی تحریک کا رنگ اختیار کیا، کہیں وہ آریہ سماج، سکھ پنت اور برہمو سماج کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ پھر جہاں علیحدہ تحریکیں شروع نہ ہوئیں وہاں خود ہندو ذہن توحید کے قریب آنے لگا۔ توحید کی تعلیمات شنکر اچاریہ کے فلسفہ میں شروع ہی سے موجود تھی مگر وہ بہت کچھ ایک ذہنی چیز تھی عملی زندگی کو اس سے زیادہ تعلق نہ تھا۔ اب وہ عملاً بھی ایک زبردست قوت بننے لگی اور اس نے اجتماعی عدل کی روح ہندو سماج میں پھونکنا شروع کی جس کے باعث ذات پات کے بندھنوں کے خلاف ہندو ذہن نے بغاوت شروع کر دی جس کا اظہار شروع شروع میں شاعری کے ذریعہ ہونے لگا لیکن بعد میں اس نے ایک عملی شکل بھی اختیار کر لی

مذہبی شعبہ میں اسلامی تمدن نے بالواسطہ اثرات مرتب کئے لیکن تمدن کے بعض دیگر شعبوں میں تو اہل ملک کے ساتھ مسلمانوں نے اشتراک عمل کیا اور ایک مشترکہ ہندی تمدن کی بنیاد ڈالی گئی۔ سیاست اور معیشت میں دونوں اقوام نے ساتھ کام کیا۔ ازمنہ متوسطہ کے فنون لطیفہ مثلاً فن تعمیر، موسیقی، شاعری، نقاشی وغیرہ میں تو اسلامی ہندی تمدن میں ہندوؤں کا بھی مساوی حصہ تھا۔ اس عہد کی ایک زریں یادگار زبان اردو ہے۔ جس کی طرف ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں۔

اس تمدن کا مستقبل اب کیا ہے یہ ایک ایسا مشکل سوال ہے جس کے جواب کا انحصار چند عناصر کی موجودگی پر ہے۔ جہاں تک اس تمدن کی افادیت کا تعلق ہے اس پر اب شک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ انسانیت کے بہترین اخلاقی اور روحانی نصب العین کا حامل ہے۔ اس میں مختلف سرچشموں سے جمالی، سیاسی اور تنظیمی عناصر آکر سمو گئے ہیں۔ اپنے اجتماعی حس، اخلاقی مقصد اور مساوات اور جمہوریت کی تاریخی روایات کی بنا پر یہ آج کل کے سیاسی اور معاشی مسائل کا ایک بہترین حل پیش کر سکتا ہے۔ یہ ایک جامد چیز نہیں ہے جس میں کسی قسم کا تغیر ہی نہ ہو سکے بلکہ ایک نامی اور حرکی چیز ہے جو اپنی بنیادی روح کو قائم رکھتے ہوئے بھی روح عصری کا حامل ہو سکتا ہے۔ عہد جدید کے سیاسی، معاشی اور بین الاقوامی مسائل کو حل کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ کلیسا اور ہندومت کی طرح اس کا بھی خاتمہ کر دیا جائے بلکہ صرف اس کی ضرورت ہے کہ تمدن اسلامیہ کی از سر نو تشکیل قرآن، اسوۂ رسول، خلفائے راشدین کے عمل اور اسلامی تاریخ کی بہترین روایات کی روشنی میں کی جائے۔ اس طرح نہ صرف انسانیت کی گذشتہ تاریخ کا بہترین روحانی اور اخلاقی سرمایہ محفوظ ہو جاتا ہے بلکہ عہد جدید کے مشکل ترین مسائل کا بھی حل مل جاتا ہے۔ ماضی کی شاندار بنیادوں پر حال کے ذریعہ مستقبل کا ایک فلک بوس تمدنی قصر تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ ہم خواہ مخواہ ماضی کی ہر چیز کو قائم رکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ اگر انسانی ترقی کے لئے ضرورت ہو تو خس و خاشاک کی طرح اسے بہہ جانا چاہئے لیکن ہم اس کے بھی قائل نہیں ہیں کہ ماضی کا وہ سرمایہ جو انسانیت کی ترقی کے لئے مفید ہے۔ اسے خواہ مخواہ تباہ و برباد کر دیا جائے۔ ہر مستقبل کے لئے بہرصورت ایک حال کی ضرورت ہے اور ہر حال کے لئے ایک ماضی کی۔ جب ماضی کی ضرورت بھی ہے تو ہم اس ماضی کو کیونکر نہ باقی رکھیں۔

جو انسانیت کی ترقی کے لئے بے انتہا مفید ہونے کے علاوہ ہماری قومی نفسی زندگی کے رگ و ریشہ میں گذشتہ چودہ سو برس سے سرایت کیا ہوا ہے۔ مارکس لینن، ہٹلر، مسولینی، گاندھی اور جواہر لال کے ناموں پر سر دھننے کے بجائے ہم کیوں نہ محمد صلعم عربی کے سامنے نذر عقیدت پیش کریں جن سے بہتر اخوت انسانیہ کا سبق آج تک کوئی دوسرا نہ دے سکا اور نہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسرا اجتماعی قانونی نظام بنا سکا

عہد جدید میں انسانیت کے مسائل کا حل پیش کرنے کی ذمہ داری امت اسلامیہ کے سر پر ہے اور ہندوستان میں مسلمانان ہند پر، کیونکہ یہی امت امت وسطی ہے اور ایسی امت کی تعلیمات میں روح اور مادہ اخلاق و سیاست، قومیت اور بین الاقوامیت، سرمایہ اور محنت کا ایک خوشگوار امتزاج پایا جاتا ہے۔ کاش کہ مسلمان اس اہم فریضہ کو سمجھیں اور اس عظیم الشان ذمہ داری کو اٹھانے کیلئے تیار ہو جائیں۔ وما توفیق الا باللہ

اس اہم انسانی اسلامی فریضہ کی ادائگی کے لئے مندرجہ ذیل امور لازمی ہیں۔

۱۔ اولاً اسلامی تعلیمات، اسلامی تمدنی روح، اور عہد جدید کے تمدنی مسائل کا علم۔

۲۔ دوم ان تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک جمعیتہ اسلامی کا قیام جو ان تعلیمات کی حامل اور اسلامی تمدنی روح سے لبریز ہو۔

ہندوستان کی بیشتر مسلم آبادی کو اسلامی تعلیمات کا بہت ہی ناکافی علم ہے۔ جدید انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ تو تقریباً محض لاعلم ہے، عربی مدارس کے فارغ التحصیل اسلامی تعلیمات سے واقف تو ہوتے ہیں لیکن وہ اسے چند مسائل میں ہی محدود سمجھتے ہیں اور ان کی نظر اس قدر کوتاہ ہوتی ہے کہ وہ اسلام کی ہمہ گیر روح کا مکمل احساس نہیں کر سکتے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ اسلام کا مقصد عبادت کے علاوہ عدل پر مبنی ایک اجتماعی نظام کی تشکیل بھی ہے۔ اور یہ فریضہ کچھ کم اہم نہیں ہے۔ بعض حضرات جو روح اسلامی کی ہمہ گیریت سے واقف ہوتے ہیں وہ موجودہ تمدنی مسائل اور ان کی پیچیدگیوں کی لاعلمی کے باعث ان تعلیمات کی روشنی میں ان مسائل کا خاطر خواہ حل نہیں پیش کر سکتے۔ اسلام کا تصور ان کے ذہن میں بہت کچھ ایک جامد نظام کا ہے حالانکہ اسلام ایک حرکی اور نامی تصور زندگی ہے۔ برسوں کے بعد اسلام کے

نامی اور حرکی پہلو کو ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اپنی کتاب The Reconstruction of Religious Thought in Islam "اسلام میں مذہبی تصور کی نئی تشکیل" میں پیش کیا ہے۔ بہر حال اسلامی ہندی تمدن کے احیا کے لئے اولین ضروری ہے کہ ہمارے عوام تعلیم اسلامی سے اور ہمارے جدید تعلیم یافتہ اور علماء اسلامی روح کی ہمہ گیریت اور جدید تمدنی مسائل سے واقف ہوں۔ بغیر وحدت فکری کے وحدت عمل ایک ناممکن چیز ہے۔ اس وقت اسلامی فکر میں جو انتشار پایا جاتا ہے۔ اس نے ایک جمعیۃ اسلامیہ کا قیام محال کر دیا ہے۔

ذہنی اعتبار سے لیکن اسلامی تعلیمات کا احساس اسلامی تمدن کی زندگی اور نشو و نما کے لئے کافی نہیں ہے۔ اسے مسلمانوں کی زندگی کا جزو ہو جانا چاہئے۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل　　جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

ان تعلیمات کے ساتھ مسلمانوں کے عمیق ترین جذبات کو وابستہ ہونا چاہئے۔ جذبات کے ساتھ لیکن عملی میدان میں قدم اٹھانے اور کامیاب ہونے کے لئے ایک مستقل ارادہ کی بھی ضرورت ہے۔ یہ مستقل ارادہ مسلمانوں میں استقلال اور تکالیف برداشت کرنے کی طاقت پیدا کر دے گا جس کے بغیر کسی مقصد میں بھی کامیابی محال ہے۔

والعصر ان الانسان لفی خسر ۵ الا الذین آمنو وعملوا الصالحات ۵ وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر ۵

مندرجہ بالا خصائص کی حامل جو جماعت ہو گی وہ دراصل جمعیۃ اسلامیہ ہو گی جو موجودہ اسلامی ہندی تمدن میں ایک نئی روح پھونک سکے گی اور اسے اس قابل بنا سکے گی کہ نہ صرف وہ مسلمانوں کے لئے بلکہ ہندوستان اور تمام عالم کے ایک رحمت ثابت ہو۔ ایسی اسلامی جمعیتیں جنہوں نے نام تو اسلامی رکھ چھوڑا ہے لیکن جو نہ اسلامی تعلیمات سے واقف ہیں نہ ہی اسلامی روح کی حامل، نہ اسلام کا مفاد اُن کے پیش نظر ہے، دراصل اسلامی جماعتیں نہیں ہیں بلکہ منافقانہ جماعتیں ہیں جو اسلام کو نقصان پہونچا رہی ہیں کیا ہمیں اسلامی مقاصد کے لئے ایک نئی جمعیۃ کی تشکیل کرنی چاہئے یا موجودہ جمعیتوں ہی کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہئے یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہمیں موجودہ اسلامی ہندی سیاست کے قریب لے آتا ہے۔ اس سوال کا جواب جو کچھ بھی ہو لیکن جو بھی جمعیۃ اسلامیہ ہونے کا دعویٰ کرے اسے

مندرجہ ذیل شرائط ضرور پوری کرنی چاہئے ورنہ وہ قطعی اسلامیہ نہیں ہوسکتی اور مسلمانوں کی قیادت کا دعویٰ تو وہ قطعی نہیں کرسکتی۔ جمعیۃ اسلامیہ کے اراکین کے لئے ضروری ہے کہ

۱- وہ صحیح عقائد اسلامی رکھتے ہوں۔
۲- وہ شعائر اسلامی یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کو ادا کرتے ہوں۔
۳- وہ ملکی آزادی کے لئے جو ایک فریضۂ اسلامی ہے بیش از بیش قربانیاں دیں۔
۴- وہ ایک ایسے نظام معاشی کی تشکیل کی کوشش کریں جو عدل و مساوات پر مبنی ہو اور جس کے ذریعہ غربت و فلاکت کا خاتمہ کر دیا جائے۔
۵- وہ اپنے دیگر تمام اعمال میں روح اسلامی سے سرشار ہوں اور زندگی کے دیگر تمام شعبوں میں اس روح کو عملی جامہ پہنانے کی عملی جدوجہد کریں۔

اس جماعت کا امیر کن خوبیوں کا انسان ہوگا اس کے متعلق ہمیں یہاں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات ہمارے ان خیالات کو رجعت پسندی پر محمول کریں گے لیکن بڑا تعجب ہے کہ اشتراکیین کی جماعت میں شریک ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اشتراکی تعلیمات پر یقین رکھے، کسی مکمل قومی تحریک میں شرکت کے لئے اُن عقائد پر یقین رکھنا ضروری ہے جو اس جماعت کے ہیں۔ لیکن اسلامی جمعیۃ کی رکنیت کے لئے اسلامی عقائد پر یقین رکھنے اور اسلامی اعمال کے مطابق زندگی بنانے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہے روشن خیالی کی انتہا جس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ جو لوگ جمعیۃ اسلامیہ کے قیام پر یقین نہیں رکھتے وہ نہ تو در اصل اسلامی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں اور نہ اسلامی تمدن کے قائل ہیں۔ ان حضرات کو حق ہے کہ ان خیالات کو رکھیں لیکن انھیں کم از کم یہ حق تو نہیں پہونچتا کہ وہ خود کو مسلمان کہیں۔ انھیں زیادہ اخلاقی جرأت کا ثبوت دینا چاہئے اور صاف صاف جمعیۃ اسلامیہ سے علیٰحدہ ہوجانا چاہئے کیونکہ اس طرح ان کے اخلاق کو سخت ضرب لگتی ہے اور ہماری صفوں میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔

اسلامی ہندی تمدن کے مستقبل کا تعلق آج کل ایک نئی تحریک سے وابستہ کر دیا گیا ہے جسے پاکستان کہتے ہیں۔ کیا واقعتاً ہندوستان کی تقسیم اسلامی ہندی تمدن کی بقا اور نشو و نما کے لئے لازمی

ضروری ہے۔ تحریک پاکستان کا مکمل خاکہ ابھی تک پیش نہیں کیا گیا ہے اس لئے ابھی تک اس کا تصور بہت دھندلا سا ہے۔ لیکن ایک چیز اس میں صاف ہے وہ یہ کہ وہ ہندوستان کے ان حصوں کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مثلاً پنجاب کشمیر، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو شمال مغرب میں اور بنگال و آسام کو شمال و مشرق میں ہندوستان سے آزاد کر دینا چاہتی ہے۔ اس راہ میں جو سیاسی اور معاشی مشکلات حائل ہیں وہ تو واضح ہیں مثلاً یہ کہ اس ملک میں جب تک انگریزی تسلط ہے یہ اسکیم کبھی بھی ایک عملی جامہ نہیں پہن سکتی۔ دوم یہ کہ ہندوستان کی دفاع کی تمام ذمہ داری شمالی مغربی صوبوں پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے لئے پچاس کروڑ روپے سے بھی زیادہ سالانہ اخراجات ہوتے ہیں اور ان تمام صوبوں کی مشترکہ آمدنی پچیس کروڑ روپے سے زائد نہیں ہے پچیس کروڑ روپیوں میں ان صوبوں کی حکومتوں کو چلانا اور قومی تعمیری کاموں کو انجام دینا ہی مشکل ہے کجا کہ دفاع کے لئے ایک کثیر رقم خرچ کی جائے۔ شمالی صوبوں کی مدافعت پھر ان صوبوں کی مدافعت نہیں ہے بلکہ تمام ملک کی مدافعت ہے پھر اس کا تمام بار کیوں صرف ان صوبوں پر ڈال دیا جائے بنگال کی حالت تو اس سے بھی بدتر ہے کیونکہ وہاں تو ایسے لوگ بھی موجود نہیں ہیں جو فوجی ذمہ داریاں اٹھا سکیں

جو شخص بھی واقعتاً اسلامی ہندی تمدن کا احیا چاہتا ہے اسے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ برطانیہ کی آغوش شفقت میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ہندوستان کی مکمل آزادی شرط اولین ہے اور یہ تحریک ہندوستان میں افتراق پیدا کر کے ملک کی فضا کو کس قدر مکدر کر دیتی ہے کہ ملکی آزادی کے لئے ایک متحدہ محاذ کا قیام جس کے بغیر آزادی ایک خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی محال ہو جاتا ہے۔ یہ تحریک دراصل مسلمانوں کو ایک خوشگوار طلسم میں مبتلا کر کے انہیں برطانوی شہنشاہیت کا آلہ کار بنا دیتی ہے۔ وہ ان کی سیاست کو حقائق کی دنیا سے علیحدہ کر کے تخیلات کے عالم میں پہونچا دیتی ہے جس سے قوم کے قوائے عملی کو شل کر دینے کے علاوہ اور کوئی دوسرا فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ ہمیں اس چیز کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک وحدت ہیں، ان کا مذہب، ان کی تاریخ اور ان کی موجودہ مشترکہ ضروریات انہیں باہم مربوط کئے ہوئے ہیں اور کوئی طاقت ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کر سکتی اور جو بھی اس کی کوشش کرتا ہے وہ دراصل ایک جسم کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں کاٹ ڈالنا چاہتا ہے جس کو دھوکہ میں مسلمان چاہیں قبول کر لیں لیکن علاوہ اس کے لئے

کبھی بھی رضامند نہیں ہو سکتے۔

پھر بفرض محال یہ صوبے انگریز اور ان صوبوں کی ہندو اقلیت کی مخالفت کے باوجود ہندوستان سے علیحدہ بھی ہو جائیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ واقعتاً اسلامی ریاستیں قائم ہو جائیں گی۔ ان صوبوں میں ہندو بھی کروڑوں کی تعداد میں آباد ہیں۔ اُن کا حکومت پر اثر انداز ہونا لازمی ہے۔ وہ ہندوستان سے علیحدہ ہو جانے کے بعد بھی تقریباً ایک مشترکہ ہی حکومت ہوگی کیونکہ تمام انسانوں کے ساتھ انصاف اور رواداری نہ برتنا یقیناً اسلامی تعلیم کے خلاف ہے جب ہندوستان سے علیحدگی کے بعد بھی صرف صوبوں میں مشترکہ ہی حکومتیں قائم ہوسکیں گی تو ہم کیوں ملک کی وحدت کو ختم کرکے اسے اس قدر کمزور کر دیں کہ وہ شہنشاہیت کا ہمیشہ غلام بنا رہے۔ ہندوستان میں اٹھارویں صدی میں تقریباً ایسی ہی کیفیت تھی جیسے ہمارے پاکستانی حضرات چاہتے ہیں یعنی ہندوستان کے مختلف صوبے پنجاب، اودھ، بنگال، دکن وغیرہ آزاد ہوگئے تھے۔ اور ان میں مرہٹوں، نظام، سکھوں اور مسلم صوبہ داروں کی حکومتیں قائم ہوگئی تھیں۔ ملک کے اس انتشار کا جو انجام ہوا وہ ظاہر ہے جلد ہی ملک مغربی اقوام کا شکارگاہ بن گیا اور ایک قوم تو اس قدر مسلط ہوگئی کہ اب تک نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ ہندوستان کے مغرب اور مشرق میں جو ہولناک جنگ اس وقت جاری ہے اس کے باعث تو یہ خطرہ اور بھی بڑھ گیا ہے۔ کیا یہ حضرات ملک کے موجودہ شہنشاہی اقتدار کے بقا کی کوشش فرما رہے ہیں یا ہندوستان کو دوسری خارجی طاقتوں کی شکارگاہ بنانا چاہتے ہیں؟

ہمیں در اصل مسلمانوں کی حکومت اور اسلامی حکومت کے تصور کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ بعض مسلمانوں کی حکومت جابر و ظالم بھی ہوسکتی ہے جس طرح بعض مرتبہ تاریخ میں ہوا ہے۔ وہ حکومت ممکن ہے مطلق بھی اسلامی نہ ہو بلکہ اس کا تمام دار و مدار ذاتی اغراض پر ہو اور ملک کو آزادی کی بجائے غلامی میں مبتلا کر دے اور عوام الناس کی خدمت کے بجائے خوب تباہ حال کرے۔ اس قسم کی حکومت چاہے اس کے حکمرانوں کے نام اسلامی کیوں نہ ہوں اسلامی نہیں کہی جاسکتی۔ اسلامی حکومت تو صرف وہی ہوسکتی ہے جو قومی آزادی برقرار رکھے، عوام الناس کی غربت دور کرے اور ان کی اخلاقی و روحانی نشوونما کے لئے ایک ماحول پیدا کرے۔ اس کے لئے ہندوستان سے علیحدہ ہو جانے کی اور ان صوبوں

میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کو خطرہ میں ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ ہم اس تصور کو اپنی زندگی کا جزو بنالیں اور ملکی تحریکات پر اپنی حرکی نفسی، قومی شخصیت کا اثر ڈالیں بیشک جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں اس تحریک کو زیادہ اثر انداز ہونا چاہئے۔ کیونکہ وہاں کے صوبوں کی حکومتیں بھی مسلمانوں ہی کے زیر اثر ہوں گی لیکن اُن صوبوں میں بھی جہاں مسلمان اقلیت نیں ہیں وہ کم اثر انداز نہیں ہو سکتے بشرطیکہ ان میں ضروری روح اور طاقت عمل موجود ہو۔ انقلابات میں اکثریت اور اقلیت کا سوال نہیں ہوتا بلکہ اس کا انحصار اس معنوی طاقت پر ہوتا ہے جو کسی قوم میں موجود ہوتی ہے۔ مسلمان ہندوستان کی سیاسی اور معاشی تحریکات کو ترقی پر ور بنانے میں بے انتہا مفید ثابت ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی زندگی کے اصل فریضہ سے واقف ہو جائیں۔

یہ خطرہ بے شک ہے کہ مرکزی حکومت میں ہندو اکثریت کہیں ان صوبوں کی آزادی بھی ختم نہ کر دے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ اس کا تدارک اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں ایک وحدانی حکومت نہ قائم کی جائے۔ بلکہ ایک وفاقی حکومت ہو۔ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دی جائے۔ صوبے اپنی خاص تمدنی روایات کے مطابق جس طرح چاہیں نشو ونما کریں۔ اس طرح ان صوبوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اسلامی تمدن کے خط و خال زیادہ واضح ہو سکیں گے اور ان صوبوں میں بھی جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہ اپنی معنوی طاقت کے باعث ملک کی حکومت اور اس کے ذریعہ ملکی تمدن میں اسلامی رنگ غالب کر سکیں گے۔ مرکزی حکومت کو آپس کے معاہدہ کے ذریعہ کم سے کم اختیارات دئے جائیں۔ صرف وہ اختیارات جو ہندوستان کے تحفظ اور بقا کے لئے ضروری ہیں مثلاً دفاع کے لئے فوجی انتظام، امور خارجیہ وغیرہ یا وہ جو ملک کی عام مرفہ الحالی کے لئے ضروری ہیں مثلاً ریلوے، جنگی، پوسٹ ایک عام معاشی پروگرام کی تشکیل وغیرہ۔

اسلامی تہذیب و تمدن کی بقا اور نشوونما کے لئے جو بھی امور ضروری ہوں وہ آئین میں بنیادی حقوق کی حیثیت سے شامل کر لئے جائیں اور یہ آئین اس وقت تک تبدیل نہ کیا جائے جب تک خود مسلمانوں کی عظیم الشان اکثریت اس کی تائید میں نہ ہو۔ یہ ڈر کہ مسلمان اقلیت میں ہیں اور ہندوستان کی آزادی

کے بعد ہندو اس آئین کو ختم کر دیں گے اور اس طرح مسلمان دوبارہ خطرہ میں آ جائیں گے اس قدر لغو ہے کہ اس کا ذکر بھی بیکار معلوم ہوتا ہے۔ آٹھ کروڑ مسلمان اگر کسی چیز کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت اسے فنا نہیں کر سکتی۔ جو رہنمایان قوم یہ احساس کمزوری مسلمانوں میں پیدا کر رہے ہیں۔ وہ دراصل مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ وہ مسلمانوں کو مفلوج کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ مسلمانوں سے ان کی تاریخی روایات کو فراموش کرا دینا چاہتے ہیں۔ اقلیت اور اکثریت کے ذریعہ قومی مسائل طے نہیں ہوا کرتے بلکہ اس میں اصل معیار معنوی طاقت ہے وہ معنوی طاقت جو قوموں کو اپنے مقاصد کے لئے اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لیا سکھا دیتی ہے، خون کو پانی کی طرح ارزاں کر دیتی ہے

اسلامی ہندی تمدن کی بقا اور نشو و نما غرضیکہ اس معنوی طاقت پر منحصر ہے جو مسلمانان ہند اپنے آپ میں پیدا کریں گے۔ دوسری اسلامی اقوام مثلاً ترک، ایرانی وغیرہ شاہراہ آزادی پر گامزن ہو چکی ہیں۔ ان میں ایک نئی زندگی کا خون دوڑ چکا ہے لیکن بد قسمتی سے یہ اقوام مغرب سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ان ممالک میں جدید تعلیم یافتہ اکثر مذہب سے ناواقف تھے اور علماء حد سے زیادہ رجعت پسند اور جدید تمدنی مسائل سے لاعلم۔ ان دونوں طبقوں میں کش کش لازمی امر تھی۔ اس کش کش میں علما کی شکست ہوئی جس کے باعث مذہبی سر رشتہ سے وہاں کی تمدنی زندگی آزاد ہو گئی۔ اس طرح یہاں مادی اور تمدنی ترقی میں وہ صحیح امتزاج نہ پیدا ہو سکا جو تمدن اسلامیہ کے لئے ضروری ہے۔ خوش قسمتی سے اب ان اقوام میں دوبارہ ردعمل شروع ہو گیا ہے اور امید ہے کہ جلد ہی ایک صالح اسلامی تمدن پیدا ہو سکے گا لیکن اس سلسلہ میں رہنمائی ہندی مسلمانوں کی قسمت میں لکھی گئی ہے۔

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا یہاں سے

ہندوستان کے علما جدید تمدنی مسائل سے بالکل غافل نہیں ہیں۔ ملک کی آزادی کی جد و جہد میں انھوں نے رہنمائی کی ہے۔ ایثار و قربانی اور استقامت راہ کی انھوں نے وہ شاندار روایات قائم کی ہیں جو ملت اسلامیہ کے لئے باعث فخر ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی یہاں مذہب سے وہ سرکشی دکھائی نہیں دیتی جو دوسرے ممالک میں ہے۔ اگر یہ دونوں طبقے متحد کوشش کریں تو ایک ایسے تمدن کی تشکیل

کر سکتے ہیں جس کی بنیاد انسانیت کی حقیقت اصلی یعنی روح کلی پر استوار ہوگی جو ماضی کی تمام شاندار اور مفید روایات کا حامل ہوگا۔ جو حال کے تمام تمدنی یعنی مذہبی، اخلاقی، قومی، بین الاقوامی، سیاسی اور معاشی مسائل کا حل پیش کرے گا۔ اور اس طرح انسانیت کی ایک شاندار مستقبل کی طرف رہنمائی کر سکے گا۔ یہ اسلامی ہندی تمدن ایک طرف تو ہندوستان کی تمدنی تحریکات پر اثر انداز ہوگا اور اسے رجعت پسندی سے نکالکر ترقی کی راہ پر چلائے گا، دوسری طرف وہ ممالک اسلامیہ پر اثر ڈالے گا اور انھیں مغرب کے بڑھتے ہوئے سیلاب الحاد و دہریت، سرمایہ داری اور شہنشاہیت سے بچائے گا۔ یہ مشرق کی بیدار روح کا ایک مظہر ہوگا جو مغرب پر پھر اپنی روحانی معنوی طاقت کے ذریعہ اسی طرح اثر انداز ہوگا جس طرح مشرق متعدد بار تاریخ میں ہو چکا ہے۔ یہ جارحانہ قومیت کے بجائے انسانیت، جنگ و جدل کی بجائے محبت و احترام دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کرے گا۔ اس طرح دنیا کی آزادی، عدل، امن اور نشو و نما کے لئے ایک نئے باب کا افتتاح کر سکے گا۔

ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب بی۔ اے (جامعہ)
ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (برلن)

مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری

(گذشتہ سے پیوستہ)

مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری کے محاسن اور معائب | مولانا کی تنقیدیں اپنے محاسن کے لحاظ سے بلند پایہ ہیں اور خوبیوں کے اعتبار سے دنیا کی بہتر سے بہتر تنقیدوں کے مقابلے میں کسی طرح کم نہیں ان میں خامیاں بہت ہی شاذ و نادر اور خوبیاں بکثرت ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک کا ذکر مثالوں کی روشنی میں حسب ذیل ہے۔

(۱) زبان اور علم و ادب پر عبور:۔ مولانا عبدالحق زبان اور ادب کے معاملات میں اس دور کے قابل اور مستند اہل رائے میں سے ہیں۔ الفاظ، محاورے اور ضرب الامثال کے معانی و مطالب اور ان کے موقع و محل استعمال کے متعلق آپ کی رائے وقیع ہوتی ہے ان مسائل پر آپ کی توضیح و تشریح اکثر آخری فیصلہ ہوتی ہے۔ آپ نے اگر ایک طرف ہمیشہ دہلی کی ٹکسالی زبان کے ماحول میں پرورش پائی ہے تو دوسری طرف اپنی عمر کا کافی حصہ زبان دانی کے مسائل کی تحقیق و جستجو میں صرف کیا ہے۔ فارسی، عربی، ہندی اور دکنی الفاظ جن سے کہ اردو کے زیادہ تر الفاظ ماخوذ ہیں ان پر آپ کو کافی عبور حاصل ہے۔ الفاظ کے مادوں اور ان کے معانی کا آپ نے بغور مطالعہ کیا ہے جس کا کچھ اندازہ آپ کی اس تنقید سے کیا جا سکتا ہے جو سرگذشت الفاظ پر کی ہے۔ چنانچہ "جلاب" اور "رضائی" کے متعلق مصنف کتاب کا خیال پیش کرنے کے بعد اس پر تنقید کی ہے۔

"جلاب انگریزی میں "جیلپ" مکسیکو کے ایک شہر جلاپا کے نام سے ہے" قابل مؤلف نے یہ نئی بات لکھی ہے جو درست نہیں معلوم ہوتی۔ ہماری تحقیق میں یہ لفظ گلاب کا معرب ہے گرمی سے بچنے کے لئے مسہل کے استعمال ہونے لگا ہے۔ "رضائی محمد رضا موجد کے نام پر ہے" جہاں تک ہمارا خیال ہے یہ لفظ در اصل "رزائی" ہے۔ چونکہ عموماً یہ رنگے ہوئے کپڑے کی بنائی جاتی ہے اس لئے یہ نام پڑ گیا۔"

(چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۳)

اسی طرح "متوالا" کی تشریح کرتے ہیں۔

"وہ (یعنی مصنف کتاب) اسے مت (سمجھ، عقل) اور والا سے مرکب سمجھے ہیں، حالانکہ یہ لفظ "مد" اور "والا" سے مرکب ہے۔ مد کے معنی ہندی اور سنسکرت میں شراب اور مستی کے ہیں۔ کثرت استعمال... سے "د" "ت" سے بدل گئی ہے۔ ان دو حرفوں کا بدل باہم ہوتا ہے۔" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۳)

"بھانا" اور "پسند آنا" کا فرق اس طرح بیان کیا ہے۔

"بھانا بھی متروک ہے حالانکہ اس کی بجائے اردو میں کوئی لفظ نہیں ہے۔ "پسند آنا" اور "پسند کرنا" میں اختیار اور ارادہ ظاہر ہوتا ہے اور "بھانا" وہاں استعمال ہوتا ہے جو کوئی شے بغیر ارادہ و اختیار کے دل کو خود بخود اچھی معلوم ہوتی ہے۔

"پرے" اور "ادھر" کا فرق بھی خوب بیان کیا ہے۔

"کہتے ہیں کہ "پرے" کا لفظ بھی متروک ہے لیکن جب یہ عرض کیا جاتا ہے کہ اس کی بجائے کیا استعمال کیا جائے تو ارشاد ہوتا ہے کہ "اُدھر" مگر "پرے" اور "اُدھر" میں بہت فرق ہے "اُدھر" سمت کو بتاتا ہے اور "پرے" بُعد کو ظاہر کرتا ہے۔

مولانا کی زبان دانی کی ایک اور مثال فیضانِ شوق کے تبصرہ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں جس میں آپ نے حضرت شوق قدوائی جیسے مستند زبان داں اور استاد محاورہ کی غلطی نکالی ہے۔ شوق نے ایک شعر میں "آہیں کھینچ دینا" استعمال کیا ہے اس پر آپ لکھتے ہیں۔

"آہیں کھینچ دینا یا کھینچ لینا، دونوں ٹھیک نہیں "آہیں کھینچیں" ہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔"

(چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۴۴)

قواعد زبان پر بھی مولانا عبدالحق مستند سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ

"قواعد اردو" اور "صرف و نحو اردو" آپ کی مستند اور معرکۃ الآرا تصانیف ہیں۔

زبان کے مسائل پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ مولانا اردو ادب کے ہر شعبے پر حاوی ہیں خصوصاً تاریخ ادب اردو پر آپ کی رائے بلا چون و چرا تسلیم کی جاتی ہے اور آپ کا ہر قول سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے دکنی زبان کے متعلق آپ نے جو تحقیقیں کی ہیں وہ اپنی نوعیت اور اہمیت کے اعتبار سے بیش بہا رہیں گی

اس ملانہ میں سلطان محمد قلی قطب شاہ، نصرتی، سب رس، قدیم اُردو یعنی دکن کا ایک شاعر خاندان اور ان کے دوسرے فاضلانہ مقدمے حرکۃ آرا اور تاریخی اہمیت کے مالک تحقیقی کارنامے ہیں۔ علاوہ ازیں مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر، اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، مرحوم دہلی کالج اور فورٹ ولیم کالج کے متعلق جو معلومات پیش کی ہیں وہ ہماری تاریخ ادب میں بیش بہا اضافے ہیں۔ یہ سب عالیشان تحقیقیں نہایت ہی صبر اور محنت سے انجام دی ہیں۔ ان کے لئے انھوں نے جہاں سینکڑوں قدیم کتابیں حاصل کیں ان کا اور اس دور کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا وہاں خود عملی کوششیں بھی کیں۔ چنانچہ بیجاپور میں نصرتی کی قبر تلاش کرنے کے لئے نامعلوم کتنی زحمتیں برداشت کیں۔ غرضکہ مولانا نے تاریخ ادب کے متعلق بہت ہی محنت اور کاوش سے تحقیقیں کی ہیں جو کہ دنیا کی دوسری زبانوں کی ادبی تحقیقاتوں سے کسی حیثیت سے کم درجہ کی نہیں۔

مولانا کے تحقیقی کارناموں کو گنانے کے بعد اردو ادب کے متعلق ان کی معلومات کی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن پھر بھی بعض تنقیدوں میں وہ جس طرح اپنی ادبی معلومات کا اظہار کرتے ہیں وہ ان کے کمال کی بہترین دلیلیں ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر گراہم بیلی کی کتاب "اردو لٹریچر" پر تبصرہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"قصہ ابوشحمہ کا مصنف محمد امین نہیں ہے۔ میرے پاس اس کے متعدد نسخے ہیں کسی میں امین یا محمد امین نہیں آیا بلکہ ہر نسخہ کے آخر میں اس کا نام "اولیا" لکھا ہوا ہے۔"

"سودا کے متعلق لکھا ہے کہ آصف الدولہ نے ملک الشعراء کا خطاب دیا حالانکہ دہلی میں ۱۱۶۵ھ سے قبل دربار دہلی سے یہ خطاب مل چکا تھا میر نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔"

"ملک خوشنود کی ایک تصنیف یوسف زلیخا بتائی ہے اور لکھا ہے کہ یہ امیر خسرو کی یوسف زلیخا کی پیروی میں لکھی گئی ہے۔ خوشنود نے یوسف زلیخا نہیں لکھی اور نہ امیر خسرو کی تصنیف سے کوئی مثنوی یوسف زلیخا ہے۔" (چند تنقیدات عبدالحق)

الفاظ، محاوروں اور تاریخ ادب کے علاوہ مولانا سخن فہمی میں بھی ملکہ رکھتے ہیں۔ نصرتی کے کلام کی جو خوبیاں بیان کی اور مقدمہ انتخاب کلام میر میں جن اشعار کا انتخاب کیا ہے اور انھیں جس خوبی سے سمجھایا ہے

جن باریکیوں اور نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ سخن فہمی اور ذوق سلیم کی دلیل ہے۔لیکن ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ شاعری پر آپ کی نگاہ اس قدر گہری نہیں پڑتی۔اسی لئے آپ کی وہ تنقیدیں جو شاعری پر ہیں تشنۂ تکمیل ہیں۔

مولانا جہاں شاعری کی خوبیاں اور نکات سمجھا سکتے ہیں وہ شاعری کی خامیوں کی طرف اشارہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔چنانچہ شوق جیسے مستند شاعر کے کلام پر خوب تنقید کی ہے ؎

کچھ شباب آتے ہی آج اس پر توکل اسیر ستم — اک ذرا سا حسن کیا پایا کہ تو اترا گیا

"اس میں زبان کا جو لطف ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں لیکن پہلے مصرعے میں 'کچھ' کچھ یونہی سا ہے اور دوسرے میں 'ذرا سا حسن' معشوق کے لئے کتنا صحیح ذوق محبت کے منافی ہے۔

سچ یہ ہے کہ حضرت شوق کی شاعری محبت کی شاعری نہیں بلکہ رسمی غزل گوئی تلازمہ و محاورہ بندی ہے۔" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۱۴)

(۲) وسعت علم:۔مولانا عبدالحق نے اُردو ادب میں نئی جان ڈالی ہے۔آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ ادب کی روح علم اور تحقیق ہے محض الفاظ کے داؤں پیچ اور ترکیبوں کے ہیر پھیر سے اثر نہیں پیدا ہوتا بلکہ وہ ادیب کا علم اور اس کے خیالات ہیں جو اس کے الفاظ میں جان ڈالتے ہیں اس لحاظ سے آپ کی تنقیدیں وسعت تحقیق کی سرمایہ دار ہوتی ہیں۔جن کا ہر ہر جملہ مطالب اور معانی سے پُر، اچھوتے خیالات اور نئی تحقیقات کا حامل ہوتا ہے۔

مولانا عبدالحق کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انگریزی زبان اور ادب پر کافی عبور رکھتے ہیں۔اسی سے جدید خیالات اور یورپین زبانوں کے ادب سے بھی انھیں واقفیت ہے۔اگر سرسید، حالی اور شبلی نے مغربی زبانوں کو جانے بغیر صرف ان کے اثر سے ہمارے ادب میں اس قدر اہم تبدیلیاں کیں، ادب کی نئی اصناف کو افسانہ نویسی اور تنقید نگاری کو جاری کیا، عبارت آرائی اور لفاظی کو چھوڑ کر زبان میں سادگی اور معانی آفرینی پیدا کی تو مولانا عبدالحق جنھوں نے اس زبان کے مختلف طرز تحریروں کا گہرا مطالعہ کیا ہے جنھوں نے انگریزی کی مدد سے فرانسیسی ادب کی اکثر بلند پایہ تصانیف اور اصناف سخن کو سمجھا ہے جو جدید خیالات اور زندگی کے

مقاصد سے بہتر طور پر واقف ہیں انھوں اپنے پیشروؤں کی ابتدائی کوششوں کو تکمیل تک پہونچایا ہے۔ خصوصاً تنقید نگاری کو جس کی بنیاد حالی اور شبلی نے رکھی تھی۔ جہاں ان کی تحریروں میں انگریزی کی سادگی پائی جاتی ہے وہاں ان کے مقدمے اور تنقیدات میں رینان (M. Renan) اور سینٹ بیو (M. Sainte Beuve) کی جھلک بھی ہے۔ اور ان کے خیالات مغربی ادب اور علوم سے متاثر نظر آتے ہیں جس کی مثالیں ان کی تنقیدات میں اکثر ملتی ہیں۔ اور کبھی کبھی مغربی خیالات کو اُردو کا جامہ پہنا کر بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں جس سے کہ ہماری زبان کی استعداد میں اضافہ اور خیالات میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔

بی۔ اے میں مولانا کے مضامین تاریخ اور فلسفہ تھے۔ چنانچہ تاریخ کا نمایاں اثر آپ کی تحقیقات اور معلومات ادب کے سلسلہ میں دیکھ چکے ہیں اسی طرح فلسفہ کا اثر بھی آپ کی تنقیدوں میں بہت نمایاں ہے۔ آپ کے ہاں اعلیٰ علمی مباحث اور اُن پر منطقی غور و فکر اور مدلّل طرز تنقید نہایت ہی قابل قدر چیزیں ہیں۔ اگر مولانا کی قابلیت اور فلسفیانہ طرز تنقید کا مشاہدہ کرنا ہو تو مقدمۂ معرکۂ مذہب و سائنس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ چنانچہ اسی میں ایک جگہ جذبات کے متعلق لکھتے ہیں۔

"جذبات درحقیقت عقلی اور دماغی حرکت کا سرچشمہ ہیں اور ان کی نشو و نما انسان کی بہبودی اور ترقی کے لئے ایسی ہی ضروری ہے جیسی قوائے عقل کی نشو و نما۔ خیالات اور جذبات کا تعلق ایسا گہرا ہے کہ وہ عموماً ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرتے ہیں لیکن بعض اوقات ان میں ان بن ہو جاتی ہے مثلاً خواہش کا رجحان ایک خاص طرف ہے مگر عقل کہتی ہے کہ یہ ٹھیک نہیں اور یہی بنائے مخاصمت ہوتی ہے۔" (مقدمات عبدالحق حصہ اول صفحہ ۶۲)

اسی مقدمے میں ایک جگہ سائنس دانوں کے ایک اعتراض کا جواب خوب دیا ہے۔

"یہ کہنا کہ انسانوں کو خود سے یہ خیال پیدا ہوا اور خدا کا خیال بھوت، پریت سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ دیگر مظاہر قدرت کی پرستش سے ایک خدا تک پہونچا۔ لہٰذا خدا کا خیال بے بنیاد ہے صحیح نہیں۔ کیونکہ مختلف مرحلے طے کر کے کسی شے تک پہونچنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ شے بے اصل ہے۔ دنیا کے تمام اعلیٰ خیال، فلسفہ اور سائنس کے تمام اصول، تمام ایجادات اور

تمام اختراعات کو اگر بہ نظر غور دیکھا جائے اور ان کی تحقیق کی جائے تو ان کی اصل انھیں وحشیوں تک پہونچے گی جہاں سے کہ ہم نے خدا کے خیال کا سراغ لگایا ہے۔ یہ چیزیں وراثتاً ملی ہیں اور اسی طرح ایک دوسرے تک پہونچتی رہیں گی۔" (مقدمات عبدالحق حصہ اول صفحہ ۹)

اس قسم کے علمی اور فلسفیانہ مسائل مولانا کی تنقیدوں میں اکثر پائے جاتے ہیں جس سے ان کی علمیت اور وسعت معلومات کا اندازہ ہوتا ہے یہی مولانا کی امتیازی چیز ہو انھیں ان کے پیشروؤں اور اکثر ہمعصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کے جیسی عالمانہ سنجیدگی، حقیقت نگاری، مدلل طرز تنقید، جدید خیالات اور علوم کے متعلق معلومات کسی دوسرے اُردو نقاد کے ہاں کم پائی جاتی ہے۔ ان کی تحریریں خود ادبی نکات اور معلومات کا مخزن ہوتی ہیں اور یہی نقاد کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ تخلیقی ادب کے لئے صحیح اور سچے خیالات کی فضا پیدا کرسکے اور ادیبوں کے لئے نئی نئی جولانگاہیں تلاش کرے تاکہ لوگ ایک ہی میدان کو اپنی تخلیقی قوت سے پامال نہ کریں۔

(۳) قوت فیصلہ:- مولانا عبدالحق بلند پایہ نقاد کی حیثیت سے غیر معمولی طور پر بہت اچھی قوت فیصلہ رکھتے ہیں۔ خیالات کی گہرائی اور وسعت تحقیق کی وجہ سے آپ ادبی معاملات میں خود اپنا نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ ایک متفکر محقق اور عالم کی حیثیت سے مولانا دوسروں کے خیالات کو بھی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور اپنے نقطہ نظر سے مقابلہ کرکے دلائل و براہین کے ساتھ کسی ایک نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں۔ اسی کا نام قوت فیصلہ ہے اور اس کی مثالیں بدرجۂ اتم مولوی صاحب کی تنقیدوں میں ملتی ہیں۔ مولانا کے جس قدر بھی مقدمات اور تبصرے ہیں ان میں صحیح معنوں میں ریسرچ تحقیق کی شان پائی جاتی ہے۔ جس میں وہ اپنے نقطہ نظر کو دوسروں کی رایوں کے مقابلے میں صحیح طور پر پرکھتے اور جانچتے ہیں۔ وہ تخیلات کی بلند پروازی سے بچتے ہیں اور منطقی طور پر بال کی کھال نکالتے ہیں اور جب تک روایت کو دلائل کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھ نہیں لیتے اس وقت تک فیصلہ نہیں کرتے اسی لئے ان کی رائیں بہت ہی صائب اور مدلل ہوتی ہیں۔

(۴) انصاف:- تنقید کی جان انصاف اور بے لوثی ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی بڑا ادیب اور کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو۔ اس کے فیصلے اور تنقیدیں اس وقت تک تسلیم نہیں کی جاسکتیں اور نہ مقبول ہوسکتی ہیں جب تک کہ

وہ خلوص، صداقت اور اصلیت پر مبنی نہ ہوں۔ مولانا عبدالحق کے مقدمے اور تنقیدیں ہر قسم کے تعصب اور تنگ نظری سے پاک ہوتی ہیں۔ وہ صوبہ وارانہ اور شخصی فرقہ بندیوں سے کہیں بلند ہیں۔ ان کے ہاں علم سے بحث علم کی خاطر ہوتی ہے بخصوص نقطہ نظر اور خیالات پیش کرنے کے لئے نہیں۔ وہ تنقید چیزوں کو ان کی ذاتی اور اصلی روشنی میں دیکھ کر کرتے ہیں۔ ذاتی عقائد اور معتقدات کے دھندلکے میں نہیں۔ چنانچہ حیات النذیر کے مقدمے میں جہاں امہات الامہ، کے جلائے جانے کا ذکر کرتے ہیں وہاں مولویوں کے طرز عمل پر بلا کم وکاست کتنی اچھی اور صحیح رائے دی ہے

"اس رات کو گویا مولویوں نے شب برات منائی اور اس آگ سے اپنے نفوس مطمئنہ کو ٹھنڈا کیا اور اپنے اعمال ناموں میں ایک ایسی بڑی نیکی کا اضافہ کیا جو غالباً ان کی نجات اخروی کا باعث ہوگی۔ یہ ان بزرگوں کا کام ہے جنھوں نے چشم بد دور مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح کا بیڑا اٹھایا تھا" (مقدمات عبدالحق حصہ اول صفحہ ۲۰۴)

مولانا تنقید لکھتے وقت سوائے حق اور ادب کے مطالبات کے اور تمام چیزوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور خوبیوں اور نقائص پر غیر جانبداری کے ساتھ نظر ڈالتے ہیں حتیٰ کہ ایک حساس دل اور قوم وملک کی آزادی اور ترقی کا صحیح جذبہ رکھنے کے باوجود قومیت کو بھی تنگ نظری سمجھتے ہوئے اسے اپنی تنقیدات میں کبھی داخل نہیں ہونے دیتے۔ جس کی بے نظیر مثال یہ ہے کہ آپ نے فورٹ ولیم کالج اور ڈاکٹر گلکرسٹ کی ادبی خدمات کی داد دینے میں جس قدر غیر جانبداری سے کام لیا ہے وہ ایک سچا نقاد ہی کر سکتا ہے اسی طرح آپ دہلی کالج کے متعلق اُردو لٹریچر کے تبصرے میں لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر صاحب نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مترجمین کا ذکر تو تفصیل سے کیا ہے لیکن دہلی کی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی، اور اس کے مترجمین کا مطلق ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ ان کا کام فورٹ ولیم کالج کے مترجمین سے کہیں زیادہ اور قابل قدر اور اہم تھا۔ فورٹ ولیم کالج کا کام زیادہ تر صرف افسانوں اور قصہ کہانیوں تک رہا مگر دہلی کالج کے مترجمین نے حقیقی علمی کام کیا۔ اس کا ذکر اردو ادب کی تاریخ میں نہایت ضروری تھا" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۶۰)

مولانا عبدالحق اپنے لب ولہجہ میں اعتدال کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بڑی بڑی خامیوں کی طرف اشارہ نہایت ہی پرلطف انداز میں کر جاتے ہیں۔ چنانچہ تذکرہ اعجاز سخن، جسے شاعروں کی ایک ڈائرکٹری سمجھنا زیادہ بہتر ہوگا اور جس میں مصنف نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اردو پنجاب سے نکلی ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ پنجاب کی پیداوار گیہوں ہے اور گیہوں مقوی دماغ ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اردو پنجاب میں پیدا نہ ہوئی ہو۔ اس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں۔

"غرض کہاں تک لکھوں کتاب کیا ہے ایک سمندر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قابل مؤلف کی نظر بہت وسیع ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ ذوق سلیم ہزار ہا دفتر پڑھنے کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اس تذکرے میں اعلیٰ سے اعلیٰ رایوں کے ساتھ ادنیٰ سے ادنیٰ مضحکہ خیز خیالات اس طرح ملا کر رکھ دئے گئے ہیں کہ ذوق صحیح پر گراں گذرتا ہے"

مولانا کی تنقیدوں کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے لب ولہجہ میں سختی اور ان کی تنقید نگاری میں محتسب کی شان پائی جاتی ہے اور اس کی مثال میں وہ "اصلاح سخن" اور "اردو لٹریچر" کے تبصروں کو پیش کرتے ہیں لیکن ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ مولانا کی تنقید کا نہ یہ عام رنگ ہے اور نہ انھوں نے ان تنقیدوں میں سختی سے کام لیا ہے۔ ان کی تنقیدوں میں علمیت، تحقیق اور صائب رائے کے ساتھ ساتھ بزرگی کا اثر ضرور پایا جاتا ہے۔ مگر یہ ان کی عمر، وسعت تجربہ، گہرا مطالعہ اور ذوق سلیم کے شایان شان ہے۔ اس قدر مسلم الثبوت اور مستند نقاد ہونے کی حیثیت سے ان کی تنقیدوں کو ایسا ہونا بھی چاہئے ورنہ ان لوگوں کو جو بے راہروی کی طرف مائل ہوں روکنا مشکل ہوگا۔

مولانا اکثر مصنفین کی خامیوں کی طرف اشارہ کرنے کا بہت اچھا انداز رکھتے ہیں لیکن بعض تنقیدوں میں کبھی کبھی ایسے طرز بھی نظر آتے ہیں جس سے کہ مصنف کی خامیاں بہت ہی نمایاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اردو لٹریچر کے تبصرے میں غلطیوں کی ایک طویل فہرست دی گئی ہے جس سے تصنیف کے متعلق بدظنی پیدا ہوتی ہے۔ مگر مولانا کیا کر سکتے تھے جب غلطیاں ہی اس قدر کثرت سے ہوں۔

مولانا عبدالحق کی تنقیدوں میں بہت شگفتہ جملے بھی شاذ و نادر مل جاتے ہیں جن سے آپ کی انصاف

پسندی پر تو کوئی حرف نہیں آتا مگر مصنف کے لئے بہت ہی ہمت شکن ہوتے ہیں مثلاً

"اس کتاب میں بھی وہی خامی پائی جاتی ہے جو مصنف کی ہر کتاب میں نظر آتی ہے۔"
(چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۲۷)

ایک جگہ اور ہے۔

"ڈاکٹر صاحب کی حیثیت ایک ناقل کی سی ہے اور مشہور ہے کہ نقل میں عقل کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ اس لئے ان سے جگہ جگہ لغزشیں سرزد ہوتی ہیں۔" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۵۹)

مولانا کے انصاف کا کمال یہ ہے کہ ان کی ادبی عدالت میں مسلمہ شہرت کے مالک اور نو آموز اور غیر معروف مصنف کا ایک ہی درجہ ہے۔ وہ نہ اس سے مرعوب ہوتے ہیں اور نہ اس سے بدظن چنانچہ مکاتیب امیر مینائی پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"ہمیں حضرت امیر مرحوم کے خطوط پڑھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ تقریباً تمام خطوط بے لطف، بے مزہ اور روکھے پھیکے ہیں۔ نہ کہیں ادبی نکات فرمائے ہیں اور نہ کہیں شعر و سخن پر ایسا خیال ظاہر فرمایا ہے کہ پڑھنے والے کو بصیرت ہو۔" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۱۷)

اسی طرح پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کی کتاب "زبان اردو پر سرسری نظر" پر تنقید کرتے ہوئے ان کے اس قول پر کہ "غالب کی شاعری ایک حد تک صرف ہائے وہو اور ناؤ نوش کی ترجمان ہے" اس طرح تنقید کرتے ہیں۔ یہ ان کے طرز تنقید کا صحیح نمونہ ہے۔

"یہ رائے ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلی ہے جس نے اردو ادب کا بغور مطالعہ کیا ہے خود بھی ادیب ہے اور یونیورسٹی میں اردو کا لکچرار بھی اور اس لئے نہایت حیرت انگیز ہے۔ ناپسندیدگی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مرزا کی شاعری میں کوئی پیغام نہیں ملتا۔ کیا شیکسپیر کی شاعری میں جو سرتاج شعرائے عالم ہے کوئی پیغام ملتا ہے۔ ایک نہیں کئی کئی یہی حال مرزا کی شاعری کا ہے۔ کیا یہ کچھ کم ہے کہ مرزا غالب نے اردو شاعری کو پستی سے نکال کر کہیں کا کہیں پہونچا دیا۔ غزل میں عام روش اور تقلید سے آزاد ہو کر نیا رنگ

پیدا کیا الیکن شاید صدیقی صاحب غزل میں کسی اصلاح کے قائل نہیں اخیالات کی جدت تخیل کی بلندی اور بیان کا جو لطف مرزا کے ہاں پایا جاتا ہے وہ اردو کے کسی شاعر میں نظر نہیں آتا۔ میں ایسے کئی صاحبوں کو جانتا ہوں جنہیں مرزا کے مختصر دیوان میں وہ پیغام ملے ہیں جو کسی دوسرے پیغام میں کیا۔ مذہب و اخلاق کی کتابوں میں بھی نہیں ہیں۔ اور ان پر مرزا کے کلام کا خاص اثر ہوا ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر مرزا غالب نہ ہوتے تو حالی اور اقبال بھی نہ ہوتے۔ مرزا غالب کا اثر اردو شاعری پر عجیب و غریب ہوا ہے اور ہے۔ کیا بغیر کسی پیغام کے یہ ممکن ہے؟" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۷)

مولانا کی تنقید نگاری کا بڑا کمال یہ ہے کہ تنقید کا اعلیٰ اور پاکیزہ معیار بھی قائم رکھتے ہیں اور مبتدیوں اور نومشقوں کی ہمت افزائی میں بھی دریغ نہیں کرتے چنانچہ پروفیسر محمود شیرانی کے متعلق اپنے ایک خطبہ میں لکھا ہے۔

"اس وقت بھی ہم میں ایسے قابل نقاد موجود ہیں جیسے پروفیسر شیرانی یا اور لوگ جنہیں ابھی شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ یا جو فی الحال اپنے کام میں مشغول ہیں جو حال کے ادب میں اپنی قابل قدر یادگار چھوڑ جائیں گے" (خطبات عبدالحق صفحہ ۱۴)

"اکبر الہ آبادی" مؤلفہ طالب الہ آبادی پر تنقید کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"طالب صاحب نے جس تحقیق و محنت و تلاش سے اکبر کے حالات لکھے ہیں۔ اور ان کے کلام کی خوبیوں کو دکھلایا ہے وہ اب تک کسی نے نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اکبر کے جو حالات محنت اور تحقیق سے جمع کئے ہیں ان کی صحت میں کلام نہیں ہو سکتا اور اس سے زیادہ امید نہیں کہ کوئی دوسرا جمع کر سکے" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۳۴)

مکاتیب امیر مینائی پر تبصرہ کرتے ہوئے مرتب کتاب مولوی احسن اللہ خاں ثاقب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اسی دیباچہ میں انہوں نے امیر کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ جو بلاشبہ منصفانہ اور ایک حد تک بے لاگ ہے جس کی توقع ان کے کسی شاگرد سے نہیں ہو سکتی" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۱۴)

مولانا کی تنقیدیں اُردو ادب میں غیر جانبداری، انصاف اور سچائی کا بہترین نمونہ ہیں جس میں خلوص اور بےنفسی کی بو آتی ہے اور اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ تنقید نگاری ذاتی اغراض و مقاصد سے بلند ہو کر صرف زبان و ادب کی ترقی کی خاطر کر رہے ہیں اور یہی صحیح تنقید ہے جو کہ آپ کی تنقیدوں اور تحریروں کے ہر ہر جملے سے نمایاں ہے لیکن انسان خالی از خطا نہیں چنانچہ مولانا عبدالحق اپنی تمام خوبیوں کے باوجود مولانا شبلی کے معاملہ میں اپنی غیر جانبداری کے اعلی معیار کو قائم نہ رکھ سکے۔ حالی اور شبلی کی معاصرانہ چشمک کی وجہ سے آپ کی تنقیدوں میں ایک کی حمایت اور دوسرے کی مخالفت کی جھلک آ ہی گئی ہے چنانچہ مقدمۂ حیات النذیر، میں ،، ہماری قوم کے ایک علامہ کے قول،، کو پیش نظر رکھ کر تاریخی شخصیتوں کے حالات زندگی اور اپنے زمانے کی شخصیتوں کے حالات زندگی لکھنے کی مشکلات سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

علامہ موصوف کو کسی ہمعصر نامور شخص کی (بشرطیکہ وہ کسی ہمعصر کو اس قابل سمجھیں) سوانح عمری لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ انھیں اس سے زیادہ دشواری پیش آئی جو ہماری زبان میں بہتر سے بہتر ،، سوانح عمری ،، لکھنے والے کو پیش آئی ہے۔ انھوں نے اب تک انھیں قدمائے کرام کے حالات پر قلم اٹھایا ہے جنھیں لوگ ایک زمانہ سے پوجتے آئے ہیں اور جن کی تنقید ذکرۃ چینی کتب کے حوالے تک محدود ہے۔ تاہم (بے ادبی معاف) کیا علامہ موصوف کی تالیفات اُس ،، پر فریب طریقہ ،، سے پاک و صاف ہیں ،، (مقدمات عبدالحق حصۂ اول صفحہ ۱۹۴)

مولانا نے عطیہ بیگم کے نام کے مولانا شبلی کے خطوط شائع کرکے بڑی زیادتی کی۔ آپ کو یہ معلوم تھا کہ جیسا کہ خطوط اور مقدمے میں خود واضح ہے کہ مولانا شبلی اپنے ان تعلقات کو بالکل پرائیویٹ سمجھتے تھے اور انھیں پردہ عام پر لانا نہیں چاہتے تھے لیکن پھر بھی مولانا عبدالحق صاحب نے ان خطوط کو شائع کر دیا اور اپنے اوپر ان الفاظ کا اطلاق کر لیا جن کو شوق سندیلوی کے متعلق ،اصلاح سخن، پر تبصرے کے دوران میں خود لکھا تھا

،، ہمارے خیال میں ان کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ خانگی خطوط بغیر اجازت کے شائع کرتے ،،

(تنقیدات عبدالحق صفحہ ۹۰)

علاوہ ازیں، مقدمہ خطوط عطیہ بیگم، میں جہاں مولانا شبلی کی بعض کمزوریوں کو نمایاں کرنے میں غلطی کی گئی ہے

وہاں مندرجہ ذیل ریمارک بھی مولانا کی تنقید نگاری کے شایان شان نہیں۔

"مولانا شبلی جیسے اکل کھرے تنگ مزاج یہ لکھیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ ان کے اخلاص ومحبت کی نوبت کہاں تک پہونچ گئی تھی۔" (مقدمات عبدالحق حصہ دوم صفحہ ۱۱۳)

ایک جگہ اور لکھتے ہیں۔

آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہوگئی ہے۔ زمانے کے ہاتھوں کوئی نہیں بچ سکتا وہ بہت سخت مزاج ہے مگر آخری انصاف اسی کے ہاتھ ہے ان کی بعض کتابیں ابھی سے لوگ بھولتے جاتے ہیں اور کچھ مدت کے بعد صرف کتب خانوں میں نظر آئیں گی۔" (مقدمات عبدالحق حصہ دوم صفحہ ۱۱۵)

مولانا عبدالحق کی شبلی کے ساتھ زیادتی کا احساس مولانا حالی کو بھی تھا جس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل خط سے ہوگا۔ جو کہ انھوں نے مولوی صاحب کو لکھا تھا۔

"جن لوگوں کو آپ نے اس غرض سے انتخاب کیا ہے کہ ان پر کرٹکل اِسے (Critical essay) لکھے جائیں ان میں سے ایک شخص کا نام ہونے سے اور ایک شخص کا نہ ہونے سے تعجب ہوا۔ مولوی سید احمد میرے نہایت دوست ہیں .... مگر ماڈرن اردو لٹریچر کا ہیرو میں ان کو نہیں کہہ سکتا اور اس سے بھی زیادہ تعجب شمس العلما مولانا شبلی نعمانی کا نام چھوڑنے پر ہے۔ اس فروگذاشت کو سوائے اس کے کہ آپ کو انتخاب کرتے وقت ان کا خیال نہ آیا ہو میں اور کسی بات پر محمول نہیں کر سکتا۔" (مکتوبات حالی صفحہ ۴۴)

مولانا شبلی کے معاملہ کو چھوڑ کر مولانا عبدالحق کی تنقیدات کے متعلق نہایت ہی وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہر قسم کی جانبداری اور تنگ نظری سے بالکل مبرا ہیں۔ ان کی تنقیدوں میں عقل سلیم اور ذوق صحیح بہت ہی نمایاں ہوتا ہے جس پر بے جا طرفداری اور تعصب کبھی فتح نہیں پا سکے۔ وہ خوبیوں اور نقائص پر غیر جانبداری کے ساتھ نظر ڈالتے ہیں۔ لب ولہجہ میں بھی اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ممکن ہے کہ کسی کو کسی خاص معاملہ میں ان کی رائے سے اصولی اختلاف ہو جیسا کہ اکثر ہوتا ہے لیکن وہ آپ کی تنقید پر

کو اس یقین کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں کہ آپ اظہار رائے میں پوری احتیاط اور انصاف سے کام لیتے ہیں اور اصول تنقید کا پورا پورا احترام کرتے ہیں۔

(۵) قوت تحریر:۔ نقاد کے لئے جو صفات لازمی ہیں، ان میں سے ایک قدرت بیان اور تحریر کی دل نشینی ہے۔ کیونکہ اس قوت کے بغیر نہ خیالات کی پوری قوت کارفرما ہو سکتی ہے اور نہ تحریر کو قبول عام کا درجہ نصیب ہو سکتا ہے۔ مولانا عبدالحق کو زبان اور قلم پر بھی قدرت حاصل ہے۔ اسی لئے ان کا ہر قول اور ہر تحریر جو ان کی زبان اور ان کے قلم سے نکلتی ہے سننے والے اور پڑھنے والے کے دل میں اُتر جاتی ہے۔ یہ بھی ان کی تنقیدوں کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب ہے۔

مولانا عبدالحق صحیح معنوں میں حالی کے پیرو اور ان کے جانشین ہیں۔ انھوں نے جہاں تنقید نگاری کو جس کی بنیاد مولانا حالی نے رکھی تھی پایۂ تکمیل تک پہونچایا وہاں ان کی سادگی زبان کو کمال عروج تک پہونچانے اور اسے مقبول عام بنانے کا پورا پورا حق بھی آپ ہی نے ادا کیا۔ آپ کی عبارت نہایت ہی صاف ستھری اور سلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ انتہائی پیچیدہ مسائل کو بھی عام فہم اور پاکیزہ انداز میں صحت و صفائی کے ساتھ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ان میں ضبط اور اعتدال غضب کا ہے۔ جو ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتا۔ واقعات کی تفصیل اور خیالات کا ہجوم ان کے قلم پر کبھی غالب نہیں آتا بلکہ وہ اس پر قابو پا کر ضبط تحریر میں لاتے ہیں ان کے خیالات بہت ہی سلجھے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے انھیں نہ نثری شاعری کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ فقروں کے روپے پر روپے چڑھاتے ہیں۔ ان کی تحریر کے الفاظ نہایت ہی سادہ اور آسان ہوتے ہیں۔ اس لئے پڑھنے والا کبھی الفاظ کے پھندوں میں نہیں الجھتا بلکہ جو لفظ ان کے قلم سے نکلتا ہے وہ دماغ میں جگہ کرتا ہے اور معانی و مطالب فوراً دل میں اتر جاتے ہیں۔ اکثر اچھے اچھے انشا پرداز جذبات سے مغلوب ہو کر بھٹک جاتے ہیں لیکن مولانا اس وقت تک کچھ نہیں کہتے جب تک کہ انھیں کسی بات کے کہنے یا خیال کے ظاہر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

مولانا عبدالحق کا اسلوب بیان علمی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے لئے بہت ہی موزوں ہے۔ جو کہ خیالات سے کبھی مغلوب نہیں ہوتا۔ وہ واقعات اور حقائق کو نہایت ہی سادہ زبان میں شگفتگی اور روانی

کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں، اس لئے انھیں تشبیہ و استعاروں تلمیح اور تمثیلوں کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے اور نہ وہ دلفریب تحریروں میں پھنس کر مبالغہ آمیزی، شاعرانہ صناعی اور لفظ طرازیوں سے کام لیتے ہیں۔ ان کا طرز تحریر علمی اور تنقیدی ہے۔ ان کی نثر میں پختگی، متانت اور حقیقت نگاری کی قوت ہے۔ جو ہر ادیب کو میسر نہیں ہوتی اور یہی ان کا خاص جوہر ہے جس کی مثال مولانا کی علمیت کے سلسلے میں پیش کی جا چکی ہے۔ یہاں ان کی انشا پردازی، زور بیان اور ادبیت کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ جو سادگی، زور بیان، طرز تحریر اور ادائے مطالب کے لحاظ سے آپ اپنی مثال ہے۔

"عقل اور عشق کی لڑائی ایک عجیب داستان ہے۔ جا بجا رت اور جنگ جرمن سے کہیں زیادہ ہولناک، یہ ایک عالمگیر جنگ ہے جو ہر آن اور ہر ساعت اور ہر مقام پر برپا ہے۔ اور ابتدائے آفرینش سے اب تک قائم ہے اور رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ انسان نہ صرف عقل ہی عقل ہے اور نہ جذبات ہی جذبات۔ اگر وہ محض عقل ہی ہوتا تو ایک اچھی خاصی مشین ہوتا۔ اور اگر صرف جذبات ہی جذبات ہوتا تو بلاشبہ مجنون ہوتا۔ کاش وہ کچھ ہوتا ایک ہوتا لیکن مشکل یہ آپڑی ہے کہ اس میں دونوں فتنے موجود ہیں۔ عقل اسے ایک طرف کھینچتی ہے اور عشق دوسری طرف اور دونوں کے رستے ایک دوسرے سے مخالف اور متضاد ہیں۔ عقل اسے بے راہ روی سے روکتی ہے اور اعتدال کے حدود میں رکھنا چاہتی ہے۔ عشق جو ہر حد سے آزاد ہے اور جس کے ہاں اعتدال ایک بے معنی لفظ ہے اسے اس تنگنائے سے نکال کر محبت و جنون کے وسیع اقلیم میں لے جانا چاہتا ہے۔ عقل اسے دنیا داری سکھاتی ہے اور دنیا میں سلیقے اور ہوشمندی سے رہنا چاہتی ہے۔ عشق دنیا اور دنیا داری کو ٹھکراتا ہے اور اسے ایک ایسے عالم میں پہنچانا چاہتا ہے جہاں نہ تن بدن کی خبر ہے نہ ہوش حواس کا خیال، نہ اپنے کی فکر ہے نہ پرائے کی۔ انسان اس دوراہے میں آکر حیران و ششدر رہ جاتا ہے اور ایک عجیب کش مکش میں پڑ جاتا ہے بعض اوقات اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا

کرے۔ان دونوں کی ضد میں یہ بے چارہ مفت میں پھنس جاتا ہے اور جب توفیق یاوری کرتی ہے تو ایسے نازک وقت میں ہمت سامنے آتی ہے اور التوائے جنگ کا ڈول ڈالکر لڑاکوؤں کو سمجھانا شروع کرتی ہے عشق پر معمولی پابندی و نصائح کا اثر کیا ہو سکتا ہے اس لئے وہ اسے اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے ایسا لبھاتی ہے کہ وہ صلح پر راضی ہو جاتا ہے۔اس صلح میں راہ مستقیم ہے۔ اس رستے کے چلنے والوں میں کبھی کبھی انسان کامل نظر آجاتے ہیں۔" (مقدمہ سب رس، صفحہ ۳۴)

اس ٹکڑے میں آپ نے عقل و عشق کا خوب محاکمہ کیا ہے۔الفاظ کی سادگی چھوٹے چھوٹے جملے اور صفائی بیان قابل داد ہے۔ ہر خیال نہایت واضح ہے۔ الجھاؤ کا پتہ بھی نہیں۔ خیالات کا ایک دریا ہے جو امڈا چلا آرہا ہے۔ سادگی اور سلاست۔ جملوں کا ربط اور خیالات کا تسلسل قابل غور چیزیں ہیں تصنع اور آورد کا نام نہیں۔ پوری عبارت میں آمد کا رنگ ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بلا تکلف جو لفظ زبان سے نکلا اسے حوالہ قلم کر دیا گیا ہے۔

مولانا عبدالحق کا ایک بڑا کمال یہ ہے کہ وہ موقع کے اعتبار سے پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں اگر سادگی اور زور بیان کا لطف اٹھانا ہو تو اس عبارت کو پڑھیئے۔کس دردناک طریقہ پر دلی کے دور انحطاط کا نقشہ کھینچا ہے۔

"اُس وقت کی دلی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ وہ ہندوستان کی جان اور سلطنت مغلیہ کی راجدھانی تھی۔ ہر طرف سے آفات کا نشانہ تھی۔اس کی حالت اس عورت کی سی تھی جو بیوہ تو نہیں پر بیواؤں سے کہیں دکھیاری ہے۔ اولعزم تیمور اور بابر کی اولاد ان کے مشہور آفاق تخت پر بے جان تصویر کی طرح دھری تھی۔ اقبال جواب دے چکا تھا۔ادبار وانحطاط کے سامان ہو چکے تھے۔ اور سیاہ روز زوال گرد و پیش منڈلا رہا تھا۔بادشاہ دست نگر اور امیر امراء مضمحل و پریشان تھے۔سب سے اول نادر شاہ کا حملہ ہوا۔ حملہ کیا تھا خدا کا قہر تھا۔نادر کی بے پناہ تلوار اور اس کے سپاہیوں کی ہولناک غارت گری نے دلی کو

فوج کھسوٹ کر برباد کر دیا تھا ابھی کچھ یہ سنبھلنے ہی پائی تھی کہ چند سال بعد احمد شاہ درانی کی چڑھائی ہوئی۔ پھر مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں نے وہ اودھم مچائی کہ رہی سہی بات بھی جاتی رہی۔ غرض ہر طرف خود غرضی، خانہ جنگی، طوائف الملوکی اور ابتری کا منظر نظر آتا تھا۔ یہ حالات میر صاحب نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور دیکھے ہی نہیں ان کے چرکے سہے اور ان انقلابات کی بدولت ناکام شاعر کی قسمت کی طرح ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ یہ دلی کے اقبال کی شام تھی جس کی سحر اب تک طلوع نہیں ہوئی" (مقدمات عبدالحق حصہ دوم صفحہ)

مولانا عبدالحق جہاں سادگی زبان اور اسلوب بیان میں حالی کے پیرو ہیں وہاں ان کی انشا پردازی میں شبلی کی رنگینی اور شگفتگی کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ اس لئے مولانا عبدالحق کی تحریروں میں مولانا حالیؔ اور شبلی کے طرزوں کی ہم آہنگی عجب لطف دیتی ہے۔ جہاں کہیں موضوع سخن اجازت دیتا ہے ان کے بیان میں نہایت دلآویز جوش اور روانی پیدا ہو جاتی ہے اور زور قلم کا لطف آتا ہے جس کی مثالیں آپ کے ہاں اکثر پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ٹیگور اور اقبال کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"آج کل بعض سخن سنج اقبال کے کلام کا مقابلہ ہندوستان کے ایک دوسرے نامور اور فخر ہندوستان شاعر ٹیگور کے کلام سے کرتے ہیں۔ ٹیگور کے کلام میں بیشک پریم کا رس گھلا ہوا ہے اس کی محبت، عالمگیر ہے۔ وہ تمام کائنات کو آغوش میں لینا چاہتا ہے۔ اس کی نظمیں پڑھ کر دل کو تسکین اور روح میں سرور پیدا ہوتا ہے لیکن اس میں وہ آگ نہیں جو اقبال میں ہے ٹیگور کے کلام میں نسائیت کا شائبہ پایا جاتا ہے اور اقبال میں مردانہ پن۔ ٹیگور کا جذبہ محبت گو بہت گہرا اور بے پناہ ہے لیکن وہ اپنے حدود کو توڑ کر آگے نہیں نکل جاتا اور باوجود کمیت و وجد کے آپے سے باہر نہیں ہونے پاتا۔ اقبال کا مطمح نظر اگرچہ محدود ہے مگر زیادہ قوی زیادہ پر زور اور زیادہ شور انگیز ہے ٹیگور کے ہاں نازک سے نازک موقع پر بھی عقل کی پرچھائیں آس پاس ضرور نظر آتی ہے مگر یہاں جذبات کے تلاطم کے سامنے بعض اوقات بیچاری عقل اپنی آبرو بچانے کے لئے اچک کر الگ جا کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں جذب اور کیفیت

کے ساتھ خودرائی اور بیان وارنگی و شگفتگی۔" (تنقیدات عبدالحق صفحہ ۷۹)

مولوی صاحب کے زور بیان اور فصاحت و بلاغت کے مولانا حالی بھی قائل تھے چنانچہ ایک خط میں مولانا حالی عبدالحق صاحب کو لکھتے ہیں۔

"آپ کا آرٹیکل جو علی گڈھ کالج کی شورش کے روزانہ پیسہ اخبار لاہور میں نکلا ہے میں نے کئی دفعہ پڑھا۔ اس کا زور اور سچائی اور فصاحت دیکھ کر طبیعت نہایت خوش ہوئی۔

(مکتوبات حالی حصہ اول صفحہ ا ۷)

عموماً مولانا کا طرز تحریر سنجیدہ اور متین ہوتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں مولانا نے اپنی شائستہ ظرافت کے جوہر بھی دکھائے ہیں جس سے کہ آپ کی تحریروں کی دلپذیری بڑھ جاتی ہے۔

چنانچہ شوق سندیلوی مصنف اصلاح سخن کی ادبی شوخی کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے استادوں کے خانگی خطوط شائع کئے اور ساتھ ہی اس فعل کی معافی بھی مانگی۔

طبع کے بعد معافی مانگنا یہ اور بھی ستم ہے۔ ہمارے خیال میں ان کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ خانگی خطوط بلا اجازت کے شائع کرتے۔ مگر شاگرد بھی تو بیٹے کے برابر ہوتا ہے اس لئے اس سے اجازت کی کیا ضرورت ہے۔" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۲۳)

اس تبصرے کے سلسلے میں شوق کے استادوں کی ان فرمائشوں کا ذکر کرتے ہوئے جو انھوں نے اپنے خطوط میں شاگرد سے کی تھیں۔ ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

"ان بیچاروں کو کیا معلوم تھا کہ ان کا شاگرد رشید یہ بھانڈا چوراہے پر پھوڑے گا۔"

مصنف "سرگذشت الفاظ" نے اپنی یہ تحقیق پیش کی تھی کہ "باورچی اردو میں آکر باورچی خانے میں برتن صاف کرنے کی صنعت کے لئے مخصوص ہو گیا" اس پر مولانا عرض کرتے ہیں۔

"ابھی تک تو یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا ممکن ہے آئندہ یہی ہو جائے۔"

مولانا صحیح الفاظ کے باموقع اور برمحل استعمال کے گر سے خوب واقف ہیں۔ اس جگہ سے اس لفظ کو ہٹا کر دوسرا لفظ رکھنا ممکن نہیں۔ بعض وقت وہ ہندی کا کوئی پرانا یا غریب لفظ اس طرح استعمال کر جاتے

ہیں اور وہ ایسا برمحل ہوتا ہے کہ کلام میں جان پڑ جاتی ہے۔ اس کی مثالیں جا بجا ملتی ہیں۔

"ان دونوں کی ضد میں یہ بے چارہ مفت میں پس جاتا ہے" (سب رس صفحہ ۳۵)

"مفت" جیسے غریب لفظ نے اس جملے میں جان ڈال دی ہے۔

مندرجہ ذیل جملے میں "ڈول ڈالنے" کا استعمال کس قدر برمحل ہے۔

"ہمت سامنے آتی ہے اور التوائے جنگ کا ڈول ڈال کر لڑاکوؤں کو سمجھانا بجھانا شروع کرتی ہے" (سب رس صفحہ ۳۵)

دیکھئے اس جملے میں "جُل" کے برمحل استعمال سے کتنی خوبی پیدا ہو گئی ہے۔

"استادی کا شوق بھی بُرا ہوتا ہے جُل میں آ گئے اور برابر اصلاحیں دیتے رہے"

(چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۲۱)

ذرا اس ٹکڑے کو پڑھئے اور دیکھئے کہ سادہ اور غریب الفاظ کس طرح اس عبارت کی جان بن گئے۔

"اردو کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب زبان کی فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے لگا نہیں کھاتی۔ اگرچہ زبان نے بہت کچھ پلٹا کھایا ہے اس وقت اور اُس وقت کی زبان میں بہت بڑا بل ہے تاہم باغ و بہار ویسی ہی دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے جیسے پہلے تھی"

(مقدمات عبدالحق حصہ دوم صفحہ ۱۳۱)

غرضکہ مولانا عبدالحق کی تمام تنقیدیں بہت ہی موثر ہوتی ہیں۔ آسان، سلیس اور شستہ زبان، نہایت ہی صاف واضح اور سلجھا ہوا طرز تحریر ان کی تنقید نگاری کی جان ہے۔ ان کی نثر کی پختگی، متانت اور حقیقت نگاری علمیت، تحقیق اور تنقید کے لئے بہت موزوں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی تحریروں میں سادگی، زور بیان، سنجیدگی اور کبھی کبھی ظرافت اس قدر دلآویزی بخشتی ہے کہ ان کی تنقیدیں اکثر کتاب سے زیادہ پرلطف ہو جاتی ہیں اور دلچسپ افسانوں کی طرح مزہ لے کر پڑھی جاتی ہیں

(باقی آئندہ)

اخلاق الرحمٰن صاحب قدوائی بی۔اے جامعہ

تعلیم میں سیر کی اہمیت

سیر بھی تعلیم کا ایک جزو ہے۔ بچوں کو چیزوں کے دیکھنے اور اس کے سمجھنے میں ایک گونہ آزادی ہوتی ہے۔ ہر چیز پر ان کی نظر آزادی سے پڑتی ہے۔ اس وقت وہ اپنی معلومات میں اس طرح اضافہ کرتے ہیں کہ جماعتی ڈسپلن کا دباؤ ان کی طبیعتوں پر نہیں ہوتا۔ اور صحیح طریقے پر بیٹھو، ٹیک نہ لگاؤ، کیوں باتیں کر رہے ہو سنو اور قلم سے کیوں نہیں لکھتے وغیرہ احکامات کی بندش سے وہ اس وقت بالکل آزاد ہوتے ہیں۔ اور آپس کے سوالات اور جوابات سے ایک دوسرے کی تشفی کرنا چاہتے ہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ پوچھتے ہی چلے جاتے ہیں اور اگر جوابات تشفی بخش نہیں ہوتے تو استاد سے سوالات کرنے لگتے ہیں اور چیزوں کے متعلق سمجھتے ہیں سیر میں تعلیم بامقصد ہو جاتی ہے۔

بچے مشاہدے اور سیروں کے درمیان جس قدر باتیں جذب کرتے ہیں اتنی کتابی تعلیم سے جذب نہیں کرتے۔ سیر میں بچے زیادہ سے زیادہ سیکھتے ہیں۔ اور کسی بات کے سمجھنے میں ان کی توجہ زیادہ عرصہ تک قائم رہتی ہے۔ سیر کا نام ہی سن کر وہ دل ہی دل میں سینکڑوں منصوبے باندھ لیتے ہیں۔ اور اگر استاد انھیں ترتیب دینا چاہے تو ہر طالب علم اپنی سوچی ہوئی تجویزیں اور منصوبے دہرانے اور لکھوانے کے لئے بڑے جوش سے تیار نظر آتا ہے اور یہی تیاری اور آمادگی تعلیم دینے کے لئے نقطہ آغاز بن سکتی ہے۔ اور بن جاتی ہے۔

تھوڑی سی تحریک سے بورڈ پر ایک لمبی فہرست تیار ہو جاتی ہے بچے جو کچھ دیکھنا معلوم کرنا، اور سمجھنا چاہتے ہیں اسے بورڈ پر لکھوا دیتے ہیں۔ اب یہ استاد پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک ان باتوں میں ان کی تشفی کر سکتا ہے۔ کہاں تک اپنی معلومات کو ان کی تسلی کے کافی سمجھتا ہے وہ خود کہاں تک تیار ہے اپنے ہنر اور ترکیبوں سے ان کی اس تیاری کو کہاں تک برقرار رکھتا ہے اور جستہ جستہ مجوزہ باتیں انھیں بتلا دیتا ہے۔ اگر استاد اچھی طرح تیاری کرے تو وہ بچوں کی آمادگی اور تیاری سے بہت زیادہ فائدہ

اٹھا سکتا ہے۔ وہ باتوں باتوں میں بچوں کو نہ صرف وہ باتیں سمجھا سکتا ہے جو وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں بلکہ سیر اور مشاہدے کے بعد ان کے لئے مضمون نگاری کا اچھا موقع بھی فراہم کر سکتا ہے۔ مدرسوں میں عموماً بچوں سے خشک عنوانات پر مضامین لکھوائے جاتے ہیں جنھیں بچے شوق سے نہیں لکھتے ہیں وہ صرف استاد کا حکم بجا لانے کے لئے لکھتے ہیں۔ لیکن سیر کی دلچسپیاں قلمبند کرانے سے بچے بغیر کسی بار اور کسی بیرونی مجبوری کے مضامین لکھتے ہیں۔ اس لئے کہ انھیں ایسی بات کی روئیداد لکھنی ہے جس میں وہ خود شریک ہیں۔ جس میں وہ، ان کے ساتھی اور ان کا استاد مل کر دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ انھیں ایک بامقصد کام کی رپورٹ لکھنی ہے۔ گویا جہاں آپ سیر کے ذریعہ بچوں کو ان کی مجوزہ باتوں کے متعلق بتلاتے اور سکھاتے ہیں وہاں آپ اُن میں مضامین لکھنے کا شوق بھی پیدا کر دیتے ہیں۔

سیر اور مشاہدوں کی تحریک اکثر بچوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ اکثر موسم کی مناسبت سے تحریک پیدا ہوتی ہے کبھی کبھی سبقوں کے پڑھانے کے دوران میں خود بخود ضرورت محسوس ہوتی ہے اور بچے سبقوں میں بیان کی ہوئی چیزوں کے دیکھنے کا شوق ظاہر کرتے ہیں۔ ویسے بھی سبقوں کو جاندار اور دلچسپ بنانے کے لئے مشاہدے اور سیروں کا موقع نکالتے رہنا چاہئے۔ اس لئے کہ سیر اور مشاہدے کے ذریعہ نہ صرف آپ اپنے سبقوں کو بامعنی اور جاندار بنا دیتے ہیں بلکہ بچوں کی فطرت کو تسلی حاصل کرنے کا موقع دیتے ہیں ان میں جو نئی نئی باتوں کے دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے اس کیلئے موقع فراہم کر دیتے ہیں گویا آپ بچوں کی نفسیات اور تعلیم میں ہم آہنگی اور ربط پیدا کر دیتے ہیں۔ سیر اور مشاہدہ کے ذریعہ آپ بچوں میں وسعت نظر پیدا کر دیتے ہیں چیزوں کو خاص ترتیب اور خاص ڈھنگ سے دیکھنے کی عادت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف وقتی طور پر فائدہ ہوتا ہے یعنی نہ صرف مجوزہ سبق میں جان پیدا ہو جاتی ہے بلکہ دوسرے سبقوں کے لئے میدان تیار ہو جاتا ہے۔ ان کے سمجھنے میں بچوں کو بڑی مدد ملتی ہے اور گذشتہ سیروں کی کڑیاں جب آنے والے سبقوں میں کہیں کہیں ملتی ہیں تو بڑی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ بچے بیداری اور غور سے تمام باتوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سبقوں کی تکمیل اور ان کو دلچسپی سے شروع کرنے کے علاوہ عملی کاموں کے کرنے کے دوران میں بھی سیر اور مشاہدہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ ابری بنانا۔ کاغذ بنانا۔ کارڈ بورڈ سے چیزیں بنانا۔ سوت کاتنا یا باغیچہ کا کام کرنا۔

جو کام بھی بچے کرتے ہوں ان کے سمجھنے اور بہتر طریقے پر انجام دینے کے لئے ایسی جگہوں پر بچوں کو لیجانا چاہئے جہاں یہ کام ہو رہے ہوں ایسا کرنے سے کبھی کبھی بچوں میں اپنے کام کے متعلق نئی قسم کی تحریک اور سوجھ بوجھ پیدا ہونے لگتی ہے بچے نئے نئے ڈھنگ اور دوسرے کے تجربے کی روشنی میں اپنا کام کرنے لگتے ہیں۔ ان کا رجحان نئی چیزیں بنانے کی طرف ہونے لگتا ہے۔ ان کی طبیعتیں ایجاد کی طرف مائل ہونے لگتی ہیں۔

تربیت اور عادات کے سنوارنے کے اعتبار سے بھی سیریں بہت مفید ہوتی ہیں۔ ایسے مدرسوں میں جہاں بچے بورڈنگ میں نہیں رہتے بلکہ آس پاس سے آتے ہیں تربیت اور عادات کے سنوارنے کا پہلو رہ جاتا ہے۔ اس لئے کہ پڑھائی لکھائی کے کاموں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ اسکی طرف بھی توجہ کیجائے گو ہوشیار استاد اسکا خیال رکھتے ہیں لیکن اس خیال سے کسی بڑے نتیجے کی امید نہیں کیجا سکتی لیکن اگر ایسے مدرسوں میں دستکاری اور حرفوں کی تعلیم کے انتظام کے ساتھ ساتھ بچوں کو وقتاً فوقتاً تماشاہے اور سیریں بھی کرائی جائیں تو عادات کے بننے اور سنورنے پر بھی خاطر خواہ اثر پڑتا ہے بچے عملی کاموں سے دلچسپی کی وجہ سے مدرسہ کے بعد بھی اسکول آتے ہیں اور کام کرتے ہیں اور اس طرح مدرس اور بچوں کا ساتھ مدرسہ کے اوقات کے بعد قائم رہتا ہے اور سیروں میں تو راتوں کو بھی مل بیٹھنے کا موقع مل آتا ہے۔ استاد اور شاگرد کے ان تعلقات کے بعد مدرسہ میں بھی بچوں کی عادات و اطوار پر استاد کی نظر پڑتی رہتی ہے اور استاد کے ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے سے ان میں اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ بچوں کی کتنی ہی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر جماعت کی روزمرہ پڑھائی میں نظر نہیں پڑتی لیکن سیروں اور تماشوں کے دوران میں جب بچوں کو آزادی ملتی ہے تو وہ بیباکانہ طور پر کھیلتے ہیں پھر استاد کو بھی معلوم ہونے لگتا ہے کہ بچے کی کونسی عادتیں ایسی ہیں جن کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

سیر میں بچوں کو بہت سے ذمہ داری کے کام سپرد کئے جاتے ہیں وہ نہ صرف اپنی چیزوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں بلکہ دوسری مشترکہ چیزوں کی بھی حفاظت کرتے ہیں۔ ذمہ داری کے کام کرانے سے ان میں ذمہ داری پیدا ہوتی ہے جب بچوں کو کوئی کام سپرد کیا جاتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ انہیں اس کام کے لائق سمجھا گیا۔ ورنہ عام طور پر بچوں سے ذمہ داری کے کام نہ لیکر ہم ان میں یہ خیال پیدا کردیتے ہیں کہ وہ کوئی کام نہیں کرسکتے یا یہ کہ دوسرے کام کرنے کیلئے ہیں اور وہ صرف دیکھنے اور برتنے کے لئے ہیں کسی لمبی سیر میں آپ دیکھیں کہ چھوٹے چھوٹے بچے کس طرح مریض کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور دوسروں کے بستر قرینے سے رکھنے اور بازار سے چیزیں لاکر کھانا پکانے کے کاموں میں کتنی مستعدی اور انہماک کا اظہار کرتے ہیں اگر آپ انہیں کسی کام کی ذمہ داری سپرد نہیں کرتے تو وہ بہت رنجیدہ ہوتے ہیں بچے جہاں سیر کی دلچسپیوں میں حصہ لینا چاہتے ہیں وہاں وہ ذمہ داری کے کاموں میں بھی اتنے ہی مستعد نظر آتے ہیں۔

سید احمد علی آزاد

کسان

[کسان" اور" مزدور" ان دو الفاظ کے پیچھے موجودہ زمانے کی چند اہم تحریکات جھلکتی ہیں۔ کسان ایک مظلوم انسان ہے جس کی محنت اور جاں فشانی پر دنیا والوں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ لیکن زمانہ اس محسن کی قدر نہیں کرتا۔ اس کی ذمہ داری حکومت اور رعایا دونوں کے کندھوں پر رکھی جاتی ہے۔ میں نے ڈرامے میں انسانیت کے اس سچے لیکن مجبور خدمت گذار کی تصویر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش قصہ کہانی نہیں۔ دکن میں مرہٹواڑی علاقے کے کسان کی زندگی کا چربہ ہے۔ اصلی اور سیدھا سادہ۔ واقعات عام ہیں۔ پتہ نام ونشان فرضی]

(باقی)

پہلا منظر

"سودا"

ایک چھوٹا سا گاؤں پیپل کے درختوں کی چھاؤں میں فتح چند مہاجن کا مکان، اینٹوں اور چونے سے بنا ہوا جس پر پلاسترکاری نہیں ہوئی ہے۔ گاؤں والیاں سامنے پنگھٹ پر پانی بھر رہی ہیں۔ مکان کے سامنے والے کمرے میں گدے پر مہاجن بیٹھا ہوا ہے۔ قریب ہی اس کا منشی شیش راؤ کھاتہ لکھ رہا ہے۔ فتح چند سکھا رام کسان سے

فتح چند۔ ہو گئی ختم اب مٹی[1] پتر ک — دیکھنا وقت پر ادا ہو اناج

سکھا رام (ہاتھ جوڑ کے) — مجھ کو سب کچھ دیا ہے آپ ہی نے — سر پہ قائم رہے حضور کا راج
اس کی کرپا سے سب ادا ہوگا — ہاتھ ہے ایشور کے میری لاج

فتح چند۔ ایشور تو ہے لیکن اے مورکھ — ہم بھروسے پہ رہ نہیں سکتے
ہم کو دینا مگر وقت پہ پیسہ — ہم مصیبت کو سہہ نہیں سکتے

(منشی شیش راؤ شواش پترا[2] میری آگے بڑھاتے ہوئے)

---

[1] مٹی پتر ک۔ رہن رکھوانے کا دستاویز۔ [2] وشواش پترا میری۔

شیش راؤ۔ اک اور نشاں اپنے انگوٹھے کا لگا دے — یہ نقش جو پتر کے پہ ہے کچھ ٹھیک نہیں ہے
سکھا رام۔ کیوں اور انگوٹھا مرا لیتے ہو جی سرکار — کیوں لوٹتے ہو ایک پریشان کو بیکار
شیش راؤ۔ گھبرا نہیں یہ ایک ہی کاگذ[1] تو ہے تیرا — ہم تجھ کو کسی حال میں دھوکا نہیں دیں گے

(سکھا رام شک کرتے ہوئے ایک اور نشان لگا دیتا ہے۔ پھر سلام کر کے کپاس کے بیجوں کی پوٹلی جو ایک پلہ ہے بیل پر لادتا اور واپس ہوتا ہے۔ راستہ میں اس کا ایک کسان دوست راما ملتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے)

راما۔ بھاؤ[2] کہنا، تو فتح چند سے کتنی ٹھیری؟
سکھا رام۔ دو پلے[3] ادائی۔
راما۔ میں کہوں اتنی ادائی تری مہنگی ٹھیری
سکھا رام۔ سچ کہتے ہو بھائی
راما۔ اب کے بارش کا بھی اندازہ کیا ہے تو نے؟
سکھا رام۔ ہے یہ بھگوان کے ہاتھ
راما۔ اور تحصیل کا باقی بھی دیا ہے تو نے؟
سکھا رام۔ یہ تو جیون کے ہے ساتھ

راما۔ آج اک بیل کی جوڑی مرے گھر آئی ہے — بات دو سو پہ بہت سوچ کے ٹھرائی ہے
دونوں پیٹھے[4] ہوئے ہر طرح نظر آتے ہیں — کھلی دو وقت کی وہ چین سے کھا جاتے ہیں
آٹھ گھنٹے[5] بصحت آرام سے جوتیں گے زمیں — دونوں کے سینگ سنگوٹی میں کوئی عیب نہیں
اب کے سختی مرے کھیتوں میں ہوئی ہے پیدا — جانے کیا بات ہے بکھر[6] بھی بہت سخت چلا
کھلا[7] چھ پلے مرے کھیت سے بھر لائے گی — میں سمجھتا ہوں یہ جوڑی مرے کام آئے گی
سکھا رام۔ قیمت بھی ٹھیک بیل بھی اچھے، مگر بتا — دو سو چکانے کا بھی کوئی بندوبست ہے؟

---

[1] کاغذ۔ دستاویز۔ [2] بھاؤ۔ بھائی۔ مہاجن کسان کو کھیت رہن رکھ کر یا اقرارنامے کے ذریعے اناج، بیج اور روپیہ قرض دیتا ہے اس کی ادائی میں وہی اناج، بیج وغیرہ لکھا لیتا ہے۔ [3] پیٹھے ہوئے۔ سدھائے ہوئے۔ [4] کسانوں کا محاورہ۔ [5] بکھر۔ ایک آلہ۔ کپاس کے کھیت میں بارش ہونے کے بعد ہو گرشے چلا کر ڈھیلے پھوڑتے جاتے ہیں پھر بکھر چلا کر بیج بکھیرے جاتے ہیں۔ [6] کھلا، یعنی اناج، فصل۔

راما۔ دو نمبر رکھانے کا وعدہ کیا ہے　　کل ہی راج ہنس جی سے سودا کیا ہے

سکھا رام۔ بہت ظالم ہے وہ بے رحم ساہو　　ارے ناداں کبھی ایسا نہ کرنا
اسی سے لے غنیمت ہی فتح چند　　مگر اس بات کا چرچا نہ کرنا

(پیچھے سے ایک تعلیم یافتہ لڑکا جس نے دیہات سدھار کا کام اپنے ذمے لیا ہے اور گاؤں والے اسے "چانگلا بابو"[1] کہہ کر پکارتے ہیں. جواب دیتا ہے۔)

لڑکا۔ کرتا ہے اس یقین سے دو ظالموں میں فرق　　بدخو، ترا فریب بھی کتنا عجیب ہے!
پہلو میں زندگی کے چھپاتا ہے موت کو　　بیشک بغور جہاں میں ترا خوش نصیب ہے!
افلاس میں تمیز کی شکتی بھی مٹ گئی　　کیوں اس کو یہ سزا نہ ملے یہ غریب ہے!

سکھا رام۔ اسے دیکھو ہمارے سامنے بھی　　پڑھے لکھوں کی باتیں کر رہا ہے!

لڑکا۔ سچ کہتا ہوں اور سچ میں ہی طوفان سکھا رام　　جو زور میں آجائے تو ہر چیز بہا دے
یاں دل کے سمندر سے اُبلتا ہو وہ سیلاب　　جو عقل کی تعمیر کو اک پل میں مٹا دے
اک بلبلا پانی کا نظر آتا ہے یاں مسلم　　اور سچ کی روانی اسے چٹکی میں اڑا دے
میں کہتا ہوں سچ سے نہیں دنیا میں تباہی　　طوفان کو تو اور مچلنے کی دعا دے

(یہ لوگ سکھا رام کی کٹیا کے قریب پہنچتے ہیں جو گاؤں کے کنارے ایک نالے پر واقع ہے۔ چاروں طرف مٹی کے مکان اور جھونپڑیاں زمین اونچی نیچی ایک طرف کھیتوں کا سلسلہ سکھا رام کی بیوی بھاگی اپنے روتے ہوئے بچے کو جس کی عمر چھ ماہ کی ہے لئے آتی ہے۔ سکھا رام اسے گود میں لیکر ہلاتا ہے۔ بھاگی بیلوں کے ساتھ چلی جاتی ہے)

سکھا رام۔ ہے یہ بھی مرے گھر کا طوفان راما　　اسے گود میں اپنی بہلا رہا ہوں

راما　شکر کر بھگوان کا اپنے ادا　　پہلا رکھوالی ہے تیرے کھیت کا

سکھا رام۔ رام ہی پہچانتے ہیں ان کٹھن اوقات کو　　میرا رکھوالی ہے یا اس کا رکھوالا ہوں میں

راما۔ کیا فکر ہے ماں دودھ پلاتی تو ہے اس کو

سکھا رام۔ اسکی ماں چھاتی سے اسکو دودھ دیتی ہے تو میں　　خون اپنا سینچتا ہوں بال بچوں کے لئے
(کٹیا کے اندر چلا جاتا ہے)

---

[1] چانگلا یعنی اچھا۔

دوسرا منظر

"پریم"

(گاؤں میں آدھی رات ہلکی ہلکی چاندنی۔ چراغ ٹمٹماتے ہوئے۔ لوگوں کے کھانسنے، بچوں کے رونے اور ماؤں کی لوریوں کی آوازیں۔ جنگل میں کووں کا شور، کھیتوں میں کتوں کا بھونکنا۔ سکھا رام کی کٹیا میں ایک جوان لڑکا صاف ستھرے لباس میں ایک ٹوٹی پھوٹی چوکی پر بیٹھا ہوا ہے۔ سکھا رام کی بیوی بھاگی اس کے قریب بیٹھی اس کے پاؤں دھو رہی ہے۔ بھاگی کی عمر بیس بائیس سال کی ہوگی۔ چہرے پر ملاحت، سانولا رنگ، میلی کچیلی ساڑھی۔ لڑکا بھی اسی عمر کا ہے۔ چندر نام۔ چندر گنگناتا ہے)

چندر۔ سانولی رانی تیرے مکھ پر چندرماں بلہار

میلے بادل اُجلا چاند | جس کے آگے تارے ماند
آنچل سرکا ہوا اُجالا | جھکی سونگے کی اک مالا
بالیاں پہنی سندر کان | دل میں بیٹھا بانکا جوان
سونی منزل بھری جوانی | چھوٹی کٹیا میں اک رانی

سانولی رانی تیرے مکھ پر چندرماں بلہار

بھاگی۔ ہم غریبوں پہ کوئی رحم دکھانے آیا | یا بھرے گاؤں میں اک آگ لگانے آیا
یاں خوشی ہے نہ جوانی نہ ہے زیور نہ سنگھار | کون اُجڑے ہوئے کرموں[1] کو بنانے آیا
ہاتھ ہر وقت جو مٹی میں بھرے رہتے ہیں | ایک بلوان انھیں سینے سے لگانے آیا
ان لبوں پر جو ہیں سوکھے ہوئے پتوں کی طرح | مسکراہٹ کا نیا رنگ جمانے آیا
ایسے کانوں کو جو رونا ہی سنا کرتے ہیں | آس امید کا اک گیت سنانے آیا
چکیاں ہیں کہ ہو جاتے ہیں شانے بیکار | ایسی دکھیاری کو محنت سے بچانے آیا

چندر۔ بھاگی مری خواہش ہے کہ جس وقت میں آؤں | اس طرح مرے سامنے آہیں نہ بھرا کر

بھاگی۔ یہ آہیں نہیں شوق کے ہیں ترانے | یہ جیون ہنسی ہے یہ دل کے ہیں گانے

---

[1] کرموں۔ قسمت۔

ان آہوں کے اندر ہی اندر سما کر | کوئی آ رہا ہے محبت جتانے
چلی آ رہی ہے گھٹا ٹوپ آندھی | ہے اک گھانس کی جھونپڑی سر چھپانے
اڑے جیسے جنگل میں کھیتوں کا بھوسا | لگیں دل کی خاموشیاں تلملانے
چلے جیسے تھا روڑ[1] سے تیز پانی | لگی آنکھ ہر وقت آنسو بہانے
خدایا تجھے واسطہ کھیتیوں کا | نہ آئیں نکل عشق میں شاخسانے

(اتنے میں بچہ روتا ہے۔ بھاگی اسے تھپک کر سلا دیتی ہے۔)

چندر۔ جاں سخت کشاکش میں گنواتی ہے شب و روز | بھاگی تجھے اس گاؤں میں تکلیف نہیں ہے

بھاگی۔ ملتا ہے مجھے آپ کی الفت کا سہارا | کرپا کرو مجھ پر تو ہے مرنا بھی گوارا

چندر۔ کیوں سہا کرتی ہے رنج زندگی تو اس قدر | اس سے بچ جانے کی شاید ایک بھی صورت نہیں؟

بھاگی۔ مرد، اولاد، زمیں، گاؤں، مویشی، محنت | اس سے چھٹکارا کسی طرح بھی قسمت میں نہیں

(ایسے میں دوسری کٹیا سے بھیکا جو سکھا رام کا نوکر ہے بھاگی کے بچے کا مزاج پوچھتا ہے۔ بچے کو بخار آ رہا ہے۔ پھر چلم پینے کے لئے آگ مانگتا ہے۔ بھاگی اُپلوں کی آگ میں سے ایک چنگاری دیدیتی ہے۔ چندر پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا جاتا ہے۔)

تیسرا منظر

صبح کی کاشت

(گاؤں کی سہانی صبح۔ شفق پھولی ہوئی پرندے چہچہاتے ہوئے۔ ٹھنڈی اور صاف ہوائیں چل رہی ہیں۔ افق اور پہاڑیوں پر کہر۔ جنگل کے پھول کھلے ہوئے۔ کسان بیلوں کی جوڑی لئے کندھے پر لٹھ رکھے افق کی طرف دیکھتے ٹیلے سے نیچے اتر رہا ہے۔)

شفق۔ قدم اٹھا کہ زمیں کو ہے انتظار ترا | بشر کی زیست پہ چھایا ہے اختیار ترا
خوشا نگاہ، تجلی ہے تیری عالم پر | زہے نصیب ہے فطرت کو اعتبار ترا
کلی کلی میں جہاں کی چھپی ہے روح تری | ہے ذرہ ذرہ زمانے کا غمگسار ترا

---

[1] تھاروڑا۔ گاؤں کی باؤلی پر دہ حوض جس میں موٹ کا پانی جمع ہوتا اور کھیتوں تک پہنچایا جاتا ہے۔

تجھے خبر نہیں کیا چیز ہے تری ہستی — جہاں کا سارا تماشہ ہے رازدار ترا

تازہ ہوا۔

آیا[1] مالی پھولا گلشن — دیکھو پھیلا میرا دامن
اُٹھا حاصل جاگا خرمن — اب کے آیا کیسا ساون
سَن سَن، سَن سَن — سَن سَن، سَن سَن
غنچے ہم سے خوش ہوتے ہیں — ہم پتوں کا منہ دھوتے ہیں
دنیا والے سب سوتے ہیں — نقدِ ہستی سب کھوتے ہیں
سَن سَن سَن سَن — سَن سَن سَن سَن
دہقاں میرے ساتھ چلا ہے — ذرہ ذرہ جاگ رہا ہے
جینے کا سامان ہوا ہے — رحمت کا طوفان اُٹھا ہے
سَن سَن۔ سَن سَن — سَن سَن سَن سَن

پہلی کرن۔

زمیں کا پروردگار آ رہا ہے — وہ اک رحمتِ کردگار آ رہا ہے!
زمین اس کے قدموں تلے ہنس رہی ہے — وہ آشفتۂ مرغزار آ رہا ہے
امیروں کی ٹھکرائی دولت کو لیکر — غریبوں کے دل کی پکار آ رہا ہے
اٹھو بہرِ تعظیم اے خاک والو — زمانے کا اک دیندار آ رہا ہے

اُگتی ہوئی کونپلیں۔

اُگے[2] قدرت سے — جاگے قسمت سے
پھولے محنت سے — اٹھے الفت سے

دہقاں اپنا ہے دہقاں اپنا ہے

دل میں بینائی — رخ پر رعنائی
سن اے سودائی — ہم نے بھر پائی

دہقاں اپنا ہے دہقاں اپنا ہے

---

[1] یہ بحر موسیقی کی ایک مشہور اور اہم تال "ترتالہ" کے وزن پر قائم کی گئی ہے جس کے طبلے کے بول ہیں
نادھن دھن نا نادھن دھن نا ناتن تن نا نادھن دھن نا — اور عروض میں تقطیع ہوگی فعلن فعلن فعلن فعلن

[2] یہ بحر دوسری تال "جھپ تالہ" کے وزن پر ہے جس کے بول ہیں۔ دھن نا۔ دھن دھن نا تن نا دھن دھن نا
اور تقطیع ہوگی۔ فعلن مفعولن فعلن مفعولن۔

ہم ہیں بچپن میں — رنگیں دامن میں
جاں ہے گلشن میں — گھر ہے آنگن میں

دہقاں اپنا ہے دہقاں اپنا ہے

ٹھنڈی خاموشی — رنگیں مدہوشی
شیریں سے نوشی — دھیمی سرگوشی

دہقاں اپنا ہے دہقاں اپنا ہے

بہتا ہوا دریا۔

میں جینے کے اسرار سمجھا رہا ہوں — بہا جا رہا ہوں، بہا جا رہا ہوں
کنارے کھڑا ہے مرے ایک دہقاں — محبت کی تصویر دکھلا رہا ہوں
مبارک ہے یہ منظر غم گساری — نگاہوں پہ امید برسا رہا ہوں
ذرا غور سے دیکھ اسے زندگانی — میں قدرت کے دامن کو پھیلا رہا ہوں
مرا منتظر ہے دل اَدگار کوئی — زمیں بوس ہوتا ہوا جا رہا ہوں

جنگل کے! ہنستے ہوئے پھول

یہ ہنسی ہم ترے قدموں پہ فدا کرتے ہیں — کامیابی تری فطرت کو عطا کرتے ہیں
بے طلب ہستیٔ رنگیں سے گلے مل مل کر — ہم تری زیست کی خاموش دعا کرتے ہیں
دل میں گو رکھتے ہیں فطرت کے سریلے نغمے — گیت ہم تیری زباں ہی سے سنا کرتے ہیں
دیکھتے رہتے ہیں ہر وقت لگائے ہوئے آنکھ — تیرے انسان ترے واسطے کیا کرتے ہیں

نغمۂ زمین

عطا کرنا سکھایا ہے کسی کی میزبانی نے — مجھے سینہ تنگانی پھر گوارا ہوتی جاتی ہے
مرے پہلو میں سینچا جا رہا ہے خون آزادی — تڑپتی زندگانی آشکارا ہوتی جاتی ہے
لٹاتا ہے خزانہ کوئی اپنے دست و بازو کا — مری دولت زمانہ کا سہارا ہوتی جاتی ہے
بہت شاداب ہیں زیر فلک بیتابیاں میری — مری ہستی محبت کا اشارا ہوتی جاتی ہے
مجھے بخشا ہے درو زندگی خود زندگانی نے — مری فطرت ہی فطرت کا نظارا ہوتی جاتی ہے
خوشا اے آبیارِ تخم غم ہر اک گرہ دل کی — تری رحمت کی گرمی پر دوبارا ہوتی جاتی ہے

سکھ دام ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر آسمان پر نظر ڈالتا ہے اور ان کو غور سے دیکھتا اور ایک آہ کھینچ کر اپنے آپ کہتا ہے۔

سکھارام۔ رات ہُمسیا کہہ رہا تھا موٹ[۱] گہری ہو گئی — کیا یہ بادل آج بھی پانی نہیں برسائینگے

موگرا[۲] چلتا نہیں ہے اور بکھر[۳] بھی ہے سخت — بیج کیا گودے[۴] کے میرے سوکھے ہی جائینگے؟

بچے سب بھوکے ہیں میرے سیر ہے سارا جہاں — کب تلک بھگوان مجھکو اس طرح ترسائینگے؟

(بیلوں سے) چل مرے روما[۵]لیا، کستوریا چل کھیت کو — آج دن بھر کام کرکے رات گھر لوٹ آئینگے

(وقت مسکراکر کہتا ہے)

مرتے ہیں شب و روز کساں فاقہ کشی سے — ہاں کیوں نہ ہو جاں بخش ہیں فطرت کی عطائیں

دنیا میں کبھی وقت پہ بادل نہیں آتے — ہر روز نئی شان سے چلتی ہیں ہوائیں

چھائی ہے سیاہی غم ہستی کی زمیں پر — رنگیں ہیں مگر چرخ منور کی فضائیں

اک وقت معین پہ ہو خورشید روانہ — ہر رات کو افلاک پہ انجم نظر آئیں

ہو چاند کی گردش میں نہ اک لمحہ کی تاخیر — مریخ و زحل آہنی تنظیم دکھائیں

آدم کے لئے ہو نہ مگر وقت مقرر — احکام کی تعمیل ہو جس وقت وہ آئیں

بیتابیٔ ارمان کو تسکین ہے ان سے — آدم کو مبارک ہوں زمانے کی ادائیں

(بیل موگرا کھینچتے ہوئے ایک دوسرے سے)

روما لیا۔ احساس ہے پستی کا نہ محنت پہ نظر ہے — دنیا میں فقط کام کا دیوانہ ہے دہقان

کستوریا۔ کیا جانئے کس حال میں رہتا ہے بہر حال — ہمدردیٔ انسان کا پیمانہ ہے دہقان

روما لیا۔ چار چھ پیسے ہیں اس خدمت گذاری کا صلہ — ہم جہاں میں ہیں فقط زور آزمانے کیلئے

کستوریا۔ آج سارے گاؤں والوں کی بھی ایسی ہی چال — یہ بھی ہیں حاکم کا بار غم اٹھانے کیلئے

ایسی بستی میں بھلا ہم کو ہو آزادی نصیب — جس جگہ انساں ہو اپنا سر جھکانے کیلئے

(سکھارام انھیں ایک کوڑا لگاتا ہے۔ دونوں گردن ہلاکر تیز چلنے لگتے ہیں)

چوتھا منظر

نمائش اور پولا

گاؤں کے ایک کشادہ حصے میں درختوں کے نیچے چند نئی جھونپڑیاں کسان اور زمیندار بیلوں کی جوڑیاں

---

[۱] یعنی باؤلی میں پانی نیچے اتر گیا [۲] موگرا [۳] بکھر۔ یہ دونوں آلے ہیں [۴] گودا یا تیتن۔ ایک سہ کونی لکڑی کا آلہ ہوتا ہے جس کے اوپر کے حصہ میں بیج بھر کے زمین پر اسے چلایا جاتا ہے اور بیج زمین پر بکھرتے جاتے ہیں [۵] کسان بیلوں کے اسی طرح نام رکھتے ہیں۔

طرح طرح سے سجا کر لا رہے ہیں۔ ایک طرف پانچ چھ ہنڈیاں کھلی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف ترکاریاں، پان اناج، امیاری سامان اور سستے میووں کا بازار لگا ہے۔ خرید و فروخت میں لوگ مصروف ہیں۔ سیر کرنے والے آرہے ہیں جا رہے ہیں۔ ایک طرف دنگل میں کشتی کے کرتب دکھائے جا رہے ہیں۔ ادھر چند لوگ پینے پلانے میں مصروف ہیں اور گا بجا رہے ہیں۔ سکھا رام کا دوست راما اپنے بیلوں کی جوڑی نمائش میں لے آیا ہے۔ چلتے چلتے سکھا رام پر اس کی نظر پڑتی ہے جو ایک درخت کے نیچے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھا ہے]

راما۔ اے سکھا رام تیرے بیلوں کی جوڑی ہے کہاں؟

(سکھا رام سر اٹھا کر دیکھتا ہے اور پھر زانو پر رکھ لیتا ہے)

راما۔ خیر ہے آج کا دن، اور ترا چہرہ ہے اداس!

(سکھا رام ہاتھ سے راما کو جانے کا اشارہ کرتا ہے)

راما۔ چل اٹھ میرے بیلوں کی جوڑی سنبھال۔

سکھا رام۔ نہیں راما میں اس سے بیزار ہوں۔

راما۔ (بیلوں کے پگھے دیتے ہوئے) یہ لے اور غم اپنے دل سے نکال

سکھا رام۔ (انماتے ہوئے اُٹھ کر) چلو خیر اس پر بھی تیار ہوں۔

(اُٹھتا ہے اور بیلوں کو ہانکتا ہے)

راما۔ کیا بات ہے، کیوں بیل ترے ساتھ نہیں ہیں؟

سکھا رام۔ معلوم نہیں؟ بچوں کو تے دست ہوئے ہیں۔

راما۔ تو پھر اس نمائش میں آیا ہی کیوں؟

سکھا رام۔ سمجھتا تھا شاید بہل جائے دل

(ایک کسان دوڑتا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے نمائش میں اس کی جوڑی بہت پسند کی جا رہی ہے۔ شاید انعام مل جائے۔ باز دسے لوگ گاتے ہوئے گزرتے ہیں

لوگ
پانی برسا، کھیتی پھولی، خوش ہو ڈھونڈے رام
اب کے روئی خوب بکے گی گھر میں ہانڈی بھر کے پکیگی
گھر کی عورت بچے بوڑھے پائیں گے آرام، خوش ہو ڈھونڈے رام

(سامنے پوٹا[1] ہو رہا ہے۔ جانوروں کو سیندی شراب پلائی جا رہی ہے۔ دہیڑوں کے ساتھ لوگ نشے میں ادھر اُدھر دوڑ رہے ہیں بعض لوگ ناچتے ہیں۔ ناچتے ناچتے ایک شخص نے تان لگائی)

رم جھم رم جھم بوندیں برسیں — گھڑ گھڑ گھڑ گھڑ بادل بولے[2]
ندی نالے جل تھل جل تھل — پنکھ پکھیرو بازو کھولے

ٹُٹیا ہماری سب سے اچھی — بیل ہمارا سب پر بھاری
آئیں ناچیں کو دیں مل کر — گوپی سنگ اب گردھاری

ہُو شو ہُو شو اچھونا چھونا — ہُو شو ہُو شو اچھونا چھونا

(ایک منچلے نے سکھا رام کے ایک دھول لگائی)

شکھو بھاؤ گاؤ ناچو، دیکھو کیسا نظارہ ہے — منہ اُلّو کا اپنا بنا کر بغلوں میں منڈی کو جھکا کر
کرکر کیوں کرتے ہو سبھا کو؟ یہ بھی کیا پو بھارا ہے

(سکھارام غصہ میں آکر اس شخص کو زمین پر دے مارتا اور گلا دباتا ہے بعض لوگ اس حرکت کو دیکھکر ہنستے ہیں بعض لوگ اسے چھڑاتے ہیں۔ سکھا رام شملہ باندھتے ہوئے راما سے کہتا ہے)

سکھارام۔ نہ جانے چڑھائی ہے کتنے کی اسنے — کہ جامے سے باہر ہوا جا رہا ہے
وہاں اس شرابی کو ہنسنے کی سوجھی — یہاں دم ہمارا گھٹا جا رہا ہے

راما۔ ارے بُدھو، یہ پی کر ناچتا ہے — تری بیوٹ سے کیوں ناراضگی ہو

سکھارام۔ یہاں دل میں لگی ہے آگ ساری — اور اس کو ہم سے سوجھی دل لگی ہے

راما۔ ہمارا جیون ہے کھیل سارا سے زمانہ کھلا رہا ہے — کوئی دکھاتا ہے رنج اپنا کوئی غم اپنا بھلا رہا ہے
(گنگناتا ہے) سکھی اگر ہے جہاں میں جینا تو ہنسنے والوں کا ساتھ دینا — یہاں اسی کا ہے راج سارا جو زندگی کو نبھا رہا ہے
کریں گے کن حسرتوں کا ماتم بھرا ہے کلفت سے سارا عالم — دھواں غم زندگی کا بیہم ہر ایک بستی پہ چھا رہا ہے
ہنسی میں آفت کو ٹال دینا خوشی سے انعام زیست لینا — قدم قدم پر نیا زمانہ سبق یہ ہم کو سکھا رہا ہے

(گاؤں کے دو چار آوارہ آدمی سکھا رام اور راما کو پینے پلانے کے لئے گھسیٹ لے جاتے ہیں سکھا رام چیختا ہے۔ اور راما پھر وہی گیت گاتا ہے۔ "ہمارا جیون ہے کھیل سارا" سکھارام کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے

---

[1] پوٹا بیلوں کو شراب پلانا۔ [2] یہ گیت کہروا تال میں ہے بول ہیں: "دھاگے نا تن۔ نا کے گھی نا" اور تقطیع ہے "فعلن فعلن فعلن فعلن"

ہیں۔ لوگ اطراف سے جمع ہو جاتے ہیں۔ بچے ہنستے ہیں۔ عورتیں روتی ہیں۔ مرد ناک پونچھتے ہیں۔ اتنے میں
بھاگی دوڑتی ہوئی آتی ہے اور چلاتی ہے)

بھاگی۔ میرا بچہ مرگیا اے لوگو! میرا بچہ مرگیا۔ سندرا کا دم گلے میں آرہا ہے ہائے ہائے!

(سارے کسان اس کے قریب آجاتے ہیں۔ سکھا رام گھر کی طرف بھاگتا ہے)

ایک کسان۔ دوا کو بھی بچے کے پیسے نہیں تھے۔

دوسرا ۔ جو پیسے بھی ہوں تو دوا کون دیوے؟

تیسرا ۔ چلو سندرا کی خبر لے تو لیں ہم۔

چوتھا ۔ چلو اپنی بھاگی کو گھر لے چلیں ہم

(بھاگی روتی ہوئی کسانوں کے ساتھ گھر کی طرف جاتی ہے۔ دو چار آدمی گاؤں کے وید کے پاس دوڑتے
ہیں۔ لوگ آنے کے بعد سکھا رام کو دیکھتے ہیں وہ بچے کی لاش کو اٹھا کر باہر لا رہا ہے

پانچواں منظر

ترغیب

(مغرب۔ ابابیل شفق آلود فضا میں تیر رہی ہیں۔ درختوں پر کوؤں اور میناؤں کا شور مچا ہوا ہے۔ بھاگی کھیت
سے واپس آکر جھونپڑی کے سامنے برتن مانجھ رہی ہے۔ اس کی اکلوتی لڑکی سندرا جو پانچ سال کی ہے اپلو
سے کھیل رہی ہے۔ ایک بڑھیا سامنے بیٹھی ہوئی چپکے چپکے باتیں کر رہی ہے)

بڑھیا۔ اجی بھاگی! بھاگ تیرے جاگ جائیں گے ضرور　　میں سمجھتی ہوں کہ تیرا بھاگ جانا ٹھیک ہے

بھاگی۔ چاچی میرا دل آپ کو معلوم نہیں ہے　　مجھ پہ جو گذرتی ہے وہ بھگوان ہی جانے
جو اچھے ہیں کچھ ان کو خبر ہو نہیں سکتی　　تکلیفِ غم اک غمزدہ انسان ہی جانے
چاہت کی مصیبت بھی بڑی ہوتی ہے ناز ک　　عورت کو اک عورت کا نگہبان ہی جانے

بڑھیا۔ اسی تکلیف سے تجھ کو بچانا چاہتے ہیں وہ

بھاگی۔ یہاں پھر بھی مری معصوم بچی ساتھ رہتی ہے　　گنہگاروں کے محلوں سے تو ٹوٹی جھونپڑی اچھی
کہاں جاؤں گی اپنے گاؤں سے منہ موڑ کر چاچی　　یہ ٹھوکر ٹھوکر کی امیری سے غریبی زندگی اچھی

خدا نے ہر کسی کو ایک حالت میں نہیں رکھا — کسی کی راتیں اچھی کسی کی بے کسی اچھی

بڑھیا۔ تو پھر کہہ دو کہ تو گھر چھوڑ کر واں آ نہیں سکتی؟

بھاگی۔ (رکتی ہوئی) میرا مطلب ہے چندر سے کہنا۔ کہ میں ....

(بڑھیا اٹھ کر چلی جاتی ہے۔ بھاگی زمیندار کے لڑکے کی ناراضی سے کچھ خوف کرنے لگتی ہے بڑھیا سیدھی چندر کے کمرے میں پہونچتی ہے۔ چندر کے قریب اس کا ایک راز دار دوست سدھار بھی بیٹھا ہوا ہے۔ بڑھیا کی زبان سے بھاگی کا مبہم جواب سن کر۔

چندر۔ (ہنستے ہوئے) ٹل رہی ہے راہ پر آجائے گی

سدھار۔ راہ پر آئے گی لیکن یہ جتا دیتا ہوں — ایک ہنگامہ مچا دیں گے یہ دہقاں سارے
سر پہ بھاگی کے زمانے کی مصیبت ہوگی — ہوں گے رسوائے جہاں آپ کے ارماں سارے

چندر۔ ہم سے منہ آئیں گے یہ ٹکڑوں کے محتاج کہاں؟

سدھار۔ شوخیٔ رنگ زمانہ پہ نظر ہے کہ نہیں؟ — آپ کو اپنے زمانے کی خبر ہے کہ نہیں؟

چندر۔ (آہستہ سی) کیا کریگا اپنی بیوی اور بچے چھوڑ کر — جانتے ہیں آپ جس کو مفلس و نادار ہے
اس میں تاب زیست تک مشکل سے باقی ہے سدا — ایک ہل ہے ایک بیوی اک نفس کا تار ہے
وہ حرامی آنکھ تک مجھ سے ملا سکتا نہیں — اور اگر ایسا ہوا بندہ بھی یاں تیار ہے

سدھار۔ روشنی دن کی غنیمت ہے اسے چھوڑ کے آج — بے تحاشا تم اندھیرے میں چلے جاتے ہو
دل میں اس وقت تمہارے ہیں چھپے تین گناہ — جس کو اک دوست سے کہتے ہوئے شرماتے ہو
ایک بھاگی سے ہے آزاد تعیش کا خیال — چند دن کے لئے بے چاری کو پھسلاتے ہو
دوسرے تم کو سکھارام پہ کچھ رحم نہیں — ایک مظلوم کو بے رحمی سے ٹھکراتے ہو
تیسرے تم میں نہیں حوصلہ اسراف کا بھی — نام سنتے ہو جو پیسے کا تو مرجاتے ہو!

چندر۔ (کسی قدر تیز ہوکر) سچ کہا آپ نے، خواہش ہے مرے دل کی یہی

سدھار۔ آہ پامال ہیں مختار کے مجبور غریب — رات دن رہتے ہیں ماحول کے محصور غریب
حادثے ان کو تو ناشاد کئے دیتے ہیں — اہل زر اور بھی برباد کئے دیتے ہیں
مکر و ترغیب کے پھندوں میں گرفتار ہیں وہ — ذمہ داری ہے ہمیں پر، کہ گنہگار ہیں وہ!

چھٹا منظر

دھوپ

(بادل چھٹنے سے دھوپ تیز ہو گئی ہے۔ چاروں طرف حبس۔ لوگ پسینے میں نہا رہے ہیں۔ ہرن درختوں کی چھاؤں میں کھڑے ہوئے ہانپ رہے ہیں۔ عورتیں بیچ کھیت میں کپاس کو نندوائی[۱] دے رہی ہیں سکھارام اور بھبکا وغیرہ کوپلے[۲] اور ڈورے چلا رہے ہیں)

دھوپ۔ (کسان کو ننگے جسم کے ساتھ کام کرتا ہوا دیکھ کر)

مرے جلال سے اس شخص کو حجاب نہیں — جلا کے خاک نہ کر دوں تو آفتاب نہیں!

روحِ عاطفت۔ ترے فروغ سے بڑھ کر ہے اہتمام مرا — جلانا کام ترا ہے بچانا کام مرا

دھوپ۔ میں کارخانۂ قدرت کی روحِ مضطر ہوں — تڑپ رہے ہیں مرے دل میں برق زا شعلے

روحِ عاطفت۔ میں تیری آگ کو دامن میں کھینچ لیتی ہوں — مرے کمال سے ہوتے ہیں دلربا شعلے

گرمی۔ جھلس رہی ہے زمیں میری آہ سوزاں سے — مگر کسان پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔

وہ بے نوا ہے کہ پہلو میں اضطراب نہیں — وہ سخت جاں ہے کہ دردِ جگر نہیں ہوتا

میں پوچھتی ہوں ہزاروں کسی طرح اک دن بھی — یہ اپنے فرض سے کیوں بے خبر نہیں ہوتا!

صدائے تقدیر۔ فراموشی کا مجرم ہے نہ غفلت ہے خطا اس کی — مری مجبوریاں بن جاتی ہیں زنجیرِ پا اس کی

لگا رکھا ہے میں نے خلق کی خدمتگذاری میں — ابھر سکتی ہے کیسے بے نیازی کی ادا اس کی

صدائے انقلاب۔ سردیاں بھولے ہوئے انسان کی — آگ بن جائیں گی اک دن دیکھنا

اس سکوں میں درد کی مجبوریاں — زلزلے لائیں گی اک دن دیکھنا

روحِ صداقت۔ بننے سے سوا بات بگڑتی ہے جہاں میں — تخریب کے پہلو میں ہے تعمیر کی دنیا

جو ساز ہے وہ سوز ہے جو نور ہے وہ نار — ہم دیکھتے ہیں اصل میں تعبیر کی دنیا

دونوں میں ہے اک کشمکشِ قوتِ بیداد — تقدیر کی دنیا ہو کہ تدبیر کی دنیا

یاں علت و معلول کے ہیں طوق و سلاسل — آزاد کہاں ہوتی ہے زنجیر کی دنیا؟

---

[۱] نندوائی دینا یعنی پودوں کے درمیان سے ہریالی نکالنا وغیرہ۔ [۲] کوپلے اور ڈورے چلانا بھی اسی قسم کا ایک عمل ہے۔

روح تخلیق — حسین فطرت کی تابشوں میں، ہے چاند سورج کی دلربائی
کمال اضداد ہے خدائی، جلال بھی ہے جمال بھی ہے
کسی کو معراج نور حاصل، کسی میں ادنیٰ کی روح شامل
فلک کی آئینہ داریوں کو، عروج بھی ہے زوال بھی ہے
ہے انقلاب آفریں زمانہ، بدلتا رہتا ہے یہ فسانہ
زمین والوں کی قسمتوں میں، نشاط بھی ہے ملال بھی ہے
کبھی وجود و عدم کے اندر، کبھی وجود و عدم کے باہر
تصور ایزدی کو حاصل فراق بھی ہے وصال بھی ہے

(فطرت کے اس خاموش مباحثے میں کسان اپنا پسینہ پونچھتا ہے۔ پھر کپاس کے ایک پودے کی طرف دیکھکر)

سکھارام۔ منہ موڑ کر کسان سے شہروں میں جائیگا — پھل پھول کر بنا تو ہے لیکن مرا نہیں!
کس طرح دیکھ بھال کے میں نے بڑا کیا — اور اہل شہر کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں
ہر پھول پر کپاس کے آنکھیں نثار ہیں — میں ایک دن بھی کھیت سے غافل ہوا نہیں
اس پر بھی دام گودی[1] میں اسکے نہ آئینگے — ہنگام[2] کی نگاہ سے کوئی بچا نہیں

پودا (جواب دیتا ہے) بنائے کوئی اور بگاڑے کوئی — یہی اس زمانے کا دستور ہے
کمائے کوئی اور کھائے کوئی — اسی طرح انسان مجبور ہے
جو بیٹھا ہوا ہے وہ سرمایہ دار — جو کرتا ہے محنت وہ مزدور ہے
نہ زر کی مدد اور نہ محنت کی قدر — بتا تجھ کو یہ زیست منظور ہے؟

دوسرا پودا۔ مدہوش ہے افلاس کی بے راہ روی میں — دہقان کو اس جور کا احساس نہیں ہے
محدود کشاکش کو سمجھتا ہے ضروری — اللہ کی طاقت کا اسے پاس نہیں ہے

تیسرا پودا۔ احساس سے کیا فائدہ مجبور ہے دہقاں — ناقدریٔ انساں کا گلہ کر نہیں سکتا
کس طرح یہ جاں بیچ کے روٹی نہ کمائے — یہ زیست کا حاصل ہے یونہی مر نہیں سکتا

چوتھا پودا۔ یہ دھوپ، یہ گرمی کہ پریشان ہیں ہم بھی — اور اس پہ یہ بے چارہ نگہبان ہمارا
آندھی ہو کہ طوفان ہو بارش ہو کہ جاڑا — کرتا ہے حفاظت کا یہ سامان ہمارا

---

[1] گودی۔ گودام۔ [2] ہنگام۔ اناج فروخت ہونے کا زمانہ۔

چوتھا پودا۔ جانتے ہیں کہ ضروری ہے شکم کا بھرنا — اس پہ بھی اہلِ جہاں کو نہیں دہقان کا درد
یہ صدا آتی ہے دنیا کے تغافل سے مجھے — آہ ہوتا نہیں انسان کو انسان کا درد

(بھاگی سکھا رام کو روٹی کھانے کیلئے آواز دیتی ہے۔ سکھا رام ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کے روٹی کھاتا ہے۔ بھاگی سامنے بیٹھی رہتی ہے۔ کھانے کے بعد کھرپی لے کر تاس[1] کے درمیان بیٹھ جاتی اور ہریالی نکالتی ہے پھر بازو والی سے کہتی ہے)

بھاگی۔ پٹا[2] تو میں نے صاف کیا اگتی ہے تو
عورت۔ بچہ تو میرے پیٹ میں ہے اور ہو رہا ہے درد
بھاگی۔ میرے بھی بچے ہوئے ہیں تجھے معلوم نہیں!
عورت۔ بچہ تو مر گیا ہے پہ زندہ ہے تیرا مرد
بھاگی۔ کیوں کوستی ہے آج تو میرے سہاگ کو؟
عورت۔ بھاگی میں کوستی نہیں بھگوان ہیں گواہ
بھاگی۔ خوش ہوں گی میں کہ میری طرح تیرے بھاگ ہوں
عورت۔ تیری دعا قبول ہو میں دیکھتی ہوں راہ

ساتواں منظر

چنوائی[3]

(کپاس تیار ہو گئی ہے۔ بونڈے کھل کر اس میں کی سفید روئی چاروں طرف نظر آنے لگی ہے۔ تاسوں کے درمیان پانچ پانچ عورتیں رنگ برنگی ساڑیاں پہنے ہوئے پشت کے پیچھے اپنی اوڑھنی کا تھیلا سا بنا کر داہنے ہاتھ سے کپاس کا بونڈا توڑتی اور منہ میں رکھتی اور بائیں ہاتھ سے کپاس نکال کر پیچھے تھیلے میں بھرتی جاتی ہیں یہ کام تیزی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ پھر باری باری سے گاتی جاتی ہیں)

پھولوں[4] کی ڈالی کا سولہ سنگھار۔ بھاگی کی گردن میں پھولوں کا ہار

---

[1] تاس۔ پودوں کی قطار [2] پٹا۔ پودوں کا درمیانی حصہ زمین۔ [3] چنوائی۔ کپاس کے بونڈے توڑنا اور روئی نکالنا۔ بونڈے الگ کرنا [4] یہ دادرا ہے۔ اس کے بول ہیں۔ دھا دھن دھا۔ دھا تن تا۔

ریشم سی روئی کی انگیا بنائی، گھٹن[1] بھی سلائی ساری بھی لائی
رانی کے جوبن پہ آئی بہار
بیلوں کی جوڑی کو کھلی کھلا کر، روٹی پکا کر، بچے سلا کر
جاتی ہوں اٹھلا کے نگری کے پار
کھیتوں میں پھولی ہے اچھی کپاس، ہنیں ہیں نراس، دنیا ہے راس
نودروں پہ روئی کا آیا بجار
(بھاگی ایک کونے میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی ہے)

آٹھواں منظر

لگان

(رکھنی[2] اور سونگھنی کے بعد مال بھانا[3] شروع ہوا ہے۔ بنڈیاں آ رہی ہیں۔ روئی کے تھیلے بھرے جا رہے ہیں۔ چاروں طرف سفید روئی بکھرے ہوئے ہیں۔ دو تین بنڈیاں تیار ہیں۔ سکھا رام کی جھونپڑی کے سامنے درخت کے نیچے سن کی چارپائی پر گاؤں کے پٹیل پٹواری جو پورے مال کی نکاسی سے پہلے ہی آ گئے ہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ تحصیل کا چپراسی قریب کھڑا ہوا بیڑی پی رہا ہے۔ سکھا رام ایک طرف چلم کا دم مار رہا ہے۔ بھاگی دوسری طرف سندرا کو گود میں لئے کھڑی ہے۔)

سکھا رام۔ ہاں تو سرکار کو کتنے ادا کرنا ہے؟

پٹیل۔ تجھ کو معلوم نہیں؟

سکھا رام۔ اب کے اجرت بھی نکلنی مشکل دشوار رہی۔

پٹواری۔ سچ ہے مانی بھی تو سرکار نے پھر مانی ہے۔

تحصیل کا چپراسی۔ بھاگ اچھے ہیں سکھا رام تیرے۔

پٹیل۔ چلو چار آنے سے چکتا کریں گے۔

چپراسی۔ ہمارا تو کچھ اس میں شامل نہیں ہے؟

---

[1] گھٹن۔ ایک قسم کا معمولی دیہاتی کپڑا۔ [2] رکھنی اور سونگھنی۔ مال کی حفاظت اور کٹائی [3] مال بھانا یعنی فروخت کے لئے کھیت سے بازار تک جانا۔

پٹواری۔ دو آنے کا دستور باقی ہے اب تک۔

سکھارام ۔ بارہ آنے سے کھیت جوتا ہے دیکھئے کیا حساب ہوتا ہے

پٹیل۔ کہدیا ناکہ ہے پچاس روپے

سکھارام۔ میرے پاس اتنے روپے اب تو نہیں ہیں سرکار

پٹیل۔ یہ تو ہر وقت کسانوں سے سنا کرتے ہیں۔

بھاگی۔ میرے دو بچوں کو تے دست ہوئے تھے مالک

چپراسی۔ اس کا سرکار نے مانی ہی میں رکھا ہے لحاظ۔

سکھارام۔ ابھی مال کی کچھ نکاسی ہے باقی

پٹیل۔ اسی واسطے دیر سے مانگتے ہیں

سکھارام۔ میں اس وقت پچیس گذرانتا ہوں

(کمر میں بندھے ہوئے دھوتی کے کپڑے سے روپے نکالتا ہے)

پٹیل۔ (عینک سے جھانکتے ہوئے) یہ سرکار ہے کوئی ساہو نہیں ہے

سکھارام۔ (ہاتھ جوڑتے ہوئے) میں سمجھتا ہوں کہ سرکار ہیں ماں باپ مرے

چپراسی (پٹیل سے) اس کو قانون سمجھ میں کبھی آتا ہی نہیں

پٹیل۔ کھیت ہراج اگر ہو تو مزا آئے گا۔

(اٹھنے کی کوشش کرتا ہے)

بھاگی۔ پٹیل تم سے یہ امید ہو نہیں سکتی۔

(تحصیل کے چپراسی کو دو مرغیاں اور کچھ انڈے دیتی ہے)

پٹیل۔ بھاگی اپنے سکھو کو ذرا سمجھا تو۔

(بھاگی اپنے پاس سے پانچ روپے اور گلے کی ہنسلیاں اتار کر دیتی ہے۔ سکھارام سر جھکا لیتا ہے)

نواں منظر

شام

(فصل ربیع۔ جوار تیار ہے۔ بعض کھیتوں میں ابھی چیک نہیں بھری ہے۔ ایک آدھ ہفتے کی دیر ہے۔ شام کا وقت سورج ڈوب رہا ہے۔ سکھا رام موٹ مار رہا ہے۔ یہ قبل از وقت ضعیف و ناتواں نظر آ رہا ہے۔ سر کے بال سفید ہو چلے ہیں۔ پشت اور شانوں کے پاس خم آگیا ہے۔ بیلوں کو ہنکاتے ہوئے۔ ایک کان میں انگلی ہے دوسرا ہاتھ ارسی پر دبا ہوا ہے)

(سکھا رام بھرائی ہوئی آواز میں گاتا ہے)

ڈرے[1] چال بیلا ہے — دھاؤ[2] صاف، تھارو رے میں پانی نین

مول[3] کا جوڑا۔ بالی[4] آئی ادسٹی[5] میں ہے چیک[6] — ساہو کھوتی مال[7] کرے، کسان مانگے بھیک

یہ کیا واویلا ہے — (کھانستا ہے)

بڑھنا[8] ہنرا بیلوں کا ہے جیسے میری آس — روپے ان کے کیسے میں اور کوڑی میرے پاس

ڈرے چال بیلا ہے — (پھر کھانستا ہے)

(پرندوں کا ایک غول اڑتا ہوا آتا ہے اور کھیت پر منڈلاتا ہے۔ پرندے نغمے سناتے ہیں)

ایک چڑیا۔ زمیں کو پہنا کے سبز جوڑا — بہار نے معجزہ دکھایا
سیاہ مٹی کی خشکیوں پر — ہری جوانی کا روپ آیا
وہ ننھے ننھے حسین پتے — ہوا کے جھونکے میں جھولتے ہیں
وہ پیارے پیارے سکائی دانے — خوشی کی بارش سے پھولتے ہیں
اگر فلک پر ہیں ماہ و انجم — زمین پر بھی ہیں چاند تارے
یہ کس کنواری نے ڈالیوں کو — ہنسی ہنسی میں یہ پھول مارے

دوسری چڑیا۔ حسین فطرت کا سبز جلوہ — دل و نظر میں بسا ہوا ہے

---

[1] ہانکتے ہوئے موٹ کے بیلوں کو ہانکنے کی آواز۔ [2] یہ مصرع کسان کے اصل گیت کا ہے [3] دھاؤ۔ موٹ پر بیل چلنے کی جگہ کا جو ڈھلوان ہوتا ہے۔ [3] جوڑا یعنی نیچے۔ [4] بالی یعنی گیہوں کے دانے جو ابھی تنے میں ہیں۔ [5] ادسٹی یعنی گیہوں کی بالی۔ [6] چیک۔ دودھ جو مغز میں آتا ہے۔ [7] مال کھوتی کرنا۔ رہن رکھنے سے قبل مال کا اندازہ کرنا۔ [8] بڑھنا ہنرا یعنی موٹ کے بیلوں کا آگے پیچھے چلنا

ہماری آپا کا پیٹ شاید — بہت دنوں سے بھرا ہوا ہے

پہلی چڑیا۔ آنکھ ہر وقت غذا ہی پہ جمی رہتی ہے — تجھ کو بس پیٹ ہی کی فکر لگی رہتی ہے

دوسری " رات دن نور ازل پیتی نہیں — چاند تارے کھا کے بھی جیتی نہیں!

تیسری " بہار کے پر لگے ہیں ہم کو — ہمارے بازو میں ہے جوانی

ہوا میں گانے ہمارے ناچیں — دکھائیں ہم رقص زندگانی

زمیں کے سب خوشنما پرندے — خوشی کی بنسی بجا رہے ہیں

فضائے سیال کی نمی میں — ستاروں کی طرح چھا رہے ہیں

دوسری " لو اور سنو پیٹ بھروں کی یہ ترنگیں — کیا شان بڑھاتی ہیں زمانے کی ہوا کا!

جب چھاؤں نظر آنے لگی زاغ و زغن کی — سب لوگ سمجھنے لگے سایہ ہے ہما کا

بے فکری ہستی بھی عجب چیز ہے ہمدم — ہر گھاس کی پتی میں گلستاں نظر آئے

جب دل میں غم و رنج کا طوفان بپا ہو — پھولوں بھرا گلزار بیاباں نظر آئے

چوتھی " خدا کی بستی میں کم نگاہو — نظر کی بربادیاں نہ رکھو

ازل کے آزاد گلشنوں میں — ہوس کی صیادیاں نہ رکھو

ملی ہے فطرت کو شادمانی — دلوں میں ناشادیاں نہ رکھو

نظام قدرت کی بندشوں میں — اسیر آزادیاں نہ رکھو

دوسری " وقت ضائع نہ کرو اور زمیں پر اترو — کتنی رنگین غذاؤں سے بھری ہے دنیا

نعمتیں فصل بہاراں کی اڑاتے جاؤ — اور کتنے رہو اک سبز پری ہے دنیا

دیکھو انسان نے بھی ہم پہ عنایت کی ہے — سارے میدان کو شاداب بنا رکھا ہے

لطف اٹھاؤ کہ بہت کم ہے شباب ہستی — خشک مداحی آفاق میں کیا رکھا ہے

(کسان مچان پہ کھڑا ہوا گوپھن ہلا رہا ہے۔ روح صداقت مسکراتی ہوئی آواز دیتی ہے)

روح صداقت۔ کس شان سے کھڑا ہے محافظ بنا ہوا — اس بادشاہ کشور ہستی کو بھی تو دیکھ

طعنہ زن کتنا کش ہستی ہے کس قدر — موسم زدہ شباب کے لب پر ہنسی تو دیکھ

کتنے پیام ایک اچٹتی نظر میں ہیں — پروردگار زیست کی یہ خامشی تو دیکھ

سرسبز کھیتیوں سے گلے مل کے روتی ہو — عالم نواز کی نظرِ بیکسی تو دیکھ
صحنِ زمیں پہ ڈھونڈتا ہے زیست کا صلہ — مدہوشِ انتظار کی یہ بے ہوشی تو دیکھ
پابند ہیں چڑیلیں حاصلِ محنتِ دہقاں کی ثنا خواں بنکر — کشتِ ہستی کی نگہبان بنی جاتی ہے
دل میں اک دردِ طلب لب پہ صدائے احسان — میری آیا تو اک انسان بنی جاتی ہے

دوسری۔ ہاں ہمیں لوٹ کے ہم دولتِ دنیا کی بہار — شکرِ خون ریزیٔ دہقاں ادا کرتے ہیں
غیر کے خرمنِ امید کے مالک بن کر — ہم بھی اک سنتِ انسان ادا کرتے ہیں۔

روحِ عاطفت (پرندوں کو اترتا ہوا دیکھ کر)

کیوں چلے آتے ہیں کھیتوں میں پرندے یا رب — روحِ تخریب میں بھی قوتِ پرواز ہے کیا؟
گونجتے رہے ہیں خرمن پہ قضا کے نغمے — تیری دنیائے تظلم بھی خوش آواز ہے کیا؟
آتے ہیں اُڑتے ہوئے لوٹنے والے اس کے — رنگ و بوئے گلشن دہقاں کی غماز ہے کیا؟
تیری بستی میں کہیں اور نہیں اس کو جگہ — ایک کٹیا ہی میں تکلیف کا دربار ہے کیا؟

سکھا رام۔ اُڑتے ہوئے، مچلتے ہوئے، چیختے ہوئے — پھر آرہے ہیں مجھ کو ستانے کے واسطے
کیوں لوٹتے ہو خون پسینے کی محنتیں — تم تو بنے ہو گیت سنانے کے واسطے
بھگوان میرے، تیرے پرندے بھی آتے ہیں — دردِ شکم کا شور مچانے کے واسطے
میں زندگی کو تمام رہا ہوں کسی طرح — اور زندگی ہے مجھ کو مٹانے کے واسطے

(ایک درخت کے پیچھے سے کوئی دوشیزہ خاتون جدید آرائشوں کا مجسمہ نظر آتی ہے زرق برق لباس میں سامنے آتی ہے۔ ہاتھ میں کیمرہ ہے۔ سکھا رام دوشیزہ کو سلام کرتا ہے۔ اس کے ساتھ جانگلا بابو بھی ہے)

جانگلا بابو۔ کیوں، جی نہ لگا شہر کی پُرشور فضا میں — تفریح کو اس دشت میں پھر آ نکلے سرکار
دوشیزہ۔ ہاں صورتِ انسان سے نفرت ہوئی ہیں — جنگل میں نظر آتا ہے اللہ کا دربار

(کسان کی تصویر لینے کے لئے کیمرہ اٹھاتی ہے)

جانگلا بابو۔ یہ سوچتا ہوں دیکھ کے اس جسمِ حزیں کو — شاید یہ غریب آپ کا انسان نہیں ہے
دوشیزہ۔ اک جسم کے ڈھانچے کو نہیں کہتے ہیں انساں — فطرت کی عطا بے سروسامان نہیں ہے

(پیچھے سے اس کی ایک سہیلی درخت کی آڑ سے ہاتھ میں منڈولین لئے ہوئے آتی ہے اور گاتی ہے)

سیلی۔ نغمہ پرستارِ رنگ ہستی خیال مسحور کیف و مستی
غریب انساں کی فرقتوں پر رہے گی ان کی نظر کہاں تک

حیات اک شان بے نیازی جہاں میں ارماں کی سرفرازی
کسی تڑپ میں فروغ کتنا کسی فغاں میں اثر کہاں تک

جہاں میں تہذیب کی شعاعیں دل و جگر میں اتر رہی ہیں
کسی کی محرومیوں کی یارب رہے گی ان کو خبر کہاں تک

کبھی ہے فطرت کا جور اس پر کبھی ہے دنیا نفور اس سے
الٰہی یہ سختیاں فلک کی سہے گا تیرا بشر کہاں تک!

دسواں منظر

"منگنی"

(سکھا رام جھونپڑی میں جوار کی روٹی پیاز ہری مرچ اور چٹنیا کھا رہا ہے چھاچھ کا ایک پیالہ سامنے اس کی لڑکی سندرا گردن پر سوار ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ بھاگی ایک طرف جھاڑو دے رہی ہے)

بھاگی۔ جلدی جلدی کھاؤ کہ لوگ آ رہے ہیں۔

سکھا رام۔ یہ مطلب ہے روٹی میں ثابت نگل جاؤں؟

بھاگی۔ ادھر مزاج تیز ہوا جا رہا ہے روز۔

سکھا رام۔ میرا مزاج تیز کہ تیرا مزاج تیز؟

بھاگی۔ بھلا نے لاٹ صاحب کا دل پوچھے مزاج بنگوائی اک خرید کے لاؤں گی گاؤں سے

سکھا رام۔ (بھاگی کی بے وفائی کا خیال کر کے) اچھا ہے تیرے جھولنے کے کام آئے گی

بھاگی۔ کیں زمیندار نہیں کوئی کہ جھولا جھولوں۔

سکھا رام۔ جانتا ہوں تو زمیندار بنے گی اک دن

بھاگی۔ کون اس طرح زمیندار بنائے گا مجھے؟

سکھا رام۔ کیا خبر کون ہے وہ؟

(روٹی ختم کر کے سیاہ مٹی کے برتن سے ہاتھ دھوتا ہے۔ اتنے میں دو مرد اور دو عورتیں آتی ہیں سندرا بلی کے ساتھ کھیلتی ہوئی دوسری جھونپڑی میں ہے)

سکھا رام۔ آؤ بیٹھو کہ بہت دیر سے تکتا ہوں راہ

ایک مرد۔ سکھو، تجھے ایک کھیت۱؎ ہم کو دینا پڑے گا۔

بھاگی۔ وہ دو سو کے بارے ۲؎ سوچا ہے تم نے؟

۱؎ جہیز کے طور پر کھیت طلب کیا جا رہا ہے ۲؎ مرہٹواڑی کا قاعدہ ہے کہ لڑکی والے لڑکے والوں سے رقم مانگتے ہیں

عورت۔ نہیں بھاگی اتنا تو ہم سے نہ ہو گا

بھاگی۔ تو لڑکی کو چھوٹا سا نمبر ہی لکھدے۔

مرد۔ ہم بھی کسان تو بھی دہی۔ دیکھتی نہیں۔

سکھارام۔ تمہارے دو سو نہ کھیت میرا چلو یونہی سندرا کو لے لو۔

مرد۔ لے دے کے آس مجھ کو فقط کھیت ہی سے ہے!

عورت۔ (سکھارام سے) فتح چند سے کتنے بیگھے بچائے؟

سکھارام۔ میرے پاس اس وقت دو کھیت ہیں۔

بھاگی۔ جو پانی نہ پڑنے سے سوکھے ہوئے ہیں۔

دوسری عورت۔ چلو جی یہاں کام کیسے بنے گا۔

بھاگی۔ یہ لڑکی کا سودا ہے یا اس زمین کا؟

پہلی عورت۔ جانتی ہو گاؤں میں لڑکوں کی ہے کتنی کمی؟

سکھارام۔ چلو خیر اک کھیت میرا ہی لے جاؤ مجھے آس جینے کی باقی نہیں ہے
میں جیتا رہوں گا تو مانگوں گا تم سے تمہاری بہو میری بیٹی نہیں ہے!

بھاگی۔ اور کم از کم سو کا کرو بندوبست

عورت۔ ذرا سندرا کو بھی آواز دینا۔

سکھارام اپنی پانچ سالہ لڑکی کو گود میں لئے ہوئے آتا ہے۔ لڑکے کے ماں باپ اپنے سب ساتھیوں کو دکھاتے ہیں اور کچھ سوچ بچار ہوتا ہے۔ پھر بات پکی ہو جاتی ہے اور سب لوگ اٹھکر چلے جاتے ہیں۔ ایک عورت واپس آکر

عورت۔ گائے تو اپنے ہی گھر آئے گی نا؟

(سکھارام ہاں کا خاموش جواب دیتا ہے)

گیارہواں منظر

طوفان

رات کا وقت۔ زور کی آندھی چلتی ہے۔ بادل گرجتے ہیں اور آن کی آن میں دھواں دھار بارش شروع

ہو جاتی ہے سارا گاؤں جل تھل ہو جاتا ہے جھونپڑیاں اڑ جاتی ہیں دو ایک درخت ٹوٹ کر گرتے ہیں)

طوفان کی آواز۔ کون کہتا ہے کہ ناگاہ ہے آنا میرا — منتظر پہلے سے رہتا ہے زمانہ میرا
چشم ظاہر پہ گراں ہے مری بیراہروی — اہل دل خوب سمجھتے ہیں فسانہ میرا
زندگی دولت غم نذر کیا کرتی ہے — ڈھونڈتا ہے دل غمگین بہانہ میرا
پتے پتے سے عیاں ہو مری بیتابی دل — ذرے ذرے کے لبوں پر ہو ترانہ میرا
رقص کرتے ہوئے ہر چیز کو لے لیتا ہوں — قافلہ جوش سے ہوتا ہے روانہ میرا
طبع نازک پہ ہو یا کوہ کی سنگینی پر — کبھی خالی نہیں جاتا ہے نشانہ میرا
زندگی میرے لئے چیختی چلاتی ہے — موت کے ہاتھ سے بھرتا ہے خزانہ میرا

سکھا رام طوفان دیکھ کر اپنے کھیتوں کا خیال کرتا ہے۔

وقت کی آواز (گاؤں کو، کھیتوں کو، اور دہقان کو — لوٹ لے اے زندگانی لوٹ لے
آتی ہے) برق و باراں کو جگا اے چرخ پیر — بے نواؤں کی جوانی لوٹ لے
تا نہ رہ جائے کہیں تسمہ لگا — اے بلائے آسمانی لوٹ لے
غمزدوں کو اور بھی غمگیں بنا — بیکسوں کی شادمانی لوٹ لے

(طوفان کا اور زور ہوتا ہے ہوا اور پانی کے سیلاب آنے لگتے ہیں)

طوفان کی دوسری آواز — سرد دیکھی جو کبھی محفل بیتابی دل — بجلیاں کوند گئیں میرے شبستانوں میں
برق بن جاتا ہے جب میری فضا کا جوبن — چاک پڑ جاتے ہیں بادل کے گریبانوں میں
سانس جب زور سے چلتی ہو شکیبائی کی — زندگی جھومنے لگتی ہے بیابانوں میں
وقت آتا ہے تو دنیا کی نظر سے بچ کر — آگ بھر دیتا ہوں میں زیست کے پیمانوں میں
کھٹکھٹاتا ہوں میں دروازہ اسیروں کا اگر — شور زنجیر کا ہو جاتا ہے زندانوں میں
مجھ کو افسوس ہے ہوتی ہے کبھی بربادی — شور مچ جاتا ہے دنیا کے پریشانوں میں
اس پہ بھی دہر کو ہر وقت طلب ہے میری — یاد رہتی ہے مری زیست کے ایوانوں میں

(باہر سے بیلوں کے پکارنے کی آواز آتی ہے سکھا رام طوفان سے لڑتا ہوا چھپر تک جاتا ہے چھپر اڑ جانے سے بیل بھیگ رہے ہیں وہ بیل کھول کر اپنی جھونپڑی میں لے آتا ہے اور ان کا جسم خشک کرتا ہے۔ رات بھر میاں بیوی کھڑے کھڑے گذار دیتے ہیں)

بارہواں منظر

میلہ

گاؤں کے باہر چھوٹا سا میلہ۔ مختلف قسم کے جھولے پڑے ہوئے ہیں۔ بچے جوان، بوڑھے سب ہی جھول رہے ہیں۔ چاروں طرف دوکانیں، ہنڈیاں، میوہ، ترکاری، نیاری سامان، کپڑوں اور کھلونوں کا بازار۔ بچے سیٹیاں بجا رہے ہیں۔ ایک طرف مداری کے کرتب، دوسری طرف ریچھ اور بندروں کا ناچ۔ میدان کی طرف بہت سے لوگ جمع ہیں۔ کسان، چمار، مزدور، زمیندار، پٹیل، پٹواری، سیٹھ، ساہو، اکثر جمع ہیں کھادی کے ایک کپڑے پر کسان کے بیج "ون بیج" کر ان سدھار لکھا ہوا ہے۔ دوسری طرف زراعتی آلے، درخت بیج وغیرہ کی نمائش کا موٹر کھڑا ہوا ہے۔ ایک شخص تخت پر کھڑا ہو لکچر دے رہا ہے۔ سکھا رام بھی بھاگی کو لئے ہوئے ایک کونے میں بیٹھ جاتا ہے۔ اور تقریر کا یہ حصہ سنتا ہے)

ضرورت ہے کہ تم اس وقت اپنے خواب سے جاگو — ذرا اچھی زراعت کے لئے پیدا کرو ساماں
نئے آلات لاؤ اور دکھا دو، سیکھو نئی باتیں — کہ لہرانے لگیں فصلوں سے سارے کھیت اور میداں
نئے جتنے طریقے ہیں انھیں تم آزماؤ تو — ترقی کے چھپاؤ گے کہاں تک دل میں تم ارماں

(سکھا رام وہاں سے اٹھ کر دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ راستے میں اس کا دوست راما ملتا ہے)

راما۔ ارے چل کتھا سنیں گے کہ چلے ہیں سب ادھر ہی۔

سکھا رام۔ اسے سن چکا ابھی میں۔

راما۔ کام کی باتیں ہیں وہ

سکھا رام۔ سب لوٹ کی گھاتیں ہیں وہ

راما۔ خیر ہے ولایت کا یہ پرچار ہے

سکھا رام۔ یہ سب کچھ صحیح ہے پہ بیکار ہے۔

اتنے میں دولتمند دوشیزہ کیمرہ لئے ہوئے آتی ہے پیچھے اس کی سہیلی ہے۔ سکھا رام کو ساتھ چلنے کا حکم دیتی ہے۔ سکھا رام کمانتا ہے اور تھوڑی دیر سیٹ پکڑ کے بیٹھ جاتا ہے۔ سدھار اسے اٹھاتا ہے۔ دونوں مل کر دوشیزہ کے ساتھ ایک پنڈال میں جاتے ہیں جس پر "امداد باہمی" کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ دوشیزہ

(وہاں کے سکریٹری سے)

دوشیزہ۔ آرزو ہے مری کچھ قرض اسے بھی مل جائے

سکریٹری۔ کتنا قرضہ اس کو ملنا چاہیے؟

(دوشیزہ سکھارام کی طرف دیکھتی ہے)

سکھارام۔ ہے میرا جیون ہی قرض سارا حساب کی یاں خبر کسے ہے؟

دوشیزہ۔ میں سمجھتی ہوں اسے دو چار سو ہی چاہئیں

سکھارام۔ ہے کرپا تمہاری، اگر چار سو میں مرا ایک نمبر بھی سا ہو نہ دے گا

سکریٹری۔ (دوشیزہ سے) معاف فرمائیے اس وقت مرے کھاتے میں ہاں آپ کے واسطے دو سو کی رقم باقی ہے۔

(سکھارام چکر کھا کر گر جاتا ہے)

تیرہواں منظر

موت

(تاریک رات۔ ندی کا کنارہ۔ سکھارام کی لاش چتا میں جل رہی ہے سناٹا اور ہوا کے ہلکے ہلکے سرد جھونکے۔ چتا کی لکڑی چٹختی ہے۔ اوپر سایہ کیا ہوا درخت)

درخت۔ ختم ہو جلد تری آخری تکلیف حیات — میرے پتے ترے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں

مدتوں روتی ہے دنیا کی فضائیں اس پر — لوگ مظلوم کو مدفن میں سلا دیتے ہیں!

آ رہی ہے عدم آباد سے آواز سنو — آ تجھے اپنے مکانوں میں چھپا دیتے ہیں

خدمت دہر نے تو چھین لی ہستی تری — آسماں والے تجھے دیکھئے کیا دیتے ہیں؟

(بھاگی چتا کے قریب بال کھولے ہوئے آنسو بہا رہی ہے۔ شعلوں کی سرخیاں اس کے چہرے پر چمکتی ہیں۔ درختوں کے نیچے چندر ایک ہاتھ پیڑ سے لگائے بھاگی کو دیکھ رہا ہے)

محمد عبدالقیوم خاں صاحب باقی

لکچرار ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ

امانت کی غزل گوئی پر ایک نظر

اندر سبھا کے مصنف اور اردو ڈرامے کے باوا آدم کی حیثیت سے امانت کا نام غیر معروف نہیں شاعری میں لکھنویت کے ایک خاص عنصر یعنی رعایت لفظی کی ایجاد و رواج کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے، واسوخت گوئی میں وہ اپنے فن کے امام ہیں۔ ان کے ابتدائی عمر کے سلام اور بعد کے مرثیے بھی بے مزہ نہیں لیکن ان سب نے مل جل کر ان کے جوہر اصلی اور کمال حقیقی یعنی غزل گوئی پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ اس وادی میں بھی وہ معاصرین سے کسی طرح پیچھے نہیں لیکن موجودہ شاعری کے رنگ سے ان کے کلام کا مقابلہ کرنا یا ان کے کمالات کو اپنے زمانے کے اصول تنقید پر پرکھنا انصاف سے بعید ہے

نام آغا حسن تھا اور امانت تخلص میاں دلگیر نے تجویز کیا تھا جن کی مرثیہ گوئی کا آوازہ انیس و دبیر کے ظہور سے پہلے لکھنؤ میں گونج رہا تھا، اندر سبھا میں بعض اوقات انھوں نے اپنا تخلص استاد لکھا ہے۔ اس کے متعلق ان کے صاحبزادے سید حسن لطافت صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"بعد اس کے احباب نے فرمائش کی کہ قصہ راجہ اندر اس طرح نظم کیجئے کہ جس میں غزلیں اور مثنوی اور ٹھمریاں اور ہولیاں اور بسنت اور ساون اور دادرے اور چھند ہوں تاکہ اس زبان میں بھی طبیعت کی جودت اور ذہن کی رسائی دیکھیں۔ بسبب اصرار ہر دوست و یار چار و ناچار ۱۲۶۵ھ میں یہ قصہ تصنیف کیا اور اندر سبھا اس کا نام رکھا کہ آج تک خاص و عام کی زبان پر جاری ہے اور صدہا مرتبہ چھپنے کی نوبت آئی مگر چونکہ اندر سبھا کا تصنیف کرنا خلاف شان و تہذیب جناب مغفور تھا اس لئے اس کتاب میں سے اپنا تخلص نکال لیا اور جا بجا بجائے تخلص لفظ استاد رکھ دیا مگر عاشقانہ غزلوں میں جو تخلص امانت تھا وہی باقی رکھا" [۱]

---

[۱] پیش لفظ از سید حسن لطافت ابن آغا حسن امانت بر دیوان امانت مسمی بہ خزائن الفصاحت مطبوعہ ۱۲۷۸ھ مطبع خاص منشی درگا پرشاد لکھنوی محلہ نوازگنج۔

مگر نور الٰہی محمد عمر صاحبان اس سے متفق نہیں ان کا بیان ہے :۔

"اندر سبھا امانت میں امانت اور استاد دو تخلص استعمال کئے گئے ہیں ہمیں شک ہوا تھا کہ یہ ڈراما بھی کسی اشتراک عمل کا نتیجہ ہے مگر ذیل کے شعر نے شک دور کر دیا ؎

ہیں قیامت بت بے شرم وحیا کی باتیں — کبھی کہتا ہے امانت کبھی استاد مجھے[1]

دو تخلص کیوں استعمال کئے گئے اس بارے میں یقینی طور پر ہم کچھ کہہ نہیں سکتے، ہاں تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بالعموم غزلوں میں امانت اور اس نظم میں جو ڈرامے سے تعلق رکھتی ہے استاد تخلص کرتے تھے۔ یہ خیال کہ وہ ڈرامے کو اپنے سے منسوب ہونا پسند نہیں کرتے تھے صریحاً غلط ہے کیونکہ اس میں استاد اور امانت کی ایک ہی ہستی ہونے کا اعلان ہے۔ ہمارے نزدیک بات یہ ہے کہ ریختہ کے شعراء جب فارسی میں یا ریختہ میں کچھ کہتے تھے تو کوئی اور تخلص کیا کرتے تھے، جیسے نیّر ورخشاں تخلص ہیں نواب ضیاءالدین دہلوی کے........ اسی طرح امانت نے اس صنف جدید کے لئے یہ نیا تخلص اختیار کیا"[2]

ناٹک ساگر کے مصنفین نے جو شعر پیش کیا ہے وہ اندر سبھا میں نہیں بلکہ دیوان خزائن الفصاحت میں موجود ہے۔ دوسرے سید حسن لطافت کے بیان سے اختلاف کرنے کی کوئی معقول دلیل ان مصنفین نے پیش نہیں کی ہے۔ یہاں تک دونوں متفق ہیں کہ غزلوں میں ان کا تخلص امانت ہی ہے۔ البتہ اندر سبھا میں "جابجا بجائے تخلص کے لفظ استاد رکھدیا"

اکثر شعرائے ریختہ وفارسی نے دو زبانوں کے لئے دو مختلف تخلص بھی استعمال کئے ہیں لیکن یہ بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ اساتذہ وقت اگر نئی اور عام پسند چیزوں کی طرف کبھی توجہ کرتے بھی تھے تو پہلے خواص سے معذرت کر لیتے تھے کہ اگر وہ ان کے اصلی کمالات کو دیکھنا چاہیں تو مروجہ اصناف پر نظر ڈالیں۔ عرصہ تک ریختہ گو فارسی شاعر اپنی اردو شاعری کو "محض تفنن طبع" کے لئے کہتے تھے اور اس پر فخر کرنا نازیبا سمجھتے تھے

---

[1] خزائن الفصاحت مطبوعہ ۱۲۸۰ھ میں دوسرا مصرعہ یوں ہے "کبھی کہتا ہے امانت مجھے استاد کبھی۔

[2] ناٹک ساگر کے دو باب از نور الٰہی محمد عمر صاحبان صفحہ ۶۶۔۶۷۔

یہ دوسری بات ہے کہ جس چیز کو وہ اپنے لئے باعث ، ارجمت تھے وہی ان کی شہرت کا اکثر ذریعہ بنی غالب اپنی اردو شاعری کو مجموعہ بے رنگ، کہکر گذر گئے ہیں حالانکہ ان کے اشعار اردو شعر و شاعری میں بے مثل ہیں یہی حال اماتنت کا ہوا ہو گا۔ اندرسبھا عوام اور احباب کی فرائش سے لکھی گئی اور عوام نے ہی اس میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس زمانہ میں کیا آج بھی ثقہ لوگ اسے کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اس لئے کچھ بعید نہیں جو اماتنت نے اپنا دامن بچانے کے لئے معذرت کے طور پر اپنا تخلص جگہ جگہ سے نکال کر استاد کا لفظ رکھدیا ہو۔

جیسا کہ مذکور ہوا اندرسبھا کی شہرت نے ان کی غزل کی خوبیوں پر پردہ ڈالدیا۔ علاوہ بریں ابتدا ہی سے ان کے متعلق یہ غلط فہمی عام ہوگئی کہ ان کا کلام صرف رعایت لفظی اور ضلع جگت تک محدود ہے یہی وجہ ہوئی کہ غزل گو شعراء کے تذکروں میں ان کے حالات بہت کم ملتے ہیں ڈراموں کی تاریخ میں اندرسبھا کے مصنف کی حیثیت سے ان کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ ان کے دیوان خزائن الفصاحت کے اس دیباچہ سے ماخوذ ہے جو ان کے صاحبزادے سید حسن لطافت نے لکھا تھا۔ یہ دیوان جو ۱۲۷۵ھ میں خود شاعر کے صاحبزادے نے مرتب کیا یہی اس کا قدیم ترین اور مستند نسخہ ہے۔ اس کے بعد بھی اگرچہ یہ متعدد بار شائع ہوا (مثلاً نول کشور پریس میں) لیکن کوئی نسخہ اس کی صحت کو نہیں پہونچا۔

اس دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آغا حسن اماتنت کا سلسلۂ نسب میر آغا ابن سید علی ابن سید محمد تقی ابن سید علی مشہدی سے ملتا ہے۔ سید علی مشہدی جو ان کے مورث اعلیٰ تھے مشہد مقدس میں جناب امام علی ابن موسی الرضاؑ کے روضۂ مقدسہ کے کلید دار تھے۔ لکھنؤ میں ان کی اولاد کو شاید وہ کشش کھینچ کر لائی ہوگی جو نواب سعادت خان برہان الملک نے مذہب اثنا عشریہ کی سرپرستی سے پیدا کر دی تھی۔ یہیں لکھنؤ میں آغا حسن پیدا ہوئے اور بیس برس کے سن تک علوم مروجہ کی تحصیل کرتے رہے۔ شاعری کی بزم یہاں نئی نئی قائم ہوئی تھی یہ بھی شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوئے یہ زمانہ لکھنؤ میں مرثیہ کی اٹھان کا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بھی ابتدا میں چند سلام موزوں کئے۔

اس وقت لکھنؤ کے مرثیہ گو شعراء میں میاں دلگیر کا بول بالا تھا چنانچہ آغا حسن کے والد اس نوخیز

شاعر کو ساتھ لے کر کسنہ مشق استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے آغا حسن نے اپنے سلام سنائے جن کو سن کر دلگیر بہت خوش ہوئے اور مستقبل کے متعلق امید افزا خیالات کا اظہار کیا اور امانت تخلص تجویز کیا

عرصے تک سلام گوئی کی مشق جاری رہی اور اس فن میں کچھ نام بھی پیدا کیا لیکن یکایک طبیعت غزل کی طرف متوجہ ہوئی اور چند غزلیں کہہ کر استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اصلاح چاہی۔ چونکہ میاں دلگیر کو غزل سے لگاؤ نہ تھا اس لئے خلوص کے ساتھ معذوری ظاہر کی البتہ وعدہ کیا کہ وہ ان کا تعارف اپنے بعض دوستوں سے کرادیں گے جو اس فن میں کامل تھے۔ امانت نے قبول نہ کیا اور اس دن سے اپنی فکر کی رہبری پر بھروسہ کر کے غزل گوئی شروع کی اس وقت ان کی عمر تقریباً بیس سال کی تھی۔

اس عمر میں کسی بیماری سے ان کی زبان بند ہو گئی اور یکایک گویائی سے محروم ہو گئے، مجبوراً بذریعہ تحریر کلام کرنا اختیار کیا، اس بیکاری اور خاموشی میں مشق سخن کا زیادہ موقع اور محنت سے شاعری کو کمال کے درجہ تک پہونچا دیا اکثر لوگ ان کے شاگرد ہوئے جن میں صاحب عالم ہمایوں بخت بہادر بھی تھے۔ انھوں نے ہی پہلا دیوان بہ تلاش و محنت جمع اور مرتب کیا لیکن وہ دیوان کسی حادثہ میں تلف ہو گیا اور ساری محنت رائگاں گئی پھر ایک سو دس بند کا ایک عاشقانہ واسوخت نظم کیا وہ ایک دوست نے مستعار مانگا اور پھر باوجود اصرار و تقاضے کے واپس نہیں کیا۔ چنانچہ پہلے دیوان کی طرح پہلا واسوخت بھی دریا برد ہوا۔ یہ کلام اگر موجود ہوتا تو معلوم ہوتا کہ جوانی میں کلام میں کیا زور اور رنگ تھا۔ اب جو سرمایہ موجود ہے وہ اس کے بعد کا ہے۔

۱۲۵۹ھ میں اپنا وہ مشہور واسوخت نظم کیا جس میں تین سو سات بند ہیں اور باوجود اس کے کہ رعایت لفظی اور معاملہ بندی کے مضامین اس میں بہت ہیں یہ عرصہ تک بہت مقبول رہا۔

واسوخت کی تکمیل سے پہلے عتبات عالیات کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور گویائی سے محروم ہونے کے باوجود کمر ہمت باندھ کر اٹھ کھڑے ہوئے ۱۲۶۰ھ میں زیارت روضہ جناب امام حسین علیہ السلام سے مشرف ہو کر لوٹے۔ وہ زبان جو دس برس سے بند تھی کھل گئی۔ ناٹک ساگر کے مصنفین کا بیان ہے کہ کسی علاج نے یہ مرض دور کیا۔ سید حسن لطافت لکھتے ہیں کہ بغیر کسی علاج کے صرف زیارت کی برکت

سے بیماری دور ہو گئی البتہ کچھ لکنت باقی رہ گئی جو مرتے دم تک ساتھ رہی۔

لکھنؤ واپس پہونچ کر واسوخت کو مکمل کیا اور ۱۲۶۲ھ میں ایک محفل منعقد کی اور تمام امرأ و روسا اور عمائدین شہر کو جمع کر کے بر سر محفل یہ واسوخت پڑھا اور داد کمال حاصل کی اب اس واسوخت کو پڑھئے تو ثقاہت کا خون ہوتا نظر آتا ہے لیکن اس محفل میں واسوخت کے سننے سنانے سے اس عہد کی معاشرت اور لوگوں کے مذاق کا کیسا صاف پتہ چلتا ہے۔

۱۲۶۵ھ میں عوام کی فرمائش سے اندر سبھا کا قصہ نظم کیا اس اندر سبھا کے لئے لکھنؤ میں فضا پہلے سے تیار تھی۔ اختر نگر کے عیش خانے اندر کی سبھا کے مکمل نمونے تھے۔ امانت نے اندر سبھا لکھی تو گویا ماحول سے متاثر ہو کر اس کی ترجمانی کی۔ ناٹک ساگر کے مصنفین اس کی تاریخ تصنیف ۱۲۷۰ھ بتاتے ہیں اور اس کے ثبوت میں یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

خلائق میں ہے دھوم اندر سبھا کی　　زروئے وجد بول اٹھے پریزاد

اس شعر میں دوسرے مصرعہ سے پورے عدد حاصل نہیں ہوتے بلکہ "وجد" کے رو یعنی و کے تعمیہ کے بعد ۱۲۷۰ھ برآمد ہوتے ہیں لیکن خزائن الفصاحت کے دیباچہ میں صاف ۱۲۶۵ھ تحریر ہے اس سلسلہ کی عبارت یہ ہے:

"بعد اس کے احباب نے فرمائش کی کہ قصہ راجہ اندر اس طرح نظم کیجئے کہ جس میں غزلیں اور مثنوی اور ٹھمریاں اور ہولیاں اور بسنت اور ساون اور دادرے اور چھند ہوں تاکہ اس زبان میں بھی طبیعت کی جودت اور ذہن کی رسائی دیکھیں بسبب اصرار ہر دوست دیار چار و ناچار ۱۲۶۵ھ میں یہ قصہ تصنیف کیا اور اندر سبھا اس کا نام رکھا۔"

ممکن ہے ۱۲۷۰ھ قصہ کا سنہ اشاعت یا طباعت ہو جسے ناٹک ساگر کے مصنفین نے غلطی سے سنہ تصنیف سمجھ لیا۔ سید حسن لطافت کی حیثیت شاہد عینی کی ہے۔ ان کے اس بیان سے اختلاف کے لئے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں۔ اندر سبھا اگرچہ تاریخی اعتبار سے ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے لیکن اس کی تفصیل اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

۱۲۶۹ھ میں چند غزلیں مسدس مخمس ترجیع بند ایک جا جمع کئے اور مجموعہ کا نام گلدستۂ امانت رکھا یہ مجموعہ

بھی متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔ زیارت عتبات عالیات کے بعد پھر سلام گوئی اور مرثیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ جسے بیس برس کے سن میں ترک کر چکے تھے۔ ہند کے حال کا ایک مرثیہ رزمیہ لکھا۔ اس صنف کے وہی موجد تھے۔ علاوہ اس کے اور مرثیے بھی بکثرت تصنیف کئے۔ آخر عمر میں جب طبیعت رعایت لفظی سے سیر ہو گئی تو چیستاں، معمہ اور پہیلی گوئی اختیار کی اور اس فن میں بھی داد کمال دی۔

۱۲۷۵ھ میں جمادی الاول کی اٹھائیسویں تاریخ کو بہ عارضہ استسقاء انتقال کیا۔ آغا باقر کے امام باڑے کے قریب مسافر خانے میں دفن ہوئے۔

ان کے مرنے کے بعد باقی ماندہ کلام کا مجموعہ ان کے صاحبزادے سید حسن لطافت نے خزائن الفصاحت کے نام سے مرتب کر کے شائع کرا دیا۔

غزل گوئی پر تبصرہ | تبصرے سے پہلے ان کی ایک مکمل غزل دیکھئے جس سے ان کے عام انداز کا پتہ چلتا ہے۔

کان کی لو کا جو شعلہ پرتو افگن ہو گیا — اک آبازو کا شب گیسو میں روشن ہو گیا
خنجر قاتل گیا جس دم ہمارے سر میں پیر — فرق کا کاسہ حباب آب آہن ہو گیا
عکس مژگان پڑ گیا جب ہمرہ تار نگاہ — یار کی شالی قبا پر کار سوزن ہو گیا
وسعت باغ جہاں کا جب کیا ہم نے خیال — آسمان نیلگوں اک برگ سوسن ہو گیا
عمر بھر کانٹوں میں لوٹا گلرخوں کی یاد میں — جامۂ ہستی مجھے صحرا کا دامن ہو گیا
قتل پر عشاق کے قاتل نے جو باندھی کمر — تن وبال جان مجھے سر بار گردن ہو گیا
بتکدوں میں ہے ہمارے نالۂ دل کا جو اوج — اے صنم کوڑی کا ناقوس برہمن ہو گیا
اے فلک محتاج ہم پیکش نہیں برسات کے — لگ گئی جس دم جھڑی اشکوں کی ساون ہو گیا
ہو گیا جس رات میرا نالۂ سوزاں بلند — آسمان کا قمقمہ دنیا میں روشن ہو گیا
جنس دل کو کر دیا زلف عرق افشاں نے خاک — ابر رحمت میرے حق میں برق خرمن ہو گیا
سرمگیں مژگاں کی الفت نے گھلایا کس قدر — جسم لاغر اپنا میل چشم سوزن ہو گیا
چٹکیوں نے تیری اے رشک چمن کیا گل کھلائے — جو پڑا نیل اپنے تن پر برگ سوسن ہو گیا

ہوں وہ زار و ناتواں کھا جو منھ اس زلف پر — حلقۂ زنجیر گیسو طوق گردن ہو گیا
اس کے جاتے ہی اڑا کیا رات کو محفل کا نور — شمع کا شعلہ چراغ زیر دامن ہو گیا
رخنہ ہر شے میں پڑا تیر نگاہ یار سے — پردہ دنیا کا نظر بازی سے چلمن ہو گیا
باغ کے در پر کیا اس گل کا یا تک انتظار — جسم خاکی پشتۂ دیوار گلشن ہو گیا
کر دیا تن کو ہمارے کیا قبا نے بے فروغ — داغ سینہ کا چراغ زیر دامن ہو گیا
ہٹ گئے ساقین جاناں سے جو شب کو پائنچے — اک دو شاخہ نور کا محفل میں روشن ہو گیا
نشۂ مے سے ہوا روشن چراغ حسن یار — ساقیا پانی سے شب کو کار روغن ہو گیا
کر دیا حسن صنم نے سرخ رو پیش ہنود — دیکھی جب بازلف سیاہ کالی کا دشمن ہو گیا

تلکدوں میں دہر کے بندھ جائے گی اپنی ہوا
گر اماانت رام وہ طفل برہمن ہو گیا

اس غزل میں بعض خصوصیات ایسی ملتی ہیں جن میں لکھنؤ کے دبستان شاعری سے تعلق رکھنے والے سب کے سب شریک ہیں[1] مثلاً غزل کی طوالت، بھرتی کے مضامین، لکھنؤ کی نسائیت، فارسی کی دلآویز تراکیب کی کمی، خارجی مضامین کی زیادتی۔ داخلی اور روحانی مضامین کا فقدان، تصوف کا فقدان، رعایت لفظی کا شوق، معاملہ بندی، ابتذال اور رکاکت، بیہودہ اور مبتذل تشبیہات و استعارات کا استعمال لیکن ان میں سے بعض اور ان کے علاوہ چند دیگر خصوصیات ایسی ہیں جو اماانت کا خاص حصہ ہیں مثلاً رعایت لفظی و معنوی جو ضلع جگت کی حد سے جاملی ہیں۔ محاورہ بندی، محاکات مختلف علمی و مذہبی اصطلاحات کا استعمال، ہندی الفاظ و محاورات، زبان کی بندش اور خوبی اور کہیں کہیں طرز ادا کی جدت اب ان کی تفصیل سنیے۔

غزل کی طوالت:- اردو کے دور قدیم میں طویل غزلیں بالعموم ناپید ہیں اور شاید اسی وجہ سے متقدمین شعرائے دہلی بھی مختصر غزلیں کہتے تھے یوں تو غزل کے اشعار کی تعداد معین و مقرر نہیں تھی لیکن شاذ و نادر

---

[1] شعر الہند حصہ اوّل۔

ہی گیارہ اشعار سے زیادہ کی غزلیں لکھی جاتی تھیں۔ ان اشعار میں بالعموم بہترین قافئے صرف ہو جاتے تھے۔ شعرائے لکھنؤ جو ہمیشہ مضمون کے مقابلہ میں زبان پر جان دیتے تھے۔ اسے گناہ عظیم سمجھتے تھے کہ قافیوں کی ممکن فہرست میں سے کوئی قافیہ نظم ہونے سے رہ جائے چنانچہ اسی شوق میں طویل غزلیں لکھی جاتی تھیں اور جب ایک غزل سے سیری نہیں ہوتی تھی. تو دوغزلہ اور سہ غزلہ تک نوبت پہونچتی تھی اور ان میں اکثر رکیک اور مبتذل قافئے بھی نظم کرنا پڑتے تھے۔ آتش کی ایک بہت مشہور غزل ہے۔ اس کے دو شعر ہیں۔

بوسہ بازی سے مری ہوتی ہے ایذا ان کو　　منھ چھپاتے ہیں جو ہوتے ہیں مہاسے پیدا
لب شیریں سے ترے چاشنی ممکن نہ ہوئی　　رس سے شکر ہوئی شکر سے بتاسے پیدا

چنانچہ امانت کی مذکورالصدر غزل میں بھی جسے ہم نے بطور نمونہ پیش کیا ہے یہ عیب موجود ہے ایک قافیہ سوزن ہے جس کے لئے شاعر کو ایک عجیب خیال اور مضمون پیدا کرنا پڑا۔

سرمگیں مژگاں کی الفت نے گھلایا اس قدر　　جسم لاغر اپنا میل چشم سوزن ہو گیا

اس قسم کی بعض اور مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ایک غزل ہے۔

دکھلائے خدا اس ستم ایجاد کی صورت　　استادہ ہیں ہم باغ میں شمشاد کی صورت

اس میں ۲۱ اشعار ہیں، قافیئے ایجاد، شمشاد، بیداد، صیاد، جلاد، فرہاد، آباد، سیاد، بہزاد، فولاد، اولاد، آزاد وغیرہ بخوبی نظم ہوئے ہیں لیکن دو قافئے حداد اور فصاد رہ گئے تھے۔ ان کو شاعر یوں نظم کرتا ہے:۔

وہ وحشی لاغر ہوں کہ مرنج ہوا نے　　زنجیر پہنائی مجھے حداد کی صورت
پھولوں کے بچھونے نے چُھپاکت سے وہ بدلے　　ہے ہر رگ گل نشتر فصاد کی صورت

دوسرا شعر تو کسی حد تک درگذر کے قابل ہے لیکن پہلے شعر کی آورد کبھی معاف نہیں کی جاسکتی۔ ایک اور غزل ہے

دیکھی جو نہیں زلف سیاہ فام کی صورت　　دن تیرہ مری آنکھوں میں ہے شام کی صورت

اس کا ایک شعر ہے۔

اخیار سدا پستے رہے باغ جہاں میں　　توام میں رہا یار سے بادام کی صورت

بادام کی وجہ سے توام اور پستے کا مضمون نکالنا پڑا جس میں رعایت لفظی کے علاوہ ابتذال بھی پیدا ہو گیا۔

ایک اور غزل ہے چشم ترکی طرح، نظر کی طرح، گھر کی طرح۔ اسی میں ایک شعر ہے۔

نہ بات کی لب شیریں سے یار نے اکدن　　　پڑی گرہ پہ گرہ دل میں نے شکر کی طرح

لب شیریں کی رعایت سے نبات اور نیشکر کا مضمون صرف نیشکر کا قافیہ نظم کرنے کی غرض سے نکالنا پڑا

امانت کے یہاں یہ عیب ہے لیکن کمتر، لکھنؤ کے معاصرین شعرا کے یہاں یہ اور بھی نمایاں ہے کیونکہ انھوں نے طویل غزلوں پر اکتفا نہ کرکے دوغزلے، سہ غزلے اور چہار غزلے تک لکھے ہیں اس روش کا اثر انشا کے کلام پر دیکھئے۔ ایک ردیف ہے "غش کیا" اس میں مسلسل نو غزلیں لکھی ہیں۔

نسائیت:- لکھنویت کا اہم ترین عنصر ہے، نواب شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد اور لکھنؤ نے مہجبینوں کا مسکن بن کر یہاں کی تہذیب اور معاشرت میں نسائیت کا عنصر غالب بنا دیا۔ شاعری اور زندگی کو ایک دوسرے سے جدا کرکے دیکھنا بہت مشکل ہے۔ چنانچہ شعرائے لکھنؤ کے ہاں بالعموم نسائیت کا رنگ غالب ہے اور یہ ماحول کی ترجمانی کرتا ہے اس قسم کے مضامین امانت کے ہاں بھی موجود ہیں۔

ڈوپٹہ اوڑھ کر آب رواں کا سرخ انگیا پر　　　رلا یا باغ میں اس گلبدن نے خوب شبنم کو

ڈوپٹہ، آب رواں، انگیا، گلبدن اور شبنم کے مضامین خارجی تو ہیں ہی ان میں نسائیت بھی پائی جاتی ہے۔ ایک قطعہ میں فرماتے ہیں۔

حنا سے پاؤں گلنار اس گل رعنا کے یکسو ہیں　　　بندھا ہے کاسنی ریشم کا گیندا بوٹ دھانی ہے

سیہ موباف بپا جامہ گلابی چنپئی نیفہ　　　ڈوپٹہ سرخ، انگیا سبز کرتی زعفرانی ہے

لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ان کے ہاں صرف نسائیت ہے۔ شعرائے متقدمین کی امرد پرستی کا رنگ بھی موجود ہے۔

دم رفتار اگر کھلے ننھے شکم ہے صاف کھل جاتا　　　کمر باندھا کر چھوڑو میاں باتیں لڑکپن کی

خارجی مضامین:- یہی خصوصیت دہلوی اور لکھنوی شاعری کا امتیاز دکھانے کے لئے بالعموم پیش کیجاتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نکالنا غلط ہے کہ شعرائے دہلی کے یہاں صرف داخلی اور جذباتی یا روحانی مضامین ہیں اور لکھنؤ والے صرف خارجی واقعات یا متعلقات حسن تک محدود رہ گئے ہیں۔ یہ البتہ صحیح ہے کہ دہلی میں جذبات زیادہ تر اور متعلقات کمتر موضوع شعر بنائے گئے ہیں۔ لکھنؤ میں اس کے برخلاف

متعلقات زیادہ ہیں اور داخلی جذبات کمتر نظم ہوئے ہیں۔

پسینہ اس کے رخ آتشیں سے ہے جاری — عجب تماشا ہے آتش سے آب نکلا ہے

بعض اوقات نہایت مضحکہ انگیز مضمون پیدا ہو گیا ہے

ہے حسن کے دریا میں حبابوں کا یہ جھرمٹ — چیچک کے ترے گال پہ ابھرے نہیں دانے

اسی غزل کا مطلع ہے۔

بخشی ہے نزاکت یہ مرے بت کو خدا نے — کنگھی کبھی کی سر میں تو شل ہو گئے شانے
تار کشی دوپٹہ تو اوڑھے جو کرن مانک کے — ہو شب مہتاب میں کیا ہی صنم جھلا جھلی
مہ و انجم کو تو نے سب کی نظروں سے اتار آئے — قیامت کامدانی کا دوپٹہ چاند تارا ہے
روشن یہ ہے کہ سبز کنول میں ہے سبز شمع — دھانی لباس پہنے جو وہ سبزہ رنگ ہے
اے بحر حسن باندھے جوڑا اٹھا کے بال — بالے کی مچھلی ڈرتی ہے زلفوں کے جال سے
کھلتی ہے مرے شوخ پہ ہر رنگ کی پوشاک — اودی، اگری، جنبئی، گلنار، بسنتی
افشاں روپہلی یار نے بالوں پہ ہے چنی — چٹکی ہے چاندنی شب زلف سیاہ میں
دم رفتار الجھتے زلف میں موتی کے چھالے ہیں — تمہارے گیسوں کے سانپ اب تو کوڑیالے ہیں

لیکن ان نمونوں کے باوجود امانت کا دامن خارجی مضامین کے سلسلے میں اس قدر آلودہ نہیں جتنا لکھنؤ کے بعض اور سر آمد شعرا کا مثلاً

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا — چنپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا (؟)
کسی کے محرم آب رواں کی یاد آئی — حباب کے جو کنارے کبھی حباب آیا (آتش)
کہاں یہ بال بیڑ دیر بھی چوٹی کی پرچھائیں — کہ ہے پشت شکم آئینہ شفاف کا جوڑا (انشا)
بام پر نکلے نہ آؤ تم شب مہتاب میں — چاندنی پڑ جائے گی میلا بدن ہو جائیگا (ناسخ)
حسرت اسکے ساتھ سونے کی ہے کیا طاقت گداز — ان دنوں میں شل تصویر یہ ہاں ہو گیا (")
پہنے کرتی اگر وہ جالی کی — کرے ہر حلقہ کو ستارا بیٹ (")

وصل کی شب دیے کے دم عریاں کرینگے اسکو زہد　　ایک دن وا عقدۂ نافِ دکمر ہو جائے گا

وانہ ہے اس پری کے شکم پر جو خال ہے　　عالم اس کی جالی کی کرتی ہے جال کا

معاملہ بندی:۔ معاملہ بندی یا وقوعہ نگاری لکھنؤ سے مخصوص نہیں اس کی ابتدا اور انتہا فارسی میں بہت پہلے ہو چکی تھی۔ دہلی کے شعرائے متقدمین کے یہاں کم اور شعرائے متاخرین کے ہاں اکثر وقوعہ نگاری کے اشعار موجود ہیں لکھنؤ میں اس فن کے امام میاں جرأت تھے جن کے انداز بیان نے معاملہ بندی کے اشعار کو اور بھی مبتذل بنا دیا ہے چند مثالیں اس کے اندازے کے لئے کافی ہیں:۔

کل واقف راز اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات　　جرأت کے یہاں رات جو مہمان گئے ہم

کیا جانئے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر　　جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

انشا فرماتے ہیں:۔

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت　　ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی رات کے وقت

ناسخ کا ایک شعر ہے:۔

رات کو چوری چھپے پہونچا جو میں　　غل مچایا اس نے دوڑو چور ہے

بحر نے لکھا ہے:۔

دوپٹے کو آگے سے دوہرا نہ اوڑھو　　نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل

خلیل کا ایک شعر ہے:۔

منہ گال پہ رکھنے سے خفا ہوتے ہو ناحق　　مس کرنے سے قرآں کی فضیلت نہیں جاتی

یہ مثالیں اس خرافات کی پوری کیفیت پیش کرنے سے قاصر ہیں جو معاملہ بندی کے پردے میں لکھنؤی شعرا کی یادگار ہے۔ اس حمام میں آکر سب کے سب برہنہ ہو گئے۔ بلکہ ان میں سے بعض اس حد سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس منزل کی مثالیں بھی ذوق پر بار گزریں گی۔ اس صنف میں امانت کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

مستی میں میں لگا ہی چکا تھا اسے گلے　　بہکا جو پاؤں ہاتھ کمر سے نکل گیا

غزل

تلاشِ مرگ میں کب تک فراقِ جان کھپائیں
جو ہو سکے تو اسی زندگی کو موت بنائیں

غمِ فراق میں اس کی جفائیں کیوں یاد آئیں
ہمیں بھی چاہئے اسوقت جی میں کچھ شرمائیں

یہ بوجھ لے کے اگر گر پڑیں تو بیڑا پار
اُٹھے نہ بارِ محبت تو کھیت ہی ہو جائیں

غرض کہ ہوش میں آنا پڑا محبت کو
ہمیں کو دیکھ لیں دیوانے تیرے دور نہ جائیں

وصال و ہجر کا ایسوں کے بھی ٹھکانا کیا
کہ جا کے بھی جو نہ جائیں اور آ کے بھی جو نہ آئیں

مغائرت کو چھپانا ہے دلدہی کیسا ہے
کہاں تک اس نگہِ لطف کے بھی دھوکے کھائیں

یہ کیا کہا کہ نہ ہو عشق پھر بھی ملتے رہیں
اب ایسی باتوں میں کیا ہو کہو تو منہ نہ دکھائیں

بہار میں نہ کھلے دل خزاں ہے دور ابھی
نہ کھل سکا کہ یہ غنچے ابھی سے کیوں مرجھائیں

زمانہ بدلا ہے اک آدھ کروٹوں سے کہیں
ابھی عناصرِ عالم کچھ اور پلٹے کھائیں

کچھ آدمی کو بھی مجبوریاں ہیں دنیا میں
ارے وہ دردِ محبت سہی تو کیا مر جائیں؟

قیامتیں نہ اُٹھانا بھی اک قیامت ہے
یہ کیا ضرور کہ مست خرام حشر اُٹھائیں

جہاں میں ترکِ تعلق نہیں ہے ترکِ رسوم
وہ دیکھتے ہیں تو ہم بھی کہاں تک آنکھ چرائیں

یہ حالِ زار تو کچھ احترامِ حسن نہیں
تری قسم تجھے اس یاد سے تو بھول ہی جائیں

ازل سے رونقِ بزمِ جہاں ہیں قلبِ تپاں
یہ انجمن بھی ہوا ہو جو یہ کنول بجھ جائیں

یہ تیری انجمنِ ناز بزمِ غیر نہیں
ہمارا کام نہیں کچھ یہاں تو کیا اُٹھ جائیں؟

دلوں کو بیٹھے بٹھائے یہ آج کیا سوجھی
کہ بن کے مست گھٹا کائنات پر چھا جائیں

فروغ انجمن دہر مہر و ماہ بھی ہیں
جو آگ دل میں دبی ہو اسی کو کیوں اکسائیں

کریں تو کس سے کریں راہ عشق کا شکوہ
رکیں تو پاؤں سنائیں چلیں تو منہ کی کھائیں

لئے رہیں وہ زمانے میں اپنی بے فکری
جو غم شناس نہیں وہ خوشی کو منہ چڑھائیں

"نگاہ[۱] اہل محبت تمام سوگند ست"
سکوت شوق کو بس دیکھ لے تو قسم کیا کھائیں

نثار جذب نہاں کیا یہ ہو نہیں سکتا
جنھیں نظر سے گرائیں وہی دلوں میں سمائیں

وہ بے نیاز یہاں موت و زندگی یکساں
دعا بجا مگر ایسے میں کس کی خیر منائیں

نے کا پھیر کہیں یا سمے کی بلہاری
نگاہیں اپنی جگہ ہوں اور اس طرح پھر جائیں

ارے یہ آنکھوں ہی آنکھوں میں جانے کیا کہہ جائے
نگاہ شوق ہے بیباک اس کو منہ نہ لگائیں

معاملہ تو سلجھتا نظر نہیں آتا
بنائیں عشق سے باتیں کہ حسن کو سمجھائیں

سوال غم کا بھی نکلا سوال منزل غم
کہ حسرتیں تو وہی ہیں جو خاک میں مل جائیں

خرام حسن کی کچھ آہٹیں تو ملتی ہیں
وہ آ رہے گا کسی روز ادھر بھی کیوں گھبرائیں

جو با فراغ ہیں کچھ پائیں زندگی کا مزہ
رکے نہ سانس گراں کے دم بھی گھٹتے جائیں

فضائے یاس بھی پہچانتی ہے یہ آواز
دل خراب کو یہ کون دے رہا ہے صدائیں

فراق بعد کو ممکن ہے یہ بھی ہو نہ سکے
ابھی تو رو بھی لے کچھ ہنس بھی لے دن آئیں نہ آئیں

ہوائے سرد چلی داستان غم ہوئی ختم
فراق رہ گئی ہے تھوڑی رات اب سو جائیں

(فراق گورکھپوری)

۱؎ یہ مصرعہ حضرت امیر خسروؔ کا ہے۔

اپنی اصلاح

مسلمان اور تجارت

مسلمانوں کے تنزل کے اسباب و علل پر اس قدر سیر حاصل بحث ہو چکی ہے اور مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے ان کا اس قدر تفصیلی تجزیہ کیا جا چکا ہے کہ بلا مبالغہ ایک انسائیکلوپیڈیا بن سکتی ہے۔ مگر حیرت ہوتی ہے کہ اسباب زوال ملت کی اس لمبی فہرست میں بھی "فقدان تجارت" کی مد کہیں نظر نہیں آتی۔ تجارت سے نفرت مسلمانوں کو اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے زوال کی ایک معقول وجہ کو کم از کم تسلیم ہی کر لیں۔

تجارت سے اتنی بے رغبتی ممکن ہے کسی زمانہ میں ان کو زیب دیتی ہو مگر موجودہ سرمایہ دارانہ دور میں اس کو کسی صورت سے بھی جائز نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ مسلمان دیکھ چکے ہیں کہ مغربی تعلیم کے متعلق ان کی ابتدائی نفرت اور بے رغبتی نے ان کو ہندوؤں کے مقابلہ میں پچاس برس پیچھے کر دیا اور باوجود سخت کوشش کے بھی ابھی تک وہ اس کمی کو پورا نہیں کر سکے ہیں۔ کیا وہ چاہتے ہیں کہ زندگی کے اس دوسرے اہم شعبے میں بھی وہ اسی طرح پیچھے رہیں؟ تجارتی لحاظ سے اب بھی وہ برادران وطن سے بہت پیچھے ہیں۔ اور اگر غفلت اور لاپرواہی کی یہی رفتار رہی تو تھوڑے ہی عرصے میں ان کی پوزیشن صفر کے برابر ہو جائے گی۔

معاشی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تجارت ہمیشہ سے انسان کا ایک اہم وسیلہ معاش رہا ہے اور آبادی کے ایک معتد بہ حصہ نے اسی ذریعہ سے روزی کمائی ہے۔ روزی کے علاوہ جو دوسرے فائد تجارت کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ اسی وجہ سے ترقی یافتہ قوموں نے ہمیشہ تجارت کو دوسرے وسائل معاش پر ترجیح دی ہے اور اس سلسلہ میں حوصلہ مند لوگوں نے دور دراز کے سفر بھی کئے ہیں۔ عرب تجارت ہی کی وجہ سے جزائر شرق الہند اور چین تک پہونچ گئے تھے۔ یورپی اقوام بھی آج اسی سے تمام دنیا پر چھائی ہوئی ہیں۔

مشینوں کی ایجاد اور پیداوار بپیمانہ کبیر نے تجارت اور صنعت و حرفت کی اہمیت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ اب دولت آخری مکمل طور پر تجارتی اور صنعتی آدمیوں کے قبضہ میں چلی گئی ہے۔ ادھر دوسرے لوگ ان کے

دست نگر ہو گئے ہیں۔ صنعت و تجارت کی اہمیت کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوگا کہ اب وہ سیاست پر بھی حاوی ہو چکی ہے۔ حکومت کی تمام مشنری پر صنعتی اور تجارتی آدمیوں کا قبضہ ہے۔ ہر ملک کی سیاست کا محور اب یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تجارتی و صنعتی فوائد حاصل کئے جائیں۔ خود غرض قومیں اس غرض کے لئے کمزور ممالک کو ہضم کرنے سے بھی نہیں چوکتیں۔ وہ کچے مال کے گودام اور تیار شدہ مال کی منڈیاں تلاش کرنے میں ہر جائز اور ناجائز ذریعہ استعمال کرتی ہیں۔ پھر کمزور ممالک کی تقسیم ہی پر آپس میں جھگڑے اور لڑائیاں ہوتی ہیں۔ موجودہ جنگ بھی اسی وجہ سے برپا ہوئی ہے گر لطف تو یہ ہے کہ جنگ بھی آج کل صنعت و تجارت کے زیر اثر ہے۔

موجودہ جنگ میں فوج سے زیادہ کارخانوں کی اور بہادری سے زیادہ صنعتی استعداد اور تنظیم کی ضرورت ہے۔ میدان جنگ میں لڑنے والی فوج کے کام سے زیادہ اہم کام سامان جنگ تیار کرنے والے کارخانوں کا ہے۔ در اصل جنگ کارخانوں میں لڑی جاتی ہے اور جو فریق اپنی صنعتی اور تجارتی استعداد کا زیادہ ثبوت دیگا وہی کامیاب ہوگا۔ غرض سیاست اور ملکی دفاع جیسے اہم قومی شعبوں پر بھی تجارت اور صنعت کا قبضہ ہے۔

تجارت اور صنعت کی اس اہمیت کے جتلانے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان اور خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کو یہ تبلایا جائے کہ اقتصادی، سیاسی اور دفاعی ترقی کے واسطے تجارت اور صنعت کی ترقی کس قدر ضروری ہے۔ یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ انگریز اپنی عظیم الشان تجارت اور صنعت کو برقرار رکھنے کے واسطے ہندوستان کو سیاسی طور پر غلام بنائے ہوئے ہے اس لئے تمام حریت پسند اور آزادی خواہ لوگوں کا فرض ہے کہ وہ استعمار اور شہنشاہیت کی اس جڑ پر ضرب کاری لگائیں۔ شاخیں خود بخود گر پڑیں گی۔ اگر پیداوار دولت کے ان وسائل پر جنہیں برطانیہ ناجائز طور پر اپنے قبضہ میں کئے ہوئے ہے۔ ہندوستان قابض ہو جائے اور اپنی تجارت اور صنعت کے تمام ذریعے اس کے ہاتھ میں آجائیں تو سیاسی غلامی کا بڑی آسانی سے خاتمہ ہو سکتا ہے ہنـ ـدوں نے اس گر کو سمجھ لیا ہے اور پچھلی جنگ عظیم سے وہ برابر استقلال کے ساتھ اپنی تجارتی اور صنعتی تنظیم کر رہے ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم میں سلسلہ آمد و رفت (درآمد و برآمد) ایک حد تک بند ہو گیا تھا۔ اس موقعہ سے انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ نئی نئی صنعتیں قائم کیں کپڑا، فولاد، سیمنٹ اور سن وغیرہ کے کارخانے قائم کئے پھر بعد میں باقاعدہ اور مسلسل ایجیٹیشن کے ذریعے نہ صرف ان صنعتوں کو برقرار رکھا بلکہ اور

ترقی دی۔ حکومت کی مالی پالیسی میں ترمیم کرائی اور اس سے بھی پورا پورا فائدہ حاصل کیا۔ صنعت شکر سازی پر پورا قبضہ کر لیا۔ موجودہ جنگ نے صنعتی ترقی کا ایک اور موقعہ بہم پہونچایا ہے اور برادران وطن اس سے بھی کماحقہٗ فائدہ حاصل کر رہے ہیں اور عجب نہیں کہ جنگ کے خاتمہ تک وہ ہندوستان کی صنعت و تجارت اور وسائل دولت پر مکمل طریقے سے قابض ہو جائیں۔

دل میں خود بخود یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس عظیم الشان صنعتی ترقی میں جو اس وقت ہندوستان میں ہو رہی ہے مسلمانوں کا کتنا حصہ ہے جواب میں یقیناً مایوسی ہوتی ہے۔ سیاسی طور پر بچاس فیصدی حق مانگنے والی قوم صنعتی میدان میں پانچ فیصدی حصے پر بھی قابض نہیں ہے۔ درانحالیکہ صنعت و تجارت کی اہمیت سیاست سے بہت زیادہ ہے۔

اگر ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک آزاد قوم کی حیثیت سے رہنا ہے تو انھیں اس اہم شعبۂ زندگی کی طرف ضرور توجہ دینی ہوگی۔ دولت آفرینی کے ان وسائل میں جو اس وقت انگریز سے ہندو کی طرف منتقل ہو رہے ہیں۔ انھیں بھی اپنے واجبی حصہ پر قابض ہونا چاہئے۔ ورنہ جس طرح آج وہ انگریز کے غلام ہیں کل ہندو کے غلام ہو جائیں گے۔ سیاسی تحفظات کی کوئی اسکیم انھیں اقتصادی غلامی سے نہیں بچاسکے گی۔ اقتصادی غلامی سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وسائل دولت میں برابر کا شریک ہوا جائے۔ جاگیرداری اور تعلقہ داری کا زمانہ اب ختم ہو چکا ہے۔ اب وسائل دولت سمٹ کر تجارت اور صنعت میں آگئے ہیں۔ مسلمانوں کو بھی اس میں پورا پورا حصہ لینا چاہئے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ پیداوار دولت ان کے قبضہ میں آجائے گی اور وہ اقتصادی طور پر کسی کے پابند نہیں ہوں گے بلکہ سیاست اور ملکی دفاع میں بھی ان کی پوزیشن مضبوط ہو جائیگی

ہندوستان میں مسلمانوں کی تمامتر کوشش صرف نشستوں کی تعین اور سرکاری ملازمتوں کے تناسب پر لگی ہوئی ہے۔ اور صنعتی اور تجارتی ترقی کے واسطے کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی جا رہی ہے ضرورت ہے کہ اس طرف بھی کماحقہٗ توجہ صرف کی جائے۔ تاکہ صنعتی ترقی کی اس دوڑ میں مسلمان اپنی ہمسایہ قوم کے ساتھ ساتھ چل سکیں۔ ورنہ بعد میں وہ بہت پیچھے رہ جائیں گے اور پھر کسی طریقے سے بھی برابر نہیں ہو سکینگے ترقی کی کوئی اسکیم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ تنزل کے اسباب دریافت نہ کر لئے

جائیں اور پھر ان کا علاج نہ تشخیص کرلیا جائے۔ صنعتی اور تجارتی ترقی سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ مسلمانوں نے اب تک اس میدان میں کیوں ترقی نہ کی تاکہ ان خرابیوں کو جو اس وقت تک اس ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں دور کیا جاسکے۔

صنعتی اور تجارتی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں کی تجارت سے طبعی بے رغبی اور نفرت ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے اس کا تاریخی پس منظر پیش کرنا از حد ضروری ہے

مسلمان اس ملک میں حکمران کی حیثیت سے آئے۔ حاکمانہ اقتدار کی وجہ سے انھوں نے فوجی اور سرکاری ملازمتوں ہی کو اپنا پیشہ بنایا۔ فوجی خدمت کے صلے میں بڑی بڑی جاگیریں اور زمینداریاں حاصل کیں اور اس طرح معاش کی طرف سے بالکل بے فکر ہوگئے صدیوں تک تجارت سے بے تعلقی نے ان کا مزاج بھی غیر تجارتی بنا دیا اور وہ تجارت سے نفرت تک کرنے لگے۔ حکومت چھن جانے کے باوجود ان کا غیر تجارتی مزاج بدستور قائم ہے اور وہ معمولی سی معمولی سرکاری ملازمت کو تجارت اور صنعت وحرفت پر ترجیح دیتے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جمہوری طرز حکومت میں حاکمانہ اقتدار سرکاری اور فوجی ملازمتوں میں نہیں بلکہ تجارت اور صنعت وحرفت میں ہے۔ خود انگریزوں نے یہ اقتدار تجارت ہی کی بدولت حاصل کیا ہے اس لئے اگر مسلمان بھی اقتدار اور اختیار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ لینی چاہتے ہیں تو انھیں بجائے نوکر بننے کے آقا بننے کی کوشش کرنی چاہئے۔

موجودہ تعلیم نے بھی ان کے اس غلط خیال کی اصلاح نہ کی بلکہ ان کے غیر تجارتی مزاج کو اور بھی مستحکم کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہر پڑھا لکھا مسلمان سرکاری ملازمت کے لئے سرگرداں ہے۔ اور تیس تیس روپے کی نوکری کے واسطے ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے لیکن اس اصلی کیمیا کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ دیگر برادران وطن نے تعلیم کے اس نقص کو بھی بہت جلد محسوس کر لیا اور اپنے نوجوانوں کو تجارتی تعلیم دلانی شروع کی۔ تاکہ وہ تجارت وصنعت کے جدید ترین طریقوں سے واقف ہو جائیں اور پھر اسی طرز پر اپنے کاروبار شروع کریں۔ تجارتی تعلیم ہی نے ان کو تجارتی تنظیم بھی سکھا دی ہے اور انھوں نے بڑے بڑے ایوانہائے تجارت بنا کر اپنے مفید مطلب مراعات حاصل کی ہیں۔ مسلمانوں میں نہ تجارتی تعلیم کا کوئی

خاطرخواہ انتظام ہے اور نہ تجارتی تنظیم ہی ہے۔

تجارتی پسماندگی کی ایک اور وجہ مسلمانوں کا افلاس ہے۔ تجارت روپے سے چلتی ہے اور مسلمانوں کے پاس اسی چیز کی کمی ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں کو تجارتی ترقی کرنی ہے تو اس کمی کو دور کرنے کی بھی کوئی نہ کوئی تدبیر سوچنی پڑے گی۔ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے افلاس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی آمدنی اور خرچ میں صحیح توازن نہیں رکھتے اور ہمیشہ خالی ہاتھ یا قرض دار رہتے ہیں پس اندازی کی عادت ان میں سرے سے نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے وہ کبھی تجارت کو کامیاب طریقے سے نہیں چلا سکتے۔ خرچ کے زیادہ ہونے کی بڑی بڑی وجوہات ان کی لاپرواہی فضول خرچی اور فضول رسم و رواج ہیں ضرورت ہے کہ کسی باقاعدہ کوشش کے ذریعہ مسلمانوں سے اسی بری عادت کو چھڑایا جائے۔ ان کو پس اندازی کی عادت ڈلوائی جائے۔ ان رسم و رواج میں ترمیم کی جائے۔ جن پر ان کا روپیہ بالکل بیکار خرچ ہوتا ہے۔ اس طرح ان کے پاس کچھ نہ کچھ روپیہ بچ سکتا ہے جس سے وہ اپنی تجارت خواہ چھوٹے پیمانہ پر ہی کیوں نہ ہو شروع کر سکتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ تجارتی لحاظ سے مسلمانوں کو اگر اپنا واجبی حصہ لینا ہے تو انھیں مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی۔

۱۔ غیر تجارتی مزاج کو بدل کر تجارتی مزاج پیدا کیا جائے، تجارت کی اہمیت جتلا کر اس سے رغبت دلائی جائے اور ایک اہم شعبہ زندگی کی طرف سے جو نفرت اور بے رخی ہے وہ دور کی جائے۔ اس مقصد کے واسطے پند و نصائح کافی نہ ہوں گے بلکہ عملی مثالیں دینی ہوں گی تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی شوق پیدا ہو۔

۲۔ تجارتی تعلیم کا تسلی بخش انتظام کیا جائے۔ تجارتی کالج کھولے جائیں۔ وظیفوں اور دوسرے ذرائع سے غریب طلبا کی امداد اور ہمت افزائی کی جائے۔ تاکہ مسلمان نوجوان تجارت و صنعت کے جدید ترین طریقوں سے واقف ہو جائیں اور پھر قوم ان کی قابلیت سے فائدہ اٹھا سکے۔

۳۔ اردو میں تجارتی اور صنعتی مضامین کو منتقل کیا جائے تاکہ وہ تجارتی لوگ بھی جو انگریزی نہیں جانتے

ملک کی ضروریات و وسائل اور دوسری تجارتی معلومات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

۴۔ تجارتی تنظیم کی جائے مسلمانوں کے ایوانہائے تجارت قائم کئے جائیں مختلف کمیٹیوں اسمبلیوں اور کونسلوں میں اپنے نمائندے بھیجے جائیں تاکہ وہ مسلمانوں کے حقوق کو فائدہ پہونچا سکیں۔

۵۔ مسلمانوں کے افلاس دور کرنے کی مناسب تدابیر اختیار کی جائیں تاکہ وہ تجارت میں حصہ لے سکیں ان کو پس اندازی کی عادت ڈلوائی جائے۔ فضول رسم و رواج میں ترمیم کی جائے وغیرہ وغیرہ ان تدابیر پر عمل کرنے کے لئے باقاعدہ اور مسلسل کوشش کی ضرورت ہے۔ صرف وقتی اور ہنگامی جوش کافی نہیں۔ کاش جتنی توجہ ملازمتوں کے تناسب پر صرف کی جارہی ہے اگر اتنی توجہ تجارتی ترقی پر بھی صرف کی جائے تو مسلمانوں کا مستقبل شاندار ہو سکتا ہے۔

اس تمام تگ و دو میں ہمیں ایک بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے وہ یہ کہ ہم مسلمان ہیں۔ اور ایک علیحدہ نظام زندگی اور ضابطہ حیات رکھتے ہیں۔ ہمارا ایک نظام معیشت بھی ہے جو ہمارے عقیدے کے مطابق بہترین نظام ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ہماری تمام تجارتی و صنعتی ترقی اس اسلامی نظام معیشت کے ماتحت ہو۔ امیر و غریب اور سرمایہ و محنت کے درمیان جو ناقابل عبور خلیج یورپ کے معاشی نظام نے پیدا کر دی ہے۔ اس سے ہمیں بچنا چاہیئے ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم میں طبقہ وارانہ احساس پیدا نہ ہو۔ ہمارے امیروں میں سرمایہ دارانہ اور غریبوں میں شکست خوردہ ذہنیت پیدا نہ ہو۔ ہماری تمام تجارتی ترقی کا مقصد یہی ہو کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو۔ نہ یہ کہ دولت اور وسائل دولت صرف چند اشخاص کے ہاتھوں میں سمٹ کر آجائے۔ ہمیں اس عمل اور ردعمل سے بچنا چاہیئے۔ جس نے پہلے سرمایہ دارانہ نظام اور پھر اشتراکیت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ہمارا راستہ دونوں کے بین بین ہے۔

محمد منصور صاحب بی کام (فائنل)

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

سُریلے بول :۔ مجموعہ کلام عظمت اللہ خاں صاحب مرحوم ۲۰۸ صفحے قیمت ۲ کتابت و طباعت دیدہ زیب
ملنے کا پتہ :۔ محمد رشید اللہ خاں، برکت بنگلہ ٹھگی جیل قدیم حیدرآباد دکن

شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو بازار میں مانگ دیکھ کر دوکان سجاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو گاہکوں کے بے خبر ہونے کی پرواہ نہیں کرتے، اپنے مال کی نایابی پر نگاہ رکھتے ہیں۔ پہلے قسم کے شاعروں کو زیادہ محنت نہیں اٹھانی پڑتی وہ جانے پہچانے خیالات کو جانے پہچانے انداز میں نظم کر دیتے ہیں۔ ان کے لئے خیالات کے پیکر۔ الفاظ کے سانچے سب ڈھلے ڈھلائے ہوتے ہیں۔ انھیں میں ادل بدل کر کے وہ داد حاصل کر لیتے ہیں۔ دوسرے قسم کے شاعر اس داد سے اکثر محروم رہتے ہیں۔ ان کا ایک قدم اپنے زمانے میں اور ایک آنے والے زمانے میں ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بنے بنائے سانچوں کے بجائے خود بنانا بگاڑنا چاہتے ہیں۔ نئے بت بنانے والے کو پرانے بت توڑنے بھی پڑتے ہیں۔ مگر کتنے ہی لوگ یہ کبھی سمجھ نہیں سکتے کہ پرانے بتوں کو توڑنے کی ضرورت پیش ہی کیوں آتی ہے۔ آخر اپنے پرانے گھسے پسے جانے بوجھے خیالات میں کونسی خرابی ہے کہ نئی چیز کی طرف توجہ کی جائے۔ جب راستہ صاف اور کشادہ معلوم ہوتا ہے تو ادھر اُدھر دیکھنے سے کیا فائدہ۔

گر جب لوگ اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں اور شاہراہ عام سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں تو انھیں اس کی سزا بھی ملتی ہے۔ نظیر نے عجمی خیالات اور عجمی اصناف کو چھوڑ کر مقامی رنگ اور دیسی موضوعات کی طرف توجہ کی۔ غالب نے پرانے خیالات کو نئی بندشوں میں پیش کرنے کے بجائے زبان اور خیال کی نئی دنیا بسائی۔ حالی نے رنگینی بلند آہنگی، آرائش اور صنعت کے بجائے سادگی، سنجیدگی، ملائمیت اور پاکیزگی پر زور دیا۔ عظمت اللہ خاں نے قافیہ، ردیف، غزل اور عربی فارسی عروض کی پابندی سے آزاد ہونا چاہا۔ یہ سب باغی تھے اور اس بغاوت کی انھیں سزا بھی ملی۔ اپنے زمانے میں لوگ جانتے ہوئے بھی ان سے انجان رہے۔ ان کی آواز ہمیشہ سنی ان سنی

کر دی۔ ان کے شاعر ہونے سے انکار کیا، کرونن (A.J.Cronin) کے ہیرو ڈاکٹر کے ساتھ جو سلوک اس کی برادری نے کیا تھا۔ ہمارے ان شاعروں کی برادری اس سے بھی زیادہ سختی سے پیش آتی رہی، جو اپنے وقت سے آگے دیکھتے ہیں ان کا یہی حشر ہوتا ہے۔

عظمت اللہ مرحوم بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ یہ دہلی کے رہنے والے تھے لیکن اپنی بیشتر عمر حیدرآباد میں گذاری۔ اُردو، فارسی، ہندی کے علاوہ انھیں انگریزی سے ذوق تھا۔ انھوں نے صرف انگریزی مصنفین کا مطالعہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ ان کے طرز سے متاثر بھی ہوئے تھے۔ اور ان کے چراغ سے چراغ روشن کرنے کی کوشش بھی کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے نہ تو شاعری بیکاری کے مشغلہ کے طور پر شروع کی، نہ مشاعروں میں داد پانے کے خیال سے۔ وہ ہمارے تمام ادبی سرمایہ کو بہت بے بضاعت سمجھتے تھے۔ ان کی طبیعت میں خود سوچنے کی قوت اور خود محسوس کرنے کی صلاحیت تھی۔ اس لئے وہ تمام طبائع سے علیحدہ نتائج پر پہونچتے تھے۔ "سریلے بول" میں جو مضمون شاعری پر شامل ہے وہ بہت اہم ہے اور اس سے ان کے ادبی نقطۂ نظر کی بہت کامیاب ترجمانی ہوتی ہے۔ عظمت اللہ خاں ان شاعروں میں سے تو تھے نہیں جو یہ نہیں جانتے کہ شعر کیوں کہتے ہیں اور اگر جانتے ہیں تو بتا نہیں سکتے۔ ان کی شاعری محض ایک شیریں دیوانگی نہیں تھی وہ شاعری کا اپنا ایک نصب العین رکھتے تھے۔ انھوں نے شاعری کی جو تعریف کی ہے وہ بہت وسیع ہے اور اس میں اچھی نثر اچھی طنز، اچھا ڈراما سب کچھ آسکتے ہیں۔ مگر ان سب سے زیادہ یہ شاعری پر صادق آتی ہے "شاعری تخیلی پیکروں کے پیدا کرنے کا نام ہے"۔ اور یہ تخیلی پیکر کسی تشبیہ کی مدد سے وجود میں آتے ہیں۔ اپنی اس تعریف کو واضح کرنے کے لئے انھوں نے میرحسن، نظیر، میر اور غالب کے اشعار سے مثالیں دی ہیں اور پھر اس کے ماتحت اردو شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔

انھیں اس سرمایہ میں "انمٹ ادب بہت کم ملتا ہے اور وہ ایک مفکر کی حیثیت سے اس کمی کے اسباب پر بھی غور کرتے ہیں۔ ایک عام نظام تعلیم کے نہ ہونے سے افراد کمزور اور سست ارادے کے ہوتے تھے اور طبیعت کی بے مرکزی انھیں کسی طرف پوری طرح جمنے نہ دیتی تھی عظمت اللہ خاں کا خیال ہے کہ اُردو کی نشوونما کے زمانے میں دماغی، سیاسی اور معاشی پستی کی انتہا ہو چکی تھی۔ اس آب و ہوا اور ایسے

کمزور کیر کٹر کی آغوش میں اردو شاعری پلنے اور تربیت پانے لگی۔ ہر کس و ناکس شاعری پر پل پڑا۔ اس لئے ادبی علوم کی کڑی جھیلنے کی نہ ہمت تھی نہ دماغ؛ درحقیقت یہ رائے ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اردو شاعری جمہور کی شاعری نہ تھی بلکہ صرف ایک ایسے طبقے کی شاعری تھی جو متوسط اور بالائی دنیا کے بین بین تھا۔ اس کا ایک سرا خانقاہ سے اور دوسرا دربار سے ملا ہوا تھا۔ خانقاہ نے اسے اتنا نقصان نہیں پہونچایا جتنا دربار نے۔ دربار کی فضا عیش و عشرت کی تھی یہاں وہی رنگ مقبول تھا۔ جو فارغ البال نہ تھے وہ بھی جھونپڑے میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھتے تھے۔ ان خوابوں میں اپنے آپ کو بھلانے کی خواہش ساری قدیم شاعری میں ملتی ہے۔

غزل کا انتخاب ہی ہمارے قدیم شعرا کی نفسیات پر روشنی ڈالتا ہے۔ عظمت اللہ خاں لکھتے ہیں کہ "غزل ریزۂ خیالی اور پریشان گوئی کا ایک ویسا ہی ڈراؤنا خواب ہے جیسا ہمارے شعرا کے لئے ان کی سماجی زندگی بن گئی تھی"۔ غزل کے خلاف یہ بغاوت نئی نہیں ہے۔ سب سے پہلے حالی نے اسے شروع کیا مگر حالی نفس غزل کے خلاف نہ تھے۔ شاعری کے معنی غزل کے معنی لینے کے خلاف تھے۔ حالی نے غزل کی تعریف بھی کی ہے۔ اس کے انتشار، عدم تسلسل اور بے ربطی کا جواز بھی بتایا ہے۔ عظمت اللہ خاں حالی سے بہت آگے ہیں وہ بے تکلف اور بے تکان غزل کی گردن مار دینا چاہتے ہیں لیکن اصلاح کے جوش میں انھوں نے اس بات کا لحاظ نہیں رکھا کہ غزل بعض صورتوں میں فطری اور حقیقی بھی ہو سکتی ہے اور ہوئی ہے اور کبھی کبھی جذبات کے سیلاب میں غزل کی آسان، ہلکی پھلکی اور لطیف صنف بھی کام دے سکتی ہے۔ نیز جب قافیے اور ردیف کی پابندی اس قدر سخت نہ ہو تو اس کے فارم میں اتنا لوچ اور لچک موجود ہے کہ جذبات محبت کی حقیقی حسن کارانہ مصوری ہو سکے۔ بات یہ ہے کہ غزل میں بے ربطی اور انتشار اس قدر عام رہے ہیں کہ اب غزل کے معنی ہی بے ربطی کے سمجھے لئے گئے ہیں۔ حالانکہ غزل سے بہت سے بلند پایہ شعرا نے مسلسل خیال کے مختلف پہلوؤں کے ادا کرنے کا کام لیا ہے۔ میر، غالب اور دوسرے شعرا کے یہاں علاوہ قطعات کے بہت سی غزلوں میں ایک خیال کے مختلف پہلو ملتے ہیں۔ پھر اس میں صرف محبت (اور وہ بھی فرضی) نہیں۔ ہر قسم کے مطالب کے اظہار کی صلاحیت موجود ہے۔

عظمت اللہ خاں کا سب سے بڑا اعتراض اردو کے شعرا پر یہ ہے کہ وہ "کائناتی مطالعہ سے کورے

ہیں اور دراصل یہی ہماری شاعری کے تقلیدی اور مصنوعی ہونے کی وجہ ہے تخیل کے زندہ اور نئے پیکر دیکھے جانے اور برتنے سے ہاتھ آتے ہیں لیکن چونکہ ہمارے یہاں ذاتی تجربے ضروری نہیں بلکہ ہر تجربے کا عنوان مقرر ہے اس لئے اس میں تقلیدی رنگ کو اور ترقی ہوتی ہے عظمت اللہ خاں اس سلسلے میں انگریزی شاعری کی مثالوں کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ شاعری اس طرز پر کی جائے اور اس کے لئے عروض بھی نئی بنائی جائے۔

ان کے مضمون کا تیسرا حصہ ایک نئے عروض کی طرف توجہ دلاتا ہے وہ اردو کو عربی اور فارسی عروض کے پنجے سے رہائی دلانا چاہتے ہیں کیونکہ ان میں موسیقی اور ترنم کے نت نئے امکانات کا بالکل لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ وہ اردو عروض کی بنیاد ہندی پنگل پر رکھنا چاہتے ہیں مگر ہندی عروض کو بجنسہ لینا انھیں پسند نہیں وہ اسے سائنٹیفک بنانا چاہتے ہیں۔ وہ عربی بحروں کو سرے سے ترک کرنے کی تلقین نہیں کرتے بلکہ ان میں سے مناسب اور موزوں بحروں کو اردو میں رہنے دینا چاہتے ہیں۔ تیسرے وہ چاہتے ہیں کہ انگریزی عروض کے ایسے اصول جو آزادی کی جان ہیں اور اتنی وسعت رکھتے ہیں کہ ہر زبان کے لئے کام دے سکیں ان پر اس نئی عروض کی آزادی کا سنگ بنیاد رکھا جائے۔

عظمت اللہ خاں اس رمز سے واقف ہیں کہ نثر اور نظم میں فرق جنس کا نہیں، آہنگ یا انگریزی کے مشہور نقاد مڈلٹن مرے کے الفاظ میں (TEMPO) کا ہے۔ وہ عروض کا ماترک طریقہ رائج کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اس کے ذریعہ ترنم کی تمام وسعتیں شاعر کے احاطہ میں آسکتی ہیں۔ وہ قافیہ کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر مصرعے یا شعر کے ساتھ اس کا نباہنا ضروری نہیں سمجھتے۔ وہ بے قافیہ نظم کے بھی مؤید ہیں۔ مگر ان پر اعتراض کرنے والے شاید ان کے اس قول کو بھول جاتے ہیں کہ "سوائے ڈرامے کے اور صورتوں میں بے قافیہ نظم مستحسن نہیں"۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اردو میں غنائی (Lyric) شاعری کی کمی ہے۔ یوں تو غزل خود اس قبیل کی چیز ہے مگر روایات نے اس سے ذاتی جذبہ چھین کر اسے وہ رسوائے عالم کر دیا۔ ان کی ساری شاعری اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش ہے۔

عظمت اللہ خاں کی نثر میں بھی ان کی نظم کی طرح انگریزی کا اثر بہت نمایاں ہے ان کے الفاظ

ان کے اپنے ہیں۔ یہ ان کے خیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں ایک نئی تازگی اور گرمی ہے مگر یہ تازگی اور گرمی ابھی مصنف کا مزاج نہیں بن پائی۔ اگر مرحوم کو زیادہ عمر مل جاتی تو ان کے طرز میں جو اکھڑی اکھڑی کیفیت ہے۔ جو بھونڈا پن ہے جو اسلوب کی ناہمواری ہے وہ دور ہو جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی میں سوچنے لگتے ہیں اور پھر ان کی اردو ترکیبیں انگریزی الفاظ کا ترجمہ یا انگریزی ترکیبوں کا چربہ معلوم ہوتی ہیں یہ چیز ان کی نظموں میں بھی ہے مگر وہاں بدنما حد تک نہیں۔ نثر میں بدنما ہو جاتی ہے اس مضمون میں اس قسم کے الفاظ اور فقرے کثرت سے ملتے ہیں۔ یہ غلط نہیں بھونڈے ہیں۔ ان کی ساخت ان کی اصل کا پردہ فاش کئے دیتی ہے۔:

جہاں گیر لافنا خیالات، آب حیات پئے پلائے خیالات، شکر لپٹے اور تخیل کو بھڑکاتے اسلوب، حکمت بسے، اصلیت لپٹے، کم منظم اور بن منجھی ترکیبیں، گاڑنے کے لئے بیتاب ابھی مستقبل کے پردے میں ہے شاعر چن چن اور تول تول کر گاتا ہے، گردوپیش پر سوار ہو جانے کی بلند حوصلگی۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان کی نظمیں بہت آسانی سے دو قسموں میں رکھی جا سکتی ہیں۔ کچھ ترجمے ہیں اور کچھ طبع زاد۔ یہ ترجمے انگریزی کے مشہور شعرا ورڈس ورتھ بائرن، براؤننگ شیکسپیر اور ہارڈی کے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیثیت ایک قسم کی ذہنی مشق کی ہے اگرچہ شاعر ان نظموں کی لطافت خیال کو اردو میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ ورڈس ورتھ کی مشہور نظم "کوئل" کو لیجئے جس میں بقول مولوی عبدالحق صاحب "جملہ خیال کے ساتھ ساتھ ہے اور قافیہ پر آب رواں کی طرح بہکر دوسرے مصرعہ اور پھر بعد کے شعروں میں گھل مل گیا ہے۔ یہاں عظمت اللہ خاں نے لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ اصل سے جو خیالی تصویر ذہن میں آتی ہے انھیں اپنے الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے "ہم سات ہیں" یہ بھی اسی شاعر کا کامیاب ترجمہ ہے اور اصل نظم کی سادگی و پرکاری اور اس کے الفاظ کی رہ رہکر دل میں کھب جانے والی خصوصیت یہاں بھی موجود ہے۔ ایک بند دیکھئے ؎

نہیں ہوتی مردوں کی زندوں میں گنتی   یہ سب بھولے پن کے خیالات ہیں

عقیدے کی اپنے وہ تھی ایک پکی　　　کہا پھر نہیں وہ اہم سات ہیں

مگر ان کے بعض ترجموں میں اصل کی روح تو ہے مگر اصل کی پختگی نہیں ہے۔ جو چیز انگریزی میں بھلی معلوم ہوتی ہے اسے اردو میں ادا کرتے وقت وہ موزونیت پیدا نہیں ہوتی۔ میرڈتھ کی ایک نظم کے پہلے دو مصرعے یہ ہیں:

On my darling's bosom
Has dropped a living rose bud

اس کا ترجمہ عظمت اللہ خاں یوں کرتے ہیں؎

میرے گھر کی دیوی کے بالائے سینہ　　　کھِلا ہے محبت کا تازہ کنول

یہاں بالائے سینہ کی ترکیب بالکل بالائے قلعہ معلوم ہوتی ہے اور اس سے مصرعے کی لطافت زائل ہو جاتی ہے۔

براؤننگ کی مشہور نظم (Pippa Passes) کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ بالکل بے جان ہے

اٹھانا پڑا دکھ کسی کو زیادہ؛　　　بڑی یا چھوٹی نظر میں خدا کی
سب یکساں ہے خدمت اگر حسبِ طاقت　　　ہے عرشِ معلیٰ پہ حق جلوہ فرما

مگر اسی کی دوسری نظم زیادہ کامیاب ہے (A pretty Woman) کا ایک بند اس طرح پیش کیا گیا ہے؎

کہیں اک اشارے پہ تم مہرباں ہو
مزیدار تقریر بھائی کہیں　　　چمکدار شمشیر بھائی کہیں
غرض ڈھل گئیں جیسا موقع جہاں ہو

بحیثیت مجموعی عظمت اللہ خاں مرحوم نے نظموں کا جو ترجمہ کیا ہے وہ باوجود کہیں کہیں دلکش ہونے کے بہت کامیاب نہیں۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ خصوصاً گیتوں کا ترجمہ جس میں صرف لفظوں کو بدلنا یا انگریزی لفظ کی بجائے اردو لفظ رکھنا ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک لطافت کو دوسری لطافت کا قالب دینا ہوتا ہے۔ مگر طبعزاد نظموں کا معیار بہت زیادہ بلند ہے۔

ان نظموں کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر اپنے گرد و پیش کے مناظر پیش کرتا ہے۔ جو چیزیں اسے

متاثر کرتی ہیں وہ اس کی دیکھی اور جانی پہچانی ہیں اور انھیں وہ اس طرح پیش کرتا ہے کہ ان میں ایک خاص بات پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر شاعر کسی منظر کی تعریف میں بڑے خوبصورت الفاظ جمع کرے، مگر اس کی تصویر سے کہیں حسن نہ ٹپکتا ہو تو یہ عجزِ فن کی دلیل ہوئی لیکن کم سے کم الفاظ میں اگر اثر پذیری کا دریا بند کر دیا جائے تو دل میں رہ رہ کر لہریں سی پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ دوسرے وہ جن مناظر کو لیتا ہے ان میں سے بعض اچھوتے ہیں انھیں ان سے پہلے کسی اردو شاعر نے منہ نہیں لگایا۔ حقہ، پیپل کا درخت، تتری کیڑا، جغرافیہ۔ ان بے رنگ اور سپاٹ عنوانوں میں شاعر نے اپنی رنگین شخصیت سے توس قزح کی سی دھاریاں پیدا کر دی ہیں پیپل کا ایک رنگ یہ ہے۔

کونپلیں تازی سویوں جیسی رنگ وہ دھانی ہلکا سا ۔۔۔ اس میں جھلک وہ پیازی پیازی

ٹہنی ٹہنی پیپلیاں ہیں جڑے ہوئے نگ ہیں گویا ۔۔۔ جان کی ہے اک شعبدہ بازی

حقہ کی کیفیت یہ ہے ؎

نیلا ابر بکھرے تارے حسنِ فطرت موجیں مارے ۔۔۔ اک دیدۂ حیران ہے حقہ

سنسان سماں بھید کے سارے جھلمل جھلمل کرتے اشارے ۔۔۔ گویا صاحبِ عرفان ہے حقہ

اچھوتے مضامین میں سے ایک "بالی بیوی" ہے۔ ہندوستان میں یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ مگر تعجب ہے کہ اس کے متعلق ہمیں شاعری میں کوئی بھی اشارہ نہیں ملتا۔ عظمت اللہ خاں کی یہ نظم ہندوستانی جذبات کا بڑا دلکش مرقع ہے بالی بیوی کے خدوخال کے متعلق جو اشارے ہیں بڑے بلیغ ہیں۔ ہندی بحر اور ہندی کے الفاظ نے ایک رسیلی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ دو اشارے ملاحظہ ہوں ؎

ترے ہونٹ یہ لال ہیں ۔۔۔ نہیں سانس میں گرمیاں

ترے پھول سے گال ہیں ۔۔۔ نہیں باس میں مستیاں

ابھی آنکھ ڈری سی ہے ابھی آگ دبی سی ہے

ترے مکھ نے پتا دیا ۔۔۔ ترے اٹھتے سبھاؤ کا

ابھی کچھ نہ پتا ملا ۔۔۔ ترے من کے لگاؤ کا

ابھی آنکھ ڈری سی ہے ابھی آگ دبی سی ہے

عورت کی مظلومیت کا بھی عظمت اللہ خاں کو بڑا احساس تھا۔ ان کی نظموں میں سے کئی اس موضوع سے متعلق ہیں۔ "مرے حسن کے لئے کیوں مرے"، "وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے"۔ "مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا"۔ "تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" یہ سب ان کی بہترین نظموں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ ان سب میں عورت کی زبان سے مرد کی غفلت شعاری اس کی بے وفائی، عورت کی آرزوں کو بھڑکا کر انھیں پامال کرنے کا رونا رویا گیا ہے۔ ان کا لہجہ نرم اور شیریں ہے شکایت کہیں نالہ و شیون کی حد تک نہیں پہونچی، ان کی بحریں روان اور مترنم ہیں اور ہندی الفاظ کے مناسب اور موزوں استعمال نے انھیں مہدی افادی کے الفاظ میں "نغمہ کی چیز" بنا دیا ہے۔ "مرے حسن کے لئے کیوں مرے" اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت تلخ لہجہ اختیار کر سکتی تھی مگر اس کے آخری بند میں ہندوستانی عورت کی فطرت کا کتنا صحیح نقشہ پیش کیا ہے ؎

وہ ہوا جو بات تھے یہ تھا لکھا مرے دل سے آ گئی یہ صدا
مرے دل سے ہو گا یہ کب بھلا تمھیں دے سکوں کوئی بددعا

مرے حُسن کے لئے کیوں مرے، نہیں لینے تھے تمھیں یوں مرے

"مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا" مرحوم شاعر کی بہترین نظم قرار دی جا سکتی ہے اس میں نظم کے قافیے انگریزی طرز کے ہیں، بحر ہندی ہے مگر اس کے پڑھنے میں ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ خود شاعر نے شعر کی جو تعریف کی ہے اس کے مطابق ایک مکمل تصویر خیال کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ موضوع نیا نہیں ہے۔ مگر ایک عورت کی زبان سے بیان کر کے عظمت اللہ خاں نے اس میں درد و اثر کوٹ کوٹ بھر دیا ہے۔ ہر بند دوسرے بند سے وصل ہوتا جاتا ہے اور خیال ٹھوکریں کھانے کے بجائے خوش اسلوبی سے بڑھتا اور پھیلتا ہے۔ عورت کا تعارف ایک بند میں ہو جاتا ہے ؎

میں تھی ننھی سی جان غریب بڑی کبھی بھول کے دکھ نہ کسی کو دیا
نہ تو روٹھی کبھی نہ کسی سے لڑی مری باتوں نے گھر کو ہی موہ لیا

اس کی محبت اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

مرے سر میں تمہارا ہی دھیان بسا میری چاہ کے راج دلارے بنے
تمھیں دیوتا مان کے من میں رکھا میری بھولی سی آنکھ کے تارے بنے

مگر جب پڑھے لکھے مرد نے دوسری جگہ شادی کی ٹھیرائی تو عورت کا دل ٹوٹ گیا اور وہ بستر مرگ پر پڑ گئی۔ اس وقت بھی لہجہ کتنا نرم ہے ؎

مرا آخری وقت ہے آن لگا — کوئی اور تمہاری ہے پیاری دلہن
مجھے اب بھی تمہارا ہی دھیان لگا — نہ بنی پہ رہی ہوں تمہاری دلہن

ایک دوسری نظم "وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے" دراصل ایک طوائف کی داستان ہے۔ اس نظم کو محض جذباتیت غارت کر سکتی تھی مگر شاعر نے توازن قائم رکھا ہے ؎

مری زندگی بڑا سبق ہے کہ یہاں کی خوب سیر کی ہے — ہے مزے کی چیز پر یہ دنیا نہ تو شر کی ہے نہ خیر کی ہے
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے، وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

عظمت اللہ خاں کے گیتوں میں ترنم بھی ہے اور تصویریں بھی۔ انھوں نے شباب کے مختلف مناظر بڑی خوبی سے پیش کئے ہیں۔ ان میں ممکن ہے بعض لوگوں کو عریانی نظر آئے۔ ہماری غزلوں میں خیال اس سے زیادہ عریاں ہے۔ اسے خوشنما الفاظ کا لباس پہنا دیا گیا ہے۔ عظمت اللہ خاں بھی مہدی کی طرح حسن کے پجاری ہیں اور جہاں کہیں حسن ہے انھیں عزیز ہے۔ چند نقوش ملاحظہ ہوں ؎

چال نشیلی جھومتا بادل — یا کوئی ندی لہراتی
پور جوانی میں اٹھلاتی
ڈرتی ڈرتی بچتی بچاتی — رکتی رکاتی شرماتی
دل کو مسلتی دل تڑپاتی
سینہ مستی کا جوالا مکھ — کمر لچکتی بل کھاتی
ہوش ربا اُتار چڑھاؤ

حسن نسوانی ہی نہیں فطرت کا ہر حسن ان کے پیش نظر ہے۔ برکھا رت کے پہلے مینہ میں بجلی کی تصویر کیسی سچی ہے

بجلی چمکی انگارہ سی آگ کی ناگن لہرائی — لہریا کاڑھا بیل بنائی
بھاکے دریا میں قدرت نے نور کی مچھلی تیرائی — اِدھر اُدھر تڑپی تڑپائی

مرے بال کالے لانبے لانبے کہ اٹھا ہو جیسے ابر کالا   مرا سینہ بھی اُمڈتا بادل بھری بجلیوں سے تھرتھراتا

الفاظ کی آواز سے مفہوم ادا کرنے کی کوشش دیکھئے۔

بادل گرجے وہ گھڑگھڑاہٹ آئی لڑھکتی لڑھکاتی   کڑوڑہا گھوڑے دوڑاتی
باڑھوں پہ باڑھیں داغتی آئی اور کڑکتی کڑکاتی   پہاڑ لڑھکاتی ٹکراتی

صبح کے سماں کی کیسی پیاری تصویر ہے ؎

بھور بھئی ہے صبح کی دلہن   نے سیج پہ لی انگڑائی
بگڑی بکھری رات کی بن ٹھن   وہ سرکی تاروں کی دلائی
رات کے کالے بالوں میں سے   چاند کی صورت وہ مسکرائی

اس قسم کی بہت سی مثالیں اس مجموعے سے دی جا سکتی ہیں۔ عظمت اللہ خاں کے خاص خاص موضوع فطرت کے مناظر، معاشرت کے مختلف پہلو، عورت کی مظلومیت، گھریلو زندگی کی دلچسپیاں، وطن کی محبت ہیں۔ ان میں زبان موضوع کے مطابق ہے۔ تصویریں سیدھی سادی اور واقعیت لئے ہوئے ہیں۔ بحریں نئی ہیں اور مترنم۔ شاعر نے اپنے مضمون میں جو دعویٰ کیا ہے اس کا کافی ثبوت ان نظموں سے مل جاتا ہے۔ شاعری میں سیدھی سادی بات بشرطیکہ وہ ذاتی طور پر محسوس کی گئی ہو اور احساس کی انفرادیت ظاہر ہو جائے۔ بڑی چیز ہے عظمت اللہ خاں اس راز سے آگاہ تھے۔ انھوں نے کئی تجربے کئے بعض میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ مونچھ اور چوٹی میں شعریت پیدا ہونے نہیں پائی۔ "ستری کپڑے" میں اچھی تشبیہوں کے باوجود شاعری کی دیوی کا نزول نہیں ہونے پایا۔ مگر وہ اردو شاعری کو عجمی نقطۂ نظر سے آزاد کرانے میں ضرور کامیاب ہوئے۔ اگر ان کی نظمیں اس پایہ کی نہ ہوتیں تو بھی ایک نئے دور کے علمبرداروں میں ان کا نام ضرور ادب سے لیا جاتا۔ مگر انھوں نے اس سے زیادہ بھی کچھ کیا۔ وہ ہمارے لئے کئی اچھی، قابل قدر اور بلند پایہ نظمیں چھوڑ گئے ہیں۔ زمانے نے انھیں زیادہ کام کرنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ چالیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اس لئے ان کے انداز میں ابھی پختگی نہیں آنے پائی تھی۔ شاعر ابھی تجربے ہی کر رہا تھا۔ مگر یہ تجربے اس قدر وقیع تھے کہ آج ان کا نقطۂ نظر صوری معیار سے اس دور کی شاعری پر کار فرما ہے۔"

(آل احمد صاحب سرور ایم۔ اے)

افتتاح الاندلس:۔ مترجمہ محمد جمیل الرحمٰن صاحب ایم۔اے پروفیسر تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن مقدمہ اور حواشی ۱۶×۲۰ م ۱۶۱ صفحے، کتاب ٹائپ میں چھپی ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ اور کتابستان الٰہ آباد سے مل سکتی ہے۔

یوں تو اردو زبان میں اندلس کی تاریخ پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں مگر بیشتر یورپی زبانوں سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ پیش نظر کتاب اندلس کے ایک مشہور مسلمان عالم اور ثقہ مورخ ابن القوطیہ کے ایک رسالہ "تاریخ افتتاح الاندلس" کا ترجمہ ہے اور مترجم نے شروع میں نہایت تحقیق سے مقدمہ لکھا ہے اور کتاب کے آخر میں مفید حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ ابن القوطیہ کا زمانہ ۳۶۷ھ ہے۔ ماں کی طرف سے آپ کا شجرہ اندلس کے عیسائی بادشاہوں سے ملتا ہے اور آپ کے دادا حضرت عمر بن عبدالعزیز کے مرید تھے۔ موصوف بڑے پایے کے بزرگ تھے اور عربی زبان اور لغت کے علاوہ حدیث و فقہ میں اپنے زمانے میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔

تاریخ افتتاح الاندلس کے ترجمے یورپ کی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ یہ تاریخ اندلس کی ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ موجودہ زمانے کا کوئی مورخ بھی جس نے اندلس پر کچھ لکھا ہے اس کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ پروفیسر جمیل الرحمٰن صاحب نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کر کے بہت بڑا کام کیا ہے اور خاص طور پر مقدمہ اور حواشی کی ترتیب میں انہوں نے بڑی محنت کی ہے۔ جس کے لئے اسلامی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اُن کے بے حد شکر گزار ہونگے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلامی تاریخ کا بہت چرچا ہے اور اس موضوع پر نہایت کثرت سے کتابیں بھی نکلتی ہیں لیکن ان کتابوں کی حیثیت بیشتر یا تو یہ ہوتی ہے کہ انگریزی کتابوں کا ترجمہ ہوتا ہے یا محض روایتی قصیدہ خوانی۔ ضرورت ہے کہ تاریخ اسلام کے اصل مصادر تک ہماری رسائی ہو۔ چنانچہ اس سلسلہ میں فتح اندلس پر اس کتاب کا شائع ہونا بہت مفید ثابت ہوگا۔ ترجمہ کی زبان بہت صاف ہے۔ مقدمہ میں مترجم نے نہایت سلجھے ہوئے انداز میں فتح اندلس کے متعلق اپنی تحقیقات کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ امید ہے کہ مترجم کی یہ کوشش علمی حلقوں میں ضرور سراہی جائے گی۔

(م۔ س)

طلسم عمل :- مترجمہ سید مجتبےٰ احسن صاحب، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ، ملنے کا پتہ درج نہیں، تقطیع ۲۶×۲۰، حجم ۲۵۸ صفحے، قیمت ۱۲؍، لکھائی چھپائی، کاغذ اوسط درجہ۔

شیخ سعدی کی گلستاں کو اتنی مقبولیت اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ انھوں نے اخلاق کے مجرد اصول کو عمل صالح کے ساتھ سمو کر اپنے ہمعصروں کے لئے کامیاب زندگی کا ایک چلتا ہوا نسخہ تیار کر دیا۔ ڈیل کارنگی کی کتاب جس کا ترجمہ جناب سید مجتبےٰ احسن صاحب نے اردو میں "طلسم عمل" کے نام سے کیا ہے اسی قسم کا نسخہ ہے موجودہ زمانے کے لئے۔ ترجمہ ایسا بے تکلف اور رواں ہے کہ اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب اس کساد بازاری کے زمانہ میں بھی بہت مقبول ہوگی۔ اور سید مجتبےٰ احسن صاحب اور بہت سی مفید اور دلچسپ کتابوں کا ترجمہ کر کے اردو کو مالامال کر دیں گے۔ (ع۔ح)

سیرت شہید کربلا :- جلد دوم، مترجمہ محمد ایوب عثمانی، صفحات ۳۲۲، سائز ۲۰×۲۶، مکتبہ معارف القرآن اورنگ آباد ضلع گیا، قیمت عہ، کتابت وطباعت اور کاغذ بہت عمدہ۔

یہ علی جلال حسینی مصری کی تالیف الحسین جلد دوم کا ترجمہ ہے۔ پہلی جلد کا ترجمہ اس سے بیشتر عثمانی صاحب کر چکے ہیں۔ یہ ترجمہ بھی پہلی جلد کی طرح آسان رواں اور بے تکلف ہے۔ اردو میں واقعی ایسی مبسوط اور مفصل کتاب حضرت امام حسینؑ کی سیرت پر اب تک شائع نہیں ہوئی۔ معرکۂ کربلا کے بعد کے تمام واقعات تفصیل سے اس جلد میں دئے گئے ہیں نیز ان تمام ضعیف روایتوں اور من گھڑت قصوں کو بھی تنقید کی کسوٹی پر جانچا گیا ہے جو امام حسین کی شہادت کے بعد پیدا ہو گئے تھے آخر میں مختلف فرقوں اور اس زمانہ کے معروف عقائد نیز علمائے کبار اور دیگر بزرگوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ حتی الامکان کوئی بات چھوڑی نہیں گئی ہے۔ امید ہے کہ لوگ اس سے ضرور مستفید ہوں گے۔

کتب موصولہ جن پر آئندہ مہینہ تبصرہ ہوگا

۱۔ اقبال اور قرآن ۔ ۲۔ رحمت عالم ۳۔ حیات محمد عبدہٗ

رفتار عالم

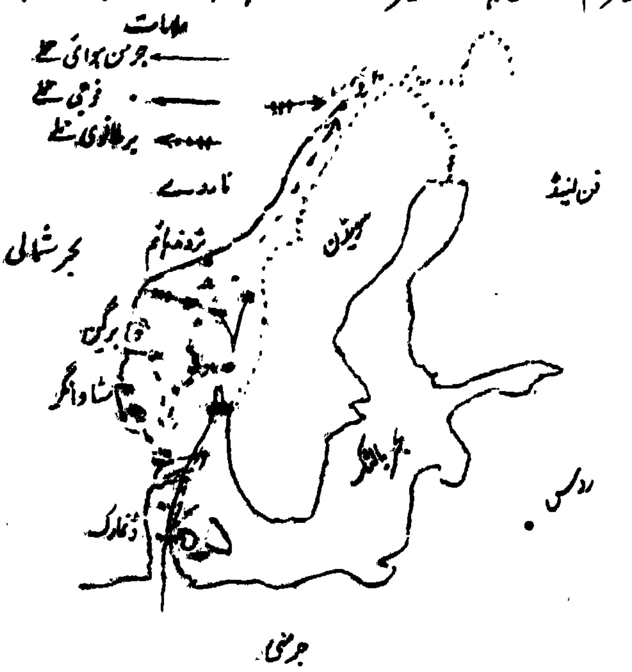
۱۹۴۰ء

نیا سال شروع ہوا تو یورپ کی جنگ عظیم کو جاری ہوئے چار مہینے ہو چکے تھے، جرمنی اور روس نے پولینڈ کو آپس میں بانٹ لیا تھا، لتھوئینیا، استھونیا اور لیتویہ نے روس کی سرپرستی منظور کرلی تھی، فن لینڈ اسی سے بچنے کے لئے لڑ رہا تھا۔ مگر فن لینڈ کا مسئلہ ایسا نہ تھا جس کے طے ہو جانے سے یورپی سیاست کے معمے حل ہوتے، اور جنوری ۱۹۴۰ء میں اناڑیوں اور شاید اکثر ماہروں کو پتہ نہ تھا کہ جنگ آگے کہاں ہوگی، کیسے ہوگی اور کس خاص مقصد کے لئے ہوگی۔ برطانیہ نے جرمنی کی بحری تجارت بند کردی تھی اور یہ معلوم تھا کہ جرمن بیڑا انگریزی بیڑے کا مقابلہ نہ کرسکے گا، فرانسیسی فوج ماژی نو لائن مورچوں میں محفوظ بیٹھی تھی اور یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جرمن فوجیں ان مورچوں سے ٹکرا کر اپنے سر کیوں پھوڑیں گی۔ ہالینڈ کی سرحد پر ارنومبر ۱۹۳۹ء کو جرمن فوجیں جمع ہوئی تھیں مگر پھر وہ ہٹالی گئیں اور خیال یہ ہوا کہ جنگ کے فریقین غیر جانب داروں کو نہ چھیڑیں گے اخباروں میں غیر جانب داروں کی حیثیت، ان کے جہازوں کی تلاشی لینے یا ان کے تاجروں کے ذریعے مال منگانے کے مسائل پر جو بحثیں ہو رہی تھیں ان کا ایسی وسیع پیمانے کی لڑائی کے وقت چھڑ جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ لیکن جنگ کا دوسرا دور اسی غیر جانب داری کے معاملے میں شروع ہوا۔

غیر جانب دار

ناروے، ہالینڈ اور بلجیم ایسے ملک ہیں جن کا گزر خارجی تجارت پر ہوتا ہے

وہ لڑائی کی وجہ سے اس تجارت کو بند نہیں کر سکتے تھے مگر اس کو جاری رکھنے کے معنی یہ تھے کہ وہ جنگ کے دونوں فریقوں سے اُلجھ جائیں - جرمنی کا اصرار تھا کہ وہ اس سے لین دین کرتے رہیں اور جہاں تک ہو سکے امریکہ سے بھی اسے مال منگوا کر دیتے رہیں - اسی کے ساتھ جرمن آبدوز ان کے جہازوں کو برطانیہ کے آس پاس پائے تو ڈبو دیتے - برطانیہ کا اصرار تھا کہ غیر جانب دار اپنے تمام جہازوں کی تلاشی لینے دیں اور اگر اس کا ذرا بھی شبہ ہوتا کہ جہازوں پر جو مال ہے وہ جرمنی کے کام آ سکتا ہے تو وہ اسے روک لیتے - یہ کشمکش اس قدر بڑھی کہ جرمنی نے اپنی طرف سے طے کر لیا کہ غیر جانب داری کی بحث کو ختم کر دینا چاہیے اور برطانیہ نے اپنی طرف اس کا ارادہ کر لیا کہ جرمنی کو غیر جانب دار ملکوں پر قبضہ نہ کرنے دیگا۔ ۸ اپریل کو برطانیہ کے جنگی جہازوں نے ناروے کے ساحل سے لگا کر بحری بم بچھا دیئے اور ایسی ناکہ بندی کر لی کہ اس تین میل کی حد کے اندر بھی جو ملک میں شامل سمجھی جاتی ہے اور جہاں امن کے زمانے میں بھی کسی غیر قوم کے جنگی جہاز کو بغیر اجازت نہ آنا چاہیے، کوئی تجارتی جہاز بغیر تلاشی دیے



نہیں گزر سکتا تھا۔ اسی کے ایک دو دن کے اندر جرمنی نے ناروے کی غیر جانب داری کو محفوظ رکھنے کا دوسرا انتظام کیا۔ ۱۰؍اپریل کو خبر آئی کہ ناروک سے لے کر ناروے کے جنوبی سرے تک جرمنی نے ہوائی جہازوں کے ذریعے فوج اتار کر تمام بندرگاہوں اور ہوائی اور فوجی مرکزوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس کی ایک اور فوج ڈنمارک فتح کرتی ہوئی ناروے کے دار السلطنت اوسلو کے قریب پہنچ گئی ہے اور ناروے کی حکومت نے دار السلطنت کو چھوڑ دیا ہے۔

کمزور کو زبردست سے بچانا ایک اخلاقی فرض ہے اور برطانیہ نے ناروے کو جرمنی کے پنجے سے چھڑانے کا ارادہ کیا۔ اصل میں مسٹر چیمبرلین کو پہلے ہی خیال ہوا تھا کہ ناروے کو مدد پہنچانے کی ضرورت ہوگی اور انھوں نے آخر مارچ میں ایک چھوٹی مگر بہت ہی آزمودہ کار فوج ناروے بھیجنے کے لئے تیار کی تھی لیکن اس وقت وہ بھیجی نہ جا سکی اور ۱۵؍اپریل کو جب وہ ناروک اور ٹرونڈ ہائم کے شمال اور جنوب میں اتاری گئی تو جرمن ناروے میں اپنے قدم بہت مضبوط جما چکے تھے۔ برطانوی فوج کے پاس مقابلے کے لئے ہوائی جہاز اور ٹینک بھی کافی نہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر اپریل میں اس فوج کو واپس بلانا پڑا۔ ناروک کا محاصرہ البتہ جاری رکھا گیا اور یہ شہر فتح بھی ہو گیا۔ مگر اس وقت تک ناروے کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا، ناروے میں نہیں بلکہ فرانس میں

ڈنمارک اور ناروے کی مہم سے فارغ ہو کر جرمن فوجیں ہالینڈ اور بلجیم پر ٹوٹ پڑیں۔ فن جنگ کے نئے اصولوں کا مظاہرہ جرمنی نے پولینڈ اور ناروے میں بھی کیا تھا لیکن پولینڈ بہت دور تھا اور ناروے میں جو مقابلہ ہوا اس کی حیثیت مقامی سی رہی لیکن اگر اتحادی یہ بھانپ بھی لیتے کہ جرمنی کس ڈھنگ سے لڑے گا تب بھی اس کی چالوں کا مناسب جواب دینا ممکن نہ تھا، اس لئے کہ انھیں مہلت بہت کم ملی۔ ۱۰؍مئی کو جرمنی نے ہالینڈ پر حملہ کیا، کسی ایک جگہ پر نہیں بلکہ سارے ملک پر، جہاں جہاں ہالینڈ کے ہوائی

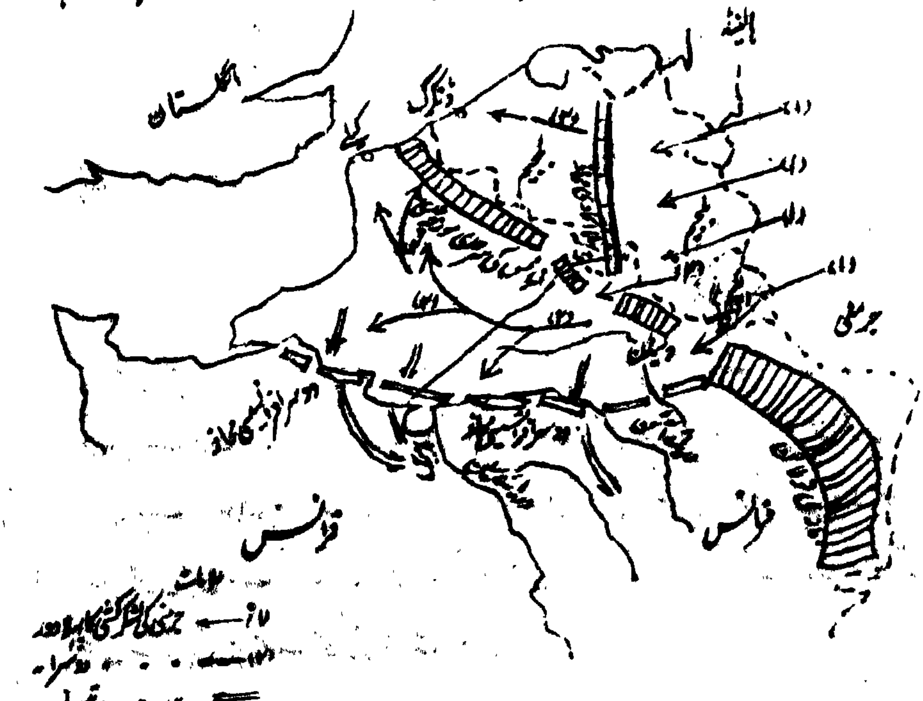
مرکز تھے، جرمن ہوائی جہازوں نے آکر پہلے بمباری کی اور پھر مسلح سپاہی اتار دئے جنھوں نے مرکز پر قبضہ کرلیا۔ ہالینڈ کی فوج نے اکثر مرکزوں پران مسلح سپاہیوں کا صفایا کردیا، مگر دشمنوں کے ہر جگہ اچانک نمودار ہونے سے ایسی کھلبلی مچ گئی اور انتظام میں ایسی گڑبڑ ہوگئی کہ ملک کو دشمن سے بچانا ناممکن ہوگیا۔ تین دن میں جزیرۂ زے لانڈ کے سوا باقی ملک پر جرمنی کا قبضہ ہوگیا اور ۱۴ رمئی کو ہالینڈ کے سپہ سالار نے صلح کی درخواست کردی۔ اس کے بعد بلجیم کی باری آئی۔ یہاں جرمنی کا کام اتنا آسان نہ تھا، اس لئے کہ برطانیہ اور فرانس کی بڑی بڑی فوجیں بلجیم میں مغرب کی طرف سے داخل ہوکر تیزی کے ساتھ مقابلے کے لئے آرہی تھیں۔ اُنھوں نے جرمن حملہ کو روک بھی لیا، مگر یہاں بھی ان کے پاس ہوائی جہاز اور ٹینک اس افراط سے نہ تھے کہ وہ ترکی بہ ترکی جواب دے سکیں اور جرمنی نے اس وقت ایسی چال بھی چلی جس نے جنگ کا نقشہ بالکل بدل دیا۔

فرانس کی شکست

فرانسیسیوں نے شمالی سوئٹزر لینڈ سے لے کر بلجیم تک زمین دوز مورچوں کا ایک سلسلہ بنالیا تھا، جو ماژی نولائن کہلاتا ہے اور جسے سامنے سے حملہ کرکے فتح کرنا امکان سے باہر ہے۔ بلجیم اور فرانس کے درمیان ایسی کوئی روک نہیں۔ فرانسیسی ماژی نولائن کے سے مورچے یہاں بھی بناسکتے تھے، لیکن اس سے خواہ مخواہ یہ نتیجہ نکالا جاتا کہ فرانس نے اپنی فکر کرلی ہے۔ بلجیم کی اسے فکر نہیں، مگر جرمن فوجوں نے سرحدی قلعوں کو پہلے ہی ہلے میں فتح کرلیا اور اتحادی فوجوں سے ان کی مڈبھیڑ وسط بلجیم میں ہوئی۔ تب خیال ہوا کہ جنگ کی صورت آخر کار وہی ہوجائے گی جو ۱۹۱۴ء کی جنگ میں تھی دونوں فریق خندقیں کھود کر بیٹھ جائیں گے، اور خالی گولہ بارود کے زور پر آگے بڑھ سکیں گے لیکن اس خیال کو جرمنی نے چند دن کے اندر ہی غلط ثابت کردیا۔ ۱۳ رمئی

کو ایک جرمن فوج نے ماژی نولائن کے آخری شمالی قلعے کے قریب شہر سیدان کے سامنے فرانسیسی سرحد کو پار کیا، یہاں پر جو فرانسیسی فوج تھی وہ اس کے شدید حملے کو برداشت نہ کر سکی اور جرمن فوج ملک کے اندر گھستی چلی گئی۔

اصل حالات کا جب پتہ چلا تو معلوم ہوا کہ فرانسیسی اس وقت جنگ کے لئے تیار ہی نہ تھے، فوج کا انتظام خراب تھا، سپہ سالار اتنے بوڑھے تھے کہ بس لکیر کے فقیر ہو کر رہ گئے تھے اور لڑائی کے نئے طریقے نے ان کو بالکل عاجز کر دیا۔ سیدان کے قریب جرمن حملے کی شدت سے فرانسیسی فوج ایسی گھبرائی کہ پسپا ہوتے وقت پلوں کو توڑنا بھی بھول گئی اور جرمن فوج کا کام بہت آسان کر دیا۔ پھر فرانسیسیوں کے پاس سامان کی بھی بڑی کمی تھی۔ جرمنی نے خشکی پر حملہ کرنے سے پہلے ہی فرانس کے ہوائی مرکزوں پر ایسی بمباری کی تھی کہ فرانس کے بیشتر ہوائی جہاز ضائع ہو گئے اور فوج کا یہ بازو ٹوٹ گیا۔ جرمنی کے پاس تیز رفتار ٹینک، مسلح موٹر اور ہوائی جہاز



اتنے تھے کہ وہ ہر مہم میں جتنے چاہتا کھپا سکتا تھا، فرانسیسی اپنے سامان کو بچا بچا کر ہی صرف کر سکتے تھے اور اس لئے مقابلے میں کامیابی کی شرط یہ تھی کہ جنگ کے وقت اور موقع اور صورت کا انتخاب وہ کریں۔ لیکن جرمنی نے انھیں سوچنے کی مہلت نہیں دی، اور اس طرح فرانسیسی سپہ سالاروں کی جو تھوڑی بہت عقل تھی وہ بھی کام نہ آئی۔

جرمنی نے جنگ کا جو طریقہ اختیار کیا وہ بھی نرالا تھا۔ ہر محاذ پر پہلے سینکڑوں ہوائی جہاز لگاتار حملے کرتے، صرف دشمن کی فوج ہی پر نہیں بلکہ اس کے پیچھے بہت دور تک۔ ان حملوں میں بہت سے ہوائی جہاز ضائع جاتے، مگر اس سے بھی حملوں کے تسلسل اور شدت میں فرق نہ آتا۔ جب ہوائی جہاز اپنا کام کر چکتے تو ٹینک اور مسلح موٹر آگے بڑھتے اور ان کی بھی تعداد اتنی ہوتی کہ فرانسیسی مقابلہ کرتے کرتے عاجز آجاتے اور پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوتے لیکن کسی ایک جگہ پر ان کے قدم اکھڑتے تو انھیں پھر دوسرا محاذ قائم کرنے کا موقع نہ دیا جاتا۔ جرمن ہوائی جہازوں، ٹینکوں اور مسلح موٹروں کے حملے کبھی رکتے ہی نہیں تھے اور جہاں کہیں فرانسیسی محاذ ٹوٹتا اور بیچ میں جگہ خالی ملی تو چھوٹے تیز رفتار ٹینک، مسلح موٹر اور موٹر سائیکلیں گھس کر فرانسیسی فوج کے پیچھے پہنچ گئیں۔ ان کا مقصد فوج کو گھیرانا نہیں بلکہ اس کے پیچھے جس قدر دور تک ممکن تھا عام آبادی کو خوف زدہ کرنا اور رسد کے انتظامات کو درہم برہم کرنا تھا۔ ان کی مدد کو فوج نہیں پہنچ سکتی تھی، اس لئے انھیں اس طرح دشمن کے ملک میں دوڑا دینا اصول جنگ کے بالکل خلاف تھا۔ اگر جرمن فوج دو تین ہفتے تک بھی پورے محاذ پر روک لی جاتی تو ان ٹینکوں، موٹروں اور موٹر سائکلوں میں سے ایک بھی باقی نہ بچتی۔ لیکن پوری جرمن فوج کہیں روکی نہ جا سکی اور اس لئے یہ تدبیر بہت کارگر ثابت ہوئی۔

ماژی نولائن کے شمال میں فرانسیسی محاذ جگہ جگہ پر توڑا جاچکا تھا اور فرانسیسی فوجیں اتنی دور تک ہٹ گئی تھیں کہ اتحادی فوج کا شمالی حصہ جو بلجیم کی مدد کو گیا تھا ویسے بھی خطرے میں تھا جب بلجیم نے ہتھیار ڈال دئے (۲۸ مئی)۔ اب اتحادی فوج کے لئے پس پا ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ انگریزی فوجیں ڈنکرک کی طرف واپس ہوئیں فرانسیسیوں نے سین اور آئن دریاؤں پر اپنا محاذ قائم کیا اور شمال مشرقی فرانس، جس میں جرمن ٹینک، مسلح موٹر اور موٹر سائکلیں آوارہ پھر رہی تھیں بالکل خالی کر دیا گیا۔ ۵ر جون کو جرمنوں نے فرانسیسیوں کے نئے محاذ پر حملے شروع کئے اور آٹھ دن میں فرانسیسیوں نے ہاری مان لی۔ ۱۶ر جون کو فرانسیسیوں نے دشمن سے لڑائی بند کرنے کی درخواست کی، جو منظور کر لی گئی، لیکن اس دوران میں جرمن فوجوں نے ماژی نولائن کو پیچھے سے گھیر لیا اور اس میں جو فرانسیسی فوج تھی وہ بغیر لڑے ہوئے منتشر ہو گئی۔ یہ تھا انجام اس مورچہ بندی کا جس پر فرانسیسی اتنا بھروسا کرتے تھے۔

برطانیہ اور فرانس

اتحادی فوجوں کی بلجیم سے پس پائی کا سب سے افسوس ناک نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس اور انگلستان کا ساتھ چھوٹ گیا۔ برطانیہ کے مقابلے پر فرانس کا جو ساحل ہے اس پر جرمنی کا قبضہ ہو گیا تھا، برطانیہ اور فرانس کے الگ الگ محاذ بن گئے تھے اور ہر ایک کو اپنی ساری قوت اپنی حفاظت کے لیے سمیٹ کر رکھنا تھا۔ برطانوی فوج کو بلجیم سے واپسی کے وقت خاصا نقصان ہوا تھا اور اس کے بعد امکان تھا کہ جرمنی فرانس میں جنگ کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر کے انگلستان پر حملہ کر دے۔ اس کے باوجود برطانیہ کے نئے وزیر اعظم مسٹر چرچل نے ایک فوج تیار کر کے فرانس کی مدد کو بھیجی مگر جب فرانس کی حالت نازک ہو گئی تو مسٹر چرچل نے تجویز کیا کہ فرانس اور برطانیہ ایک مشترک حکومت

قائم کریں۔ فرانسیسی اس تجویز کو منظور کر لیتے تو ان کی حیثیت پسپائی کی سی ہو جاتی، وہ جنگ جاری رکھ سکتے اور ہر ہٹلر کامیابی کا سہرا پہن نہ پاتے۔ لیکن فرانس کے رہبروں میں سوائے جنرل ڈی گول کے کوئی ایسا نہ تھا جس میں جنگ کو جاری رکھنے کی ہمت تھی، مسٹر چرچل کی تجویز پر جیسا کہ چاہئے تھا غور نہیں کیا گیا اور جرمنی سے یہ درخواست کرکے کہ لڑائی بند کر دی جائے فرانس نے برطانیہ سے اپنا پرانا تعلق توڑ دیا۔

برطانیہ

جمہوریت میں بڑی خوبیاں ہیں، لیکن فن جنگ کے نقطۂ نظر سے خامی بھی ہے کہ حملہ اور مدافعت کی پہلے سے تیاری نہیں کی جا سکتی، جرمنی نے جنگ کے لئے اس وقت سے انتظام کرنا شروع کر دیا جب سے کہ نازی پارٹی برسر اقتدار ہوئی، انگلستان میں اس طرف توجہ چار سال بعد کی گئی جب یہ یقین ہو گیا کہ جرمنی سے لڑائی ضرور ہوگی۔ لڑائی کے لئے اس نیت سے تیاری کرنا جو کہ جرمنی کی تھی آدمیت اور تہذیب کے بالکل خلاف ہے اور آدمیت اور تہذیب کی قربانی چند فوجی افسروں کی خوشنودی یا تماشائیوں کی واہ وا کے لئے نہیں کی جا سکتی۔ جب واقعی ضرورت پیش آئی تو برطانیہ کی جمہوریت نے بھی اپنے جوہر دکھائے۔ ناروے کی مہم ناکامیاب ہوئی تو مسٹر چیمبرلین نے وزارت سے استعفا دے دیا۔ مسٹر چرچل وزیر اعظم مقرر ہوئے اور ۱۰ مئی کو بغیر بحث مباحثے کے چند گھنٹوں کے اندر اشخاص اور ملکیت کے بارے میں پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کر لیا جس سے برطانیہ کی حکومت کو شہریوں اور ان کی ملکیت پر اتنا ہی اختیار ہو گیا جتنا کہ نازی پارٹی نے برسوں کی گالی گلوچ اور غنڈے پن اور خونریزی اور خفیہ پولیس کی بے شمار زیادتیوں کے بعد حاصل کیا تھا۔ نئی حکومت کی خود اعتمادی اور جمہوری سیاست کا استقلال اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شروع جون میں مسٹر چرچل نے بلجیم اور شمالی فرانس سے پسپائی کے سارے حالات

صحیح صحیح بیان کر دئے، قوم کو نقصان پورا کر کے اپنے زبردست دشمن کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی اور یہ دعوت بڑے جوش سے قبول کی گئی۔

فرانس کی شکست اور اس کے ہتھیار ڈال دینے کے معنی یہ تھے کہ فرانس کی شمالی بندرگاہیں اور کیلے کے پاس کا ساحل، جہاں سے برطانیہ صرف چوبیس میل ہے، جرمنی کے قبضے میں ہوگا اور انگلستان پر حملہ کرنے کے لئے وہاں انتظام کیا جا سکے گا۔ جرمن ہوائی جہازوں کے لئے بڑی آسانی ہو گئی کہ وہ فرانس سے اُڑ کر برطانیہ کے جس حصے پر چاہتے بم باری کر آتے۔ جولائی میں تو کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جرمنی واقعی برطانیہ پر لشکر کشی کرنا چاہتا ہے، لیکن اگر جرمنی نے حملہ کا ارادہ بھی کیا تھا تو برطانیہ کے بیڑے اور ہوائی جہازوں نے اس کی نوبت نہیں آنے دی۔ اگست سے برطانیہ پر ہوائی حملے ہونے لگے، جن کی شدت گھٹتی بڑھتی رہی اور جواب تک جاری ہیں۔ لیکن جون جولائی اور اگست ہی میں برطانیہ نے اپنی حفاظت کا پورا انتظام کر لیا۔ اور جرمنی نے ہوائی حملے کر کے بہت سخت نقصان اٹھایا۔ ان حملوں کے جواب میں برطانیہ نے بھی جرمنی پر بمباری شروع کر دی اور چونکہ جرمنی میں مدافعت کا انتظام اتنا اچھا نہیں ہے جتنا کہ انگلستان میں، اور جرمن ہوابازوں کو فرداً فرداً لڑنے کی خاص مشق نہیں ہے، جنگ کی موجودہ شکل میں جرمنی بہت گھاٹے میں رہتا ہے۔

فرانس اور جرمنی کے درمیان لڑائی بند کرنے کی شرطیں طے ہوتے ہی برطانیہ نے فرانسیسی بیڑے کے ان تمام جہازوں پر جو بحر روم کے باہر تھے یا تو قبضہ کر لیا یا انھیں بیکار کر دیا۔ چند جہاز ایسے بھی تھے جنھیں ان کے کپتانوں نے اپنی خوشی سے برطانیہ کے بیڑے میں شامل کر لیا۔ برطانیہ کے لئے یہ کارروائی لازمی تھی، اس لئے کہ فرانسیسی حکومت پر جرمنی دباؤ ڈال کر فرانس کا پورا بیڑا حاصل کر لیتا تو جرمنی کی بحری قوت بہت بڑھ جاتی اور مفت کے جہازوں سے جرمنی وہ کام لے سکتا تھا جو وہ اپنے جہازوں

سے ہٹتے ہوئے گھبراتا ہے۔ برطانیہ نے بڑی ہوشیاری سے اس خطرے کی پیش بندی کر لی۔

اٹلی

۱۰ رجون کو جب اس کا پورا یقین ہوگیا تھا کہ فرانس جرمنی کا مقابلہ ایک ہفتے سے زیادہ نہ کر سکے گا، اٹلی نے برطانیہ اور فرانس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۱۹۳۶ء سے جرمنی اور اٹلی کی سیاست کا ایک ہی مسلک رہا ہے اور ہر معاملے وہ ایک دوسرے کو سہارا دیتے رہے ہیں۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں لڑائی چھڑی تو اٹلی غیر جانب دار رہا، لیکن یہ بھی واضح کرتا رہا کہ اسے جرمنی سے ہمدردی ہے اور اس کی غیر جانب داری محض اصطلاحی ہے، بحر روم کی حکومت کو وہ اپنا حق سمجھتا ہے اور اپنے حق کو وہ حاصل ضرور کرے گا۔ یہ سب کہنے کی باتیں تھیں اٹلی جنگ کے لئے تیار نہیں تھا، ورنہ اس کے لئے ہر لحاظ سے بہتر تھا کہ فوراً لڑائی شروع کر دے۔ اس نے ۱۹۳۹ء کے آخر میں مصر اور یونان پر حملہ کر دیا ہوتا تو برطانیہ کو اس کے مقابلہ کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آتیں۔ اور اپریل سے جون ۱۹۴۰ء تک جرمنی کو جو کامیابیاں ہوئیں وہ فاشست سیاست کے لئے بہت نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔ ظاہر میں کچھ معلوم ہوتا ہو، اٹلی کے لڑائی ملتوی رکھنے کے معنی یہ تھے کہ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ دونوں فریقوں میں سے کامیابی کس کو ہوتی ہے۔ جون میں فرانس کے خلاف اعلان جنگ کرنے کا منشا جرمنی کو مدد کرنا نہیں تھا، اس لئے کہ جرمنی کو اس وقت مدد کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ اٹلی چاہتا تھا کہ فرانس کی شکست سے فائدہ اٹھائے اور بغیر لڑے ہوئے نیس، کورسکا اور فرانس کی افریقی نوآبادیاں حاصل کرلے۔ یہ سب مل جاتا تو بحر روم پر حکومت کرنے کا حق بھی آگے چل کر ثابت کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ایسے خود غرض اور گیدڑ صفت دوست کی جیسا کہ اٹلی ہے، کوئی قدر نہیں کرتا۔ فرانس سے وقتی صلح کی شرائط پر گفتگو کرنے میں اٹلی کے نمائندے تھے بلکہ بہت پیش پیش تھے، مگر اٹلی کو ملا کچھ نہیں، اس لئے کہ فرانسیسی اٹلی کے مطالبے

منظور کرنے پر تیار نہیں تھے اور جرمنی کی مصلحت کے بالکل خلاف تھا کہ اٹلی کے مطالبے منظور کرانے کی خاطر وہ فرانس سے لڑائی جاری رکھے۔ بالآخر فرانس سے جو شرطیں منوائی گئیں وہ جرمن سیاست کی خونخواری کو دیکھتے ہوئے بہت ہلکی تھیں، فرانس کے دارالسلطنت اور شمالی و مشرقی حصہ دوران جنگ کے لئے جرمنی کے قبضہ میں رہنا طے پایا، الساس لورین کے دونوں ضلعوں میں سے لورین جرمنی نے لے لیا اور الساس فرانس کے پاس رہنے دیا گیا، فرانسیسیوں کو ملک کے ایک تہائی حصے میں، جو آزاد چھوڑا گیا تھا، حکومت کرنے کا پورا اختیار دے دیا گیا، لیکن ظاہر ہے یہ حکومت جرمنی کے مفاد کے خلاف کچھ کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ اس وقت تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ضلع سیووئی اور ساحل ایلپ کے وہ حصے جن کی آبادی زیادہ تر اطالوی ہے اٹلی کو دے دئے گئے ہیں لیکن اس کی تصدیق کسی مستند ذریعے سے نہیں ہوئی کہ اٹلی کا واقعی ان پر قبضہ بھی ہو گیا ہے۔

اس ناکامیابی کے بعد اٹلی افریقہ کی طرف متوجہ ہوا۔ پہلے اس نے برطانوی سومالی لینڈ پر حملہ کیا، شاید اس وجہ سے کہ اسے معلوم تھا کہ برطانیہ یہاں پر مقابلہ نہ کرے گا۔ برطانیہ نے مقابلہ کیا بھی نہیں، اس لئے کہ یہاں لڑنے کی بہ نسبت نہ لڑنے میں زیادہ مصلحت تھی اور یہاں کی فوج اور سامان کو مصر بھیج دیا، جو اصل محاذ ہے۔ اٹلی مصر پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا، اور طرابلس میں ضروری فوج اور سامان جمع کر کے اس کی فوجیں سڑک بناتی اور ریگستان میں جگہ جگہ پٹرول اور دوسرے سامان کے ڈپو قائم کرتی اور پانی کا انتظام کرتی ہوئی سیدی برانی تک بڑھ آئیں۔ جو مصر کی سرحد کے اندر ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ رک گئیں، اس لئے کہ اب بھی اٹلی کا مقصد لڑنا نہیں تھا بلکہ لڑائی کے اتفاقات سے فائدہ اٹھانا۔ مصر کی طرف بڑھنے کے ساتھ ہی اٹلی نے جنوبی البانیہ پر حملہ کرنے کی تیاری کی، کہ یہاں بھی بغیر لڑے ہوئے

جو کچھ ملے اسے مار لی جائے ۔

جرمنی کے مقاصد

جرمنی کا جنگ سے پہلے یہ اصرار تھا اور اب بھی اس کا مقصد یہ ہے کہ یورپ کی نئی تنظیم کی جائے ۔ نئی تنظیم کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے، کیونکہ یورپ ہی نہیں بلکہ دنیا کے کسی براعظم اور کسی ملک کی حالت کبھی ایسی نہیں ہوئی ہے کہ نئی تنظیم سے اسے بہتر نہ بنایا جا سکتا ۔ لیکن نئی تنظیم سے جرمنی کا مطلب یہ تھا اور اب بھی ہے کہ یورپ کی سیاست اور تجارت بالکل اس کے اختیار میں دیدی جائے ۔ یورپ کے ان علاقوں کو جہاں جرمن آباد ہیں جرمنی اپنے اندر شامل کرلینا اپنا حق سمجھتا ہے اور آسٹریا، چیکوسلواکیہ اور آدھے پولینڈ پر اسی حق کی بنا پر قبضہ کیا گیا ۔ یہ قبضہ نئی تنظیم کے مسئلے سے بالکل الگ ہے ۔ نئی تنظیم کے سلسلے میں ڈنمارک، ناروے، ہالینڈ اور بلجیم پر لشکر کشی کی گئی اور رومانیہ پر تسلط حاصل کیا گیا ۔ اب جرمنی کا مقصد یہ ہے کہ اپنے تسلط کو قائم رکھے اور اسے بڑھاتا اور مضبوط کرتا رہے ۔

(۱) فرانس کے شکست کھاتے ہی جرمنی اور اٹلی کے تعلقات بدل گئے ۔ جرمنی مغربی یورپ میں اپنا تسلط قائم نہیں رکھ سکتا اگر فرانس اس کا ساتھ نہ دے ۔ اس مقصد کے لئے فرانس کے مقابلے میں اٹلی کی دوستی نسبتاً بیکار ہے اور وقتی صلح کی گفتگو چھڑتے ہی جرمنی اور اٹلی کے تعلقات نے پلٹا کھایا ۔ جرمنی نے، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، اٹلی کے مطالبوں کو منظور کرانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی اور اپنا رویہ ایسا رکھا کہ فوجی انتظامات میں کوئی رکاوٹ نہ ہو مگر فرانسیسی کوئی خاص شکایت بھی نہ کر سکیں ۔ اسی کے ساتھ جرمنی فرانس کی زندگی کو خاص نازی اصولوں کے مطابق اپنی معاشی تنظیم کے تحت میں لے آیا، کارخانوں کو کام دیا، کارخانہ داروں کی سرپرستی کی، مگر سارا نقد روپیہ اپنے قبضے میں کرلیا اور جتنا مال خریدا یا بنوایا اس کے معاوضے

میں قرض کے پروانے دئے جن کا نقد میں منتقل ہونا جرمن سیاست کے فروغ پر منحصر ہے مارشل پے ٹین اور فرانسیسی حکومت کو راضی کرنے کے لئے ہٹلر نے موسیو لوال کے ذریعے سیاسی گفتگو شروع کی اور اسی سلسلے میں اس کی مارشل پے ٹین سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرانسیسی حکومت اتحاد عمل پر رضامند ہو گئی لیکن یہ نہیں معلوم ہے کہ یہ اتحاد عمل کن شرطوں پر ہوگا اور کس حد تک۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ فرانسیسی حکومت جرمنی سے اتحاد عمل کرنے پر راضی ہو گئی ہے۔ اس میں اسے کوئی چارہ بھی نہیں۔ مگر برطانیہ کے خلاف کوئی ایسی کارروائی کرنے پر تیار نہیں جس سے ظاہر ہو کہ برطانیہ سے اس کی لڑائی ہو گئی ہے۔

فرانس کو اتحاد عمل کی عادت ہو جائے اور اس کی زندگی راہ پر آجائے تو جرمنی کا خیال ہے کہ بلجیم، ہالینڈ اور ناروے بھی اپنی شکست اور جرمنی کے تسلط کو تسلیم کر لیں گے اور یورپ کی نئی تنظیم کا ایک اور مرحلہ بھی طے ہو جائے گا۔ بلجیم کے بادشاہ لیوپولڈ سے ہٹلر نے معاملے کی گفتگو شروع کر دی ہے۔ لیکن اس کا ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے۔

(۲) مغربی یورپ کی سیاست یورپ کی نئی تنظیم کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو جرمنی کا ہنگری، رومانیہ اور بلقان پر تسلط ہے۔ ہنگری سے اس کو غلہ، رومانیہ سے پٹرول اور غلہ، بلقان سے غلہ اور بھاری صنعت کے لئے کچھ اور ضروری خام اشیا مل سکتی ہیں۔ دریائے ڈینیوب جنوب مشرقی یورپ کی سب سے بڑی تجارتی شاہ راہ ہے اور اس کو کھلا رکھنے کے لئے لازمی ہے کہ جن ملکوں سے وہ گذرتا ہے وہ جرمنی کے کہے میں ہوں۔ جرمنی نے پہلے تو رومانیہ کے دو شمال مشرقی ضلعے جن پر روس کا دعوے تھا روس کو دلوا دئے اور جنوب مشرق میں ضلع دوبروجا بلغاریہ کو، پھر ہنگری کو ٹرین سلوینیا کا بیشتر حصہ دلوا کر اسے خوش کر دیا اور آخر میں جو کچھ بچ رہا تھا اس پر خود قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کی سمجھ میں بھی آگیا

کہ جرمنی کی خوشامد کیے بغیر چارہ نہیں اور وہ بھی جرمنی کی معاشی تنظیم کے ماتحت ہو گئے۔ اس طرح جنوب مشرقی یورپ میں جرمنی نے ایک مورچہ بنا لیا جو فی الحال خاصا مضبوط معلوم ہوتا ہے۔ اس مورچے کی تعمیر میں روس بھی شریک ہوا تھا اور اسے قائم رکھنے میں بھی شریک رہے گا جب تک کہ اس میں جرمنی سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔

(۳) جرمنی کے مغربی اور مشرقی دونوں مورچے ٹوٹ سکتے ہیں اگر برطانیہ جنگ جاری رکھ سکا۔ جرمنی کی دولت اور اس کے جمع کیے ہوئے مختلف قسم کے ذخیروں کا لڑائی سے پہلے جو اندازہ کیا جاتا تھا وہ بالکل غلط نکلا ہے۔ لیکن جنگ جاری رہی۔ برطانیہ اسی طرح جرمنی کے کارخانوں پر حملے کرتا رہا اور امریکہ سے اس کو ضرورت کے مناسب مدد پہنچتی رہی تو جرمنی کے معاشی کرتب کام نہ آئیں گے، اور یورپ کی جو قومیں اس وقت مجبور اور عاجز ہیں سب اس کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوں گی۔ اسی وجہ سے جرمنی نے سمجھ لیا ہے کہ اس کی اصل لڑائی برطانیہ سے ہے۔ اس نے ہوائی حملوں کا سلسلہ برابر جاری رکھا ہے، نومبر سے اس نے برطانیہ کے تجارتی جہازوں کو ڈبونے کے لئے بہت سے آبدوز اور ہوائی جہاز الگ کر دئے ہیں جو دور سمندر میں جا کر اپنا کام کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب پرانی ترکیبیں ہیں جو بس شروع میں کسی قدر کامیاب ہوتی ہیں۔ خود جرمنی کو بھی ان کے کارگر ہونے پر بھروسا نہیں۔ سنتے ہیں اسی وجہ سے جرمنی نے فرانس کے شمالی ساحل پر ماژینو لائن اور زیگفریڈ لائن کے سے مورچے بنائے ہیں، کہ فرانس اور بلجیم اور ہالینڈ کے ساحل پر کہیں برطانوی فوجیں اُتاری نہ جا سکیں، لیکن انسانی آزادی کی لہروں کو ایسے مورچے بھی کبھی روک نہیں سکتے۔ بس لہروں کے اُٹھنے کی دیر ہے۔

جنگ کی موجودہ صورت

جیسے ہی فرانسیسی حکومت نے جرمنی سے اتحادِ عمل کا وعدہ کیا، ویسے ہی

اٹلی نے یونان پر حملہ کر دیا (۱۰ نومبر) اس حملہ کا شاید اور کوئی مقصد تھا بھی نہیں سوا اس کے کہ ایک کمزور ملک کو شکست دے کر اٹلی اپنی سیاست کی آبرو بچائے لیکن یہ مقصد پورا نہیں ہوا، بلکہ اس کے برعکس اٹلی نے منہ کی کھائی۔ یہ ان فوجوں کی خبر لینے کا بہت اچھا موقع تھا جو اٹلی نے سیدی برانی میں جمع کی تھیں۔ مصر کی برطانوی فوج نے ان پر حملہ کر دیا اور وہ ایسی بودی نکلیں کہ کہیں پر مقابلہ بھی نہ کیا، بس جان کو غنیمت سمجھ کر بھاگتی ہی رہیں۔ ثابت قدمی اور جواں مردی کے اس مظاہرے نے اٹلی اور اس کی سیاست کو بالکل بے آبرو کر دیا ہے اور اب اٹلی دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا اگر جرمنی نے اس کی مدد نہ کی۔ لیکن جرمنی اس کی مدد کیوں کرے؟ اٹلی کے سبب سے اس کو فرانس سے سمجھوتا کرنے میں دشواری تھی، اٹلی کے سبب سے یوگوسلاویہ اور ترکی دونوں جرمن سیاست سے بہت بدظن تھے اور اب اس کی شکست سے جرمنی کے بہت سے کام آسان ہو جائیں گے۔ پھر اٹلی کی مدد کرنا بھی کچھ آسان نہیں۔ اٹلی کا بیڑا اس کی فوج سے کچھ کم جاں باز نہیں، جب سے جنگ چھڑی ہے وہ برطانوی جہازوں سے پٹتا یا منہ چھپا کر بھاگتا رہا ہے۔ اگر جرمنی اپنی فوجیں اٹلی کو مدد پہنچانے کے لئے افریقہ بھیجے تو ان کی سلامتی کا دارومدار اٹلی کے بیڑے پر ہوگا۔ رومانیہ میں جو جرمن فوجیں جمع ہیں انھیں یونان بھیجنے کے لئے بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کی رضامندی درکار ہے، کیوں کہ فوجوں کو انھیں ملکوں میں سے گذرنا ہوگا اور یہ دونوں ریاستیں جرمنی کو رستہ دینے پر رضامند نہیں ہوں گی، اس لئے کہ ان کا ملک پھر میدان جنگ بن جائے گا۔ یونان میں بھی اٹلی کو اپنی گیدڑ بھبکیوں کی سزا اکیلے بھگتنا ہوگا۔

اٹلی کی سیاست ایک زمانے میں اہمیت رکھتی تھی، اب وہ زمانہ ختم ہو گیا ہے غالباً جرمنی اسے اس کے حال پر چھوڑ کر فرانس اور ہسپانیہ سے تعلقات بڑھائے گا۔

فرانس سے اس کو اتحاد عمل کی جو خواہش ہے اس کے اسباب بتائے جا چکے ہیں، ہسپانیہ سے تعلق بڑھانے کا مقصد یہ ہوگا کہ بحر روم برطانیہ کے لئے بالکل خطرے سے خالی نہ ہو جائے، اور ہسپانیہ جبل الطارق کا مطالبہ کرکے برطانوی جہازوں کی آمد و رفت میں خلل ڈالتا رہے۔ لیکن اس کی بھی خبریں آتی رہی ہیں کہ اٹلی میں جرمن فوجیں پہنچا دی گئی ہیں۔ جو ممکن ہے افریقہ بھیجی جائیں اور ممکن ہے یونان۔ جرمنی کے رویے کا صحیح اندازہ ان خبروں کی تصدیق کے بعد ہی کیا جا سکے گا۔

امریکہ اور برطانیہ

امریکہ کی متحدہ ریاستوں کی غیر جانب داری ویسی ہی اصطلاحی ہے جیسے کہ ایک زمانے میں اٹلی کی تھی، یعنی انھیں برطانیہ سے ہمدردی ہے مگر وہ جنگ میں شریک نہیں ہیں، اپنے غیر جانب داری کے قانون سے وہ مجبور ہیں کہ برطانیہ کے ہاتھ جو کچھ بیچیں اس کے دام نقد وصول کریں۔ اب تک تو برطانیہ نقد دام دیتا رہا ہے، یا ایسا سودا کیا ہے جیسے کہ دو سو جنگی جہازوں کے بدلے بحر اٹلانٹک میں چند فوجی مرکز امریکہ کو دے دینا۔ لیکن اب نہ تو نقد دام دئے جا سکتے ہیں نہ کوئی سودا کیا جا سکتا ہے، اور امریکہ کو یا تو اپنا غیر جانبداری کا قانون بدلنا ہوگا یا کوئی اور ترکیب کرنا۔ امریکہ کے مدبر اس کے لئے بھی آمادہ ہیں، اس لئے کہ برطانیہ اس وقت جمہوری اصول زندگی۔ قومی خود مختاری اور انفرادی آزادی کا مجاہد بنا ہوا ہے اور اس کی مدد کرنا ہر جمہوری ریاست کا فرض ہے۔ امریکہ مدد پہنچانے کا جو طریقہ بھی اختیار کرے، دنیا کی ان دو بڑی جمہوری ریاستوں کا تعلق بڑھتا ہوا ہی نظر آتا ہے۔ ممکن ہے لڑائی کے بعد پھر دونوں الگ ہو جائیں، ممکن ہے ان کی سیاست اور تجارت انھیں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ کر دے کہ پھر وہ علیحدہ نہ ہو سکیں اور ان کے رشتے کی مضبوطی دنیا میں جمہوریت کا سہارا بن جائے۔

باقیاتِ بجنوری

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم سے اُردو دُنیا اچھی طرح واقف ہے۔ ان کا پہلا کارنامہ دیوان غالب (نسخۂ حمیدیہ) کا دیباچہ ہے۔ اسی کی بدولت اُنھوں نے اُردو داں طبقے میں مقبولیت و شہرت حاصل کی۔ اپنی علمی قابلیت اور زبان آوری کی بدولت ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے، طرزِ تحریر میں اُنھوں نے اپنی ایک الگ اور مجتہدانہ راہ نکالی تھی۔ سنجیدہ سے سنجیدہ اور علمی مباحث میں بھی شگفتگی، زبان ہاتھ سے نہ جانے پاتی تھی۔ یہ جواہر ریزے جو ایک طرح سے ان کے علمی و ادبی تبرکات ہیں، صرف ادب و زبان کی حیثیت سے قابل قدر نہیں ہیں بلکہ ان میں بعض اہم علمی و معاشرتی مسائل پر بھی بحث کی گئی ہے مکتبہ جامعہ نے اس کی ظاہری نمود پر بھی بہت توجہ صرف کی ہے پوری کتاب ٹائپ میں چھپی ہے، جلد اور گرد پوش نہایت دیدہ زیب۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (عہ)

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

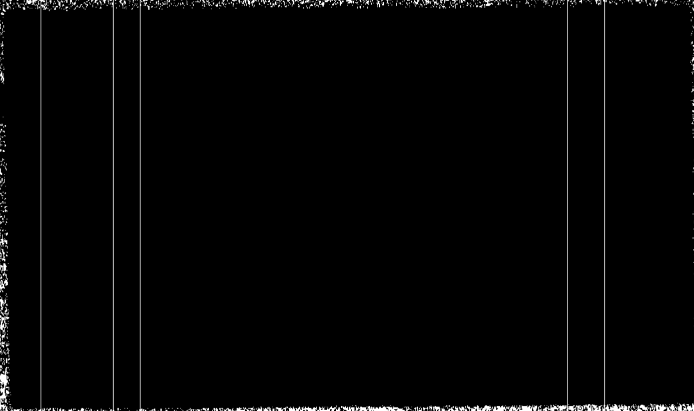
خطوط محمد علی

[illegible] مرحوم کا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]



ہندوستانی کھیل

مصنفہ الطاف علی صاحب نگران تربیت جسمانی، جامعہ

ہمارے ملک میں بچے کی جسمانی تندرستی سے نہایت افسوسناک حد تک بے اعتنائی برتی جاتی ہے اور اس کی تفریحی ضروریات کی طرف تو سرے سے توجہ نہیں دی جاتی۔ عام طور پر ہمارے ملک کے بچے جسمانی لحاظ سے کمزور ہوتے ہیں اور ان کی چال ڈھال میں وہ مستعدی نہیں پائی جاتی جو ان بچوں میں ملتی ہے جنہیں کثرت سے کھیلنے کے مواقع ملتے ہیں۔ بچوں کو کم سے کم ایک گھنٹہ تک ہر روز آزادی کے ساتھ کھیلنے کا موقع ملنا چاہیے تاکہ وہ اپنے اعصاب کی تربیت کر سکیں۔ جو بچے ایسے ماحول میں تربیت پائے گا وہ ملک و ملت کے لئے سرمایۂ افتخار ہوگا اور ملک کے تمام شعبے وزارتیں اس پر اعتماد کیا جائے گا۔ مصنف نے انہیں باتوں کو پیش نظر رکھ کر تقریباً [illegible] ہندوستانی کھیل اس کتاب میں جمع کر دیے ہیں جو مختلف عمر کے بچے کھیل سکتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

مکتبہ جامعہ

[illegible]

جامعہ

زیرِادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۲۳ نمبر ۲ | بابتہ ماہ فروری سنہ ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

براہِ کرم

اس صفحہ کی پشت پر رسالے سے متعلق ایک ضروری نوٹ ملاحظہ فرمائیے۔ "منیجر"

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی

ضروری اطلاع

رسالہ جامعہ کی روانگی کے متعلق چند اہم گذارشیں درج ذیل ہیں :-

۱۔ رسالہ جامعہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے جو تمام خریداروں کو ۷ تاریخ تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ براہ کرم ۱۵ تک خط لکھ کر دفتر سے دوبارہ منگالیں۔ ۱۵ تاریخ کے بعد رسالہ روانہ نہ کیا جائے گا۔

۲۔ اس ماہ سے تمام خریداروں کے نمبر خریداری تبدیل ہو گئے ہیں۔ جدید نمبر خریداری ہر رسالہ پر پتے کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ براہ کرم اسے کسی یادداشت میں نوٹ فرمالیجیے۔

۳۔ آیندہ ماہ تمام خریداروں کے پتے مع نمبر خریداری چھپ جائیں گے جو صاحب پتوں میں کچھ تبدیلی کرانا چاہیں زحمت فرماکر ۱۵ فروری تک دفتر کو اطلاع دے دیں خط میں نئے نمبر خریداری کا ضرور حوالہ دیا جائے ورنہ پتے میں ردّ و بدل کرنے میں ہمیں غیر معمولی دشواری ہوگی۔

۴۔ خطوط اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ہمیشہ تحریر فرمائیے۔ جو خط بغیر نمبر خریداری کے موصول ہوں گے ان کی تعمیل سے دفتر قطعاً معذور ہوگا جس سے غالباً آپ کو بھی شکایت ہوگی اور ہمیں بھی رنج ہوگا۔

منیجر رسالہ جامعہ، دہلی

مطبوعات جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہو گئی ہے۔ اس فہرست میں آپ کو اپنے پسند کی بہت سی نئی کتابیں نظر آئیں گی۔ مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسرے اداروں کی کتابیں بھی مختلف عنوانات کے تحت درج کی گئی ہیں۔ ارباب ذوق یہ نئی فہرست منگا کر ملاحظہ فرمائیں۔

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

سائنس[1] اور مذہب

آج ہم تاریخ کے بڑے ہیجانی دور میں سانس لے رہے ہیں۔ صحیح معنوں میں اس کو انقلابی زمانہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ہم اپنی روحانی اور مادی تہذیب کے ہر شعبہ میں ایک نازک نقطہ پر پہونچ گئے ہیں اور اس ڈرامہ میں جو اپنے عروج کے قریب پہونچ چکا ہے ہم بیک وقت اداکار بھی ہیں اور تماشائی بھی۔ اس تماشاگاہ عالم کی سحرآفریں رنگینیوں میں شاید خاص اداکار سائنس ہے جو ہمارے متمدن عہد کے تمام کارناموں کے پیچھے سب سے بڑا محرک یا تی عنصر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے عظیم الشان ایجادات اور انکشافات، اس کے زندگی کے نئے رجحانات، اس کے اخلاقی اور روحانی توقعات نے انسان میں ایک نئی جان ڈالدی ہے۔ موجودہ زمانے میں خیالات اور نظریے کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں۔ اور فرسودہ معتقدات اور مروجات کا گرد و غبار جو ہماری زندگی کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا اس کی تابناک روشنی میں چھنتا نظر آتا ہے۔

سائنس ایک نئے مذہب، نئی سماج اور نئے ادب کی تخلیق کر رہی ہے اور سچ تو یہ ہے اس کی کوشش ایک نئے انسان کا عالم وجود میں لانا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سائنس کا یہ تفاعل انسانی تصورات اور نظریوں پر کیونکر اثر انداز ہوا۔ کس طرح سماج، مذہب اور تمدن اپنے موجودہ درجوں تک پہونچے ہیں اور پھر سائنس کس انداز میں ان کی صورتگری کر رہی ہے۔ سائنس ہمیشہ ایک ناقدانہ اور غیر متعصبانہ طرز عمل کی سفارش کرتی آئی ہے جس کی بے لاگ خارجیت کسی سے خواہ مخواہ مرعوب نہیں ہوتی۔ دنیا کے وسیع علوم کے خزانہ میں غالباً یہ اسی کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔

ہر جاندار شے پر دو قسم کے ماحولی اثرات کا عکس پڑتا ہے۔ ایک خارجی یا جسمانی اور دوسرا داخلی یا روحانی ہم انہیں دو ماحولوں کی گود میں پرورش پاتے ہیں۔ اسی خارجی عنصر کے ذریعہ ہم بیرونی دنیا سے وابستہ رہتے ہیں

---

[1] اس مقالہ میں تمام مذہبی اعتقادات اور روایات سے قطع نظر کر کے خالص عقلی اور استدلالی پہلو سے گفتگو کی گئی ہے

مگر ہم اپنی اس اندرونی حکومت میں "شدید انفرادی" حیثیت رکھتے ہیں جہاں ہم اپنے وجود کے الگ الگ مالک سمجھے جاتے ہیں۔ ان دونوں کے سناروں میں ان کے اپنے قوانین اور ضروریات کی حکومت ہے۔ سائنس طبیعاتی نظام میں ربط پیدا کرتی ہے اور فطرت کو تسخیر کر کے ہماری جسمانی آسائش کی جانب متوجہ ہوتی ہے۔ اور مذہب ہماری داخلی دنیا پر حاوی ہونے کے باعث ہماری اخلاقی فلاح کا ذمہ دار بنتا ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ یہ دونوں نظام جو ہماری زندگی کی دو مختلف طریقوں سے رہنمائی کرتے ہیں۔ جیسے ایک سوت دو الگ الگ راستوں سے بہہ کر ایک ہی خطہ زمین کو سرسبز و شاداب کرتی ہیں۔ ایک دوسرے میں ہم آہنگی نہ پیدا کرلیں اور انسان کی ہمہ گیر ترقی میں اضافہ نہ کریں۔

یوں اپنی عمومی حیثیت میں سائنس اور مذہب میں کسی طرح کا تصادم رونما نہیں ہوتا۔ مگر سائنس اس مذہب سے ضرور دست و گریباں* نظر آتی ہے جو رواجی معتقدات کے خوفناک ڈھانچہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ سائنس بذاتِ خود صداقت اور سچائی کے اصول کی ترویج کرتی ہے جو تمام سچے مذاہب کے بنیادی اصول ہیں۔ مذہب کے اس اخلاقی پہلو پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سائنس ہمیشہ مذہب سے جھگڑا مول لیتی ہے درست نہیں۔ سائنس کبھی یہ تبلیغ نہیں کرتی کہ "کبھی سچ نہ بولنا چاہیئے" یا "دوسروں کی خدمت کرنا ٹھیک نہیں" یا "بنی نوع انسان کو تباہ کر دینا چاہیئے" بلکہ اس کے برخلاف جہاں تک اخلاقی اور طبیعاتی بہتری کا تعلق ہے سائنس ہمیشہ مذہب کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے کے لئے تیار رہی ہے۔ پس ہمیں اس تصادم کا سبب کہیں اور تلاش کرنا چاہیئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سائنس اور مذہب میں کشمکش کا بنیادی سبب خدا کا تخیل ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سائنس کے پرستاروں میں سے اکثر دہریئے ہیں اور تمام بڑے بڑے مذاہب (سوائے بدھ مت کے جیسا کہ مہاتما بدھ کی تعلیم سے ظاہر ہوتا ہے) سب کے سب خدا یا دیوتاؤں کا سہارا خاص طور پر ڈھونڈتے ہیں۔ خداوندی تصور کا ارتقا، اپنی مختلف منزلوں میں حد درجہ رنگین نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس میں انسانی شعور کی داستان پنہاں ہے۔

انسان اس دور سے گذر چکنے کے بعد جس میں وہ ہوا اور سورج، بارش اور گرج کے سامنے حیوانوں

کی طرح سربسجود ہوتا تھا۔ بظاہر خدا کا کوئی تصور قائم نہ کر سکا تھا۔ اسے ایک بے حس احساس کے ساتھ بعض طاقتوں اور اثرات یعنی منتروں اور جادوؤں کا اعتراف تھا، جو اس کے نزدیک قدرت کے جلووں میں چھپے ہوئے اور طلسماتی طور پر بعض چیزوں اور حرکات میں خوابیدہ تھے۔ پیپوٓا اور پولینیشیا کے علاوہ نہ جانے کتنے چھوٹے چھوٹے گروہ اب بھی انھیں فرسودہ اعتقادات کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔

لیکن رفتہ رفتہ جب اس کی ہستی کے دھندلے اثرات بڑھتے گئے تو اس نے ان شخصیتوں کے مابین مطابقت پیدا کر لی جس سے اسے دوچار ہونا پڑا تھا۔ بعد میں یہی شخصیتیں مختلف دیوتاؤں کی شکلوں میں نمودار ہوتی ہیں۔ توہم پرستی پیدا ہوتی ہے اور کچھ دنوں کے بعد یہ اصنام پرستی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ارتقاً کی منزلوں میں اس کے بعد وحدانیت کا درجہ ہے۔

خدا یا دیوتاؤں کے اس تصور کے چاروں طرف سادھوؤں اور پیروں کا ایک گروہ اکٹھا ہو جاتا ہے ان کی زندگیاں، ارشادات، شعائر ظاہری اور مراسم سب مل کر ترویج مذہب کے میدان کو وسیع کرنے میں امداد کرتے ہیں۔ پھر قدرت قوم میں ایک پیغمبر بھیجتی ہے جس کی آتش بیانی کا سیلاب پچھلے اعتقادات کو خس و خاشاک کی طرح بہا لیجاتا ہے اور قوم کو ایک مطمح نظر پر متحد کر دیتا ہے اور خدا یا دیوتاؤں کا تخیل ہمیشہ اس مطمح نظر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے بعد خدا انسانی فطرت کی تمام خوبیوں ——— نیکی، حقانیت اور حسن ——— کا سرچشمہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ مذہب کی یہ سادہ صورت اپنی جگہ بڑی پاکیزہ چیز ہے کیونکہ یہ عوام کی جسمانی اور روحانی صلاحیتوں کے ابھارنے اور چمکانے میں امداد کرتی ہے۔ دہریت اپنی عملی صورت میں ایک دودھاری تلوار کا سا کام کرتی ہے۔ چند ہی آدمی ایسے ہوں گے جو ایک طرف سچے دہریئے ہوں اور دوسری طرف اخلاق کی کسوٹی پر بھی پورے اتریں۔ ایک عمومی انسان جب خدا کا قائل نہیں رہتا تو وہ اپنے وجودی مقام سے ہٹ جاتا ہے اور کسی طاقت کا سہارا اس کی جسمانی اور اخلاقی عمارت کے کھنڈر کو گرنے سے نہیں روک سکتا۔

اگر کوئی مذہب اتنا سادہ ہو یا یوں کہنا چاہیے کہ اپنی عملیت میں اتنا سادہ نظر آئے تو شاید سائنس اور مذہب میں کوئی وجہ مخالفت باقی نہ رہے۔ لیکن کوئی مذہب کم از کم اپنی ظاہری صورتوں میں اس حد تک سادہ اور مکمل دکھائی نہیں دیتا۔ مروجہ توہمات، تعصب مذہبی پیشواؤں کی خود غرضانہ مصلحتیں اور دوسرے مذاہب کے

نظاموں سے جنگ آزمائیاں۔ ان سب بحرانی اثرات نے ہر مذہب کی اصلی صورت مسخ کر کے اس کو طبوسات اور رسوم کا احمقانہ اور پیچیدہ گھروندہ بنا دیا ہے۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح اصنام پرستی کے دور تک خدا کا تصور پیدا ہوا اور اب دیکھنا یہ ہے کہ سائنسی فکر نے اس پر کس طرح اثر اندازی کی ہے؟ فرانسس بیکن اور گیلیلو اُن مردانِ مجاہدین سے ہیں جنہوں نے فکری آزادی کی راہ میں روشنی دکھائی ہے۔ سائنس کی تحقیقات اور مشاہدات کو مختلف مذہبی نظاموں کے مسلّمہ عقائد سے دوچار ہونا پڑا۔ مذہب کے سچے اور پُرخلوص پرستاروں نے ان باغیانہ خیالات کو روکنے کی سختی سے کوشش کی۔ گیلیلیو اور برونو اور ایسے ہی کتنوں کو اپنے بلند آہنگی سے سوچنے کے جرم میں بڑی گراں قیمتیں ادا کرنی پڑیں۔ کیونکہ مذہبی مطلق العنانی کی بارگاہ میں یہ بڑا ہولناک جرم سمجھا گیا۔ مگر یہ سب سختیاں اور مظالم جو مذہب کے پردہ میں ہوئے عقل پرستی کی اس آنے والی روح کو پژمردہ نہ کر سکے۔ نشاۃ ثانیہ کا دور آیا اور اس کے سایہ عاطفت میں ذہن اور دلیل کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور کسی طرح کی جبرہ دستی انسان کی ازلی پیاس کو بجھا نہ سکی۔ سائنسی روح عالم وجود میں آجانے کے بعد روشن خیال طبقہ نے مذہب کے مہلکی بندھنوں کو توڑنا شروع کر دیا اور صدیوں کی دست اندازی کے خلاف گویا احتجاجی طور پر انھوں نے خدا کے تصور کو بھی ایک ڈھکوسلا قرار دے کر مسترد کر دیا۔

مگر اس بیسویں صدی میں پھر خداوندی تخیل نے حیرت انگیز طور پر نئے سرے سے جنم لیا ہے پہلی فتحمندی کے نشہ کے بعد سائنسدانوں میں زیادہ سنجیدگی اور ذہنی روحانیت پیدا ہو گئی۔ ایک متمدن سائنسداں جتنا زیادہ کائنات کی پہنائیوں میں اپنے آپ کو کھو دیتا ہے۔ اسی قدر وہ ریاضیاتی صحت سے زیادہ متعجب ہوتا ہے اور علت و معلول کا جچا تلا تعلق اسے اس حد تک انگشت بدنداں کرتا ہے کہ اس کو ہمیشہ کے لئے ہر چیز میں ایک بنیادی قانون اور منشا کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ایک ممتاز سائنسداں کے الفاظ میں خواہ اسے قوت کہا جائے یا رہنمایانہ عنصر یعنی دوسرے معنوں میں خدا مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس کائنات کی ہر چیز میں ایک غرض اور ایک منشا کی کارفرمائی ہے۔

حیاتیاتی نقطہ نظر سے بھی کسی خالق کے تصور کے باقی رکھنے کی ضرورت ہے۔ جب تک کہ سائنس "زندگی"

کی تخلیق میں ناکام رہتی ہے "فطرت محض" کا نظریہ جو ایک زندگی سے دوسری زندگی اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے اب تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ پھر اسی خیال کی روشنی میں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اولین زندگی پھر کس واسطہ سے پیدا ہوئی؟ ایک سائنسداں نے کہا اگر مجھے اولین مادہ اولیٰ دیا جائے تو ارتقا کے ایک سادہ عمل کے ذریعہ سے میں زندگی کی سب سے مختلف النوع شکل پر پہونچ جاؤنگا، حیاتیات کے ایک فرانسیسی عالم نے یہ انوکھا نظریہ پیش کیا ہے کہ دنیا کی اولین زندگی پہلے آسمانی اجرام میں سے کسی پر قائم تھی جس سے ایک دفعہ زمین اتصال میں آئی اور پھر اس کو جاندار حلیہ ملا لیکن یہ سب ایسا ہی ہے کہ سوال کو دلیل سمجھ کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیا جائے اور اس کو زمانہ کے پھیلاؤ سے ایک قدم اور پیچھے ہٹا دیا جائے کیونکہ یہ مسئلہ اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ "زندگی" اس سرکش کرہ پر کس طرح نمودار ہوئی؟ سائنس اس کا جواب دینے میں ساکت نظر آتی ہے۔ خدا کے مبحث پر اس کو خاموش رہنا ہی آسان نظر آتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کا اقرار کر سکتی ہے اور نہ انکار، جیسا کہ ایک مصنف نے کہا ہے سائنس کی صحیح دعا یہ ہوگی "اے خدا ۔۔۔ اگر اس کا وجود ہے، میری روح کو بچا ۔۔۔ اگر یہ کوئی چیز ہے۔" کیونکہ روح ایک دوسرا معلول ہے جس کے وجود کے متعلق سائنس نے خموشی کو دانشمندی سمجھا ہے۔

مگر پھر بھی یہ تفاوت سائنس اور مذہب کے مابین کوئی تصادم پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر آج تمام مذاہب کے مختلف نظام اپنے بے عقل اصولوں اور اوہام پرستیوں، دقیانوسی خیالوں اور بیہودہ ظاہرداریوں کی اصلاح کی کوشش کریں اور اصول اخلاق اور انسانی بھلائی کے دامن عاطفت میں سکون کی تلاش کریں تو شاید خدا اور روح کے مسئلہ میں اتنی پیچیدگی باقی نہ رہے۔ سائنس کے بنیادی اصول مادہ اور قوت ہیں۔ ان کا کھوج لگانے کیلئے ایک سرچشمہ کی تلاش ضروری ہے سائنسدانوں کو حقیقت میں فی الحال خدا کے وجود پر نہ اعتراض ہے اور نہ ہو سکتا ہے مگر اصل تصادم سائنس کے تحکمانہ طرز عمل اور مذہبی عقائد کے فرسودہ اصولوں اور روایات کو آنکھیں بند کر کے مان لینے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے بہت سے سائنسداں اپنی ابتدائی تمکنیوں کے پندار میں یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے کہ انسان کا داخلی یا روحانی ماحول خود اپنے قوانین کی رہنمائی میں کام کرتا ہے اور سائنسی قوانین جو خارجی طاقت پر حکمرانی کرتے ہیں وہاں اسی درجہ پر جائز قرار نہیں دئیے جا سکتے۔ روحانیت کی موجودہ تحقیقات اور تحلیل نفسی نے ان قدامت پسند سائنسدانوں کے اس فکری

گرد و غبار کو پوری طرح صاف کر دیا ہے۔ جدید سائنس۔ کامیاب علم کی تفتیش میں پیدا ہونے والی انکساری کی روشنی میں یہ دیکھ لیتی ہے کہ وہ کائنات کے اس بسیط چیتان کے متعلق کچھ نہیں سیکھ سکی۔ اب ایڈنگٹن اور جینز جیسے ممتاز سائنسدانوں کی رہنمائی نے اس کا تعین ہستی روحانی طور پر کیا ہے اور یہ مادہ اور ادراک کے روحانی پہلو کو زیادہ نظر انداز نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ جولین ہکسلے نے لکھا ہے۔ "اس زمانہ میں کوئی حقیقی سائنسداں اس کی اہمیت کو یہ کہکر کم نہیں کر سکتا کہ مذہب جیسی کسی شے کا کوئی وجود نہیں اور یہ کسی دوسرے عالم کی چیز ہے۔ یا یہ ایک عجیب ہراس ہے یا لطیف مبنی وجدان یا خوش اعتقادی اور منافرت کا ایک امتزاج ہے۔"

دونوں کے تہذیبی پہلوؤں کے لحاظ سے بھی سائنس اور مذہب کی موجودہ صورتوں میں بڑا اختلاف ہے سائنس نے ہمیشہ خیالی اور عملی آزادی کی حوصلہ افزائی کی ہے اور ذہن کو سوچنے کے لئے آزاد چھوڑا ہے۔ اور اس نے کبھی پرانی روایات کا خواہ مخواہ لحاظ بھی نہیں کیا لیکن مذہبی شعائر اور خصوصاً وہ جو آج ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں رسم و رواج کی زنجیروں میں بری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ ان میں مایوسانہ حد تک قدامت کی بو آتی ہے۔ انھوں نے اس حقیقت سے بالکل چشم پوشی کر لی ہے کہ پچھلی صدیوں میں انسان حیرت انگیز طور پر ترقی کر چکا ہے اور اس کے ذہنی مطالبات کو صرف حکیمانہ قول عقیدہ اور دعائے خیر زیادہ دنوں تک بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ مختلف زمانوں میں مصلحین نے قدیم اور جدید ذہنی میلانات کا اختلاف مٹانے کی کوشش کی مگر محض ایسی تاویلوں سے کب کام چلا ہے؟ اگر "مذہب انسانیت" کی تلاش ہے تو ہمیں۔ طرح نو۔ ڈالنا ہو گی۔

ہم غیر محسوس طور پر "مذہب انسانیت" کے لئے بے چین ہیں۔ مگر ہمیں اب تک یہ نہیں معلوم کہ وہ کیا صورت اختیار کرنے والا ہے۔ سائنس کے اس ترقی یافتہ دور اور مشینوں کے پھیلے ہوئے جال نے ہماری اجتماعی زندگی کی قیمتوں میں بڑا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ دنیا کی تہذیب اب اس منزل پر پہونچ گئی ہے جہاں روایت اور عقیدہ کی سرحدیں ختم ہوتی ہیں۔ اور استدلال کے بغیر کسی بات کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری زندگی کی تلخیوں کو اب شاید آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے اثرات مادۂ فاسد کی طرح خطرناک حد تک پھیل چکے ہیں۔ اس دور میں ایسے مذہبی نظام کی ضرورت ہے جو حالات کی ان پیچیدگیوں میں روحانی اور ذہنی اضطراب کی تسکین کر سکے۔ اس کو بالکل استدلالی بنیادوں پر استوار ہونا چاہئے۔ اس کا مقصد ان تمام شدید اختلافات کی بیخ کنی کرنا ہو گا

جس سے متاثر ہو کر آج ایک مذہب دوسرے مذہب کا اور ایک انسان دوسرے انسان کے خون کا پیاسا نظر آتا ہے۔ اس کو یکسر لچکدار ہونا چاہئے تاکہ وہ نئے خیالات اور نئے نظریوں کو اپنے اندر سمو سکے۔ اپنی روحانی حیثیت میں وہ شخصی رجحانات کو نظر انداز نہیں کر سکے گا تاکہ انسانی ذہن اور انسانی آرزومندیوں کی پوری طرح امداد کر سکے مگر اخلاقی نقطہ خیال سے چونکہ اس کا فرض سماج کی اخلاقی اور مادی فلاح کی پوری پوری نگرانی ہوگا اس لئے اس کا حکم ہوگا کہ اس کے قوانین کی سختی سے پابندی کی جائے۔ اس نظام کے ماتحت خداوندی تصور کے بارے میں ہر شخص کو پوری پوری فکری آزادی دی جائے گی مگر اس کا واحد اور اساسی مقصد انسانیت کی خدمت ہوگا ظاہر ہے کہ موجودہ مذاہب میں سے کوئی بھی اب اس صورت میں جس میں وہ جلوہ فرما ہوتے ہیں معیاری حیثیت کو نہیں پہونچتا۔ مگر اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ موجودہ زمانہ کے تمام نمایاں مذاہب سے قطع تعلق کر لیا جائے ضرورت اس کی ہے کہ ان کے روشن پہلوؤں کی نئی تشکیل کر کے ان میں ہمہ گیر اثریت پیدا کی جائے جو پوری انسانیت کو متاثر کر سکے۔ ممکن ہے کہ اس کو خیال پرستانہ منصوبہ سمجھا جائے مگر اب یہ ایک بھیانک خواب نہیں رہا ہمارے نقطہ نظر میں پوری تبدیلی کی ضرورت ہے تاکہ ظاہر داری اور عصبیت کی اس فضا کو پاک کیا جائے۔

بہت سے شعرا اور مفکرین نے آنے والے انسانی مذہب کا رنگین خواب دیکھا ہے۔ بعضوں کے نزدیک مستقبل ایک "بین الاقوامی جنگ" کا نقشہ پیش کرتا ہے اور کچھ لوگوں کو اس میں آنے والے "عہد سعادت" کی مہک اپنی دلفریبیاں دکھاتی ہے۔ پس کوئی تعجب کی بات نہیں اگر بہت سے حلقوں میں "عالمگیر مذہب" کے تصور کو مضحکہ خیز سمجھا گیا اور دوسری طرف کچھ لوگوں کو مستقبل کی پنہائیوں میں اس روشنی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ مذہبی اور سائنسی معتقدات کے مابین مستقبل قریب میں پھر جنگ آزمائیاں شروع ہو جائیں۔ مگر یہ بھی روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ انسان جتنا زیادہ متمدن ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کی حقیقت اور سکون کی تلاش بڑھتی جاتی ہے۔ اس کی ذہنی صلاحیتوں اور سماجی بلندیوں کا مطالبہ ہے کہ وہ اپنے مذہبی تصورات کو حقیقی اور بہتر صورتوں میں دیکھے جس کا مطمح نظر ایک ایسے عالمگیر مذہبی نظام تک پہونچنا ہے جو روحانی توقعات اور انسانی تفکرات کو ابدی استواری اور ہم آہنگی کے رشتہ میں جوڑ دے۔

مقبول الرحمن صاحب بی۔ اے (آنرز)

مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری

(گذشتہ سے پیوستہ)

مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری پر مجموعی نظر "تنقید پر صرف وہی لکھ سکتا ہے اور دوسروں کو ہدایت کر سکتا ہے جس کا تجربہ وسیع، مطالعہ گہرا اور نظر دور بیں ہو، جو صرف ذوق ہی صحیح نہ رکھتا ہو بلکہ دریائے ادب کا شناور بھی ہو، جس نے ایک مدت کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد ان امور کے متعلق رائے قائم کی ہو اور وہ اس رائے کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور دوسروں کے دل نشیں کر سکتا ہے" (تنقیدات عبدالحق صفحہ ۹۹)

ان تمام شرائط پر مولوی صاحب کے خیال میں صرف مولانا حالی کی ذات پوری اترتی ہے۔ ان کی اس رائے سے تمام و کمال اتفاق کرنے کے بعد ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ حالی کے بعد جس شخص نے صحیح معنوں میں ان کی تنقیدی روایات کو قائم رکھا اور اعلیٰ تنقید نگاری کو جس شخص نے اردو میں رائج کیا وہ خود مولوی عبدالحق صاحب ہیں۔

ایک خط میں مولانا حالی بھی ہمارے خط کی تائید کرتے ہیں اور مولانا کی تنقید نگاری کی داد دیتے ہیں مصنف حیات النذیر نے اپنی کتاب پر مولانا حالی سے ریویو لکھایا تھا لیکن اس کے شائع ہونے سے قبل مولوی عبدالحق صاحب کی تنقید شائع ہو گئی اس پر مولانا نے مولوی صاحب کو لکھا۔

"اب آپ کے ریویو کے بعد اس کی اشاعت کی ضرورت نہیں ہے مضمون کے لحاظ سے میرے اور آپ کے ریویو میں اختصار و اشباع یا ناقص و کامل کے سوا کچھ فرق نہیں"

(رسالہ اردو جولائی ۱۹۳۶ء صفحہ ۴۱۹)

مولانا عبدالحق انگریزی دانی اور جدید علوم خصوصاً فلسفہ اور تاریخ سے بخوبی واقف ہونے کی وجہ سے نئے خیالات اور ترقی یافتہ زبانوں کے جدید ادب سے بہت اچھی واقفیت رکھتے ہیں خصوصاً اصناف ادب کے متعلق وہ بہت گہرا مطالعہ رکھتے ہیں اور تنقید نگاری کے جدید ترین اصولوں کے علاوہ اس

فن کی باریکیوں سے بھی واقف ہیں۔ مولوی صاحب کی نظریں جب کسی چیز پر پڑتی ہیں تو اس کے سنجیدہ اور علمی پہلو پر پڑتی ہیں۔ وہ جب کسی چیز پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو اس مضمون کی ساری وسعت اور پورے ماحول پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اسی لئے آپ کی تنقیدیں بہت مکمل ہوتی ہیں۔

مولانا عبدالحق کی تنقیدیں نہایت محققانہ اور مبصرانہ ہوتی ہیں۔ ان میں ان کی ذاتی تحقیقوں کو بھی جو کہ صحت و سچائی میں مسلمہ ہوتی ہیں بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ریسرچ کی مشان سے مزین ہو جاتی ہیں۔ وہ خود ادبی نکات اور معلومات کا مخزن ہوتی ہیں۔ اور اس طرح دنیا کی بلند ترین تنقیدوں کے معیار پر کامیابی سے پرکھی جا سکتی ہیں۔

مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے تعصب اور تنگ نظری سے بہت بلند ہیں۔ وہ تنقیدی معاملات میں صرف مطالبات ادب کا خیال رکھتے ہیں اور علم سے علم کی خاطر بحث کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی رائے غیر جانبدارانہ ہوتی ہے اور اسی لئے ان کی تنقیدیں قابل وقعت، قابل قدر اور مقبول ہوتی ہیں۔

چونکہ مولانا ایک خاص طرز تحریر کے مالک ہیں جو کہ انتہائی سادہ اور ساتھ ہی ساتھ شگفتہ بھی ہے اور اپنے قلم کو خیالات سے مغلوب نہیں ہونے دیتے۔ اس لئے وہ اپنی وقیع رایوں کو بہت اچھے اسلوب میں لوگوں کے سامنے پیش بھی کر سکتے ہیں۔ جو اپنی جگہ نہایت ہی دلکش اور موثر ہوتا ہے۔

مولوی صاحب میں بزرگی اور سنجیدگی فطری ہے۔ یہی خصوصیات ایک فطری نقاد پیدا کرتی ہیں حق یہ ہے کہ مولانا نے اپنی زندگی کو جس طرح تنقید نگاری کے لئے تج دیا ہے اور اپنی زندگی کا بلند ترین مقصد بنا لیا ہے۔ اس طرح اُردو زبان کیا ایشیائی زبانوں میں کسی نقاد نے نہیں کیا۔

مولانا کے ادبی کارناموں کو اگر یورپ کی ترقی یافتہ زبان کے نقادوں کے مقابلہ میں تولا جائے تو کبھی کسی حیثیت سے بھی کم نہ نکلیں گے بلکہ ان کی تنقیدوں اور علمی کوششوں کے ساتھ ساتھ اگر ان کی تحقیقی معلومات کو بھی شامل کر لیا جائے تو وہ ان میں سے ہر ایک سے بڑھ کر ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مولوی صاحب ایسے ملک اور ایسی قوم میں پیدا ہوئے ہیں جو اپنے خادموں اور رہنماؤں کی صحیح قدر نہیں کرتی اور نہ ان کی صلاحیتوں

سے پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہے ہمیں چاہئے کہ ہم ان کی زیادہ سے زیادہ قدر کریں اور ان کی صلاحیتوں سے ورا پورا فائدہ اٹھائیں۔

ردو زبان و ادب پر مولانا کی تنقیدات کا اثر اور ان کی اہمیت

جس طرح حالی نے اردو ادب میں تنقید نگاری کی بنیاد ڈال کر ہماری زبان کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ اسی طرح مولوی عبدالحق صاحب نے تنقید نگاری کو مال وعروج تک پہنچا کر نہ صرف اردو تنقید نگاری کو ہی دنیا کی بلند ترین زبانوں کے مقابلے میں پیش کیا ہے بلکہ ہماری زبان و ادب کا معیار بلند کر کے اس کو دنیا کی صف اول کی زبانوں کے مقابلے میں ترقی دینے ی کوشش کی ہے اور وہ دن دور نہیں جب آپ کی ان تنقیدی کوششوں سے اردو زبان انتہائی ترقی فتہ زبانوں میں شامل ہونے لگے گی۔ زبان پر تنقید نگاری کے اثر سے بحث کرتے ہوئے ہمیں اس چیز بھی نہ بھولنا چاہئے کہ زبان و ادب کی ترقی میں نقاد کی کوششوں کا اثر زیادہ تر بالواسطہ طور پر ظاہر تا ہے۔ ہم اس کی تنقیدی خدمات کا اس وقت تک صحیح اندازہ نہیں کر سکتے جب تک کہ زبان و ادب کے جودہ ماحول اور جدید ترقیوں کو اس کے کارناموں میں شامل نہ کیا جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ سوال ی پیدا ہوتا ہے کہ کیا زبان و ادب کی تمام تر ترقی صرف تنقیدی کوششوں کا ہی نتیجہ ہوتی ہے؟ اس کا اب یہ ہے کہ اگرچہ زبان اور لٹریچر کی اصلاح و ترقی میں تنقید نگاری کے علاوہ دوسرے عاملین بھی اثر کھتے ہیں اور وہ ماحول تاریخی سیاسی اور معاشرتی حالات ہوتے ہیں لیکن ان موافق حالات سے فائدہ ھانے کی کوشش نقاد کی طرف سے ہوتی ہے اور وہی ادیبوں کو نئی شاہراہیں دکھا کر ترقی کی طرف ے کرتا ہے لہذا زبان و ادب کی ترقی میں نقاد کی کوششوں کو ہی بنیادی کوشش سمجھنا چاہئے۔

اگرچہ عام تنقیدی کوشش نہ کسی ایک فرد کی کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے اور نہ کسی ایک کے بس ی ہوتی ہے لیکن جس طرح سورج کی تمام قوت تمام عالم میں کارفرما ہوتی ہے اور اسی کے گرد تمام سیارے ر لگاتے ہیں اسی طرح ایک مسلمہ نقاد کی شخصیت ہوتی ہے جس کی روح، جس کے خیالات اور جس کا پرتو سے کے دور کے ہر نقاد اور ہر ادیب پر ہوتا ہے۔ اسی کے دم سے ادبی رجحانات قائم و دائم رہتے اور اسی ے اشاروں پر بدلتے اور سنورتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اردو زبان میں عناصر خمسہ کا دور اس کی بین مثال

ہے جس کا محور اُس وقت کے سب سے بڑے مصلح سر سید تھے۔ جن کے خیالات و افکار اور جن کی قوت عمل ان کے معاصرین میں کار فرما نظر آتی ہے۔ اور انہیں کے مشوروں سے اس زمانے کا تحقیقی ادب وجود میں آیا لیکن اس دور کے خاتمہ پر ہم دیکھتے ہیں کہ اردو ادب کے جدید دور میں ایک نیا آفتاب طلوع ہوتا ہے جو زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ گذشتہ محور سے قوت عمل میں کسی طرح کم نہیں جس کی فطری صلاحیتوں اور نقادی میں کسی کو کلام نہیں۔ جن کے خیالات طرز تحریر اور تنقید نگاری کا اثر موجودہ زمانے کے تمام ادیبوں پر نظر آتا ہے۔ اور اس زمانے کے ناقدین بھی انھیں کے پیرو ہیں۔ یہ مولوی صاحب ہی کی شخصیت ہے جو اُردو کی عنان قیادت ہاتھ میں لئے ہوئے ہے اور موجودہ زمانے میں جتنی بھی اُن زبان اور ترقی ادب کی کوششیں ہو رہی ہیں ان سب میں بالواسطہ مولانا کی تنقیدات کا زبردست حصہ ہے۔

زبان و ادب کی ترقی ہے۔ مولوی صاحب نے اگر ایک طرف زبان کی اصلاح کی ہے اور اسے سنوارا ہے دوسری طرف اس کی استعداد کو موجودہ حالات اور علوم جدیدہ کی ضروریات کے مطابق بہت وسعت دی ہے۔ بہت سے متروک الفاظ رائج کئے۔ جہاں ضرورت ہوئی نئے الفاظ کی تشکیل کی اور زبان و ادب کو کسوٹی پر تنقیدی نگاہوں سے پرکھ کر رائج کیا اور اس طرح اسے ایک علمی زبان بنا دیا۔

مولانا کی ایک بہت بڑی ادبی خدمت یہ ہے کہ آپ نے غیر زبانوں کے بلند اور بہتر خیالات افکار کو اپنے قابل قدر مقدموں کے ذریعہ مقبول بنایا جس سے کہ ہماری زبان میں ادب کی نئی شاہراہ کھلیں علمی مسائل سے بحث اور تحقیقی مسائل کا اظہار اردو زبان میں نئی چیز ہے۔ اس کے علاوہ تنقید نگاری افسانہ نویسی، ناول نگاری، مضمون نویسی کا نیا طرز اور علمی مقالوں کے جدید ترین طرز جو یورپ کی زبانوں میں رائج ہیں۔ انھیں کے معیار پر پرکھا جس کی بہترین مثال آپ کے رسالے "اردو" کے مضامین تنقیدیں ہیں۔ یہی مولانا کی سب سے زیادہ قابل قدر خدمت ہے کہ انھوں نے جدید افکار و خیالات سے اردو زبان کے دائرہ ادب میں وسعت پیدا کر دی اور اعلیٰ ادبی مذاق پیدا کیا اگر آپ اپنی بلند اور مقبول تنقید نگاری سے اُردو کو محروم رکھتے تو شاید اُردو زبان کی موجودہ اصلاح و ترقی کا خواب ہم

ہیں دیکھ سکتے۔

اردو لٹریچر میں جدید اضافوں کا ذکر مولوی صاحب خود ایک خطبۂ صدارت میں کرتے ہیں۔

"اس زمانے میں اردو زبان و ادب کے متعلق ہمارے معلومات میں ایک جدید اضافہ ہوا ہے بعض محققین نے بڑی محنت اور تلاش سے قدیم اردو ادب کا پتہ لگایا ہے اور بہت سی ایسی بے بہا اور نایاب کتابیں ڈھونڈھ نکالی ہیں جو اب تک گمنامی میں پڑی ہوئی تھیں اس کی بدولت اردو زبان کی زندگی میں تقریباً تین سو سال کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اور اب اردو زبان و ادب کی تاریخ کے لئے ایک نیا باب کھل گیا ہے" (خطبات عبدالحق صفحہ ۱۵)

لیکن ہم یہ کہیں گے کہ اردو زبان و ادب کی یہ تمام ترقی اور اس کی زندگی میں اضافہ تمام تر آپ کی ہی تنقیدی و تحقیقی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولانا نے کوئی تخلیقی کام نہیں کیا بجز قواعد اردو، اور صرف و نحو اردو کے۔ مگر ہم ان لوگوں سے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ وہ تنقیدی کاموں کی نوعیت کے قائل نہیں۔ اگر وہ ذرا بھی تخلیق کے لئے تنقید کی ضرورت پر غور کریں تو یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ ہر بڑے تخلیقی کام اور تخلیقی دور کے لئے بہت بڑی تنقیدی کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ علاوہ بریں کیا باعتبار ضخامت اور کیا باعتبار نوعیت مولانا کے ادبی کارنامے کسی حیثیت سے بھی کم نہیں۔ مولانا کی تنقیدات اگر ان کے تخلیقی اثرات اور ان کے بالواسطہ فوائد کو نظر انداز بھی کر دیا جائے۔ تب بھی بجائے خود وہ تخلیقی اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ جہاں گہرے مطالعے، مشاہدے اور علمی مباحث سے ملو ہوتی ہیں۔ وہاں ادبی صفات اور نکات سے بھی مزین ہوتی ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ حالی کی طرح مولوی صاحب کی بھی تنقیدیں جہاں ہماری تاریخ ادب میں بحیثیت صنف ایک بہت بڑا کارنامہ اور اضافہ ہیں وہاں ایک عظیم الشان انقلاب کی یادگار بھی ہیں۔ جنھوں نے ہماری شاعری اور نثر کا رنگ ہی بدل دیا۔ عبارت آرائی اور الفاظ کی صناعی کی جگہ سادگی اور سنجیدگی نے لے لی۔ مولانا کی تنقیدوں نے ہمارے افکار و خیالات میں بھی تبدیلی پیدا کر دی۔ بے بنیاد قیاس آرائی اور تخیلات کی بلند پروازی کی جگہ ٹھوس علمیت، معلومات اور حقیقت نگاری برتی جانے لگی غرض یہ کہ مولانا

کی تنقیدیں ہماری تاریخ ادب میں اس دورِ تغیر کی عظیم الشان یادگار اور دراصل اس کی اصل محرک ہیں جس نے ہمارے ادب کو پستی اور کم مائگی کے ابتدائی دور سے نکال کر موجودہ ادبی اور علمی ترقی کے دور میں داخل کیا۔ یہ تنقیدیں دراصل عروج اور کمال کا ایک زینہ ہیں جن کے ذریعہ اردو زبان اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے۔

مولانا عبدالحق ہماری زبان کے ان بلند پایہ ادیبوں میں سے ہیں جن کا احسان ہم رہتی دنیا تک نہیں بھول سکتے۔ اردو زبان و ادب کی موجودہ ترقی ان کی بہت کچھ زیر بار منت ہے۔ ان سے قبل نہ ہماری زبان میں وہ خوبیاں تھیں اور نہ اس کا وہ رتبہ جو اسے اس وقت مولوی عبدالحق صاحب کی تنقیدی کوششوں کی بدولت حاصل ہے۔ اگرچہ آپ کی اصلاحات وہی تھیں اور جادۂ عمل وہی تھا۔ جس کی بنیاد رکھنے کا فخر سرسید اور حالی کو حاصل ہے لیکن اس کی کامیابی اور تکمیل کا سہرا آپ کے سر ہے اور اس حیثیت سے اردو ادب میں مولوی صاحب اپنی تنقیدوں کے ساتھ موجودہ دور کے ہیرو کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

اخلاق الرحمٰن صاحب قدوائی بی، اے (جامعہ)

جان ڈیوی کے فلسفہ تعلیم کا اثر

جان ڈیوی نے ۱۸۹۹ء میں اپنی تصنیف "اسکول اور معاشرہ" میں لکھا ہے کہ اب تعلیمی دنیا میں جو انقلابات رونما ہو رہے ہیں وہ مرکز کشش کو منتقل کر رہے ہیں۔ انقلاب و تبدیلی کی نوعیت کوپرنیکی[1] کی طرح ہے جس نے علم ہیئت کے مرکز کو زمین سے آفتاب کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ آج اسی طرح تعلیمی دنیا میں بچہ آفتاب کی پوزیشن اختیار کر رہا ہے جس کے گرد تمام تعلیمی آلات و ذرائع گردش کر رہے ہیں۔ بچہ مرکز ہے اور اسی کے ارد گرد نظام تعلیم کی تشکیل و تنظیم ہوتی ہے۔ بادی النظر میں یہ الفاظ الہامی معلوم ہوتے ہیں اور ان میں انقلاب کی جھلک نمایاں ہے لیکن یہ حقیقت ہے جو تعلّی و مبالغہ سے بالکل مبرا ہے۔ ڈیوی کی اس تحریر نے تعلیمی دنیا پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے اور اس میں اس کے مندرجہ ذیل اصول خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں۔

۱۔ ڈیوی نے بچہ کے فطری میلانات جبلی رجحانات اور طفلانہ ضروریات پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس نے اساتذہ و معلمین کو اس حقیقت سے روشناس کرایا ہے کہ بچے کی نشو و نما مضامین و نصاب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ مدرسوں میں اسی بات کا زیادہ لحاظ رکھنا چاہئے اور اس کی اشاعت و ترویج کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان خیالات کی داغ بیل اٹھارہویں صدی عیسوی میں ڈالی گئی تھی اور ہربارٹ کے پیرووں نے بھی شوق اور دلچسپی کی اہمیت کو سراہا اور اس کی تلقین بھی کی تھی جو مدرسے ان کی تعلیمات کے اثر سے قائم کئے گئے تھے ان میں یہی روح کارفرما تھی یعنی عہد طفولیت کی اہمیت لیکن انھوں نے جو معاشرتی ورثہ یا ترکہ اور طور و طریقہ پر تاکید اور پانچ درجوں کے رسمی اصول (Formalism of five steps) پر زور دیا تھا۔ اس نے علمیت کے نظم و نسق کو اور زیادہ محدود اور جکڑ دیا۔ اور اساتذہ

---

[1] کوپرنیکس پروشیا کا باشندہ تھا۔ ۱۴۷۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۴۳ء میں وفات پائی۔ وہ دنیا کا پہلا ہیئت داں ہے جس نے اجرام فلکی کی حرکت کی واضح تحلیل کی اور بطلیموس کے خلاف یہ ثابت کیا کہ اس نظام شمسی کا مرکز آفتاب ہے نہ کہ زمین۔

کی پوزیشن کو زیادہ اقتدار اور اہمیت دیدی عملی طور پر اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اب تک خاص کر ہمارے ملک ہندوستان میں چند مضامین و نصاب کا طوطے کی طرح رٹ لینا ہی علمیت کے مرادف خیال کیا جاتا ہے اور یہ اسپرٹ عمومیت کے ساتھ تمام اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جاری ہے۔ ڈیوی نے اس نظریے کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور دنیا کو یہ بتایا کہ مضامین، نصاب اور علمی مشاغل کو منتہائے مقصود تصور کرنا سراسر غلطی ہے۔ وہ تو ایک ذریعہ اور راستہ ہے جس پر قدم رکھنے کے بعد بچے اپنی فطری جبلتوں کی نشو ونما اور قدرتی رجحانات کی افزائش اور تشکیل کر سکتے ہیں۔ اور ان کی جسمانی اور ذہنی قوتیں حساس و بیدار ہو سکتی ہیں۔ ڈیوی کے نقطۂ نظر سے مدرسہ کا یہ فرض عین ہے کہ وہ بچے کی بالیدگی اور ترقی کو معاشرتی ماحول اور اجتماعی فضا میں پوری آزادی سے نشو ونما پانے اور معاشرہ کے سرچشموں، علوم و فنون، مشاغل اور آرٹ سے پوری طرح سیراب ہونے دے کیونکہ سماج ایک جیتا جاگتا ماحول ہے۔

۲۔ ڈیوی کا اعتقاد ہے کہ تعلیم تجربات کے حاصل کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اسی خیال کو اپنی تصنیف "بچہ اور نصاب" میں یوں ظاہر کیا ہے "نفس مضمون کو خارجی اثر سے بچوں کے اس طرح ذہن نشین کرنا کہ وہ دماغ میں گھر کر جائے ہرگز ہرگز ممکن نہیں۔ سیکھنا موثر ہے (بغیر بیرونی اثر کے)۔ اس کی مثال عضوی ہضم کی سی ہے جو اندر سے شروع ہوتا ہے" وہ اپنی تصنیف "جمہوریت اور تعلیم" میں اسی حقیقت کو اس طرح بے نقاب کرتا ہے کہ "تعلیم تجربات کی مسلسل تعمیر نو کا نام ہے اور تجربہ کی از سر نو تشکیل و تجدید اجتماعی و معاشرتی آسودگی اور رضامندی کو وسیع اور عمیق کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ افراد میں اس کے تجربے کے طور طریقہ پر قابو پانے کی صلاحیت بھی پیدا ہوتی ہے۔"

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تعلیم تجربہ کے ہم معنی اور مرادف ہے اور جو کچھ ہم سیکھتے ہیں وہ ہماری عملی جدوجہد کا ثمرہ ہے تو مدرسوں کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ وہ ان تمام مشاغل کو مہیا کریں جن کے بغیر مدرسے تعلیمی چمنستان اور چشمۂ رواں نہیں بن سکتے۔ مدرسوں کا کام اور ان کی حقیقت اور اہمیت کا اندازہ صرف اس طور پر لگایا جا سکتا ہے کہ طلباء میں یہ استعداد و قوت پیدا ہو جائے کہ وہ نازک مواقع سے دوچار ہونے اور نئے تجربات کے پیش آنے کے باوجود ثابت قدم اور مستحکم رہیں، اور گذشتہ آزمودہ تجربات کی مدد سے

زمانے کے جدید مواقع اور پیچیدہ حوادثات کو ملیع و منقاد کریں اور نہایت اطمینان، سکون اور خندہ پیشانی سے مشکلات کی گتھیوں کو سلجھائیں۔

دانائی اور غور و فکر انسان کی قابلیت و لیاقت کا سنگ بنیاد ہے۔ بغیر اس کے کوئی شخص پیش آنے والے نئے واقعات پر نہ تو قابو پا سکتا ہے نہ گذشتہ تجربات کے نتائج سے کوئی خاص استفادہ کر سکتا ہے اور نہ نئے پیچیدہ مسائل کی گرہوں کو کھول سکتا ہے۔ بہت کم اسکولوں میں اس بات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ بچوں کی دماغی نشو و نما مکمل طور پر ہو سکے اور ان کی قوت فکریہ پوری آزادی کے ساتھ ترقی پذیر ہو کر اعلیٰ مدارج تک پہونچ سکے۔

غور و فکر کا صحیح مقصد انسانی تجربات کی تعمیر و تشکیل ہے اور انسان مشکل مسائل سے دو چار ہوئے بغیر قوت فکریہ کو معرض عمل میں نہیں لا سکتا۔ ڈیوی کا خیال ہے کہ انسان اسی وقت غور و فکر کرتا ہے جب پیچیدہ حالات اور نئے مسائل و سوالات کا پہاڑ اس کے سامنے حائل ہو جاتا ہے۔ اور اس کی دشواریاں معمے سے زیادہ مشکل اور فلسفہ سے زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہیں اور ایسی ہی حالت میں کسی عوض اور چارہ کار کی تلاش لازمی ہو جاتی ہے۔ تشویش و پیچیدگی کے علاج کا مطالبہ اس کی قوت فکریہ میں عزم و استقلال پیدا کرتا ہے اور اس طرح قوت فکریہ انسان کا ایک فطری جزو بن جاتی ہے۔ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر — تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ
یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام — میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خون دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات — فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ

۴۔ ڈیوی کا عقیدہ اصول "شوق و کوشش" یعنی (Interest & Effort) قابل توجہ ہے جس کا گہرا اثر تعلیمی دنیا میں عملی طور پر پڑا ہے اور جو اس کے نظریہ تعلیم بمعنی تجربہ کا نتیجہ و ماحصل ہے۔ لفظ "شوق" کا رواج تعلیمی دنیا میں اسی کی کاوش ذہنی کا نتیجہ ہے۔ اس کے نزدیک "شوق و کوشش" میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ اپنی تصنیف "شوق و کوشش" کے صفحہ ۱ میں اسی خیال کی توضیح و تشریح کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ عام طور پر یہ فرض کیا جاتا ہے کہ کسی شئے، خیال اور انجام کی خارجیت کو مسخر کرنا خودی (اہم

کا کام ہے۔ کیونکہ شئے یا انجام عام طور پر خودی سے جدا اور الگ ہوتا ہے۔ اس کو دلچسپ بنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مصنوعی ترغیبات و تحریکات سے اپنے احاطہ میں لانے کی حاجت ہوتی ہے اور وہی تحریص سے توجہ مبذول کی جاتی ہے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ وہ شئے احاطہ خودی سے باہر ہے اس لئے محض قوت عزم و ارادہ سے اپیل کی جائے۔ اور سعی و کوشش کو جس میں "شوق" کا شائبہ بھی نہ ہو مرکو تقل بنایا جائے۔

تمام علمائے تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ "شوق کا اصلی سرچشمہ یہ ہے کہ جس بات یا واقعہ کو سیکھنا یا جس عمل کو پیش کرنا ہو اس میں اور ترقی پذیر نفس (self) میں تطابق اور ہم آہنگی پائی جائے۔ اس شوق کی ترقی کا دارومدار عامل یعنی خود بچہ) کی ذاتی بالیدگی پر ہے اور اسی وجہ سے اس کا آمرانہ تقاضا ہوتا ہے۔ اگر عامل (یعنی بچہ) کو اپنی شخصیت کی تکمیل مقصود ہے۔ اگر تطابق (یعنی نفس اور شوق کی غیر شعوری ترقی کا تعابق) کی اس حالت کو ایک مرتبہ حاصل کر لیا جائے تو اس وقت نہ تو ہم کو قوت ارادہ سے اپیل کرنی پڑے گی اور نہ اس بات پر زیادہ وقت صرف کرنا پڑے گا کہ ان اشیاء کو دلچسپ بنائیں۔

ڈاکٹر فرینک میک مرے ڈیوی کے "شوق و کوشش" کے متعلق لکھتا ہے کہ بہت سے سن رسیدہ لوگ اس کو مجذوب کی بڑسے زیادہ خیال نہ کریں گے۔ پرانی لکیر کے شیدائیوں کا فتویٰ ہوگا کہ یہ خیال محض مذاق و استہزا ہے۔ کرنل پارکر نے ڈیوی کے خیال "شوق" سے بہت متاثر ہو کر غیر معمولی فریفتگی ظاہر کی۔ اس نے اس بات کو محسوس کیا کہ بچے کو بجائے نصاب و مضامین کا ماتحت بنانے کے خود مرکز و محور بنانا ترقی کی ایک نئی شاہراہ ہے اور اس صراط مستقیم پر گامزن ہونا کامیابی و فلاح کی دلیل ہے۔

۴- ڈیوی کا ایمان ہے کہ مدرسہ سماجی ادارہ ہے اور ہماری تمام اجتماعی و عمرانی ترقی کا وراثتاً ایک حصہ ہے۔ مدرسہ ایک چھوٹی جماعت اور سوسائٹی کا دوسرا نام ہے جس کا طور و طریق بعینہ جماعت کا چربہ اور نمونہ ہوتا ہے۔ وہ کسی طرح خارجی دنیا کی راہ و روش سے علیحدہ اور متضاد نہیں ہوتا۔ ۱۸۹۹ء میں ڈیوی نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ مدرسہ ایک چھوٹی سی دنیا ہے جس میں سماج کی زندگی کا بہترین مرقع ہونا چاہئے جس میں سماج کے انواع و اقسام کی حرفت و صنعت کا پورا انعکاس ہو جس میں چمنستان زندگی کے رنگ برنگ کے پھول اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ ہوں اور جس میں آرٹ، تاریخ، سائنس، فلسفہ، فنون لطیفہ اور

دیگر مفید علوم کی تازہ اور پاکیزہ روح موجود ہو یعنی دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مدرسہ کو سماج کا آئینہ اور نقش ثانی ہونا چاہئے ۔

جب مدرسہ میں ایسی چیزیں جاری ہوں گی اور بچوں کی ایسی تربیت اور نشو ونما ہوگی کہ وہ مدرسہ کی چار دیواری کے اندر معاشرہ کے باکار ممبر بننے کی صلاحیت اور لیاقت پیدا کر سکیں گے اور ان میں ایثار، انکسار، خدمت خلق، خود اعتمادی اور اپنی مدد آپ کرنے کی استعداد ہوگی اور کشتی حیات کے کھینے کی خود مہارت تامہ حاصل کرلیں گے اور بحر زخار کے تلاطم و تموج کی بالکل پروا نہ کریں گے اور منزل مقصود تک پہونچنے میں شجاعت اور عزم واستقلال سے کام لیں گے، تو ہم سوسائٹی کی خدمت میں ایسے افراد پیش کرسکیں گے جو فخر وستائش کے قابل، احترام و عزت کے لائق اور معاشرہ کی زندہ یادگار ہوں گے۔ مدرسہ کا حقیقی مقصد بچوں میں قوت تعمیر و تخلیق کا ابھارنا ہے اور ان کی مخفی تخلیقی قوتوں کو پایۂ تکمیل تک پہونچانا ہے

اخلاقی تعلیم ڈیوی نے اخلاق پر بہت زور دیا ہے اور اس کے خیالات کا اثر اس شعبہ میں بہت گہرا پڑا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تعلیم کا صحیح مقصد ہر فرد میں اتنی قوت فکریہ پیدا کر دینا ہے کہ وہ اپنی کشتی حیات کو سماجی افادہ کے لئے پار لگا سکے۔ اور اس کی شخصیت کا وجود جماعت و معاشرہ کے لئے مفید ثابت ہو۔ وہ پند ونصائح کے رسمی لکچروں اور وعظوں کو ناقص سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک تعلیم و اخلاق کی مفارقت کا باعث علم و عمل کا نفاق ہے۔ انسان کا اخلاق اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب وہ اس کو ذاتی تجربہ کے ساتھ ساتھ حاصل کرے اور تجربہ و عمل سے وہ (یعنی اخلاق) اس کی فطرت ثانیہ بن جائے۔ وہ لکھتا ہے کہ بعض اخلاقی کیفیات کا سماجی تعلق ایسا ہوتا ہے کہ ہم ان کو اخلاقیات کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جن میں راستبازی ایمانداری، تقویٰ، حیا، رواداری اور ہر دل عزیزی کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ وہ مرکزی فضائل ہیں جن کے گرد دوسری خوبیاں گردش کرتی ہیں۔

اخلاقیات کے دائرے میں نیک کرداری، خصلت اور سیرت شامل ہے۔ اور سیرت بحیثیت مجموعی انسانیت کے مرادف ہے۔ صفات حمیدہ سے متصف ہونا اسی وقت ممکن ہے جبکہ عملی زندگی میں دوسروں سے میل جول، ربط و تعلق اور لین دین کیا جائے اور فطری قوتوں کو اعلیٰ مدارج تک پہونچانے کی انتھک

کوشش کی جائے۔ مدرسوں اور اسکولوں کا نظم ونسق، نصاب اور تعلیم وتدریس سب اسی وقت قابل قدر ہو سکتے ہیں جب ان میں سماجی واجتماعی روح کارفرما ہو۔ تادیب، فطری ترقی، تمدن وتہذیب، سماجی استعداد وہ اخلاقی صفات ہیں جن سے ہر انسان کو متصف ہونا چاہئے۔ صرف ذاتی خوبی ایک بے معنی شئے ہوگی اگر وہ دوسروں کے لئے مفید اور کارآمد نہ ثابت ہو۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے کہ خدمت خلق حسن اخلاق کا بہترین مظہر اور کمال تزکیہ نفس کا اعلیٰ ترین معیار ہے۔

عبادت بجز خدمت خلق نیست

ڈیوی نے اخلاقی سیرت کے تین اہم اور لازمی اجزا قرار دئے ہیں اور بتایا ہے کہ اخلاقی سیرت کی تعمیر وتکمیل میں انھیں صفات کو شعوری طور پر اپنے سامنے رکھنا چاہئے۔

۱۔ قوت عمل یا کارکردگی کی صلاحیت[۱]: ہم اکثر گفتگو میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی سیرت بہت مضبوط ہے یا بہت پختہ ہے۔ اس سے ہماری یہ مراد ہوتی ہے کہ اس میں یہ قابلیت ہے کہ جب وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو اس کے انجام دینے میں استقلال، محنت، جرات اور حوصلے سے کام لیتا ہے۔ یہ فعالی صفات ہیں جو بحیثیت مجموعی ہماری سیرت کے اس رخ کو ظاہر کرتی ہیں جو ہمیں مشکلات پر قابو پانے میں مدد دیتا ہے اور مایوسیوں اور شکستوں کا مقابلہ کرکے آخر کار کامیابی کی منزل تک پہونچاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کی طبیعت میں یہ عنصر نہ ہوگا وہ اپنے ارادوں کو عمل میں نہیں لا سکتا۔ عام اس سے کہ وہ ارادے اچھے ہیں یا برے۔ ہر ارادے اور عمل کے درمیان بالعموم ایک طویل منزل حائل ہوتی ہے جس میں انسان کو کاوش اور جد وجہد سے کام لینا پڑتا ہے۔ وسائل کی تنظیم کرکے اور مادی اور نفسی حالات کو قابو میں لاکر اپنے ماحول کو اپنا مددگار بنانا پڑتا ہے۔ جو شخص صرف نیک ارادوں کی پونجی لے کر زندگی کے سفر پر روانہ ہوتا ہے اس کا خدا ہی حافظ ہے۔ ہم اس کی نیک نیتی کی ایک حد تک تعریف کر سکتے ہیں لیکن ہمیں یہ توقع نہیں ہوتی کہ وہ منزل مقصود تک پہونچ جائے گا...... ہر تندرست اور صحیح دماغ رکھنے والے بچے میں فطرتاً یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ کچھ کرکے دکھائے کسی طرح اپنے عمل کا سکہ اپنے ماحول پر جمائے۔ یہ وہی خواہش ہے جو چھوٹے بچوں کے کھیلوں میں ان کی تعمیر وتخریب میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس تقاضائے عمل کی حقیقت کو

[۱] Force or Efficiency in Execution

سمجنا اس کو ایسے مشاغل میں استعمال کرنا جو تعلیم و تربیت کے مقاصد میں معین ہوں اس کو حسب توقع ابھارنا اور راہ پر لگانا تاکہ بچہ میں مفید عادتیں پیدا ہوں یہ مدرسہ اور معلم کا فرض ہے۔

• قوت عمل کو قابل قدر اخلاقی مقاصد کے ساتھ وابستہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ معاشری نقطۂ نظر سے مفید کاموں میں صرف ہو۔ اس کے لئے دو اور صفات کا ہونا لازمی ہے یعنی قوت فیصلہ (Judgement) اور ذکاوت احساس (Delicate personal Sensitiveness)"

۲۔ "انسانی سیرت کا عقلی اور ذہنی پہلو اس وقت مکمل ہوگا جب انسان کی قوت فیصلہ کی تربیت کی جائے یہ قوت محض علم تک محدود نہیں بلکہ عقل اور اس کے استعمال کی صلاحیت پر منحصر ہے۔ جب ہمارا علم مربوط اور منظم ہو۔ جب وہ ذہن میں روشنی پیدا کرے تکمیل مقاصد میں مدد دے۔ جب اس کی بدولت ہم میں معاملات کی سمجھ، احساس تناسب، موقع شناسی اور مصلحت اندیشی پیدا ہو جائے۔ اس وقت ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم فیصلے کی قوت رکھتے ہیں۔

۳۔ تیسری صفت جو عمدہ سیرت کا جزو ہے جذبات سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر کسی شخص میں قوت عمل اور قوت فیصلہ دونوں موجود ہوں مگر وہ ذکاوت احساس سے محروم ہو تو وہ معاشرے کا مفید رکن نہیں بن سکتا لوگ اپنی عقل اور علم کو نہایت قابلیت کے ساتھ صرف اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور چونکہ ان میں قوت عمل ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ تاریخ میں بہت سے ایسے بادشاہوں کی مثالیں ملتی ہیں اور خود ہم میں سے ہر ایک کو ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہی ہے جن کو معاشر اغراض و مقاصد سے کوئی دلچسپی نہیں جن کو اخلاق کے اصول بالکل مجرد اور دور از کار معلوم ہوتے ہیں جن میں روح انسانی کی بلند تر آرزوؤں کی مطلق حس نہیں۔ وہ تالاب کے مینڈک کی طرح اپنے محدود دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا........ معلم کا اور مدرسے کی تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہئے کہ طلبا کے جذبات کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان میں ذکاوت احساس پیدا ہو، وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوں جب انہیں کسی اہم معاشری تحریک یا اخلاقی مسئلے سے سابقہ پڑے تو وہ اس کی طرف دل سے توجہ کریں اور اس پر محض اپنے شخصی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اجتماعی مفاد کے لحاظ سے غور کریں۔ ہر کام میں اس بات کو مدنظر رکھیں

کہ اس کا رد عمل دوسروں پر کیا ہوگا۔ اس میں ان کی حق تلفی تو نہ ہوگی، ان کے جائز جذبات کو ٹھیس تو نہیں لگیگی جب انسان کے نفس میں ذکاوت احساس کی بدولت ہمدردی اور فراخدلی کی صفات پیدا ہوجاتی ہیں تو وہ اپنی ذات کے تنگ دائرے سے نکل کر تمدنی اغراض ومقاصد سے آشنا ہوتا ہے اور اس کا شخصی نصب العین اجتماعی نصب العین سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے۔ اس میں اخلاق کی وہ امتیازی شان پیدا ہوجاتی ہے۔ جس کا مقتضا یہ ہے کہ اپنے آپ میں اور دوسروں میں بے جا فرق نہ کرے اور اپنی بھلائی اور بہتری ان مشاغل میں تلاش کرے جن کا نتیجہ معاشری لحاظ سے قابل قدر ہو۔

الغرض جن مدرسوں میں علم مسلسل عمل اور پیہم مشاغل کے ساتھ سکھایا جاتا ہے وہاں کے ماحول میں سماجی زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے وہ ایک چھوٹا سا معاشرہ ہوجاتا ہے جس میں بیرونی زندگی کے تجربات سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ اس چھوٹے معاشرے میں بچے میل جول اور ارتباط و اختلاط کے باعث زندگی کے نئے نئے تجربات اخذ کرتے اور مستفید ہوتے ہیں۔ اس سرچشمہ سے سیراب ہوکر ان میں یہ صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ سماجی زندگی میں مستعدی سے حصہ لے سکیں۔ وہ اس قابل بن جاتے ہیں کہ دنیا کے تغیرات کے دوش بدوش چل سکیں اور ضرورت کے مطابق اپنی زندگی میں بھی تغیر وتبدل کرسکیں۔ یہی حسن اخلاق ہے۔ اسی کا نام سماجی افادہ ہے اور یہی علم وعمل کا ارتباط و اتحاد ہے۔ انہی خصائص کو مدرسوں کا منتائے مقصود ہونا چاہیئے تاکہ یہ فردکی اخلاقی زندگی کے رگ وریشہ میں پوری طرح سرایت کرجائیں اور اس کی سرشت کا ایک جزو لاینفک بن جائیں۔

<u>سماجی لیاقت وصلاحیت</u>| ڈیوی اور بیگلے، نظریۂ سماجی لیاقت (social efficiency) کے بہت بڑے علمبردار ہیں۔ ان دونوں امریکی مفکروں نے اس خیال کو اپنی تحریروں کے ذریعہ سے پھیلایا ہے۔ ان کی تمام تحریریں اسی خیال سے لبریز ہیں۔ ڈیوی نے خاص طور پر "سماجی لیاقت" کی بڑی اشاعت کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہر بچے کو سماجی لیاقت کے لئے تیار کرنا اسکول کا فرض ہے۔ وہی شخص سماجی لیاقت رکھتا ہے جو جونک کی طرح دوسروں کا خون چوس کر زندہ نہیں رہتا بلکہ خود اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہوکر اپنی زندگی کا خالق ہوتا ہے۔ اس میں یہ بھی صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ وہ اپنی کامیاب زندگی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگی کی ترقی میں روڑے نہ اٹکائے۔

بلکہ دوسروں کا ہاتھ بٹانے میں ہر وقت مستعد رہے اور سماج کی ترقی میں ہر ممکن کوشش کرے۔

بقول ڈیوی "سماجی لیاقت" دو عناصر کا مجموعہ ہے۔(۱) معاشی لیاقت (۲) مدنی لیاقت۔ جب تک یہ دونوں اوصاف ایک انسان میں جمع نہ ہو جائیں اس وقت تک ان کو "سماجی لیاقت" کے نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ معاشی لیاقت اسی وقت ممکن ہے جب ہم فطری قوتوں کو سماجی افادہ کے لئے پوری طرح استعمال کریں۔ سماجی لیاقت میں صنعتی و حرفتی آسودہ حالی اور قابلیت شامل ہیں۔ ہر انسان کے لئے ذریعہ معاش حاصل کرنا لازمی ہے اور وہ بغیر اپنے پیٹ کی فکر کئے سماج کے لائق نہیں بن سکتا۔ جن ذرائع سے روزی کمائی جاتی اور خرچ کی جاتی ہے ان سے باہمی تعاون اور لین دین پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ جو شخص یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ اپنی ذات اپنی اولاد اور متعلقین کے لئے روزی حاصل کر سکے اور دوسروں کے سہارے زندہ رہتا ہے تو وہ مفت خوار اور طفیلی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اسی لئے وہ تجربات زندگی سے محروم رہتا ہے جو انسان کے بہترین معلم اور رہادی ہیں۔ اگر وہ صنعتی پیداوار کے صحیح مصرف و استعمال کو نہیں سیکھتا تو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ اپنی شخصیت کو ضائع کرنے کے علاوہ دوسروں کی مفید دولت کو برباد نہ کر دے اور ایک مچھلی کی طرح سارے تالاب کو گندہ نہ کر دے۔

جمہوری نقطہ نظر سے ہر انسان کا یہ فرض عین ہے کہ وہ اپنی زندگی اور قسمت کا مختار کل بن جائے اور اپنی زندگی کی ایک منزل مقصود ٹھہرائے ؎

کچھ مقصد لے کر آتا ہے اس دنیا میں جو آتا ہے　　　محروم عمل جو رہتا ہے وہ جیتے جی مر جاتا ہے

عموماً لوگ اس اصول کے خلاف کسی ایسے بہتر پیشہ اور بہتر روزگار کو اختیار کرتے ہیں جس میں فطری رجحانات اور جبلی قوتوں کا مطلق لحاظ نہیں کیا جاتا بلکہ دولت اور موروثی پیشہ کو جانچ کا طریقہ ٹھہرایا جاتا ہے۔

"مدنی لیاقت" کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ لوگ اس قابل ہو جائیں کہ انسانوں اور تدابیر کو نہایت عقلمندی سے جانچ سکیں، قانون کے بنانے اور نافذ کرنے میں دانستہ حصہ لے سکیں۔ یہ انسان کی ذہنی تربیت کا بہترین ذریعہ ہے۔ اسی ذریعہ سے انسان اپنی فطری قوتوں کو عملی طور پر استعمال کر سکتا ہے یہی انسان میں باہمی تعاون اور اشتراک عمل کا احساس پیدا کرتا ہے اور اسی طرح ایک انسان دوسرے انسان کی انفرادی اہمیت کو عملی طور پر سمجھتا ہے۔ تجربات کا مبادلہ ہوتا ہے۔ قوم کی سماجی بیداری میں حصہ لینے کے جذبات موجزن ہوتے ہیں۔ انسان کو دوسرے انسان کے تجربات سے مستفید ہونے کا زرین موقع

ملتا ہے اور اس طرح سے کام بہتر طریقہ پر انجام پاتا ہے۔ اشیا کا اختراع، آرٹ سے حظ اٹھانا، فنون لطیفہ سے تازگی حاصل کرنا، فرصت کے وقت کو صحیح استعمال کرنا، دولت کا موقع و محل سے خرچ کرنا، ضرورت کے وقت مستعد رہنا اور اپنی تمام قوتوں کا بحیثیت مجموعی بہتر استعمال کرنا مدنیت کے مرادف و ہم معنی ہے۔ الغرض حقیقی مدنیت سے مراد داخلی اشتراکیت، عملی شائستگی اور وسیع النظری ہے جو سماجی طبقات کی خلیج کو فنا کر دیتا ہے جو تجربات کی آمد و رفت کو نہیں روکتا اور جس میں ہمدردی، خوش مزاجی، بھلائی اور نیکی شامل ہیں۔

بگلے کے نقطۂ نظر سے: سماجی لیاقت، وہ معیار ہے جس سے تعلیمی ذرائع ان تمام تجربات کا انتخاب کر سکیں جو افراد کے ذہن نشین کرتا ہوں۔ یہی میزان ہونی چاہئے تاکہ جو خصائل و عادات بچے اسکولوں میں سیکھیں وہ ان کی زندگی میں سماجی لحاظ سے مفید ہوں۔

برٹرینڈ رسل جو انگلستان کا بہت بڑا مفکر ہے وہ اپنی تصنیف "اجتماعی نظم اور تعلیم" میں "تخلیقی مدنیت" کے پانچ اوصاف بیان کرتا ہے جس سے متصف ہو کر انسان مکمل شہری کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔

۱۔ قوت اشارہ (Initiative) یعنی ہر تحریک اور سماجی کام میں پیش قدمی کرنے کی صلاحیت تاکہ ہر اجتماعی افادہ کے لئے ملک کا ہر شہری اپنے فرائض کا احساس کر کے اس پر عملی قدم اٹھائے۔

۲۔ قیادت (Leadership) یعنی ملک کی سیاست اور تمدن کو برقرار رکھنے کیلئے دوسروں کا دست نگر نہ ہو بلکہ ہر شہری میں یہ اسپرٹ موجود ہو کہ اگر قوم کے جہاز کا ناخدا مر جائے تو وہ اس سے بہتر و لائق شخص کی خدمت کو پیش کر سکے گا ؎

اذا سید منا خلا قام سید ۔ قؤول لما قال الکرام فعول

۳۔ تادیب و انضباط (Discipline) یعنی ایک ایسے اصول و نظم کے ماتحت کام کرنا جو سماج کے افادہ کے لئے ناگزیر ہو اور جس سے اجتماعی شیرازہ منتشر نہ ہونے پائے۔

۴۔ اتحاد و اشتراک عمل (Cooperation) یعنی سماج و قوم کی خدمت باہمی تعاون اور اشتراک عمل سے کرنا تاکہ انفرادی نشو و نما کے ساتھ ساتھ قوم و ملک کی بھی ترقی ہو اور ہر شہری میں خود غرضی کے بجائے ہمدردی و ایثار کے جذبات پیدا ہوں۔

۵۔ رواداری (Tolerance) یعنی دوسروں کے جذبات و اختلافات کا لحاظ رکھنا اور ان کو آزادی رائے، آزادی تقریر اور آزادی عمل دینا تاکہ چمنستان قوم کی آبیاری ہو سکے ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن ۔ اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

(ضیاء الدین احمد صاحب الٰہ آبادی، ایم۔اے)

اقبال کا ذہنی ارتقا

اقبال عہد حاضر کا سب سے بڑا شاعر ہوا ہے جس کے افکار کے نغموں نے رنگ و آب شاعری کے طلسم کو ایک نئے انداز سے باندھا اور جس کے خیالات کی بلند پروازی نے ادب کے خزانوں کو بھر پور کر دیا ہے خیالات کی بوقلمونی ہر مرتبہ ایک نئی ادائی شان کے ساتھ مختلف پیرایوں میں جلوہ گر ہوتی ہے اور زمین شعر میں وہ گل کھلاتی ہے جس میں دائمی کشش، حسن اور سحر آفرینی کے عناصر ملے جلے ہوتے ہیں۔ وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا اصول اس کے اشعار میں پڑھ کر صاف سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس کے تخیلی پیکروں میں سچا رنگ روپ ہوتا ہے۔ ان میں توانائی بھی ہوتی ہے صداقت بھی، حسن بھی ہوتا ہے کشش بھی، لطافت بھی ہوتی ہے موسیقیت بھی لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ اعجاز ہوتا ہے جو اپنے نفس گرم سے "خاک ہزار سالہ" میں زندگی کا احساس اور گرمی، حرارت اور گداز پیدا کر دیتا ہے اور زندگی کی ایسی لہریں دوڑ جاتی ہیں جن سے دل گرفتہ غنچوں کی گرہیں کھل جاتی ہیں اور نغموں کے روح پرور ارتعاش سے درون لالہ بھی تازہ ہو جاتا ہے۔ ان میں ایک الہامی کیفیت ہوتی ہے، ایک سرمدی نشہ ہوتا ہے، ایک بے پے کی مستی لیکن اس سے خود فراموشی کی بجائے خود شعوری کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ شام پسندی کے بجائے تفاعل پسندی کا عنصر طاقتور ہو جاتا ہے۔ قنوطیت کے بادل چھنٹ جاتے ہیں۔ رجائیت کی سحر طلوع ہونے لگتی ہے، سینوں میں تمناؤں کی فروزاں آگ مشتعل ہو جاتی ہے۔ زندگی میں حسن اور حسن میں زندگی نظر آنے لگتی ہے۔ آتش نفس تیز تر ہو جاتی ہے، ممکنات زندگی کا میدان وسیع ہو جاتا ہے اور دل کیف و مستی کی تہ میں ڈوب کر جب ابھرتا ہے تو قوت، حیات اور امید سے لبریز ہو جاتی ہے۔

اس کے ہر خیال میں ایک نئی شان اور ہر بات میں ایک نیا رنگ ہے۔ اس میں حدت بھی ہے اور خلاقی بھی، اوج بھی ہے اور تنومندی بھی۔ خون تازہ بھی اور حقیقت پژوہی بھی۔ اس کے ہاں محض الفاظ کی صنعت کاری نہیں بلکہ رنگ و آہنگ، کیف و کم اور خط و خال کے ایسے ایسے حسین مرقعے ہیں جن میں سے زندگی جھانک جھانک کر دیکھ رہی ہے اور یہی اس کی بلندی کی دلیل ہے۔

اقبال کے ابتدائی اشعار میں داغ کی شوخ بیانی، جدت اور شیرینی صاف نظر آتی ہے۔ اس کی تصویروں میں وہی بانکپن، وہی رعنائی اور وہی دلکشی پائی جاتی ہے جن میں داغ کا انداز بیان سمویا ہوا ہے لیکن چونکہ اقبال نے فلسفیانہ طبیعت پائی تھی اس لئے غالب کے کلام کے اثر نے اسے اور چمکا دیا اور ان کے ذہنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہ حکیمانہ طریق فکر بڑھتا گیا۔ لیکن شاعر کی روح نے اسے شعریت کے سانچے میں ایسا ڈھالا کہ اس کی شان انوکھی ہوگئی حالی کے دردِ دل نے بھی اقبال کی رگ جاں کو متحرک کیا اور چونکہ اقبال کو بھی ایک سوئی ہوئی قوم کی درماندہ رگوں میں خون حیات دوڑانا تھا اس لئے اس کی لے نے بھی یہی طرز اختیار کیا۔ مگر اقبال ایک رجائی شاعر ہے۔ اور قوم کے سامنے ایک بلند اور امید افزا مطمح نظر پیش کرتا ہے۔ اس لئے اس کے اشعار ملال و زاری اور حزن و یاس کے عناصر سے آزاد ہیں۔ بلکہ ان کی بجائے ان میں امید اور زندگی کی حرارت اور سوز ہے لیکن جس طرح ہر بڑا شاعر قوت تخلیق کا مالک ہوتا ہے اسی طرح اقبال نے ان تینوں شاعروں کے اثرات کو اپنی فطرت میں اس طرح سمویا۔ اور اپنی انفرادی ذہنی اپج سے اس طرح چمکایا کہ اس کی راہ سب سے الگ اور سب سے پرشوکت نظر آتی ہے۔ اسکے ہاں داغ کی زبان، غالب کا فلسفہ اور حالی کا درد اور تپش حل ہو کر موزوں قالب میں جلوہ گر ہو گئے ہیں۔

اقبال کے ابتدائی کلام کے مجموعہ "بانگ درا" میں داغ، غالب اور حالی پر بڑی نظمیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال ان تینوں کا کس حد تک رہین منت ہے اور اس کے قلب کی گہرائیوں میں احترام و عظمت کے کتنے لطیف جذبات ہیں۔ "بانگ درا" میں شاعری کے تین دھارے الگ الگ بہتے نظر آتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر جو ابھی پر تول رہا ہے آئندہ کن بلندیوں پر پرواز کرنے والا ہے۔ ان تینوں دوروں کو سامنے رکھنے سے تخیل کے تدریجی ارتقا کا نقشہ صاف نظر آجاتا ہے۔ ہر نقش ثانی نقش اول سے زیادہ پختہ ہوتا ہے اور ایک دور کی خامیاں دوسرے دور میں رفع ہو جاتی ہیں جو نقش پہلے دھندلے اور پھیکے ہوتے ہیں وہ ذہن کی نشو و نما کے ساتھ روشن، جاذب اور دلفریب بن جاتے ہیں اور بڑھتے بڑھتے ایک تصویر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

اقبال کے پہلے دور کی نظموں میں سب سے پہلی نظم "ہمالہ" ہے اس میں خیالات انگریزی ہیں اور زبان پر فارسی کا رنگ غالب ہے۔ تخیل بے انتہا حسین ہے۔ سادگی اور سلاست کے ساتھ رعنائی اور زیبائی کی

جھلکیاں شاعر کے مصورانہ کمال کی غمازی کر رہی ہیں۔ اس کے الفاظ قوس قزح کی طرح رنگین اور دلکش ہیں۔ اور خیالات کا تسلسل موسم بہار کی رنگا رنگ دل آویزیوں کی طرح دلپذیر ہے۔ شاعر کے دل میں وطن کی محبت کے جذبات بھی موجیں لے رہے ہیں اور اس کی روح اس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ یہ نظم پہلے دور کی نظموں کی خصوصیات کا آئینہ ہے۔ منظر کشی جس میں اقبال کو خاص مہارت حاصل ہے اس میں موجود ہے۔ ادبی مصوری کا یہ اچھوتا نمونہ ہے جس میں شعریت کا عنصر موجود ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

آئی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی — کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئنہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی — سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراقِ دل نشیں کے ساز کو — اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

ایک نظم "ماہِ نو" میں تشبیہوں اور استعاروں کی لطافت اپنے انتہائی کمال تک پہنچ گئی ہے۔ "ماہِ نو" کو خورشید کی ٹوٹی ہوئی کشتی کا ایک ٹکڑا قرار دینا، انوکھا خیال ہے۔ اپنے بے مثل تخیل کی صناعی سے اقبال نے جو تصویر پیش کی ہے۔ اس کا ایک پہلو دیکھئے ؎

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل — ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب — نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب!
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی — نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی؛

تصویرِ درد اس دور کی بہترین نظموں میں ہے۔ جس میں اقبال ایک وطن پرست کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ وہ احساس جس نے ان سے یہ کہلوایا کہ "خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے" یہاں بھی موجود ہے ان کا دل ہندوستانیوں کے نفاق پر نوحہ خوانی کر رہا ہے اور اس کے مستقبل کا خیال کر کے ان کا دل بیٹھا جاتا ہے۔ وہ ہندوستانیوں کی غیرتِ قومی کے جذبہ کو متحرک کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ فرقہ آرائیوں کی زنجیروں کو توڑ کر اور "افسانہائے ماضی" کو بالائے طاق رکھ کر موجودہ صورت حالات کا جائزہ لیں اور مستقبل کی تعمیر کی فکر کریں۔ وہ انھیں متنبہ کرتے ہیں کہ اگر انھوں نے قومی مصیبت کا احساس نہ کیا اور ماضی کے سیمیائی طلسم کے اسیر رہے۔ تو وہ ایک دن صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دئے جائیں گے اور تاریخ ان کے قومی تشخص کی کوئی یادگار محفوظ

نہ رکھ سکے گی۔ قوموں کا اجتماعی احساس جب کمزور پڑجاتا ہے تو دوسری قوی سیرت رکھنے والی قوموں کے اندر جذب ہو جاتی ہیں۔ اس نظم میں ایک قومی ہمدرد کی تڑپ اور مضطرب روح آہ و فغاں کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے دلدوز نغمے ہر ہندوستانی کے لئے ایک عمومی اپیل رکھتے ہیں ؎

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا — لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں — تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو! — تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

بدقسمت ہندوستان کی حالتِ زار انھیں یہاں تک بے چین کرتی ہے کہ بالآخر پکار اٹھتے ہیں ؎

نمے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں — عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

وطنیت کے اس شدید احساس کے ساتھ ساتھ شاعر کی عشق پرور روح بھی اپنا مظاہرہ کئے بغیر نہیں رہتی۔ اسے فطرت کے ہر منظر اور قدرت کی ہر نیرنگی میں حُسن نظر آتا ہے۔ وہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں اس رُوح کو رقصاں دیکھتا ہے۔ ہر طرف اسے اسی کیف کی جلوہ سامانیاں نظر آتی ہیں۔ بتانِ شوخ و شنگ کا تو کیا کہنا جن کے عارضِ تاباں کی جھلک میں حسن کی تمام فتنہ زائیاں مرکوز ہو گئی ہیں اور جن کی نکیلی پلکوں کے ستم کش تیروں سے شاعر کا دل خون ہو کر رہ گیا تھا۔ اس چمن کا ذرہ ذرہ محشر بداماں ہے اور ہر شئے سے حسن کی شعاعیں پھوٹ کر نکل رہی ہیں۔ ماہِ نو کی چاندنی، سورج کی کرن، شفق کے رنگ، چشمہ کی روانی، پہاڑ کی بلندی اور طائر خوش الحاں کے نغموں میں اسے حسن کے جلوے نظر آتے ہیں۔ اور جب کبھی وہ کسی ایسے نظارہ سے ہمکنار ہوتا ہے تو اس کی روح ابدی مسرت میں ڈوب جاتی ہے۔ اس کا دل ذوق و شوق سے بیتاب ہو جاتا ہے اور اسے ایک روحانی کیف محسوس ہوتا ہے۔ اس کے دل میں خیال گزرتا ہے کہ یہ پوری کائنات اس جذبہ سے بھرپور ہے اور اس کی رنگینیاں ہر چیز پر چھائی ہوئی ہیں ؎

محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حُسن — آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حُسن

حسن کوہستان کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے — مہر ضوگستر کی شب کی سیہ پوشی میں ہے
آسمان صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ — شام کی ظلمت شفق کی گل فروشی میں ہے یہ
عظمت دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں — طفلک ناآشنا کی کوشش گفتار میں
ساکنان صحن گلشن کی ہم آوازی میں ہے — ننھے ننھے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے
چشمۂ کہسار میں دریا کی آزادی میں حسن — شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں آبادی میں حسن
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس — ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثل جرس
حسن کے اس عام جلوہ میں بھی یہ بے تاب ہے — زندگی اس کی مثال ماہی بے آب ہے

دور اول کی نظموں میں ہمیں دو عنصر کام کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اوّل وطن سے بے انتہا محبت دوسرے مظاہر فطرت میں زندگی کے رازہائے سربستہ کے انکشاف کی جستجو۔ اُن نظموں میں جہاں اقبال فطرت کی مصوری کرتا ہوا نظر آتا ہے وہاں ایک خاص قسم کی جھجک، جستجو اور تلاش کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔ وہ حسن میں حقیقت کا متلاشی نظر آتا ہے۔ شاعر فطرت سے درس لینے کی کوشش کرتا ہے اور قدرت کی نیرنگیوں کو دیکھ کر بعض اوقات حیران سا رہ جاتا ہے۔ اس کی حقیقت پژوہی کی صلاحیتیں ہر موقع پر اپنا اظہار کرتی ہیں۔ چاندنی رات آب رواں اور شمع فروزاں کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں کچھ سوچتا ہے اور پھر اپنے ذہنی تاثرات کو صفحۂ قرطاس پر منتقش کر دیتا ہے ؎

پروانہ اور ذوق تماشائے روشنی — کیڑا ذرا سا اور تمنائے روشنی
نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں — طفلک سیماب پا ہوں مکتب ہستی میں میں
پھر بھی اے ماہ مبیں! میں اور ہوں تو اور ہے — درد جس پہلو میں اٹھتا ہے وہ پہلو اور ہے
گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں سراپا نور تو — سینکڑوں منزل ہے ذوق آگہی سے دور تو
جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے — یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس — ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثل جرس

اسی طرح "ایک پرندہ اور جگنو" میں بھی خیال بندی کے بعض نادر نمونے نظر آتے ہیں۔

۱۹۰۵ء میں ڈاکٹر اقبال یورپ چلے گئے۔ ہندوستان سے روانہ ہوتے وقت حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار مبارک پر انھوں نے جو نظم پڑھی وہ اس دور کی آخری نظم ہے یہیں سے ان کی شاعری میں مغربی علم و حکمت کے اثرات کی ابتدا ہوئی اور دانش کدۂ فرنگ سے مستفید ہونے کے بعد انھوں نے جو نظمیں کہیں ان سے ان کی شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس نظم میں اقبال نے جن خیالات کا اظہار کیا ان میں ان کی علو ہمتی اور خلوص صاف نظر آتے ہیں اور اس عقیدت کا پتہ چلتا ہے جو ہمیشہ انھیں بزرگان دین کے ساتھ رہی۔ اس وقت اقبال نے اپنے لئے جو دعا کی تھی وہ بارگاہ خداوندی میں قبول ہو گئی ؎

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے — شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں — تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے — کہ سمجھے منزل مقصود کارواں مجھ کو
مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے — کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے — یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

اقبال کے دوسرے دور کی نظموں میں ہمیں شاعر کی رومانی طبیعت کی تصویر بے نقاب نظر آتی ہے۔ فطرت کی منظر کشی جو پہلے دور میں قومی اور وطنی نظموں کے جھرمٹ میں کبھی کبھی ایک لمحہ کے لئے لمعہ افگن ہوتی تھی اب اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر نظر آتی ہے۔ اس کے قلم کی ہر جنبش فطرت کے حسین جلوؤں کے لئے مشاطگی کا کام دیتی ہے جس میں شاعر خود بھی کبھی کبھی اپنی تصویر دیکھ لیتا ہے۔ اجزائے کائنات میں حسن کی جو بظاہر خاموش قوتیں کام کر رہی ہیں، وہ انھیں نمایاں کرتا ہے اور فطرت کے نرم و نازک ہاتھ میں ساغر حسن کو دیکھ کر بیخود ہو جاتا ہے اور اس کی ایک ایک بوند کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ اقبال کے نزدیک حسن و صداقت ایک ہی چیز کے دو پہلو ہیں جن کا منتہا یہ ہے کہ وہ ہمیں صداقت کے قریب کر دے اور ہمارے دل میں اعلیٰ مقاصد کی قدر کا جذبہ پیدا کرے۔ حسن، محبت کی فطرت کے لئے جذبۂ محرکہ کا کام کرتا ہے۔ اقبال محبت کو ایک لطیف کیفیت سمجھتا ہے جو زندگی کی رگ و پے میں جاری و ساری ہے۔ اس کے عناصر عالم خاکی سے نہیں بلکہ عالم بالا کے مو عیار کے ذروں سے مرکب ہیں۔ اس میں لرزتے ہوئے تاروں کی چمک، تڑپتی ہوئی بجلی

کی کوک، حور کی پاکیزگی، شبنم کی افتادگی اور فرشتہ کی معصومیت کے اجزا ملے ہوئے ہیں۔ اور کائنات کی تمام حسین چیزیں اسی لطیف آمیزش کے خارجی مظاہر ہیں۔ محبت کے عنوان سے پہلی نظم میں لکھتے ہیں ؎

چمک تارے سے مانگی چاند سے داغ جگر مانگا   اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی   حرارت لی نفس ہائے مسیح ابن مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی   ملک سے عاجزی افتادگی تقدیر شبنم سے
پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں   مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے

اور پھر اس کا اثر یہ ہوا ؎

ہوئی جنبش عیاں ذروں نے لطف خواب کو چھوڑا   گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
خرام ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے   چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

"حقیقت حسن" کے نام سے جو نظم لکھی ہے اسے اس دور کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ رمزیت (Symbolisun) جو اقبال کے آرٹ کا ایک نمایاں پہلو ہے اس میں بھی موجود ہے۔ اس میں شاعر نے رمز و کنایہ سے حسن کی بے ثباتی پر بڑے لطیف پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے۔ اور پھر "حقیقت زوال" کی توجیہ عجیب انداز سے کی ہے۔ اس نظم میں کس قدر قنوطی انداز نمایاں ہے جو اس دور کی ایک خصوصیت ہے اور جو حساس نوجوانوں میں عام طور سے پایا جاتا ہے۔ ان اشعار کی وقعت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ایک شاعر کا دل اور ایک مصور کی نگاہ چاہئے

کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی   فلک پہ عام ہوئی اختر سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو   فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے   کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا   شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

"طلبائے علی گڑھ کالج کے نام" جو پیام اقبال نے دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نظم ہستی کے ان اجزا کو کس قدر اہم سمجھتے تھے اور ملت کی زندگی نوجوانوں کے کردار سے کس حد تک وابستہ ہے۔ اقبال پوری قوم کو جو پیام دینا چاہتے تھے۔ وہی پیام انھوں نے اس قوم کے اہل علم نوجوان طبقہ کے سامنے پیش کیا۔

۱۹۰۷ء کا زمانہ ہندوستان میں سیاسی شورش کا زمانہ تھا اور مسلمان اپنے نصب العین سے ہٹ کر مختلف راستوں کی طرف بھٹک رہے تھے۔ اس وقت اقبالؔ نے نوجوانوں کو ذوقِ عمل اور ذوقِ تپش کا سبق دے کر انھیں اپنی زندگی کا ایک جزو بنا لینے کا پیام دیا اور ان کی سرد رگوں میں احساس اور زندگی کی تازہ لہریں دوڑا دیں۔ اس پیام میں ہمیں بعض وہ چیزیں ملتی ہیں جنھوں نے اقبالؔ کی آئندہ شاعری میں ایک منظم فلسفۂ زندگی کی صورت اختیار کر لی اور جنھوں نے اقبالؔ کو رومانی شاعری سے اونچا اٹھا کر نشاۃِ جدیدہ کی طلوع ہونے والی سحر کا نقیب اور قوموں کی زندگی کے دھارے کو موڑ دینے والا مفکر اور شاعر بنا دیا۔ یہی وہ دبی ہوئی چنگاریاں تھیں جو بعد میں شعلہ بن کر بھڑک اٹھیں اور جنھوں نے اقبال کی شاعری کی پیشانی پر حیاتِ جاوید کا جھومر لگا دیا ؎

آتی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکوں　　کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے
جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا　　اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے
موت ہے عیشِ جاوداں ذوقِ طلب اگر نہ ہو　　گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے
شمعِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز　　غمکدۂ نمود میں شرطِ دوام اور ہے

یورپ کے عیش پرور ماحول نے اقبال کے دماغ پر جو تاثرات مرتب کئے۔ ان کا عکس کم و بیش تمام نظموں میں نظر آتا ہے اس وقت اقبالؔ عام نوجوان شاعروں کے انداز میں حسن و عشق کے رموز آشکارا کرنے میں منہمک نظر آتا ہے۔ اور بعض وقت ایسا کھویا جاتا ہے گویا اس کی روح اس میں ڈوب گئی ہے۔ "حسن و عشق" کے عنواں سے ایک نظم میں یہ احساس بہت بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں اقبالؔ محبوبِ مجازی کے جمال کے مشاہدہ میں غرق ہے تاکہ اس جذبہ کی تسکین کر سکے جو انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اقبال کا اندازِ بیان بہت دلکش اور سحر آفریں ہے۔ فرماتے ہیں۔

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیِ سیمینِ قمر　　نورِ خورشید کے طوفاں میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل　　چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم　　موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم
ہے ترے سیلِ محبت میں یونہی دل میرا!

اسی نوع کے چند اشعار اور سنیئے ؎

شیشۂ دہر میں مانند مئے ناب ہے عشق — روح خورشید ہے خون رگ مہتاب ہے عشق
دل ہر ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی — نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی
کہیں سامان مسرت کہیں ساز غم ہے — کہیں گوہر ہے کہیں اشک کہیں شبنم ہے

تیلے کا فلسفۂ محبت بھی اسی کے قریب ہے۔ اس کے نزدیک اجزائے عالم کی باہمی وابستگی کا نام محبت ہے جس کے بغیر کائنات کا وجود ناممکن ہے اور انسانی زندگی کیف سے خالی۔

"چاند اور تارے" کے عنوان سے ایک نظم میں اقبال نے نہایت دلکش انداز میں زندگی اور حرکتِ دوام کے مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے اور عمل پیہم اور ذوق طلب کو ترقی اور حیات کے لوازمات قرار دیا ہے قوموں کی زندگی میں جب یہ عنصر کمزور پڑ جاتا ہے۔ تو ان کا اجتماعی احساس ختم ہو جاتا ہے اور وہ بہت جلد اپنی انفرادیت کو ختم کرکے زندگی کے چراغ کو گل کر دیتی ہیں۔ اقبال نے چاند کی زبانی یہ پیام پہونچایا ہے۔ زبان اسقدر سادہ دلنشیں اور مسلسل ہے معلوم ہوتا ہے کہ غالب اور داغ کے بعض اجزا لیکر اقبال کے پیکر میں ڈھالے گئے ہیں ؎

کہنے لگا چاند ہم نشینو! — اے مزرع شب کے خوشہ چینو!
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی — یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہب زمانہ — کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

اس رہ میں مقام بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں — جو ٹھیرے ذرا کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حسن — آغاز ہے عشق، انتہا حسن

یوروپین معاشرت کی رنگا رنگ بزم آرائیوں اور رومانی شعرا کے کلام نے اقبال کے نوجوان اور شاعرانہ دل پر جو اثرات ڈالے انھیں ایک حد تک ابیقوریت (Epicureanism) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے وہ زندگی سے جی بھر کر لطف اندوز ہونا چاہتا ہے اور غم واندوہ کے گرد وغبار سے شیشۂ دل کو صاف رکھنے کا خواہشمند ہے۔ اسے ساقیان جمیل، شراب طہور، ذکر سلسبیل اور جلوۂ طور سے کوئی دلچسپی نہیں وہ تخیل کے ان طلسموں کو توڑ کر اس دنیا میں اپنی روح کے بڑھتے ہوئے اضطراب کو دور کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کی

زندگی میں بالیدگی اور نمو کا سلسلہ جاری رہے۔ وہ عیش و سرور کے ان رنگین پردوں کو اٹھا دینا چاہتا ہے۔ تاکہ انسان کسی فریب میں مبتلا نہ رہے۔ سرمدی کیفیت کے یہ حسین جلوے ایک نوجوان شاعر کے دل کی تسکین کے لئے کافی نہیں۔ یہ اس کی بے چین اور ناشکیبا روح کی ایسی آزمائش ہے جس سے وہ دامن بچا کر نکل جانا چاہتا ہے اور شاعر زندگی کے چھلکتے ہوئے افشردہ کو خوب دل کھول کر پینا چاہتا ہے۔ وہ خیام کی طرح عشرت امروز کا قائل ہے ؎

مقام امن ہے جنت مجھے کلام نہیں
شباب کے لئے موزوں ترا پیام نہیں

شباب آہ کہاں تک امیدوار رہے
وہ عیش عیش نہیں جس کا انتظار رہے

وہ حسن کیا ہے جو محتاج چشم بینا ہو
نمود کے لئے منت پذیر فردا ہو

عجیب چیز ہے احساس زندگانی کا
عقیدہ "عشرت امروز" ہے جوانی کا

لیکن شراب زندگی میں اس قدر منہمک ہونے کے باوجود بھی اقبال حقیقت کی جستجو سے غافل نہیں۔ وہ اسرار رموز کے چہرے سے نقاب اٹھا دینا چاہتا ہے۔ اس کا "ذوق آگہی" زندگی کا راز معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہے۔ اور وہ ہمہ تن استعجاب بنا ہوا طلسم زمان و مکان کی پہنائیوں کو ناپ رہا ہے۔ اپنی نظم "انسان" میں اقبال نے انہی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ان گنت مخلوقات کی اس نیرنگی میں اقبال نے انسان کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بہت دلکش ہے۔ اس کے ارد گرد تمام فضا میں ہر چیز کیف آور نشہ میں چور ہے۔ اور اپنی شخصیت کو نمایاں کرنا چاہتی ہے۔ موج دریا، بادل، تارے، خورشید، اپنے اپنے کام میں منہمک ہیں۔ اور ان کی طمانیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کائنات کے معموں کا حل پا گئے ہیں لیکن اس "نگار خانۂ چین" میں انسان یکہ و تنہا کھڑا اپنے تخیل کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تلخی روزگار پر نوحہ خوانی کر رہا ہے ؎

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے

انسان کو راز جو بنایا
راز اس کی نگاہ سے چھپایا

بیتاب ہے ذوق آگہی کا
کھلتا نہیں بھید زندگی کا

حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے

لذت گیر وجود ہر شئے — سرمست مئے نمود ہر شئے

کوئی نہیں غمگسار انساں — کیا تلخ ہے روزگار انساں

تیسرے دور کی ایک نظم "انسان" میں قنوطیت کا یہ انداز رجائیت سے بدل گیا ہے۔ اس تصویر میں انسان بااختیار اور دوسرے موجودات سے برتر نظر آتا ہے اور اس کی ہستی میں زندگی کے شاندار امکانات مضمر ہیں چنانچہ لکھتے ہیں ؎

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں — انسان کی ہر قوت سرگرم تقاضا ہے!

اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم — یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستان کی — یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے!

"ایک شام" اور "تنہائی" دو نظمیں دوسرے دور میں امتیازی شان رکھتی ہیں ان دونوں نظموں میں ورڈزورتھ (Wordsworth) کا تخیل اقبال کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ زبان اس قدر پیاری اور دلکش ہے۔ اور شاعر نے انداز بیان سے ایسا سحر پھونکا ہے کہ انھیں ادب العالیہ کے بہترین نمونوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ فطرت کی اس سے بہتر تصویر کشی جس میں جذبات، زبان اور تخیل مل جل کر افسوں بن گئے ہیں، خیال میں نہیں آسکتی جس وقت اقبال نے یہ نظم کہی ہوگی تو اس کا تخیل آسمانوں میں پرواز کر رہا ہوگا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا دل فطرت کے ساتھ اس قدر ہم آہنگ ہو گیا ہے کہ اس کی انفرادیت غائب ہو گئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

خاموش ہے چاندنی قمر کی — شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی

وادی کے نوا فروش خاموش — کہسار کے سبز پوش خاموش

فطرت بیہوش ہو گئی ہے — آغوش میں شب کے سو گئی ہے

خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا — قدرت ہے مراقبے میں گویا

اے دل تو بھی خموش ہو جا — آغوش میں غم کو لے کے سو جا

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا! — انجم نہیں تیرے ہم نشیں کیا!

یہ رفعتِ آسمانِ خاموش | خوابیدہ زمیں، جہانِ خاموش
یہ چاند، یہ دشت و در، یہ کہسار | فطرت ہے تمام نسترن زار
موتی خوش رنگ پیارے پیارے | یعنی ترے آنسوؤں کے تارے
کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل! | قدرت تری ہم نفس ہے اے دل!

"عبد القادر کے نام" کی نظم میں اقبال کے ارادوں اور ولولوں کا خواب صاف نظر آتا ہے۔ یہ نظم دراصل ان کے ذہنی نقوش کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جو بعد میں شاعرانہ معجز نمائی کے ساتھ زیبِ قرطاس ہوئے یہی وہ دھندلی سی تصویر ہے جو آئندہ "شکوہ"، "جوابِ شکوہ"، "شمع و شاعر"، "خضرِ راہ" اور "طلوعِ اسلام" میں تخیل کی صورت گری سے دلکشی و زیبائی کا جامہ پہن کر ظاہر ہوئی ہے اور جس کی نقاب کشائی نے اقبال کی شاعرانہ عظمت کا سکہ دلوں پر بٹھا دیا۔

مارچ ۱۹۰۷ء کی نظم میں جو دوسرے دور کی آخری نظموں میں سے ہے اقبال نے اپنے شاعرانہ ماضی کے خلاف کھلا ہوا مظاہرہ کیا۔ یہیں سے اقبال کی شاعری کا دوسرا دور ختم ہو جاتا ہے اور ایک نئے رجحان کا آغاز نمایاں ہوتا ہے۔ جو تیسرے دور کی نظموں میں پوری وسعت میں پھیل کر جلوہ گر ہوتا ہے۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا | سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے | بنے گا سارا جہاں میخانہ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

پہلے دور میں شاعر ذوقِ استفہام کی بدولت قدرت سے اصولِ زندگی اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے دور میں فطرت کے جادے اس پر رازہائے سربستہ کی پردہ دری کرتے ہیں۔ اور تیسرے دور میں وہ زندگی کے رازوں سے واقف ہو کر اپنی ملت کے سامنے ایک لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ اپنی شاعری کے عہدِ طفولیت میں وہ ایک وطنی شاعر تھا یا زیادہ سے زیادہ فطرت کا ایک جابک دست منظر کش۔ دوسرے دور میں جذباتِ حسن و عشق کا تلاطم، فطرت کی حسین صناعی اور زندگی کے رازوں کی آشکارائی اس کے ذہنی نشوونما کی غمازی کر رہے ہیں۔ بعض نظمیں پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے جس چیز کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے پا گیا ہے اور ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے۔ تیسرے دور میں وہ ایک مفکر، فلسفی اور نبض شناس

حکیم کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور اپنی دوررس نگاہوں سے قومی زندگی کے مد و جزر کا جائزہ لیکر حیاتِ قومی کے اصول مرتب کر رہا ہے اور مسلمانوں کی کشتیٔ حیات کو موجوں کے تھپیڑوں سے بچاکر ہمکنار ساحل کردینا چاہتا ہے۔

قیام ولایت کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اقبال کی پیغمبرانہ شان کا آغاز ہے۔ اس سے پہلے کا اقبال محض شاعر تھا۔ مگر اس کے بعد کا اقبال ایک پیغامبر کی حیثیت رکھتا ہے جو سست عناصر قوم کے جسد خاکی میں حیات نو کا شرارہ پھونک کر اور ممکنات زندگی کے شعلہ کو بھڑکا کر اسے بیدار کرنا چاہتا ہے۔ قیام یورپ کے زمانہ میں اقبال نے مغرب کی معاشرتی زندگی رس بس کر اس تمدن کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اور اس دریا کے عین منجدھار میں پہونچکر اس کی انتہائی گہرائیوں کا جائزہ لیا تھا۔ چنانچہ اس کے غیر معمولی غور و فکر اور ژرف نگاہی نے اسے مغرب کی مردہ روحانیت سے بیزار کر دیا اور اس نے کہا ؎

پیر مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر　　اس میں وہ کیف غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

مغربی تہذیب و تمدن کی رنگا رنگ دلفریبیوں نے اقبال کے ذہنی توازن کو بگاڑا نہیں بلکہ اس پر صیقل کر کے اس میں گہرائی، صداقت اور دوررسی پیدا کر دی اور جب اس نے اس کا مقابلہ اسلامی تمدن سے کیا تو حقیقت ظاہر ہو کر سامنے آگئی اور اقبال کو معلوم ہوگیا کہ مغربی تمدن کی بنیاد کس قدر کمزور اور سست ہے۔ اور ان رنگین پردوں کے پیچھے اوہام کا ایک حسین پیکر ہے جس کی اصلیت کچھ نہیں۔ ان دونوں تہذیبوں کے موازنہ نے اقبال کی زندگی کا عظیم الشان نصب العین متعین کر دیا۔ اور اس نے اپنے تخیل اور جذبات فکری اور ذہنی استعداد کے اظہار کے لئے ایک راہ نکال لی۔ اقبال نے دیکھ لیا تھا کہ تہذیب کی یہ چمک دمک زوال پذیر ہے اور اس کے ساتھ مغربی قوموں کا خرمن حیات بھی خاکستر ہو جائے گا۔ انھیں اس تہذیب میں روحانیت کی موت نظر آرہی تھی۔ اور ان کا خیال تھا کہ مادیت کی بنیادوں پر جو فلسفہ حیات مرتب کیا جائے گا وہ انسانیت کی حفاظت کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ انہی خیالات کو اقبال نے دوسرے دور کے آخر میں ان الفاظ میں بلند آواز سے منتشر کیا ؎

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے　　کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

اس موضوع پر اقبال نے اپنی آئندہ تصانیف میں مستقل طور سے اظہار خیال کیا اور ہندوستانیوں کو اس فریب سے آگاہ کرکے صحیح راہ عمل دکھائی۔

شروع شروع میں اقبال نے سیاسی تحریکات سے متاثر ہوکر وطنیت کی نغمہ سرائی کی تھی لیکن قومیت کے تصور کی تنگ دامنی ان کے بین الاقوامی فلسفہ کا ساتھ کیوں کر دے سکتی؟ اقبال نے دیکھ لیا تھا کہ ان کی آڑ میں قومیں کس طرح قوت و اقتدار کی خواہش کو پورا کرکے انسانیت کے زوال کا باعث ہوتی ہیں اور اپنے حرص و آز کو شیریں الفاظ کا جامہ پہنا کر امپیریلزم کے قیام و بقا میں مد ہوتی ہیں۔ ہر بڑے شاعر کا پیغام عالمگیر ہوتا ہے اور اسکی نگاہ میں جغرافیائی حد بندیاں کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ اقبال نے اس بت کو جو تراشیدۂ تہذیب نوی ہے پاش پاش کر دیا اور ان خیالات کی بیخ کنی کرکے اسلامی نظریۂ قومیت پیش کیا۔ اب اس ترانہ ہندی کی بجائے ترانۂ ملی لکھا اور وطنیت کے مذموم اور ادھورے فلسفہ کو اس کی اصلی صورت میں پیش کر دیا جس سے سب کو معلوم ہو گیا کہ مغربی تہذیب کے ان خوشنما کھلونوں میں کس قدر زہر ملا ہوا ہے ؎

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی
اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے — تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے — قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

"شکوہ" اور "جواب شکوہ" میں اقبال نے مسلمانوں کے ماضی کی شاندار روایات، حال کی تباہ حالی، اور مستقبل کی امید افزا جھلکیوں کا نقشہ ایک نئے انداز سے کھینچا ہے۔ "شکوہ" میں ماضی کا گلہ اور "جواب شکوہ" میں حال کی ترجمہ جس انداز میں کی گئی ہے وہ خیالی مذہب پرستوں کے نزدیک بیباکانہ سہی مگر اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک انوکھی چیز ہے جس سے اقبال کی گہری نظر اور جدت کا پتہ چلتا ہے۔ "مسدس" بھی اسی قسم کی ایک نظم ہے جسے مسلمانوں کی حیات ملی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں گو انگریزی کی واقعیت (Realism) اور ہندی کی گھلاوٹ پوری طرح موجود ہے جس سے حالی کی استادی کا پتہ چلتا ہے۔ مگر اس میں گہرائی کے ساتھ شگفتگی موجود نہیں اور واقعیت نے شعریت کے چہرہ پر نقاب ڈال دی ہے۔ "شکوہ" میں حقیقت نگاری کے ساتھ جامعیت موجود ہے

اور اندازِ بیان اس قدر دلکش ہے کہ خود بقول اقبال "شکر شکوہ کو کیا حسنِ ادا سے تو نے" حالی نے اپنے پرسوز اشعار سے جن میں عرب شاعروں کی سی گرمی ہے نیند کے متوالوں کو چونکا دیا۔ اور ان کے خون میں حرارت اور تپش پیدا کی۔ مگر اس کے باوجود تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کی شاعری نمک سے خالی ہے۔ مسدس کے دیباچہ میں انھوں نے خود اس کا اعتراف کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر شاعر اپنے دور کی پیداوار ہوتا ہے۔ اور اس دور کے لوازمات اور تقاضوں کے مطابق اس کی شاعری کا پیکر تیار ہوتا ہے۔ مگر طرزِ ادا ایک الگ چیز ہے جو شاعر کی شخصیت اور انفرادیت کو نمایاں کرتی ہے۔ حالی کے یہاں جو کسک اور کھٹک ہے اقبال نے اسے اور بڑھا دیا ہے۔ حالی کے یہاں قومی احساسات کی دھیمی دھیمی آنچ ہے۔ اقبال نے اسے شعلوں میں تبدیل کر دیا۔ فارسی شاعری کے رسیا ہر چیز کو نغمہ، جام، مے، محفل، ساقی اور اسی قسم کے دوسرے اصطلاحاتِ شاعری میں دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے اور ان کے دماغوں میں تکلفات اس قدر رچ گئے تھے کہ وہ ہر چیز کو اسی روشنی میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اقبال نے انہی پرانے ساغروں میں تند و تیز شراب ایک نئے انداز سے بھر کر پیش کی اور اپنی غیر معمولی قوتِ بیان سے کام لے کر اس کام کو پورا جس کی ابتدا حالی نے کی تھی۔ ایک جگہ شکایت کا انداز کس قدر پیارا ہے ؎

دردِ لیلیٰ بھی وہی، قیس کا پہلو بھی وہی — نجد کے دشت و جبل میں رمِ آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی، حسن کا جادو بھی وہی — امتِ احمدِ مرسل بھی وہی، تو بھی وہی
پھر یہ آزردگیِ غیر سبب کیا معنی؟ — اپنے شیداؤں پہ یہ چشمِ غضب کیا معنی؟

اور پھر ایک دوسری جگہ یہ طرز کس قدر دلکش ہے ؎

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے — سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے یکسو بیٹھے — تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ ہو بیٹھے
اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے — برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

قدرت کے مناظر کی دلکشی کے ساتھ ساتھ اپنے پیام کی نشر و اشاعت کا سلسلہ تیسرے دور میں بھی جاری ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اہمیت پر اقبال نے جگہ جگہ زور دیا ہے۔ اجزائے ملی کی باہمی آویزش سے

اقبال نے اجتماعی قوت کا اصول مرتب کیا ہے جس کے بغیر افراد کی زندگی میں کوئی زور نہیں ہوتا۔ تنظیم اور اخوت اور اجتماعی احساس ملت کی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اور باہمی ربط سے وہ چشمے پھوٹتے ہیں جو کشت زار قوم کو سیراب کرتے ہیں۔ ایک نظم "بزم انجم" میں اقبال نے تاروں کی زبان سے زندگی کا اصول واضح کیا ہے ؎

اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں
ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

اجتماعی تنظیم کے بغیر انفرادی زندگی بیکار ہے۔ قطرہ دریا میں ضم ہو کر اپنی انفرادیت کو ختم نہیں کر دیتا بلکہ اصل میں اس کی زندگی کے سوتے یہیں سے کھلتے ہیں۔ فرد اور ملت کے اس تعلق کو اقبال نے "شمع اور شاعر" میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروان بو ہوا
زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار حیات یہ کبھی گوہر کبھی شبنم کبھی آنسو ہوا
پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا
آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا
فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

"شمع و شاعر" میں اقبال نے مسلمانوں کو ان کی اصلیت سے آگاہ کیا ہے۔ ہمتیں بڑھائی ہیں۔ ولولوں کو تازہ کیا ہے۔ احساس کمتری کے افسوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ نظام کائنات میں ان کی حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔ ان کے پیام کی عظمت کا احساس دلایا ہے۔ ذمہ داریوں سے آگاہ کیا ہے۔ اور حالات کے چہرہ سے نقاب اٹھا کر مستقبل کا حسین اور تابناک چہرہ دکھلایا ہے ؎

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیام ناز کا جو نظام دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے — یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

"جواب شکوہ" میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی — برق طبعی نہ رہی، شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں روح بلالیؓ نہ رہی — فلسفہ رہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے — یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

"خضر راہ" میں جو تیسرے دور کی مقبول ترین نظموں میں سے ہے۔ اقبال نے حالات حاضرہ پر بڑی گہری تنقید کی ہے۔ یہ نظم سنہ ۱۹۲۲ء میں لکھی گئی اور سوز و گداز سے لبریز ہے۔ جنگ عظیم کی ہولناک تباہ کاریوں کا نقش اقبال کے دل پر مرتسم ہو چکا تھا، انھوں نے اس میں انسانیت کا خون ہوتے دیکھا تھا۔ ممالک اسلامیہ کہ جو پہلے ہی سے اضمحلال کی گہرائیوں میں ڈوب چکے تھے۔ اس دھچکے کی تاب نہ لا سکے۔ انتشار کی قوتیں نشو و نما پا چکی تھیں۔ پراگندگی اور بدنظمی سے حالت پہلے ہی دگرگوں تھی اس پر دوسرا چرکہ لگا۔ دنیائے اسلام پر نکبت و ادبار کی گھٹائیں ہر چہار طرف سے چھا گئی تھیں اور اسلامی سلطنت کا خیال افسانہ پارینہ ہو کر رہ گیا تھا۔

اس نظم میں اقبال نے صحرانوردی کی حقیقت بیان کی ہے۔ زندگی کے رموز آشکارا کئے ہیں سلطنت اور حکومت کی ماہیت کا نقشہ کھینچا ہے۔ سرمایہ و محنت کی آویزش پر روشنی ڈالی ہے۔ ایشیا کی یورپ زدگی پر اظہار خیال کیا ہے۔ ممالک اسلامیہ کی سیاسی روش پر تنقید کی ہے اور مسلمانوں کو امید کا درس دیا ہے۔ یہ نظم گوناگوں خیالات سے لبریز ہے اور اس میں زندگی کے بہت سے باریک نکات حل کئے ہیں۔

زندگی کا فلسفہ پیش کرنے میں اقبال نے بڑی ندرت سے کام لیا ہے۔ وہ زندگی عام پیمانوں سے ناپنا نہیں چاہتے۔ ان کے خیال میں حقیقی زندگی موت کے بعد شروع ہوتی ہے وہ ایک تخلیقی حرکت ہے جو زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد ہے سخت کوشی زندگی کا اساسی اصول ہے اور آزادی اس کی نشو و نما اور تسلسل کا جزو لاینفک۔ غلامی سے زندگی کے سرچشمے خشک ہو جاتے ہیں اور انسان زندگی کی حقیقی مسرت سے محروم ہو جاتا ہے۔ روح کی بالیدگی، تخلیقی قوتوں کی نشو و نما اور بلند مقاصد کو حاصل کرنے کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے اور انسانی تگ و تاز کا میدان تنگ ہو جاتا ہے ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی　　ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ　　جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ　　جوئے شیر و تیشۂ و سنگ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب　　اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

"طلوع اسلام" میں اقبال نے اپنا رجائی پیغام بڑے پُر شوکت انداز میں پیش کیا ہے۔ یاس و ناامیدی کی کالی کالی گھٹاؤں میں امیدوں کا چمکتا ہوا چہرہ صاف نظر آ رہا ہے۔ اقبال نے اسلام کی سربلندی کا جو خواب دیکھا تھا۔ زمانہ نے اس کی تفسیر پیش کر دی اور جنگ عظیم کے بعد کچھ ہی عرصہ میں اسلامی سلطنت کے تن خاکی میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر بڑے شاعر کے کلام میں الہامی رنگ ہوتا ہے۔ وہ محض افکار کی سرمستی میں کھویا نہیں رہتا۔ بلکہ اس کے "آئینہ گفتار" میں مستقبل کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ اس کا مشاہدہ تیز ہوتا ہے اور وجدان تیز تر۔ وہ زمانہ کا بڑا نبض شناس ہوتا ہے اور اسی لئے اس کے پیام میں حیات قومی کی تعمیر کے لئے ایک لائحہ عمل موجود ہوتا ہے۔ "شمع و شاعر" میں اقبال نے مسلمان کو مخاطب کر کے کہا تھا ؎

بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے　　تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

"طلوع اسلام" میں ایک نئے انداز سے پھر اسے دہرایا اور کہا ؎

تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی　　جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

"خضر راہ" میں شاعر کے جذبات میں ایک ہلکا سا قنوطی انداز ہے لیکن اب اس کا پیام شک اور تذبذب اضطراب و بے چینی کی جگہ یقین و وثوق، سکون اور اطمینان کے جذبات سے مملو ہے۔ اسے یقین ہے کہ اگر مسلمان کے ایمان کی چنگاریوں کو مشتعل کیا جائے تو وہ پھر تقدیر کی صورت گری کر سکتا ہے۔

"طلوع اسلام" میں وہ امید کے گیت الاپ رہا ہے اس کا دل مسرت سے لبریز ہے۔ اس کی لے میں ترنم ہے اور انداز میں مستی۔ ترانوں میں تازگی ہے اور موسیقیت۔ وہ شراب زندگی سے مدہوش کیف و سرود کے عالم میں گائے جا رہا ہے اور نغموں کے روح پرور ارتعاش سے جذبات کو چھیڑ رہا ہے۔ اس کی آواز میں سحر ہے اور انداز بیان میں بے پناہ دلکشی۔ احساسات میں خوشی مسکرا رہی ہے

نواؤں میں زندگی ہے اور زندگی میں حسن۔ اس کے ہر لفظ سے امرت کے رس کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ اور اس کا دل انبساط کی لہروں کے ساتھ رقص کر رہا ہے۔ یہی کیفیت اس کے ساز کے ہر تار سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر نمایاں ہو گئی ہے ۔

بیا ساقی نوائے مرغزار از شاخسار آمد — بہار آمد نگار آمد نگار آمد قرار آمد

کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا — صدائے آبشاراں از فراز کوہسار آمد

کنار از زاہداں برگیر و بیباکانہ ساغر کش — پس از مدت ازیں شاخ کہن بانگ ہزار آمد

سر خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم — کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

"بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم — فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم"

ادھر تو "بانگ درا" کی تیسرے دور کی نظمیں لکھی جا رہی تھیں اور ادھر "اسرار خودی" اور "رموز خودی" کا تانا بانا تیار ہو رہا تھا۔ یہی وہ معرکۃ الآرا مثنویاں ہیں جنھوں نے اقبال کی شہرت کو چار چاند لگا دئے اور ان کے عالمگیر پیام کا شہرہ تمام دنیا میں پھیل گیا۔ جس طرح ملٹن کی "گم شدہ فردوس" نے اس کی شاعرانہ عظمت کا نقش دلوں پر بٹھا دیا۔ اور شہرت عام اور بقائے دوام کا مرصع تاج اس کے سر پر رکھ دیا اسی طرح اقبال سب سے پہلے ان ہی مثنویوں کی بدولت ایک مفکر کی حیثیت سے سامنے آئے۔ اُن کی ان دو مثنویوں نے دنیائے تصوف اور دنیائے ادب میں تہلکہ ڈال دیا۔ اور انھوں نے افراد، قوموں اور کائنات کی خودی کا جو نظریہ پیش کیا اس سے انانیت کے تمام پرانے بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ ڈھکے ہوئے اشارے اور دھیمی آوازیں جو کبھی کبھی "بانگ درا" میں "ذوق عمل" اور "ذوق طلب" کی مبہم اصطلاحوں کے پردوں میں ظاہر ہوتی تھیں اب ایک گرج بنکر گونج اُٹھیں۔ شاعری فلسفہ اور تصوف کی جھلکیاں پہلے بھی نظر آتی تھیں۔ اب اقبال نے ایک فلسفی شاعر کی قبا پہن لی اور اس کے فلسفہ نے ایک منظم فلسفہ زندگی کی حیثیت اختیار کر لی۔

اقبال کے فلسفہ کا سنگ بنیاد جو "اسرار خودی" کا موضوع ہے۔ اثبات خودی میں مضمر ہے۔ اپنی ہستی کا احساس اور اپنی قوتوں کا ادراک فرد کی نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ اس سے انسان میں یقین، وثوق اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس پر زندگی کے رازہائے سربستہ کا انکشاف ہوتا ہے۔ انسان خدا

کی ہستی کا ایک پرتو ہے۔ اس لئے شعورِ ذات کے بغیر ہستی مطلق کی معرفت حاصل ہونا ممکن نہیں۔ اگر خدا کو ایک بحرِ خیال تصور کر لیا جائے تو اس میں انسان کی ہستی ایک قطرہ کی مانند ہے شعورِ ذات سے انسان میں عمل کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ تمنائیں اور ولولے تازہ تازہ ہو جاتے ہیں جن سے رزمگاہ خیر و شر میں وہ اپنی دنیا آسانی سے بنا سکتا ہے۔ فرد کا نفس گو ایک فانی ہستی ہے مگر وہ اپنا علیحدہ وجود رکھتی ہے جو عمل سے پائیدار اور لازوال بن جاتی ہے۔ خودی کا استحکام اور نشو و نما اُس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ غیرِ خودی یعنی عالم طبعی سے مسلسل برسرِ پیکار رہے۔ اس سے نت نئی خواہشات کی تخلیق ہوتی رہتی ہے اور نئے نئے مقاصد کا تعین ہوتا ہے اسی سے ارادے اور امنگیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ سوزِ آرزو پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے تڑپ اور بے چینی بے قراری اور کسک پیدا ہوتی ہے۔ جو زندگی کا دوسرا نام ہے ؎

زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دل خود زندہ دار — تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست — فطرتِ ہر شئے امیں آرزوست
آرزو ہنگامہ ہائے خودی — موجِ بے تابے ز دریائے خودی

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم — از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

خودی کی منازلِ ترقی زمان و مکان کی حد بندیوں کو قبول نہیں کرتیں بلکہ ان کے طلسم کو توڑ کر عالم ما ورائے کی پہنائیوں میں ڈوب جاتی ہیں اور اپنی تگ و تاز کے لئے نئے نئے میدان تلاش کرتی ہیں ؎

خودی کی ہے یہ منزلِ اولیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں!
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر! (بالِ جبریل)

خودی کی تقویت اور رہنمائی کے لئے عشق ضروری ہے۔ اقبال نے عشق کو بہت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد وہ جذبِ اندروں ہے جس کا سرچشمہ وجدان ہے۔ محبت ہی سے خودی معراج کمال تک پہونچتی ہے اور اسی سے اس شرارہ میں سوز، جلا اور تابندگی پیدا ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کی بنیادیں اسی سے استوار ہوتی ہیں اور وہ نظر پیدا ہوتی ہے جو روحانیت کا جوہر ہے عشق ہی کائنات

کی اصل روح ہے اور اسی سے انسان اعلیٰ مدارج تک پہونچتا ہے ؎

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است | زیر خاک ما شرار زندگی است
از محبت می شود پائندہ تر | زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر
عشق را از تیغ و خنجر باک نیست | اصل عشق از آب و باد و خاک نیست
دل ز عشق او توانا می شود | خاک ہمدوش ثریا می شود

احساس خودی کی اہمیت کو اقبال نے جگہ جگہ دہرایا ہے اور اس کی لازوال قوتوں کی مدح سرائی میں اپنی پوری طاقت صرف کر دی ہے ؎

پیکر ہستی ز آثار خودی است | ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد | آشکارا عالم پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او | غیر او پیداست از اثبات او

اقبال کا فلسفۂ انفرادیت جس میں زندگی اور کائنات کی وحدت کا تصور پیش کیا گیا ہے ہیگل کے فلسفہ سے بالکل مطابقت نہیں کرتا۔ اس کے خیال کے مطابق انسان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ حیات کلی میں جذب ہو جائے اور اپنی انفرادی حیثیت کو ختم کر دے۔ اقبال خودی کی ابھار اور نشو و نما کے قائل ہیں جس سے انسان میں تسخیر نفس و آفاق کی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ خدا کو بھی اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت کا مالک ہو جاتا ہے اور اس کے عزائم کا یہ حال ہو جاتا ہے ؎

در دشت جنون من جبرئیل زبوں صیدے | یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ!

اقبال کی رائے میں مصائب و آلام خودی کی تربیت اور اصلاح کا موجب ہیں۔ شوپنہار کے نزدیک یہی چیز خودکشی کے جواز میں پیش کی جا سکتی ہے۔ فقر و استغنا خودی کی نشو و نما کے لئے ضروری ہیں۔ فقر مادی لذتوں سے بے نیازی، نوامیس فطرت کی تسخیر اور دنیا میں انسانیت کے نصب العین کو فروغ دینے کا نام ہے۔ جب خودی عشق و محبت اور فقر و استغنا سے پختگی حاصل کر لیتی ہے تو اس میں زندگی کی لازوال قوتیں بروئے کار آ جاتی ہیں اور کائنات میں اپنی برتری کا سکہ جما دیتی ہیں۔ اس وقت اس کی

براتی کے خلاف کوئی روک نہیں کی جا سکتی اور انسان اپنی اس حیثیت سے بہت بلند ہو جاتا ہے اسی سے اس میں روحانیت کا عنصر طاقتور ہو جاتا ہے اور احساس نفس کے مکمل نشو و نما کے بعد وہ قرب الٰہی حاصل کر سکتا ہے اور یہی ارتقائے خودی کا انتہائی نصب العین ہے جو اقبال پیش کرتے ہیں۔

فرد اور ملت کے قانون کو اقبال نے بیخودی سے تعبیر کیا ہے جس سے انسان کی انفرادی قوتیں زیادہ منظم اور منضبط ہو جاتی ہیں۔ اجتماعی خودی کا احساس فرد کی خودی کے احساس کو تقویت پہونچاتا ہے اور اسے وسیع تر اور محکم تر کر دیتا ہے۔ اس سے اس کی تیغ خودی آبدار ہو جاتی ہے اور اس کی فطرت کا جوہر اپنے کمال کو پہونچتا ہے۔ اسلام کے تمام ارکان میں اجتماعی احساس کی یہی روح کام کر رہی ہے اور اسی نے ابھی تک مسلمانوں کو ایک مضبوط معاشرتی نظام میں باندھے رکھا ہے۔ ملت میں گم ہو کر افراد کی ہستی گم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ زیادہ موثر اور معنی خیز بن جاتی ہے افکار اور کردار کی وحدت جو اسلامی تعلیمات کا اساسی اصول ہے۔ آئین ملت کو سامنے رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور اسی سے کسی قوم میں سربلندی پیدا ہو سکتی ہے اقبال نے اس موضوع پر کثرت سے اظہار خیال کیا ہے ؎

فرد را ربط جماعت رحمت است جوہر او را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش رونق ہنگامۂ احرار باش
فرد می گیرد ز ملت احترام ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

خلافت راشدہ کے زوال کے بعد مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی کمزوریوں کی وجہ سے اسلام کے بنیادی تصورات بھی متزلزل ہونے لگے۔ عباسیوں کے عہد حکومت میں جب عجمیت کا عنصر اپنے شباب پر تھا اور مسلمانوں کی ذہنی زندگی اس سے پورے طور پر مرعوب ہو چکی تھی۔ اسلامی نظریوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ یونانی اور ہندی فلسفہ جب مسلمانوں کے ہاں منتقل ہوا تو اس کے اثرات مسلمانوں پر بہت گہرے پڑے افلاطون کے فلسفہ نے مسلمانوں کی زندگی میں جمود پیدا کر دیا اور ان کے قوائے عملیہ شل ہو گئے جن کا نتیجہ رہبانیت اور تباہی کی صورت میں نمایاں ہوا۔ ویدانت کے فلسفہ نے اسلامی فلسفہ کی صورت مسخ کر دی۔

اور مسلمانوں پر تصوف کا رنگ غالب آ گیا۔ اسلام کا اساسی اصول توحید ہے اور تصوف کی بنیاد وہمہ اوست کے نظریہ پر قائم ہے۔ توحید مثبت ہے اور ہمہ اوست منفی، صوفیوں کا رقص مستانہ افلاطونی روح کا عکس ہے۔ جس نے زندگی کی عملی قوتوں کو معطل کر دیا ہے۔ اقبال کے فلسفہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ اسلامی شعائر اور عقائد کو ان تاثرات سے آزاد کر دے اور مسلمان پھر جادۂ عمل پر گامزن ہو کر زندگی کی نبرد آزمائیوں میں شریک ہوں اور اس جہان رنگ و بو کی تزئین و آرائش کریں۔ فلسفۂ عمل کے متعلق "رموز بیخودی" میں لکھتے ہیں ؎

در عمل پوشیدہ مضمون حیات　　لذت تخلیق قانون حیات
با جہانِ نامساعد ساختن　　ہست در میداں سپر انداختن
گر نہ سازد با مزاج او جہان　　می شود جنگ آزما خود با جہاں
برکند بنیاد موجودات را　　می دہد ترکیب نو ذرات را
می کند از قوت خود آشکار　　روزگار نو کہ باشد سازگار
در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست　　ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست
زندگانی قوت پیدا است　　اصل او از ذوق استیلا است
عفو بے جا سردی خون حیات　　سکتۂ در بیت موزون حیات
ناتوانی زندگی را رہزن است　　بطنش از خوف و دروغ آبستن است

اقبال کے خیال کے مطابق مسلمانوں کے انحطاط کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے عمل کی زندگی کی بجائے افلاطونی بے عملی اختیار کر لی ہے۔ وہ انھیں افلاطون کی تشائم پسندی کے خلاف خبردار کرتا ہے اور اس سے بہت بیزار ہے ؎

راہب دیرینہ افلاطون حکیم　　از گروہ گوسفندان قدیم
گفت سر زندگی در مردن است　　شمع را صد جلوہ از افسردن است
گوسفندے در لباس آدم است　　حکم او بر جان صوفی محکم است
بسکہ از ذوق عمل محروم بود　　جان او وارفتۂ معدوم بود

مست کر ہنگامۂ موجود گشت　　　خالق اعیان نا مشہود گشت
آہوش بے بہرہ از لطف خرام　　　لذت رفتار بر کبکش حرام
شبنمش از طاقت رم بے نصیب　　　طائرش را سینہ از دم بے نصیب
ذوق روئیدن ندارد دانہ اش　　　از تپیدن بے خبر پروانہ اش
قوم ہا از سکر او مسموم گشت　　　خفت و از ذوق عمل محروم گشت
"اسرار خودی"

اقبال نے اپنی تمام تصانیف میں موجودہ تعلیم یافتہ طبقہ کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن کی پروردہ و ساختہ نسل سے ان کی بیزاری کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس نے ان کے دماغوں سے اعلیٰ روحانی اور اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت کو زائل کر دیا۔ مادی فلسفہ و سائنس سے اکتساب نور کرنے والوں کا ذوق و شوق سرد پڑ گیا۔ ان کے دماغ تو روشن ہیں۔ مگر دل تیرہ اور نگاہیں بیباک ہیں فقر و استغنا جو اقبال کے آئیڈیل انسان کی لازمی صفات ہیں ان میں مفقود ہیں۔ کیونکہ موجودہ تن آسانیوں کے ساتھ ان چیزوں کا تطابق نہیں ہو سکتا۔ قومیت اور وطنیت کے خیالات ان کے دماغوں میں اس طرح رچ چکے ہیں کہ اب انسانیت کی کوئی قدر ان کی نگاہوں میں نہیں رہی۔ اقبال کے نزدیک عورت کا سب سے بڑا جوہر عصمت و عفت ہے۔ جو یورپین معاشرت کے اثرات کی وجہ سے زنگ آلودہ ہو گیا ہے۔ اقبال اس کی نظر میں وسعت پیدا کرنا چاہتا ہے اور اسے اپنی نسائیت کو برقرار رکھنے کی ہدایت کرتا ہے ؎

آں تہی آغوش نازک پیکرے　　　خانہ پرورد نگاہش محشرے
فکر او از تاب مغرب روشن است　　　ظاہرش زن، باطن او نازن است
بندہائے ملت بیضا گسیخت　　　تا ز چشمش عشوہ ہا حل کردہ ریخت
شوخ چشم و فتنہ زا آزاد یش　　　از حیا نا آشنا آزادیش
علم او بار امومت بر نتافت　　　بر سر شامش یکے اختر نتافت
این گل از بستان ما نارستہ بہ　　　داغش از دامان ملت شستہ بہ "رموز بیخودی"

وطنیت کے مغربی نظریہ پر بھی اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی گرم جوشی کے ساتھ کیا ہے۔

یورپ میں سب سے پہلے اس ذلیل فلسفہ کو رواج دینے والا میکا ولی تھا جس نے مادیت کی بنیادوں پر یہ عمارت اٹھائی۔ وہ فلارنس کا رہنے والا تھا۔ اور اس نے "الملوک" ایک کتاب لکھی جو بعد میں شاہنشاہوں کا لائحہ عمل بنی۔ مگر اقبال کی برہمی کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے حب وطن کو جغرافیائی حد بندیوں میں مقید کر دیا۔ وطن یا وطنیت محض ایک عارضی چیز ہے۔ تاریخی حوادث اس کی حدود میں ہمیشہ تغیر و تبدل کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے وہ ہمارے لئے مقصود بالذات نہیں ہو سکتی میکاولی کے اس فلسفہ نے یورپ میں اس قدر رواج پکڑا کہ اس کی ایک مستقل حیثیت قائم ہو گئی۔ آج بھی وہ یورپ کے مفکروں اور سیاستدانوں کے دماغ پر مسلط ہے اور اسی کی بنا پر اقوام یورپ مناقشات کا شکار ہو رہی ہیں۔ ہر ملک کے لئے اس کی متعینہ حدود کی انسانی آبادی سربلندی اور سرفرازی کے قابل ہے اور افراد کا انتہائی نصب العین وطنیت پرستی ہے۔ بین الاقوامی روح کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اقبال نے اپنی مثنوی میں لکھا ہے ؎

دہریت چوں جامۂ مذہب درید — مرسلے از حضرت شیطاں رسید
آں فلارنسائی باطل پرست — سرمۂ او دیدۂ مردم شکست
تنگری مانند آذر پیشہ اش — بست نقش تازۂ اندیشہ اش
مملکت را دینِ او معبود ساخت — فکر او مذموم را محمود ساخت
بوسہ تا بر سرِ پائے ایں معبود زد — نقد حق را بر عیار سود زد
طرح تدبیر زبوں فرجام ریخت — ایں خسک در جادۂ ایام ریخت
شب بہ چشم اہل عالم چیدہ است — مصلحت تزویر را نامیدہ است ("رموز بیخودی")

"اسرار خودی" اور "رموز بیخودی" کے کچھ ہی عرصہ بعد "پیام مشرق" منظر عام پر نمایاں ہوئی۔ "اسرار خودی" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں حقیقت کا عنصر بہت زیادہ ہے اور "رموز بیخودی" میں تخیلی عنصر غالب ہے "پیام مشرق" میں شاعر نے حقیقت اور تخیل کا بڑا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ اس پر فارسی کی شیرینی نے وہ اثر کیا ہے کہ "پیام مشرق" کو بجا طور پر دنیا کے بہترین ادبی شاہکاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ شعریت قدم قدم پر موتی لٹاتی ہے اور زبان کی سلاست اور ترنم ریزی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلکش نغمے الفاظ کے

بیکروں میں ڈھل گئے ہیں تخیل کے آبدار موتیوں سے تمام کلام مرصع ہے اور زبان کے سحر نے ان کی شان کو اور دوبالا کر دیا ہے۔ اس لالہ زار کی نکہت آنی جانی نہیں بلکہ دائم و قائم رہنے والی ہے۔ کیونکہ شاعر نے اسے اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔ اور اپنی بہترین دماغی صلاحیتوں سے کام لے کر اس میں رنگ و بو پیدا کیا ہے۔ یہ کتاب گوئٹے کی مشہور کتاب "سلام مغرب" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اقبال نے شروع کے اشعار میں خود کہا ہے ؎

پیر مغرب شاعر المانوی — آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی
بست نقش شاہدان شوخ و شنگ — داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق — ماہ تاباں ریختم بر شام شرق

اس مجموعہ کی تمام تصویریں بڑی پیاری ہیں جن میں اقبال نے اپنے موقلم سے بڑی شوخ گلکاریاں کی ہیں۔ اور ہر چند وہ "آرٹ برائے آرٹ" کے نظریہ کا قائل نہیں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ خدا نے اسے شاعر پیدا کیا ہے۔ اس کے افکار کی صورتگری میں شعریت کا دامن کہیں بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ اور شاعر کا جمالیاتی ذوق ہر تصویر میں جھلکتا ہے۔ "پیام مشرق" میں یہ رنگ اس قدر گہرا ہو گیا ہے کہ اسے رنگ اور لطافت کا دلپذیر مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ جس نے اپنے اظہار کے لئے الفاظ کی شکل اختیار کر لی۔ صوری اور معنوی حیثیت سے اقبال جن بلندیوں پر پرواز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اس کا صحیح ادراک کرنے کے لئے روح ادب سے واقف ہونا ضروری ہے۔ کتاب کو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "نکتہ دان المانوی" اور "بلبل شیراز" کی دو روحوں نے اقبال کے قالب میں جنم لیا ہے۔

کتاب "پیش کش" سے شروع ہوتی ہے۔ جس کے بعد رباعیات ہیں جن میں اقبال نے زندگی، سخت کوشی، خودداری، عقل و عشق اور خودی پر بعض نہایت بلیغ اشعار قلمبند کئے ہیں۔ اور زبان کی نزاکت کے ساتھ عقل اور حکمت کے ایسے ایسے رموز آشکارا کئے ہیں جن سے ان کی وسعت فکر، تازگی تخیل کا پتہ چلتا ہے ان انمول موتیوں میں سے اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے چند گوہر بے بہا کو پیش کرتا ہوں ؎

دمادم نقشہائے تازہ ریزد — بیک صورت قرار زندگی نیست
اگر امروز تو تصویر دوش است — بخاک تو شرار زندگی نیست

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت   شریک سوز و ساز بحر و بر شو
تو این جنگ از کنار عرصہ بینی   بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

زمیں خاک در میخانۂ ما   فلک یک گردش پیمانۂ ما
حدیث سوز و ساز ما دراز است   جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

دوام ما ز سوز ناتمام است   چو ماہی جز تپش بر ما حرام است
مجو ساحل کہ در آغوش ساحل   تپید یک دم و مرگ دوام است

میا را بزم بر ساحل کہ آنجا   نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز   حیات جاوداں اندر ستیز است

اگر آگاہی از کیف و کم خویش   یمے تعمیر کن از شبنم خویش
دلا دریوزۂ مہتاب تا کے؟   شب خود را برافروز از دم خویش

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش   براہ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دست تو کار نادر آید   گناہے ہم اگر باشد ثواب است

سفالم را مئے او جام جم کرد   درون قطرہ ام پوشیدہ یم کرد
خرد اندر سرم بتخانہ ریخت   خلیل عشق دیرم را حرم کرد

گدائے جلوہ رفتی بر سر طور   کہ جان تو ز خود نامحرمی است
قدم در جستجوئے آدمی زن   خدا ہم در تلاش آدمی است

فطرت کی منظر کشی کے بعض حسین نمونے جو "بانگ درا" میں ملتے ہیں، وہ ہم اس سے پہلے پیش کر چکے ہیں۔ "پیام مشرق" میں یہ نمونے اور زیادہ دلکش ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ان میں موسیقیت اور ترنم کا عنصر بہت بڑھ گیا ہے۔ "فصل بہار"، "سرود انجم"، "نوائے وقت"، "نغمۂ ساربان" اور "ساقی نامہ" اس طرز کے بہترین نمونے ہیں جن میں اقبال نے سبک و شیریں الفاظ کی نشست و ترکیب سے دل موہ لینے والی راگنیاں پیدا کی ہیں اور نغموں کے نشاط انگیز انتشار سے کیف آور فضا پیدا کر دی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ۔

خیز که در کوه و دشت خیمه زد ابر بہار
مست ترنم ہزار   طوطی و دراج و سار
بر طرف جوئبار   کشت گل و لاله زار
چشم تماشا بیار
خیز که در کوه و دشت خیمه زد ابر بہار

خیز که در باغ و راغ، قافلهٔ گل رسید
باد بہاراں وزید   مرغ نوا آفرید
لاله گریباں درید   حسن گل تازه چید
عشق غم نو خرید
خیز که در باغ و راغ قافلهٔ گل رسید

حجره نشینی گذار، گوشهٔ صحرا گزیں
بر لب جوئے نشیں   آب رواں را ببیں
نرگس ناز آفریں   لخت دل فرودیں
بوسه زنش بر جبیں
حجره نشینی گذار، گوشهٔ صحرا گزیں   «فصل بہار»

ہستی ما، نظام ما   مستی ما خرام ما
گردش بے مقام ما   زندگی دوام ما
دور فلک بکام ما، می نگریم و می رویم

خواجه ز سروری گذشت   بنده ز چاکری گذشت
زاری و قیصری گذشت   دور سکندری گذشت
شیوهٔ بت گری گذشت، می نگریم و می رویم

پردہ چرا؟ ظہور چیست؟ اصل ظلام و نور چیست؟

چشم و دل و شعور چیست؟ فطرت ناصبور چیست؟

این ہمہ نزد و دور چیست؟ می نگریم و می رویم

"سرود انجم"

خورشید بہ دامانم انجم بہ گریبانم در من نگری ہیچم، در خود نگری جانم

در شہر و بیابانم، در کاخ و شبستانم من دردم و درمانم من عیش فراوانم

من تیغ جہاں سوزم من چشمۂ حیوانم

چنگیزی و تیموری مشتے ز غبار من ہنگامہ افرنگی یک جستہ شرار من

انسان و جہان او یک نقش و نگار من خون جگر مردان سامان بہار من

من آتش سوزانم من روضہ رضوانم

آسودہ و سیارم این طرفہ تماشا بین در بادۂ امروزم کیفیت فردا بین

پنہاں بہ ضمیر من صد عالم رعنا بین صد کوکب غلطاں بین صد گنبد خضرا بین

من کسوت انسانم پیراہن یزدانم

"نوائے وقت"

ناقۂ سیار من آہوئے تاتار من

درہم و دینار من اندک و بسیار من

دولت بیدار من

تیز ترک گام زن، منزل ما دور نیست

دلکش و زیباستی شاہد رعناستی

روکش حوراستی غیرت لیلاستی

دختر صحراستی

تیز ترک گام زن، منزل ما دور نیست

نغمۂ من دلکشائے زیر و بمش جانفزائے
قافلہ ہا را درائے فتنہ ربا فتنہ زائے

اے بہ حرم چہرہ سائے
تیز ترک گام زن، منزل ما دور نیست

"نغمۂ ساربان"

خوشا روزگارے، خوشا نوبہارے نجوم پرن رست از مرغزارے
لب جو خود آرائی غنچہ دیدی؟ چہ زیبا نگارے چہ آئینہ دارے
نواہائے مرغ بلند آشیانے در آمیخت با نغمۂ جوئبارے
تو گوئی کہ یزداں بہشت بریں را نہادست در دامن کوہسارے
چہ خواہم درین گلستاں گر نخواہم شرابے، کتابے، ربابے، نگارے
بہ ساغر فرو ریز آبے کہ جاں را فروزد چو نورے، بسوزد چو نارے

(باقی آئندہ) "ساقی نامہ"

(اسلوب احمد صاحب انصاری متعلم مسلم یونیورسٹی)

انقلاب روس کا تاریخی پس منظر

انقلاب روس سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا پر ایک عظیم وہمہ گیر اثر پڑا ہے۔ انقلاب صرف سیاسی اور معاشری نظام کو درہم برہم نہیں کرتا بلکہ اس سے ذہنی رجحانات بھی یکسر بدل جاتے ہیں۔ انسان ایک دوسرے کے تجربات سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ انقلاب فرانس نے فرانس ہی کی شہنشاہیت کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ اس کے اثرات اس قدر دور رس تھے کہ اس نے تمام یورپ کو آزادی، مساوات اور اخوت کا سبق دیا۔ اگر آپ یورپ کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو اس کا صحیح اندازہ ہو جائے گا

اس سلسلہ میں ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے انقلاب کے تاریخی پس منظر کا مطالعہ نہایت اہم ہے۔ اسی صورت میں ہم انقلاب کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ کسی ملک میں انقلاب خود بخود نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے پس پشت ایک زبردست تاریخ ہوتی ہے۔ اس تاریخ کو بنانے والے ایک یا دو افراد نہیں ہوتے بلکہ ایک انقلابی جماعت ہوتی ہے جس کے افراد اپنے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں۔ وہ گمنامی کی حالت میں ہر قسم کی قربانیاں کرتے ہیں۔ انقلابی تحریک کا ابتدائی دور ہمیشہ ہنگامی ہوتا ہے جس میں بعض عجیب غریب باتیں رونما ہوتی ہیں۔ مگر یہ خاص حالات کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ اس طرح انقلابی تحریک سماج کی گود میں پرورش پاتی رہتی ہے۔

روس کے انقلاب کو اکثر لوگ ایک معجزہ سمجھتے ہیں لیکن اگر اس کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ روس کی تاریخ کا ایک لازمی نتیجہ تھا۔ سیاسی اعتبار سے روس دیگر مغربی اقوام کے مقابلہ میں بہت پیچھے تھا۔ روس کی سیاسی جدوجہد ایک عجیب کشمکش کی تاریخ ہے۔ ایک طرف تو ہم قرون وسطیٰ کے گرجا اور ایشیائی مطلق العنان بادشاہت کو دیکھتے ہیں اور دوسری طرف نراجی اور عدمیت پسند تحریکیں بروئے کار نظر آتی ہیں۔

روس کے دو بڑے تاریخی ادارے زار اور بڑے زمیندار تھے۔ زار کی اہمیت سیاسی تھی اور زمینداروں

کی سماجی۔ زار کی شخصیت کی وجہ سے روس کے لوگوں میں اتحاد رہا اور وہ تاتاریوں، ترکوں، پولینڈ اور سویڈن کے رہنے والوں کے مقابلہ میں لڑائیوں میں کامیاب رہے۔ اس کے علاوہ امراء اور جاگیرداروں کی سرکوبی ہوتی رہی اور انھیں سر اٹھانے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ اسی طرح پادریوں اور مذہبی رہناؤں کو بھی زار کے خلاف کبھی دم مارنے کی جرأت نہیں ہوئی بلکہ ایک طرح سے یہ لوگ زار کے ہمیشہ حلیف رہے۔ اسی طرح حالات نے روس میں ایک شخصی حکومت کو برقرار رکھا اور زار کی شخصی قوت یورپ کی دیگر شخصی حکومتوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ رہی۔ روس ایک زرعی ملک رہا ہے۔ وہاں صنعتی اور شہری زندگی تقریباً مفقود تھی۔ وہاں کی زیادہ تر آبادی مزدور کاشتکاروں کی جماعتوں پر مشتمل تھی۔ وہ لوگ صحیح معنوں میں کاشتکار بھی نہیں تھے۔ بلکہ زمینداروں کے غلام تھے جو قلیل اجرت پر کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ اس نظام کی وجہ سے زمینداروں اور زار میں یگانگت تھی۔ اس طرح حکومت کو لگان وصول کرنے اور فوج میں رنگروٹوں کو بھرتی کرنے میں آسانی رہتی تھی۔

اسی وجہ سے تمام ملک پر جہالت اور افلاس کی بلا مسلط رہی۔ حکومت کی سختیوں سے لوگوں میں بے چینی پیدا ہوتی رہتی تھی۔ جو اکثر ادقات بغاوتوں کی شکل میں نمودار ہوتی۔ ان حالات نے اس سوئی ہوئی قوم میں انتہا پسند انقلابی جراثیم پیدا کر دئے۔

کیتھرائن اور الیگزنڈر اول کے زمانے میں انتہائی قسم کے لبرل خیالات اعلیٰ طبقہ کے لوگ صرف فیشن کی خاطر رکھتے تھے۔ چنانچہ نکوس کے عہد کے شروع میں پیٹرس برگ کے سنتریوں نے جن میں بہت سے لوگ خاندان کے افسران بھی شامل تھے بغاوت کرنا چاہی مگر انھیں سختی کے ساتھ دبا دیا گیا۔ الیگزنڈر دوم کے عہد میں مختلف حالات نے روس کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔

جنگ کریمیا کی شکستوں کی وجہ سے اس وقت کی طرز حکومت کو غیر مفید خیال کیا جانے لگا۔ عام طور سے مغربی طرز حکومت کو ترجیح دی گئی۔ نوجوان زار نے اس ضرورت کو محسوس کیا چنانچہ اس نے غلام کاشتکاروں کی نجات کے لئے قانون بنائے نئی عدالتیں قائم کیں اور تعلیم عام کرنا چاہی۔ مگر ان اصلاحات کی روس کے رجعت پسند طبقہ نے مخالفت کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح رجعت پسندوں اور انتہا پسندوں میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ ان اختلافات نے ان دونوں جماعتوں میں بڑی کش مکش پیدا کر دی۔ کیونکہ انتہا پسند جماعت سے متعلق

سیاسی اداروں کو خطرہ تھا بلکہ وہ سماج کے پرانے اور بوسیدہ اداروں یعنی ملکیت، مذہب اور خاندان کے بھی درپے تھی۔

ان حالات میں روس کی انقلابی تحریک کی بنیاد پڑی۔ آسانی کے لئے ہم اس تحریک کی تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

پہلا دور ۱۸۵۵ء (جو الیگزنڈر دوئم کے عہد سے شروع ہوتا ہے) سے ۱۸۷۰ء تک ہے۔ اس دور کی خصوصیت منفی اور تخریبی ہے جو عدمیت (Nehilism) کی صورت میں نمودار ہوئی مختصر الفاظ میں اس تحریک کا مقصد سوسائٹی کے تمام فرسودہ اداروں کو مٹانا ہے تاکہ پھر نئے سرے سے سماج کی عمارت کھڑی کی جائے۔ یہ نظریہ محض سیاسی نہیں تھا بلکہ ہیگلی فلسفہ کے بائیں بازو کی روح تھی۔ اور اس کی بنیاد Moleschott اور Buchner کے فلسفہ مادیت پر تھی۔ اس ملک میں جہاں تعلیم یافتہ طبقہ پر مذہب کا اثر کم ہو اور عوام کے دماغ فلسفہ کی ذہنی عیاشیوں سے پاک ہوں وہاں فلسفہ مادیت کو قبول کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روس کے اس زمانے کے بڑے بڑے مفکر فلسفہ مادیت کے علمبردار تھے۔

تورگنیف نے اس تحریک کا نقشہ اپنے مشہور ناول "باپ اور بیٹے" میں اس طرح کھینچا ہے کہ نہلسٹ وہ لوگ تھے جو ـــــ "کسی قسم کی طاقت یا حاکم کے سامنے سر نہیں جھکاتے تھے اور کسی اصول کو خواہ وہ کتنا ہی قابل تعظیم ہو عقیدہ کا درجہ نہیں دیتے تھے" وہ لوگ سیاسی اور سماجی اداروں۔ مذہب اور خاندان پر منفی نقطہ نظر سے تنقید کرتے تھے۔ وہ ان تمام باتوں کو جو پرانی ہیں (خواہ وہ اچھی ہوں یا بری) ٹھکراتے تھے۔ ان کے لئے آرٹ، شاعری یا رومان کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ ان کے خیال میں ایک نیا تجربہ جو مینڈک چیر کر کیا جائے اور ہمارے اثباتی علم میں اضافہ کرے زیادہ اہم تھا۔ بہ نسبت گوئٹے کی شاعری یا رفیل کی مصوری کے۔

تورگنیف کے ناول کا ہیرو بیزروف نہلسٹ تحریک کا علمبردار ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو اس کے کردار میں جاذبیت نہ محسوس ہو کیونکہ وہ بہت خشک مزاج ہے اور اپنے خاندان سے بے تعلق نظر آتا ہے۔ مگر ہم اس کی جرأت، ایمانداری، صاف گوئی اور انانیت کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کی قبل از وقت موت کی وجہ سے ہم اس کے متعلق اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وہ آئندہ کیا ہوتا لیکن اگر قصہ جاری رہتا تو ہم دیکھتے

کہ تعمیری خیالات اس کے تخریبی خیالات کی جگہ لے لیتے۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کوئی تخریبی تحریک مستقل نہیں ہوتی بلکہ وقت کی ایک ضرورت ہوتی ہے۔ نہلسٹ تحریک کے علمبرداروں نے ڈارون، ہربرٹ اسپنسر اور مل کی تحریروں میں ایک وسیع دنیا پائی اور بعد میں سین سائمن، فوریر، رابرٹ آؤن اور مارکس کے نظریوں کے متاثر ہوئے۔ انھوں نے لوگوں کی توجہ آرٹ اور شاعری کی جذباتی دنیا سے ہٹا کر روٹی، ابتدائی تعلیم اور "عورتوں کے حقوق" کی مبذول کرائی۔ یہ صرف اس لئے کہ انھیں مظلوم طبقہ سے ہمدردی تھی۔

یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے فلسفہ حیات کی روس کے افکار کی تاریخ میں ضرورت تھی۔ چنانچہ اس سے باوجود اس کے انتہائی تخریبی ہونے کے مفید نتائج مرتب ہوئے۔ اُس ملک میں جو توہمات اور تعصبات کے بوجھ سے پسا جا رہا ہو اس قسم کی تخریبی تحریک کی اشد ضرورت تھی۔ مگر جوں جوں وقت گذرتا گیا، روس میں انقلابی تحریک نے ایک تعمیری اور اثباتی شکل اختیار کرنا شروع کی تھی۔

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا   غالبؔ

اس کے بعد انقلابی تحریک کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جبکہ اس تحریک پر اشتراکی خیالات کا عنصر غالب تھا۔ اشتراکیت کی تعلیم دیر جار اس دور کی خصوصیت ہے۔ "انٹرنیشنل" کا بڑھتا ہوا اثر، اشتالیوں کی پیرس کی جدوجہد اور جرمنی کی سوشل ڈیموکریسی یورپ کے ان تمام تاریخی واقعات نے روس کی آزادی کے علمبردار نوجوانوں میں ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ ان کے سامنے اب ایک نصب العین تھا اور وہ روس کی پرولتاریہ کی نجات دہندگی تھا۔ ابتدا میں اس نئی تحریک پر باکونین کی اشتراکی نراجیت (Anarchic Socialism) کا کافی اثر تھا۔ باکونین کی تعلیم کے مطابق اس جماعت کے افراد نے "عوام سے ملاپ" اور ان نئے خیالات کی عوام میں اشاعت شروع کی۔ حکومت کی سخت گیر پالیسی نے اس تحریک کو اور ابھارا۔ انیسویں صدی کے آخر میں روس کے کئی طلبا یورپ خاص کر سوئزرلینڈ میں تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے۔ وہاں انھیں روسی جلاوطن سے ملنے جلنے اور تبادلہ خیالات کا موقع ملتا تھا۔ ان کی صحبت میں رہ کر یہ طلبا بھی انقلابی خیالات کے حامی بن جاتے تھے۔ جب یہ اپنے وطن لوٹتے تو اپنے ساتھ نئے نئے خیالات لاتے۔ ان کی کوئی باقاعدہ جماعت نہ تھی اور نہ کوئی لائحہ عمل صرف ایک اصول

تھا اور وہ یہ کہ عوام میں جا کر نئے خیالات کا پرچار کیا جائے۔ ان میں سے اکثر اس مقصد کے لئے استاد، نرسیں اور ڈاکٹر بن گئے۔ اور مواضعات میں بودوباش اختیار کرلی۔ کئی لوگوں نے محض اس وجہ سے کہ وہ عوام سے ممتاز نہ رہیں نہایت ہی ادنیٰ قسم کے پیشے اختیار کئے۔ نجاری اور جوتے سینے کا کام نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اس لئے اکثر انہیں پیشوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ بعض لوگ کارخانوں میں پندرہ پندرہ گھنٹے مسلسل کام کرتے تھے تاکہ انہیں مزدوروں میں اپنے خیالات کے پھیلانے کا موقع مل سکے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جن کا تعلق بڑے خاندانوں سے تھا اور جو بڑے ناز و نعم میں پرورش کئے گئے تھے۔ کسانوں میں رہ کر گمنامی میں اپنی زندگیاں گذار دیتے تھے وہ اپنے ہاتھوں اور چہروں کو کھردرا بنا لیتے اور معمولی کسانوں کا لباس پہنتے تھے۔ صرف اس لئے کہ ان میں اور کسانوں میں جو فرق ہے وہ مٹ جائے۔

شروع شروع میں ان بے لوث کام کرنے والوں کی کوششیں زیادہ بارآور نہ ہوسکیں۔ کسانوں میں توہمات اور تعصبات زیادہ تر پائے جاتے ہیں اس لئے ابتدا میں یہ لوگ ان نئے خیالات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکے۔ اس کے علاوہ ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ اس انقلابی جماعت کے بہت سے افراد ان نئے خیالات کو مدلل اور عام فہم طریقہ پر لوگوں کو نہیں سمجھا سکتے تھے۔ یہ لوگ دوسرے مغربی ممالک کی مثالیں دیتے تھے جنھیں روس کے مخصوص حالات اور ماحول سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

یہ تحریک حکومت کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہ رہ سکی۔ ان خیالات کے پھیلانے والے افراد نہایت جوشیلے تھے وہ اپنے خیالات کی نشر و اشاعت میں مطلق احتیاط نہیں برتتے تھے۔ اور کھلے بندوں کام کرتے تھے حکومت کو اس تحریک کے علمبرداروں کو ڈھونڈنے میں زیادہ دقت پیش نہ آئی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۷۴ء کے آخر تک تقریباً تمام انقلابی جیل میں بھر دئے گئے۔ سنہ ۱۸۷۳ء اور سنہ ۱۸۷۷ء کے درمیان دو ہزار سے زیادہ لوگ گرفتار کرلئے گئے۔ بہت سے جیلوں میں مدت تک نظر بند رہے۔ مقدمے چلانے کے بعد عدالتوں نے زیادہ لوگوں کو بری کر دیا مگر حکومت نے حکمت عملی سے سب کو جلاوطن کر دیا۔

ان تلخ تجربات کے بعد انقلابیوں کو اپنا طرز عمل بدلنا پڑا۔ انہوں نے پُرامن پروپیگنڈے کے بجائے عمل کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ انہوں نے عوام کے ساتھ بودوباش اختیار کی اور انہیں حکومت کے

خلاف کھڑے ہونے کے لئے تیار کرنا شروع کیا چونکہ حکومت نے پرامن پرچار کو بھی ممنوع قرار دیا تھا اس لئے انہوں نے تشدد آمیز طریقے استعمال کرنے کی کوشش کی۔

پچھلے تجربات نے انقلابیوں کو مفید سبق سکھایا۔ ان پر ان کی کمزوریاں ظاہر ہو گئیں اور وہ یہ اچھی طرح سمجھنے لگے کہ صرف انفرادی کوششوں سے انقلاب پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ حکومت کی سختیوں کی وجہ سے تحریک ختم ہوئی جا رہی تھی۔ انہوں نے اس کی سخت ضرورت محسوس کی کہ ایک منظم جماعت قائم کی جائے۔ یہیں سے انقلابی تحریک کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اب انہیں باکونین کے اصولوں کو چھوڑنا پڑا۔ کیونکہ پرانے طریقے انقلاب پیدا کرنے میں ناکام ثابت ہو چکے تھے۔ انہیں اب پورا یقین تھا کہ سوائے مطلق العنان حکومت اور اس کے حامیوں کے خلاف صف آرا ہو جانے اور اپنے مخالفین سے کسی صورت میں بھی صلح نہ کرنے کے کوئی چارہ کار نہیں ہے چنانچہ انہوں نے زاریت کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔

اس مقصد کے لئے تمام کارروائیاں پارٹی کی مرکزی کمیٹی سے کی جاتی تھیں۔ چونکہ یہ جماعت غیر قانونی تھی۔ اس لئے کام خفیہ اور پوشیدہ طریقے سے کیا جاتا تھا۔ اس زمانہ کا مشہور واقعہ جنرل ٹری پوف (Trepoff) کا قتل ہے جو پیٹرس برگ میں ۱۸۷۸ء میں ہوا۔ اس کی قاتلہ ایک عورت تھی جس کا نام ویرا (Vera) تھا۔ عدالت میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے اس نے کہا کہ "میرا مقصد ان مظلوموں کا بدلہ لینا ہے۔ جو مطلق العنانی کے ہاتھوں پس رہے ہیں۔" ویرا نے جنرل کو صرف اس لئے قتل کیا تھا کہ جنرل نے ایک سیاسی قیدی کے بازار میں کوڑے لگوائے تھے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ویرا اس قیدی سے بالکل ناواقف تھی۔ جیوری نے ویرا کو رہا کر دیا۔ لیکن پولیس نے اس کو پھر گرفتار کرنا چاہا۔ مگر آخر کار وہ سوئٹزرلینڈ بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر عوام نے ویرا سے ہمدردی کے کئی ثبوت دیئے۔ چنانچہ اس کے تھوڑے ہی دن بعد پولیس کے متعدد افسران اور بعض صوبوں کے گورنر ون وحاڑے قتل کر دیئے گئے۔ آخر کار انقلابیوں نے مطلق العنان حکومت کے سرچشمہ یعنی زار کو قتل کرنے کی سازش کی۔ زار کو ختم کرنے کے لئے اس پر کئی مرتبہ گولی چلائی گئی۔ شاہی ٹرین پر بم پھینکے گئے اور ونٹر پیلس کو اڑانے کی کوشش کی گئی۔ سوء اتفاق سے ہر جگہ ناکامی ہوئی۔ آخر کار ۱۳ مارچ ۱۸۸۱ء کو الیگزنڈر قتل کر دیا گیا۔

اس انقلابی تحریک کے طلبہ وار روس کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے تھے ان میں بعض امرا کے خاندانوں کے اور بعض پادریوں اور افسروں کی اولاد تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے نوجوان کسان اور مزدور اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ اس تحریک کو فروغ دینے میں عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش کام کر رہی تھیں چنانچہ سوفیا نامی لڑکی نے جس کا تعلق ایک معزز خاندان سے تھا اپنی نقاب اُلٹ کر ان آدمیوں کی رہنمائی کی جنھوں نے بم پھینک کر الیگزنڈر دوئم کا خاتمہ کیا تھا۔ اس جماعت کے تقریباً تمام افراد نوجوان تھے ان کی عمریں پچیس برس کی بھی نہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ولولہ تھا اور خود اعتمادی تھی۔ وہ ذہنی گتھیوں کے سلجھانے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے تھے اور نہ بوڑھوں کی طرح خواہ مخواہ خطرات کے پہاڑ کھڑے کرتے تھے جو انھیں کام کرنے سے باز رکھ سکیں۔ انقلابیوں میں انتہا پسندی خود بخود پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ حالات کی وجہ سے مجبور تھے کہ اپنا طرز عمل اس قسم کا رکھیں۔ سخت گیر حکومت کے ظلم و تشدد بے انتہا تھے۔ یونیورسٹی میں اگر طلبا کچھ گڑبڑ پیدا کرنا چاہتے تو انھیں دبانے کے لئے انسانیت سوز طریقے استعمال کئے جاتے تھے محض شبہ پر ہزاروں نوجوان بغیر مقدمہ چلائے جیلوں میں سڑتے رہتے تھے۔ روس میں ہر قسم کا پروپیگنڈہ خلاف قانون تھا۔ انقلابیوں کو جلسے منعقد کرنے کی بالکل اجازت نہ تھی۔ اخبارات پر سخت پابندیاں عائد تھیں۔ وہ ہر وقت جاسوسوں سے گھرے رہتے تھے۔ اگر اُس وقت روس کی حکومت دیگر حکومتوں کی طرح آئینی ہوتی تو عوام کے حقوق کا خیال رکھتی اور ان کے مطالبات کو ماننے کے لئے تیار ہو جاتی اور انقلابی جماعت میں اتنی انتہا پسندی پیدا نہ ہوتی۔

اس کا ثبوت ہمیں اس بات سے ملتا ہے کہ اس پارٹی کی مجلس عاملہ نے جو سپاس نامہ الیگزنڈر سوئم کو ۱۸۸۱ء میں پیش کیا اس میں انھوں نے وعدہ کیا کہ ہر قسم کی دہشت انگیزی کو ختم کر دیں گے اگر ان کے صرف اس مطالبے کو مان لیا جائے کہ قومی اسمبلی منعقد کی جائے جس کے تمام ممبران عوام آزادانہ طور پر منتخب کریں اسی طرح انقلابی کچھ عرصہ تک حکومت کی سخت گیر پالیسی کے شکار رہے۔ اسی اثنا میں روس میں صنعت پھیلتی جا رہی تھی جس کی وجہ سے ایک کثیر تعداد میں مزدور طبقہ پیدا ہوا اور جلد ہی روسی سماج کا ایک اہم جزو بن گیا اب اشتراکیوں کو اپنے لئے ایک وسیع میدان مل گیا۔ پیٹرس برگ کا مشہور اسٹرائک جو ۱۸۹۶ء میں ہوا تھا

انقلابی تحریک میں ایک عظیم تبدیلی کا باعث ہوا۔ اس کے کچھ روز بعد ہی ایک سماجی اشتراکی پارٹی کی بنیاد پڑی جو مارکس کے اصولوں کی حامی تھی۔ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں پہلی مرتبہ روسی اشتراکی بحیثیت نمائندوں کے انٹرنیشنل کانگریس میں شریک ہوئے جو لندن میں منعقد ہوئی تھی۔

اشتراکیوں کی بعد میں دو جماعتیں بن گئیں۔ کچھ پرانے پسماندہ انتہاپسند اشتراکیوں نے اپنی ایک جماعت اشتراکی انقلابی پارٹی کے نام سے ۱۹۰۱ء میں قائم کی یہ پارٹی اس کی حامل تھی کہ کسانوں میں زور شور سے پروپیگنڈہ کیا جائے اور ساتھ ہی زاریت کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا جائے۔ دوسری پارٹی اشتراکی جمہوریں کی تھی یہ لوگ روس میں اس وقت تک انقلاب کرانا نہیں چاہتے تھے جب تک کہ وہاں کے اقتصادی حالات اجازت نہ دیں اور مزدور طبقہ اچھی طرح پیدا نہ ہو جائے لیکن پہلی پارٹی کا اثر عوام پر زیادہ تھا۔

۱۹۰۱ء میں طلبا نے بڑا ہنگامہ کیا۔ انھوں نے حکومت کے احکام کی مخالفت کی جن کی رو سے طلبا زبردستی فوج میں بھرتی کئے جاتے تھے۔ اس میں پیٹرس برگ اور ماسکو کے مزدوروں نے طلبا کا ساتھ دیا۔ چنانچہ حکومت کو مجبوراً بادل ناخواستہ ان احکام کو واپس لینا پڑا۔

لیکن زار کسی قسم کی آئینی ترقی بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ کاؤنٹ وٹی جس نے کچھ اصلاحات کرنے کی کوشش کی علیحدہ کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ فان پلیہو (Von Plehoe) مقرر کیا گیا۔ جو بعد میں کسی انقلابی کی گولی کا نشانہ بن گیا۔

جنوری ۱۹۰۵ء میں ایک پادری گیپن نے تقریباً ایک لاکھ مزدوروں کے ساتھ جو بالکل نہتے تھے جلوس کی صورت میں ونٹر پیلس کے سامنے مظاہرہ کیا اور ان کے حقوق کا مطالبہ کیا۔ اس پر امن مجمع پر گولی چلوائی گئی جس میں ہزاروں عورتیں بچے اور ضعیف شامل تھے چنانچہ تقریباً دس ہزار آدمی ہلاک اور مجروح ہوئے گیپن وہاں سے کسی طرح بچ نکلا مگر بعد میں اسے بھی کسی غیر معروف شخص نے ہلاک کر دیا۔ یہ نامبارک دن اتوار کا تھا جسے لوگ خونی اتوار کہتے ہیں۔

اس کے بعد ہی سارے روس اور تمام پولینڈ میں اسٹرائک ہوا۔ اڈیسہ میں فوجیوں نے بغاوت کر دی بحیرہ اسود کے بیڑے میں بغاوت کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ مجبوراً زار نے اگست ۱۹۰۵ء میں آئینی دستور دیا جس میں

مزدوروں اور غریبوں کو رائے دینے کے حق سے محروم رکھا گیا۔ اس سے کوئی بھی مطمئن نہیں ہوا۔ چنانچہ ماسکو میں مشہور عام اسٹرائک ہوا جو تمام روس میں آگ کی طرح پھیل گیا۔ تمام ٹرینوں کی آمد و رفت بند ہو گئی یہاں تک کہ اس اسٹرائک میں عدالتوں کے بہت سے ججوں نے بھی حصہ لیا۔ زار نے کاونٹ وٹی کو واپس بلایا اور ۳۰ اکتوبر کو اعلان کیا کہ ڈوما یعنی روسی پارلیمنٹ منعقد کی جائے گی اس کے دو روز بعد تمام سیاسی اسیروں کی معافی کا اعلان کیا گیا لیکن اب اس کی مراعات عوام کو مطمئن نہیں کر سکتی تھیں۔ انھوں نے اپنی ضرورتوں کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ پرانے نظام کو الٹے بغیر انھیں سچا اطمینان میسر نہیں آ سکتا تھا چنانچہ اس کے بعد ماسکو میں جنوری ۱۹۰۶ء میں بلوے ہوئے اور ہزاروں جگہ کسانوں نے بغاوتیں کیں۔

مئی ۱۹۰۶ء میں پہلی ڈوما منعقد ہوئی۔ اشتراکی پارٹیوں نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ ۱۹۰۷ء میں دوسری مرتبہ ڈوما کے انتخابات میں دونوں اشتراکی پارٹیوں نے حصہ لیا۔ اس میں ۵۲۴ ممبران میں سے ۱۳۲ اشتراکی تھے یہ تعداد اہمیت کی نہیں تھی کیونکہ اس وقت اشتراکی خیالات رکھنے والوں پر بڑی سختیاں کی جاتی تھیں۔ دوسری ڈوما جون میں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد ہی سولہ اشتراکی ممبر گرفتار کر لئے گئے اور ۱۵۰ اشتراکی ممبران نظر بند کر دئے گئے۔ اس کے بعد ہی بغیر ممبران کی رائے کے ایک قانون بنایا گیا جس کی رو سے رائے دہندگی کا حق زیادہ تر زمینداروں اور سرمایہ داروں تک محدود رکھا گیا۔ جب اس کی مخالفت کی گئی تو پھر سختیاں شروع ہو گئیں بہت سے اخباروں کے اڈیٹروں کو سائبریا جلا وطن کر دیا گیا۔ ڈوما کے بعض اشتراکی ممبروں کو قید بامشقت کی سزا دی گئی اور کئی کے سیاسی حقوق سلب کر لئے گئے۔ صرف ۱۹۰۸ء میں ستر ہزار افراد جلا وطن کئے گئے اور سات سو بیاسی آدمی پھانسی پر چڑھائے گئے۔

ان تجربات نے روس کے انقلابیوں میں ہم آہنگی پیدا کر دی۔ ان میں آپس میں اختلافات رہے مگر ان کی نوعیت مختلف تھی۔ زاریت کے مظالم اور سختیوں کا یہی نتیجہ نکلا کہ ان کے ارادے مضبوط ہوتے چلے گئے۔ انھوں نے اپنی قربانیوں اور ان تھک کوششوں سے مزدوروں۔ کسانوں اور سپاہیوں میں ایک احساس پیدا کر دیا تھا۔ عوام پرانے نظام کی خامیوں کو سمجھنے لگے تھے۔ وہ اس کے منتظر تھے کہ حکومت کی مشنری کمزور ہو۔ اور اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر اس پر قابض ہو جائیں۔ انقلابی جماعت کے رہنماؤں کی دانشمندی

کی وجہ سے تحریک ہمیشہ صحیح راستہ پر رہی۔ انھیں حالات کا صحیح اندازہ تھا چنانچہ گزشتہ جنگ عظیم میں جب زار کی فوجوں کو پے در پے شکستیں ہوئیں تو وہ حکومت کے رویہ سے بد دل ہو گئے۔ ادھر ملک میں ابتری بڑھتی گئی۔ خاکر کسانوں میں عام بے چینی پھیل گئی غرضکہ مواد اندر ہی اندر تنا پکا تھا کہ زخم کا پھٹنا ضروری ہو گیا۔ انقلابی پارٹی اور اس کے رہنماؤں نے اس موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اگر اس وقت وہ اپنی کمزوری دکھاتے اور صرف اصلاحی اور سطحی رعایتوں پر ہی اکتفا کرتے تو یورپ کے اور ملکوں کی طرح آج انھیں بھی فاشزم اور سامراج کی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پنا پڑتا۔ مگر انھوں نے پرانے نظام کی بوسیدہ عمارت کو انقلاب ۱۹۱۷ء کے ذریعہ بالکل منہدم کیا۔ اور دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اشتراکیت کی عمارت کی بنیاد ڈالی۔

یہ انقلاب صرف معدودے چند افراد کی مہم پسند طبیعتوں کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کی خاموش اور مسلسل قربانیوں کا رہین منت ہے۔ مختلف زمانوں میں حالات کے مطابق مختلف انقلابی تحریکیں اٹھیں اور انھوں نے اپنے وقت کی ضرورتوں کو پورا کیا۔ انقلابیوں نے ان تحریکوں کا پہلے سے کوئی خاکہ تیار نہیں کر رکھا تھا۔ وہ صرف زمانہ کی پیداوار تھیں۔ انقلابیوں کا کام یہ تھا کہ انھوں نے حالات سے متاثر ہو کر ان تحریکوں کو قبول کیا اور انھیں آگے بڑھاتے رہے۔ یہاں تک کہ اپنے آخری مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

مرزا اشفاق بیگ صاحب متعلم ایل ایل بی فائنل

امانت کی غزل گوئی پر ایک نظر

(گذشتہ سے پیوستہ)

امانت کا خاص رنگ | مذکورالصدر خصوصیات لکھنؤ کے دیگر باکمال شعراء کے یہاں بھی کم وبیش موجود ہیں لیکن امانت کے کلام میں بعض ایسے عناصر بھی شامل ہیں جو انہیں سے مخصوص ہیں مثلاً

رعایت لفظی ۔۔ لکھنؤ میں اس کا شوق پہلے سے موجود تھا البتہ اسے فنی حیثیت امانت نے بخشی اور اس طرح یہ ان ہی کے کلام کا خاصہ بن گیا۔

یاد دُرِ دندان میں مری جان گئی رند تقدیر نے کشتہ کیا ہیرے کی کنی کا

وصل کی شب پلنگ کے اوپر مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں

جو میٹھی میٹھی نظروں سے وہ دیکھے کہوں آنکھوں کو میں بادام شیریں

مرغ جاں کو توڑے گی بلی ترے دروازہ کی رخنت تن کو کاٹے کا چوہا تمہاری ناک کا

امانت کے دیوان خزائن الفصاحت کے سرورق کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"دیوان امانت، خزائن الفصاحت، تاریخی نام ہے، بڑے استاد کا کلام ہے۔ یعنی شاعر شیریں مقال، ساحر سحر حلال، ذاکر امام مقبول انام، سخنور بے بدل استاد ضرب المثل، موجد رعایت لفظی، جناب سید آغا حسن صاحب لکھنوی......."

اس سلسلہ میں امانت کے کلام میں رعایت لفظی کے بے شمار نمونے موجود ہیں۔ جہاں رنگ صاف ہے وہاں زبان وبیان سے لطف پیدا کر دیا ہے لیکن جہاں اعتدال سے گذر گئے ہیں وہیں عیب پیدا ہو گیا ہے

ہنگام رقص زلف سے نکلی تڑپ کے صاف توڑا تمہاری کان کی مچھلی نے جال کیا

کر خط سے بوسہ لب شیریں ولا نہ ترک قند ونبات میں نہیں ہوتا ہے بال کیا

قبر کے اوپر لگایا نیم کا اس نے درخت بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

آگیا اس شعلہ رو کے دھانی جوڑے کا خیال | خانۂ دل میں کنول اک سبز روشن ہوگیا
تو ہے وہ صید فگن دشت میں رکھے جو قدم | آنکھیں آآ کے ملیں بھیڑیئے گرگابی پر
ہندو پسر کے عشق کا کشتہ ہوں باغباں | لالا کے پھول رکھنا امانت کی گور پر
گر عین وعدہ دید فہ کسی روز آئے تو | سو جائیں بھی تو آنکھ ہماری کھلی رہے
اثر ہے گنجفہ میں بھی سیاہ بختی کا | ہماری بازی میں کب آفتاب نکلا ہے

اس قسم کی مثالیں امانت کے کلام میں بہت ہیں اور ان کی کثرت نے ہی امانت کو بدنام کر رکھا ہے۔ ورنہ ان کے کلام میں بہت سی خوبیاں بھی موجود ہیں۔

سب سے اہم پہلو زبان کا ہے۔ مضمون کے اعتبار سے لکھنؤ کے سرآمد شعراء کا بیشتر کلام ادنیٰ درجے کا ہے لیکن ان کے کمال کا اصلی جوہر ان کی زبان ہے۔ غالب نے ایک موقع پر یہ مصرعہ پڑھ کر کہ

نہاتا ہے وہ مہ دریا میں کپڑے ہورد ھوتی ہے

کہا تھا کہ مضمون دلی کا اور زبان لکھنؤ کی خوب ہے۔ زبان کی خدمت شعرائے لکھنؤ میں ناسخ نے سب سے زیادہ کی اور فی الحقیقت زبان کے امام ناسخ قرار پائے۔ الفاظ کی صحت وعدم صحت کے اصول مقرر کر کے بہت سے قدیم و ثقیل الفاظ و محاورات کو ترک کر دیا اور ان کی جگہ نئی ایجادات سے زبان کو فروغ بخشا

زبان کی خوبی کے اس عام اصول پر لکھنؤ کے تمام شعراء کاربند تھے اور معمولی شاعروں کے کلام بھی زبان کی لطافت وخوبی کا بہترین مرقع ہوتا تھا۔ آتش کے یہاں یہ رنگ بہت نمایاں ہے اور ان کے معاصرین میں اس وصف خاص میں شاید کوئی ان سے بازی لے جا سکے۔

امانت نے بھی زبان کی صحت کا بڑا خیال رکھا ہے اور خصوصیت کے ساتھ محاورہ بندی کی طرف توجہ کی ہے اور اس فن میں انہیں لکھنؤ میں اگر وہی درجہ دیا جائے جو بعد میں دلی میں داغ کو ملا تو بے جا نہ ہوگا۔ ذیل کی مختصر فہرست سے بھی ان کی اس کوشش کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

محاورہ | شعر
پتا کھڑکنا۔ آفت کی ہوا اک چلی باغ جہاں میں | پتا بھی نہ کھڑکا مرے گلشن کے شجر کا

نہ اِدھر کا نہ اُدھر کا رکھنا۔

کعبہ کی نہ بت خانہ کی دی اس نے اجازت ‏ رکھا مجھے کافر نے اِدھر کا نہ اُدھر کا

حق ادا ہونا۔ ‏ تپ ہجر سے دم فنا ہو گیا ‏ قضا سے مرا حق ادا ہو گیا

آب آب ہونا۔ آمد سے یار کی یہ ہوئے ہیں گل آب آب ‏ چھڑکاؤ ہو گیا ہے چمن میں گلاب کا

انگلیاں اُٹھنا۔ کیا مرتبہ ہوا ہے امانت کو دستیاب ‏ سو انگلیاں اٹھیں وہ جدھر سے نکل گیا

در در کی ٹھوکریں کھانا۔

در در کی ٹھوکریں نہ کھلا بہر اہل بیت ‏ بتلا دے اپنا گھر مجھے اے خانماں خراب

سر پہ احسان لینا۔

آفتیں آئیں دلا اس سے فراواں سر پر ‏ میں تو لوں گا کبھی قاتل کا نہ احساں سر پر

سر پہ اٹھانا۔ فصل گل آئی چمن میں کہ قیامت آئی ‏ عندلیبوں نے اٹھایا ہے گلستاں سر پر

سر آنکھوں پر بٹھانا۔

میں وہ ہوں رند اگر دیر و حرم میں جاؤں ‏ گبر آنکھوں پہ بٹھائیں تو مسلماں سر پر

سر پہ خاک اڑانا۔

کوہ ٹکرائیں گے آپس میں مروں گا جس دن ‏ خاک اڑائیں گے مرے غم میں بیاباں سر پر

سر پہ شیطان چڑھنا، بھوت بن جانا۔

آدمی کیا وہ فرشتے کی نہیں سنتے ہیں ‏ بھوت بن جاتے ہیں جب چڑھتا ہے شیطاں سر پر

گھانس کاٹنا۔

قصہ کہتے ہیں نظر جب آگیا مجھ کو وہ گل ‏ گھانس کاٹی عارض رنگیں کا سبزہ دیکھ کر

اوس پڑنا۔ ‏ شبنم کے ہیں گہر نظر آتے نہ گوش پر ‏ کیا اوس پڑ گئی ہے چمن میں بہار پر

کان رکھنا، ناک میں دم ہونا۔

ناک میں دم ہے گل اندا موں کی بیدردی سے ‏ کان رکھتے نہیں عشاق کی فریادوں پر

گھی کے چراغ جلنا۔

بعد فنا بھی نعمت دنیا کی چاٹ ہے ‏ ‏ گھی کے چراغ جلتے ہیں زاہد کی گور پر

گریبان میں منھ ڈالنا۔

دیکھ کر تیغ بکف میں نے یہ دلبر سے کہا ‏ ‏ جان لیتے ہیں نہ دل آپ مرا دیتے ہیں
بولا وہ غصہ سے منھ ڈال گریباں میں ذرا ‏ (ق) ‏ مانگتے کب ہیں جو کچھ اہل وفا دیتے ہیں

ہاتھوں کے طوطے اڑنا۔

دھانی انگیا کی دو چڑیاں کا کے چمن میں چڑیا ‏ ‏ طوطے صیاد کے ہاتھوں کے اڑا دیتے ہیں
دنگ ہونا۔ تصویر کیا ٹھیر سکے اس رخ کے سامنے ‏ ‏ آئینے دنگ ہوتے ہیں جوش صفا ہے یہ

ٹٹی کی اوٹ میں شکار کھیلنا

کھیلا کرتے ہیں سدا ٹٹی کی اوٹ اہل شکار ‏ ‏ طائر تصویر ہے نخچیر پشت آئینہ

زمین سر پر اٹھانا

بلاتا ہوں فلک کو بعد مردن دل کے نالوں سے ‏ ‏ لحد میں پاؤں پھیلا کر زمیں سر پر اٹھاتا ہوں

بنانا۔ کہتا ہے کوئی کالی بلا کوئی شب تار ‏ ‏ شاعر لگے اب یار کی زلفوں کو بنانے

امانت کے یہاں اس قسم کے اشعار رعایت لفظی کے مضامین سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس لئے جہاں ان کے عیوب پر روشنی ڈالی جائے وہاں بطور تلافی یہ نمونے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

اس سے قطع نظر پورے دیوان میں بہت سی غزلیں ایسی بھی نکل آئیں گی جن میں رعایت لفظی صرف چاشنی کی حد تک ہے۔ اصل خوبی زبان کی سادگی اور بندش کی چستی پر مبنی ہے۔ مثلاً حمد میں دیوان کی پہلی غزل۔

کیا کیا ہے کرم مجھ پہ خدائے دو جہاں کا ‏ ‏ شکر اس کا ادا کر سکے کیا منھ ہے زباں کا
تازہ ہے چمن صد خدائے دو جہاں کا ‏ ‏ کچھ دخل نہیں گلشن قدرت میں خزاں کا
جو آگیا اس راہ میں سالک وہی ٹھیرا ‏ ‏ گمراہ ہوا جو نہ یہاں کا نہ وہاں کا

دیکھے تو کوئی غور سے قدرت کے کرشمے　　شادی کہیں بچے کی کہیں غم ہے جوان کا
غم اپنا وہیں ہو گیا شادی سے مبدل　　جب نام لیا رنج میں اس رحلت جاں کا
پوشیدہ بھلا کر سکے اس سے کوئی کیا بات　　دانندہ و واقف ہے وہ ہر راز نہاں کا
دم مارنے کی جا نہیں اسے صاحب ادراک　　حقا کہ وہاں دخل نہیں وہم و گماں کا

علاوہ بریں ایسے اشعار بھی ناپید نہیں جو مضمون اور بیان دونوں کے اعتبار سے بلند پایہ ہیں۔

ہو گئی قطع اسیری میں امید پرواز　　اڑ گئے ہوش جو پر کاٹنے صیاد آیا

جب تک پر نہیں کٹے تھے یہ امید تھی کہ شاید کبھی رہائی ہو اور پرواز نصیب ہو لیکن اب تو رہائی نصیب ہونے پر بھی پرواز کی امید باقی نہ رہی۔

وہ بت مجھ سے ناحق خفا ہو گیا　　خداوند عالم یہ کیا ہو گیا۔

ہمارے زمانہ کے ایک مشہور شاعر کا شعر ہے ؎

بعد مدت کے ملے تو مجھ سے پردہ کس لئے　　کچھ نئے تم ہو گئے یا میں نرالا ہو گیا

اس سے بھی بلند مضمون امانت نے پیدا کیا ہے۔ بجائے "بعد مدت کے" ترک ملاقات کے بعد ملنے کا خیال ہے

مل جاؤ گر تو پھر وہی باہم ہوں صحبتیں　　کچھ تم بدل گئے ہو نہ میں کچھ بدل گیا

میر صاحب امام الشعرا ہیں ان کا ایک بہت مشہور شعر ہے ؎

رہ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی　　شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

اسی مضمون کو امانت نے دو اشعار میں ادا کیا ہے۔

وہ بلبل بے برگ و نوا ہوں کہ ہمیشہ　　خالق کے کرم سے رہی آرام کی صورت
محتاجی تقدیر نے آفت سے بچایا　　اس باغ میں دیکھی نہ کبھی دام کی صورت

عشاق کی بدنامی کا مضمون عام ہے۔ امانت کا ایک شعر ہے ؎

نیک نامی ہے ولا فرقہ عشاق میں عشق　　ہے وہ بدنام محبت میں جو بدنام نہیں

اسی غزل میں ایک اور اچھا شعر ہے۔

ہر سخن پر مجھے دیتا ہے وہ بد خو دشنام — کونسی بات مری قابل انعام نہیں

غم فراق سے ضبط و تحمل کا ساغر لبریز ہو کر چھلکنا ہی چاہتا ہے اور عاشق عاشقی سے توبہ کرتا ہے ؎

ایسے مزے چکھائے غم ہجر یار نے — واللہ دل لگانے کا اب حوصلہ نہیں

الم نصیبی کی حد اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ انسان اس کا خوگر ہو جائے اور اگر کسی وقت رنج و محن سے نجات بھی ملے تو خود گرفتاری کی دعوت دے ؎

اسیری کے مزے نے کھو دیا مجھ کو زمانے سے — قفس سے چھوٹ کر صیاد کے چپٹتا ہوں دامن میں

اسی غزل میں ایک اور شعر ہے جس کی بندش اور ادا قابل داد ہے ؎

تڑپ اعضا میں ابرو میں کجی شوخی ہے چتون میں — جوانی میں غضب ہوگا جو آفت ہے لڑکپن میں

محبوبوں کی بے نیازی کے عام مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

بزم عالم کے حسینوں میں عجب اندھیر ہے — جان یوں پروانہ دے اور شمع کو پروا نہ ہو

اس شعر میں اگرچہ رعایت لفظی کو ملحوظ رکھا ہے لیکن آورد کا پتہ نہیں چلتا۔

ایک واقعہ کو کس خوبی سے نظم کیا ہے ؎

کسی نے ہاتھ ملے نعرہ زن ہوا کوئی — زمانے میں مرے مرنے کی جب خبر پھیلی

دبا کے دانتوں میں انگلی وہ بے وفا بولا — تپ فراق نے عاشق کی جاں ابھی لے لی!

اپنے دل کے وا شدہ نہ ہونے پر میر صاحب فرماتے ہیں ؎

سب کھلا باغ جہاں الا وہ حیران و خفا — جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا

اسی مضمون کو ذرا اور المیہ رنگ دے کر امانت نے پیش کیا ہے ؎

غنچۂ دل کے مقدر میں نہیں کھلنا لکھا — یاں صبا بھی آن کر باد خزاں ہو جائے گی

ایک مشکل زمین میں طبع آزمائی کی ہے لیکن عجب آبدار گوہر نکالے ہیں۔

یہی دل قلق کرتا رہا زیر زمیں نہ موئے پہ بھی رنج و الم سے چھٹے

جنہیں چھوڑتے تھے اکدم نہ کبھی تا حشر غضب ہے وہ ہم سے چھٹے

ہو کیوں نہ ہمیں مرنے کی خوشی کہ لحد میں فراق کے غم سے چھٹے
آفت سے چھٹے ایذا سے چھٹے ہر وقت کے رنج و الم سے چھٹے
سر پھوڑتے تھے دم توڑتے تھے عنقا تھی جہاں میں سیر چمن
موت آئی قفس میں خوب ہوا صیاد کے جور و ستم سے چھٹے
ہر طرح اماؔنت مشکل ہے کوئی نہیں شکل رہائی کی
ہستی کے وہ دام میں آکے پھنسے جو لوگ کہ قید عدم سے چھٹے

مقطع میں وہی مضمون ہے جسے علامہ اقبال نے ایک دوسرے انداز میں پیش کیا ہے ؎

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا — یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

حروف وحکایات کے سلسلہ میں ایک شعر ہے۔

بیداد مجھے یاد ہے واللہ تمہاری — یوسف کی قسم اب نہ کروں چاہ تمہاری

اماؔنت کے کلام میں بعض اوقات ضمنی طور پر ان کے عقائد، حالات اور واقعات کا بھی سلسلہ مل جاتا ہے۔ اس قبیل کی غزلوں میں سب سے اہم درج ذیل ہے۔

کیوں نہ ہوں لطافت سے پر اشعار اماؔنت — مائل ہے رعایت پہ دل زار اماؔنت
کی بدلے عبادت کے سدا حسن پرستی — جنت ہو بھلا خاک طلب گار اماؔنت
اخلاق سے پیش آئے شرافت ہے جتانا — بنتا ہے مروت کے سبب کار اماؔنت
غم دوست ہے دل رنج سے راحت ہو جانیں — فرحت کا سر انجام ہے آزار اماؔنت
کیوں ہوں نہ ریاضت پہ نظر کر کے عدو سرد — رحمت سے تری گرم ہے بازار اماؔنت
لفظوں میں متانت ہے فصاحت ہو زباں میں — کہتا ہے ہر اک سن کے یہ اشعار اماؔنت
کاذب ہیں مضامین کی بندش کو کہیں جھوٹ — معمور صداقت سے ہے گفتار اماؔنت
مہتاب کی طلعت ہے کم از کرمک شب تاب — کس مرتبہ ہے تیرہ شب تار اماؔنت
وحدت کے نظر آتے ہیں کثرت میں کرشمے — ہیں دور دل و دیدہ بیدار اماؔنت

رہتا ہے غمیں درد محبت سے ہمیشہ — صحت سے بری ہے دل بیمار امانت
عشرت کسے کہتے ہیں شب وصل کہاں کی — فرقت ہے سدا درپئے آزار امانت
صورت میں اصالت میں نجابت میں ہے بےمثل — ہر بلبل خوش لہجہ گلزار امانت
تحصیل مضامیں ہے سدا ملک سخن میں — ہے طبع رسا ناظم سرکار امانت

کچھ تھوڑے سے شاگردوں کے نام ابھی ہوئے نظم
دیکھو بفراست سوئے اشعار امانت

اسی طرح ایک شعر میں آتش سے معاصرانہ چشمک کی طرف اشارہ کیا ہے اور بعض اشعار میں اپنے اثنا عشری عقائد ظاہر کئے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے ان کا کلام ان کی قادر الکلامی پر دلیل ہے اور اس عہد کی شاعری میں لکھنویت کے عناصر کا پورا پورا رنگ دکھاتی ہے۔ اور اس حیثیت سے ڈرامائی نظموں، واسوختوں اور سلام و مراثی پر نظر ڈالتے وقت ان کی غزل گوئی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

محمد ابو اللیث صاحب صدیقی ایم۔ اے (علیگ)

جامِ صہبائی

(۱)

کوئی مری داستاں سنے یا نہ سنے
ہوں گرم بیاں جہاں سنے یا نہ سنے!
مانند جرس ہوں اے اثر وقف خروش
مجھ کو سرا کارواں سنے یا نہ سنے!

(۲)

دل تیرے خیال سے مزہ پاتا ہے
سرمستی و بے خودی میں لہراتا ہے
وہ مست ہوں جو بے پیئے مست رہے
پی کر تو ہر ایک مست ہو جاتا ہے

(۳)

دل شکوۂ رنج و غم سے بیگانہ رہے
ہنگامۂ ہاؤ ہو سے مستانہ رہے
افسردہ نہ ہو کبھی مری آتش شوق
کچھ اور مرے پاس رہے یا نہ رہے

(۴)

دل میرا سیاہ اب بھی ہو جاتا ہے
کمبخت تباہ اب بھی ہو جاتا ہے
ان ماہ رخوں پر پڑ ہی جاتی ہے نظر
اتنا تو گناہ اب بھی ہو جاتا ہے

(۵)

ہے قلب و جگر میں مستی اب تک!
ہے روح کو ذوق مے پرستی ابتک!
ڈالی تھی کبھی نگاہ الفت تو نے
اب تک ہے وہی ہجوم مستی ابتک!

(۶)

یارب دل گرم و روح مستانہ ملے:
جاں سوزی شمع و شوق پروانہ ملے!
سوز غم عشق سے نہ محروم رہوں
یارب مجھے اور کچھ ملے یا نہ ملے!

(۷)

ہے صبح کی تازگی ابھی تک معصوم
ہے شام کی خامشی ابھی تک معصوم
ہر چند ہوئی ہے بزم دنیا ناپاک
ہے چاند کی چاندنی ابھی تک معصوم

(۸)

رخ سے ترے کسب رنگ و بو کرتا ہوں
ہر سانس کو اپنی مشکبو کرتا ہوں
محفل سے بہت لذیذ تنہائی ہے
تنہائی میں تجھ سے گفتگو کرتا ہوں

(اثر صہبائی)

انتخاب غزلیات

دل دکھائے ہوئے سے ہیں پیارے
اشک آئے ہوئے سے ہیں پیارے

جو ستم تو نے روک رکھے ہیں
وہ بھی ڈھائے ہوئے سے ہیں پیارے

جو سراسر سکون ہیں وہ بھی
تلملائے ہوئے سے ہیں پیارے

رنگ اُڑنے پہ بھی گل رخسار
رنگ لائے ہوئے سے ہیں پیارے

داغ دل کے چراغ ہیں لیکن
جھلملائے ہوئے سے ہیں پیارے

تجھ کو پاکر بھی تیرے غم دل میں
کیوں سمائے ہوئے سے ہیں پیارے

ہوش والے بھی ان نگاہوں کے
دھوکے کھائے ہوئے سے ہیں پیارے

تیرے افسردہ آگ سی ہر سمت
کیوں لگائے ہوئے سے ہیں پیارے

یوں تو تیرے ہیں پھر بھی عشق سے ہم
باز آئے ہوئے سے ہیں پیارے

اہل منزل پہونچ کے بھی کیا کیا
پھیر کھائے ہوئے سے ہیں پیارے

ہم نے اہل خوشی کو دیکھا ہے
چوٹ کھائے ہوئے سے ہیں پیارے

کون دیتا ہے یہ صدائیں فراق
ہم تو آئے ہوئے سے ہیں پیارے

(فراق گورکھپوری)

میرے لئے

فصل گل میرے لئے عہد خزاں میرے لئے
ہر قدم پر ہے نیا رنگ جہاں میرے لئے

سعی تسکیں ہے امید رائگاں میرے لئے
ہر زمیں ہے آسماں ہی آسماں میرے لئے

چاک گل ہے درحقیقت چاک داماں کا پیام
وہ بہار آئی بعنوان خزاں میرے لئے

جل رہا ہوں ایک مدت سے بعنوان حیات
وقف ہیں سوز دروں کی گرمیاں میرے لئے

(عظیم حیدرآبادی (عثمانیہ)

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

رحمت عالم :- از جناب سید سلیمان صاحب ندوی مطبع معارف اعظم گڈھ قیمت ۶؍ صفحات ۱۵۷ سائز ۲۲×۱۸/۸ کاغذ کتابت طباعت عمدہ۔

سید صاحب نے یہ کتاب مدرسوں اور اسکولوں کے طالب علموں کے لئے ترتیب دی ہے۔ ہمارے بچوں اور لڑکیوں کی صحیح دینی تعلیم ہمیشہ سے ہر مسلمان کے پیش نظر رہی ہے لیکن بہت کم عالموں نے خالص تعلیمی نقطہ نظر سے ان کی اس حاجت کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ زیادہ تر وہ علما اونچی قسم کی تصانیف و تالیفات میں مشغول و مصروف رہے۔ لڑکیوں اور بچوں کے لئے کتابیں تیار کرنا محض ایک تجارتی سودا سمجھا جاتا اور اس لئے ایک گری ہوئی بات یوں بھی ہمارے ہندوستانی علما کے لئے چھوٹے بچوں اور لڑکیوں کے لئے کتابیں تیار کرنا ایک ایسا کام تھا جو بڑے بڑے علما اپنی شایان شان نہیں سمجھتے تھے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دراصل یہ ہمارے بچوں ہی کی ابتدائی تعلیم جس کی طرف اولین توجہ ہونی چاہئے۔ بنا مضبوط ہوتی ہے تو ثریا تک دیوار سیدھی رہتی ہے لیکن ہمارے یہاں یہی نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ مذہبی تعلیم لڑکوں کی ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے لیکن کوئی باقاعدہ اور سوچا ہوا نظام دینی تعلیم کا نہیں رہا۔ اغلب ہے کہ ہمارے بہت سے نوجوانوں میں جو عقائد کی کمزوری اور ایمان کی نا استواری نظر آتی ہے وہ بہت کچھ اسی ابتدائی دینی تعلیم کی کمی یا فقدان کے باعث ہو محض تقاضائے زمانہ یا انگریزی تعلیم کی بدولت نہیں سید سلیمان صاحب کی یہ کتاب تعلیمی نقطہ نظر سے ایک بڑی کمی کو پورا کرتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کی مستند کتابیں مختلف اداروں سے نکلتی رہیں۔ ساتھ ہی اس کی بھی اشد ضرورت ہے کہ مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا ایک ایسا مستند نصاب علما تیار کریں جو تعلیمی نقطہ نظر سے مفید بھی ہو اور مستند بھی۔

زیر نظر کتاب میں سید صاحب قبلہ نے عرب، اہل قریش کا حال، پیغمبر صلعم کا گھرانا، پیغمبر صلعم کی حیات مبارک، پھر اسلام کی اشاعت، ہجرت اور لڑائیوں کا حال، آخر میں اسلامی نظام کی تاسیس۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج کے

اصول اور پیغمبر صلعم کی آخری وصیت سب کا اجمالاً ذکر کر دیا ہے۔ زبان دانستہ آسان رکھی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو اس کے مطالعہ سے ہرگز محروم نہ رکھیں گے۔

گلبانگ حیات:۔ مصنفہ امین حزین سیالکوٹی۔ اردو اکیڈمی پنجاب لوہاری گیٹ لاہور قیمت ۱؍ صفحات ۲۰۲ سائز $\frac{۲۰×۲۶}{۸}$ کاغذ کتابت و طباعت عمدہ۔

حضرت امین حزیں کا کلام عرصہ سے رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہوتا رہا ہے۔ شروع میں سر عبدالقادر کا تعارف نامہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی طرح آپ نے بھی علامہ شمس العلماء سید میر حسن صاحب مرحوم سے استفادہ کیا ہے اور ادبیات کا ذوق وہیں سے حاصل کیا ہے۔ کلام پر اقبال مرحوم کا بہت زیادہ اثر ہے خود کو انہیں کا معنوی شاگرد سمجھتے ہیں۔

آپ کے کلام میں بھی یقین، خودی، زندگی کی اہمیت وغیرہ کے مضامین ہیں۔ آپ کا کلام گویا اقبال کے کلام کی تفسیر ہے آسان تر الفاظ میں۔ پہلی نظم فاتحۃ الکتاب ہی سے آپ کا رنگ ظاہر ہو جاتا ہے۔

لالے پڑے ہیں جان کے جینے کا اہتمام کر ۔۔۔ جن میں ہو کیف زندگی بہر خدا وہ کام کر
طور حیات سے اڑا خذبۂ زیستن کی آگ ۔۔۔ جب کہیں جا کے نیت زندگی دوام کر
پہلے یہ سوچ دام کے توڑ بھی سکت بھی ہے ۔۔۔ بعد کو دل میں خواہش دانہ زیر دام کر
نقش نوی نہیں ہے تو صفحۂ روزگار پر ۔۔۔ مٹنے سے گر نہیں مفر مٹ ہی کے اپنا نام کر
تجھ کو تری ہی آنکھ سے دیکھ رہی ہے کائنات ۔۔۔ بات یہ راز کی نہیں اپنا خود احترام کر
بندۂ خواہشات کو کہتا ہے کون عبد حُر ۔۔۔ چاہئے حریت اگر دل کو امین غلام کر

حیات محمد عبدہٗ:۔ مترجمہ جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی بی۔ اے۔ شائع کردہ دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور حجم ۸۲ صفحات، سائز $\frac{۲۰×۲۶}{۸}$ قیمت ۱۲؍ کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ۔

محمد عبدہٗ کا نام دنیائے اسلام کے ان جلیل القدر فرزندوں میں سے ہے جنہوں نے انیسویں صدی

کے آخر میں مغرب نے بڑھتے ہوئے سیلاب الحاد و عیسائیت کو روکنے میں اپنی زندگیاں وقف کردیں۔ آخر انیسویں صدی میں تمام ممالک اسلامیہ خصوصاً مصر و ہندوستان میں عیسائیت اور الحاد اور مغربیت کے طوفان برپا تھے۔ امت اسلامیہ اس وقت بڑے نازک دور سے گذر رہی تھی۔ ایسے وقت میں جمال الدین افغانی کی شخصیت نے اس خطرہ کو شدت سے محسوس کیا اور تمام ممالک اسلامیہ میں اس بیدینی اور غیر اسلامی تحریکات کے خلاف جد وجہد کرنے کے لئے ہر جگہ اور ہر ممکن صورتوں سے اس کا استعمال کرنا شروع کیا مصر میں اسی قائد اعظم کے دست راست ، محمد عبدہ تھے۔

یہ ترجمہ دراصل چارلس ایڈیس (ایک عیسائی مشنری کی کتاب "مصر اور جدیدیت" کے ان چند ابواب کا ہے جو محمد عبدہ کی حیات کے متعلق ہیں۔ باوجود عیسائی اور مشنری ہونے کے اس نے محمد عبدہ کے حالات کمال بے تعصبی اور غیر جانبداری سے پیش کئے ہیں۔ ترجمہ آزاد، رواں اور بے تکلف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب اردو تالیفات میں بیش بہا اضافہ ہے۔ آئندہ ایڈیشن میں اگر مرتب صاحب بین الاقوامی اتحاد ملت پر ایک باب کا اضافہ کردیں تو خوب ہو۔ امید ہے کہ یہ کتاب ضرور مقبول و معروف ہوگی۔

اقبال اور قرآن :- از ابو محمد مصلح۔ ادارہ عالمگیر تحریک قرآن مجید حیدرآباد دکن۔ قیمت عہ۔ صفحات ۱۹۱ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ کاغذ، کتابت و طباعت بہت عمدہ۔

مولوی محمد مصلح صاحب عرصہ سے قرآن مجید کی تعلیمات عام کرنے کے سلسلے میں کوشش کر رہے ہیں۔ خود اقبال مرحوم سے اسی سلسلے میں کئی ملاقاتیں رہیں۔ زیر نظر کتاب کا مقصد اقبال کی تصنیفات میں سے ان حصوں کو ایک جگہ جمع کرنا ہے جو صاف لفظوں میں قرآن مجید سے متعلق ہیں۔ شروع میں مختصر مضامین، قرآن کا اثر اقبال پر، اقبال کا مقصد شاعری، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ختم نبوت اور قادیانیت کے عنوان سے لکھے ہیں جو برے نہیں اور بہت مختصر ہیں۔ انتخاب نظم میں جگہ جگہ مختصر تبصرہ اور اشارے بھی دیتے گئے ہیں جو یقیناً مفید ہیں۔ قیمت دو روپے کچھ زیادہ ہے

مسافر کی ڈائری :- از خواجہ احمد عباس صاحب۔ حالی پبلشنگ ہاؤس قیمت عہ صفحات ۱۹۲، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$

کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ۔

خواجہ احمد عباس صاحب نے ابھی جب جنگ شروع ہونے والی تھی دنیا کا سفر کر ڈالا محض تفریحاً۔ واپسی پر ایک کتاب اسی سفر پر لکھ ڈالی۔ پہلے انگریزی میں اب اردو میں۔ کتابیں اکثر لوگ اپنے سفر کے بعد لکھ ڈالا کرتے ہیں لیکن وہ اتنا لکھ جاتے ہیں جتنا نہ لکھنا چاہئے۔ اور اس طرح لکھتے ہیں گویا کتابیں پڑھکر لکھ رہے ہیں دنیا دیکھکر نہیں۔ خواجہ احمد عباس کی یہ ڈائری اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس کو پڑھ کر دنیا کا ہلکا سا نقشہ سامنے آجاتا ہے، دنیا کا جغرافیہ نہیں۔ اور یہ بات مصنف نے پہلے ہی سے صاف کر دی ہے "اگر آپ نے اس کتاب کو اس امید پر خریدا ہے کہ اس کو پڑھ کر آپ پر جاپان کی صنعتی ترقی کا راز کھل جائے یا ترکی کے سماجی انقلاب کا پورا حال معلوم ہو جائے۔۔۔۔۔۔ تو ممکن ہے آپ کو مایوسی ہو" اس کو پڑھ کر تو آپ کو یہ بھی نہ معلوم ہوگا کہ رومانیہ کی آبادی کیا ہے اور کنیڈا کا رقبہ کتنا ہے۔ پھر بھی اگر آپ اس کتاب کو شروع کریں تو بغیر ختم کئے جی چھوڑنے کو نہ چاہے گا لطف داستان نہیں اس میں لطف حیات ہے تمام ممالک کے لوگ اس میں آپ کو جیتے جاگتے نظر آئیں گے۔ حالانکہ آپ ان سے زیادہ واقف نہ ہو سکیں گے لیکن آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ مصنف کے ساتھ آپ نے بھی تیزی سے ایک سفر تمام دنیا کا کر لیا ہے۔ اختصار اور شگفتگی جو ایک کامیاب جرنلسٹ کی خصوصیات ہوتی ہیں آپ کو لطف بیان کا کافی مزا دینگی مختلف موقعوں کی تصاویر بھی دیدی ہیں۔

جدید جغرافیہ پنجاب ؛۔ از سندباد جہازی۔ اردو اکیڈمی پنجاب۔ لوہاری گیٹ لاہور، قیمت ایک روپیہ صفحات ۱۴۳۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ

سندباد جہازی صاحب نے اپنے مخصوص مزاحیہ رنگ میں پنجاب کی سیاسیات کو بیان کیا ہے۔ ممکن ہے پطرس کا لاہور کا جغرافیہ والا مضمون دیکھ کر موصوف کو یہ خیال پیدا ہوا ہو۔ بہر حال ہندوستانیوں کے لئے عموماً اور پنجابیوں کے لئے خصوصاً یہ ایک دلچسپ چیز ہے۔ پنجاب کی قدرتی تقسیم اس طرح کی ہے (۱) اتحادی سلسلہ کوہ (۲) اشتراکی جوالا مکھی (۳) احراری کاہستان (گھاس کے میدان) (۴) کانگریسی سلسلہ کوہ (۵) اکالی جنگلات (۶) وادی لیگ (۷) ہندو مہا سبھا کی ترائی۔ اسی طرح ہر پارٹی، ہر سیاسی تحریک اور ہر لیڈر کو کسی جغرافی نام سے موسوم کیا ہے اور اس کی خصوصیات کو جغرافیہ کے اصطلاحات میں بیان کیا ہے۔ مقصود ظرافت زیادہ ہے بجائے طنز کے۔ آخر میں اشارات بھی دیئے ہیں تاکہ وہ حضرات جو پنجاب کی سیاسی شخصیتوں سے واقف نہیں ہیں واقف ہو سکیں

رسائل :-

ترجمان القرآن :- ستمبر، اکتوبر، نومبر، مرتبہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ مبارک پارک پونچھ روڈ لاہور
قیمت فی پرچہ ۸ ؍ سالانہ صہ ؍ صفحات ۲۴۸۔

رسالہ ترجمان القرآن کا یہ تین مہینے یعنی ستمبر، اکتوبر اور نومبر کا یکجائی پرچہ ہے جو مودودی صاحب کے خطبات پر مشتمل ہے۔ مودودی صاحب دین اسلام کی جو خاموش خدمت کر رہے ہیں وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں آپ اکثر و بیشتر مفید کتابیں مسلمانوں کی ہدایت و رہبری کے لئے لکھتے رہتے ہیں۔ موجودہ نمبر بھی اسی قسم کی تالیف ہے۔ اس میں مختلف ارکان اسلام پر آپ کے مدلل خطبات ہیں جو عوام الناس کے لئے بہت آسان زبان میں لکھے گئے ہیں چند عنوان یہ ہیں: کلمہ طیبہ پر ایمان لانے کا مقصد مسلمان کسے کہتے ہیں۔ خدا کی اطاعت کس لئے، عبادت، نمازمیں آپ کیا پڑھتے ہیں، نمازیں بے اثر کیوں ہو گئیں، حج کے فائدے، جہاد کی اہمیت وغیرہ یہ خطبات ہر حیثیت سے بہت مفید ہیں۔ ضرورت ہے جمعہ کی نمازوں میں ان خطبوں کو سنایا جائے۔

ساقی سالنامہ :- مرتبہ شاہد احمد صاحب قیمت عہ صفحات ۲۷۵۔

اپنی گذشتہ روایات کے مطابق ساقی کا یہ بارہواں سالنامہ بھی منتخب لکھنے والوں کے افسانوں اور نظموں سے مزین ہو کر نکلا ہے۔ اس میں تقریباً ہر افسانہ نویس نظر آئے گا۔ عظیم بیگ، عصمت، مد صوسودن، رفیق حسین، اور کملا چٹوپادھیا کے افسانے خصوصیت سے اچھے مطالعے ہیں۔ ویسے دوسرے افسانے بھی کم دلچسپ نہیں ہیں۔ ل۔ احمد اور محمد احمد کے مضامین، سوویٹ ادب اور شرم کی نفسیاتی تحلیل بھی خوب ہیں۔ سرورق رنگین اور جاذب نظر ہے۔ کھاری باؤلی دہلی کے پتہ سے مل سکتا ہے۔

رسید کتب :-

پیام رسالت، (۲) اسلامی خاتون اور تہذیب نو (۳) ارشاد رسالت حصہ اول۔ ہر سہ کتب از نسیم قریشی۔ قیمت ۲ ؍ ۔ ۲ ؍ ۔ ۱۱ ؍ علی الترتیب۔ ملنے کا پتہ :- اسلامی دارالاشاعت۔ محلہ اقبال گنج گجرات (پنجاب)

باقیاتِ بجنوری

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم سے اردو دنیا بخوبی واقف ہے ان کا پہلا کارنامہ دیوانِ غالب (نسخۂ حمیدیہ) کا دیباچہ ہے۔ اسی کی بدولت انھوں نے اردو داں طبقے میں مقبولیت و شہرت حاصل کی۔ ان کی قابلیت اور زبان آوری کی بدولت ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ [illegible] تحریر میں انھوں نے اپنی ایک الگ اور مجتہدانہ راہ نکالی تھی۔ سنجیدہ سے سنجیدہ اور علمی مباحث میں بھی شگفتگیٔ زبان ان کے ہاتھ سے جانے نہ پاتی تھی۔ یہ جواہر ریزے جو ایک طرح سے ان کے علمی و ادبی تبرکات ہیں، نہ صرف اسلوبِ بیان کی حیثیت سے قابلِ قدر ہیں بلکہ ان مضامین میں اہم علمی و معاشرتی مسائل پر بھی بحث کی گئی ہے۔ [illegible] نوجوانوں [illegible] کتاب [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

خطوط محمد علی

[illegible]

[illegible] مرحوم [illegible]

[illegible] کیے گئے۔

[illegible] مرحوم کی [illegible] سرگرمیوں کا [illegible] ہے اور

[illegible]

[illegible] مرحوم کا [illegible] ہے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] خطوط [illegible]

قیمت [illegible] روپے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اسلامی ممالک کی سیاست

مصنفہ حضرت [illegible] صدیقی [illegible]

مصنف نے اس کتاب میں مختلف اسلامی ملکوں کے سیاسی اور تاریخی افکار پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ جنگ عظیم سے پہلے مصر، ترکی، عراق، عرب، ایران وغیرہ کے کیا حالات تھے جنگ عظیم کے خاتمہ پر ان کی سیاسی حیثیت کیا باقی رہ گئی۔

مصنف نے یہ بھی بتایا ہے کہ جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد ان ملکوں میں کس قسم کی سیاسی تحریکیں اٹھیں، ان کا حشر کیا ہوا اور موجودہ [illegible] ان کی سیاسی اور جغرافیائی پوزیشن کیا ہے۔

اسلامی ملکوں کی موجودہ سیاست اس وقت کا نہایت اہم مسئلہ ہے خصوصاً اس وقت میں جبکہ ہر شخص [illegible] ملک کی موجودہ سیاست کا [illegible] کرنا چاہتا ہے۔ یہ کتاب بہت اہم ہے۔ قیمت عمر

مکتبہ [illegible]

[illegible]

جامعہ

زیر ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم، اے

جلد ۳۴ نمبر ۳ | بابتہ ماہ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی-اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی

مطبوعات جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہو گئی ہے۔ اس فہرست میں آپ کو
اپنے پسند کی بہت سی نئی کتابیں نظر آئیں گی مطبوعات جامعہ
کے علاوہ دوسرے اداروں کی کتابیں بھی مختلف عنوانات
کے ماتحت درج کی گئی ہیں۔ ارباب ذوق یہ نئی فہرست
منگا کر ملاحظہ فرمائیں

مکتبہ جامعہ نئی دہلی

اقبال کا ذہنی ارتقا [1]

(گذشتہ سے پیوستہ)

زندگی کے متعلق اقبال کا نظریہ نامی اور دست پذیر ہے۔ زندگی ایک مسلسل حرکت ہے جو ہمیشہ بڑھتی اور پھیلتی رہتی ہے۔ جمود اور سکون زندگی کی قوتوں کو مردہ کر دیتے ہیں۔ پیہم حرکت میں زندگی کا راز پنہاں ہے۔ اس سے خون تازہ پیدا ہوتا ہے، آرزوئیں ہوتی ہیں اور زندگی میں نمو کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ "پیام مشرق" میں اقبال نے "زندگی و عمل" کے عنوان سے ایک نظم میں لکھا ہے ؎

ساحل افتادہ گفت　　گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد　　آہ! کہ من چیستم
موج ز خود رفتۂ　　تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم　　گر نہ روم نیستم

زندگی اور موت کی حقیقت کے متعلق اقبال نے ایک بہت ہی بلیغ شعر کہا ہے یعنی خواب کیا ہے؟ ایک ہلکی سی موت، اور موت کیا ہے؟ ایک گہرا خواب ؎

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں　　خواب را مرگ سبک داں مرگ را خواب گراں

زندگی کی آسائشوں کو ڈھونڈنے والی قوم کو جس کے افراد کا میخانہ حیات خالی ہو چکا ہے اور جس میں زندگی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں اقبال کا پیام یہ ہے ؎

اے کہ آسودہ نشینی لب ساحل برخیز　　کہ ترا کار بگرداب و نہنگ است ہنوز
از سر تیشہ گذشتن ز خردمندی نیست　　اے بسا لعل کہ اندر دل سنگ است ہنوز

سوشلزم کے متعلق اقبال کا رویہ ہمدردانہ ہے۔ وہ سرمایہ داری کی موجودہ صورت کو انسانیت کے لیے مضر سمجھتے ہیں۔ انھیں مزدوروں کے ساتھ بھی ہمدردی ہے اور وہ دولت کی منصفانہ تقسیم کے حامی

---

[1] اس مضمون میں مندرجہ ذیل مضامین سے مدد لی گئی ہے۔ (۱) سیرت اقبال (۲) جوہر اقبال (۳) "اردو" کا اقبال نمبر (۴) "نیرنگ خیال" کا اقبال نمبر (۵) "علیگڑھ میگزین" کا اقبال نمبر (۶) رسالہ جامعہ کے مختلف پرچے (۷) اقبال کا تعلیمی فلسفہ

اس میں شک نہیں کہ اقبال اشتراکیت کے مادی فلسفہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مگر وہ اس تحریک کی عالمگیری سے پریشان خاطر نہیں ہیں۔ وہ اس جبر و استبداد کا خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں جو قیصریت کے پردے میں مزدوروں پر روا رکھا جاتا ہے وہ ایک ایسا نظام چاہتے ہیں جس میں مزدوروں کو ابھرنے کا موقع ملے اور وہ انسانیت کے کسی حق سے محروم نہ رکھے جائیں۔ اپنی نظم "خضر راہ" میں انھوں نے سرمایہ و محنت کے مسئلہ پر اظہار خیالات کرتے ہوئے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی مذمت کی تھی اور مزدوروں کی حمایت میں آواز بلند کی تھی۔ انھوں نے مزدوروں کو ایک روشن مستقبل کی خوشخبری سنائی تھی۔ "پیام مشرق" میں بھی انھوں نے اس کی ہمنوائی کی ہے ؂

بیا کہ تازہ نوائے تراود از رگ ساز — مئے کہ شیشہ گدازد بہ ساغر اندازیم
مغان و دیر مغاں را نظام تازہ دہیم — بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم
ز رہزنان چمن انتقام لالہ کشیم — بہ بزم غنچہ و گل طرح دیگر اندازیم
بہ طوف شمع چو پروانہ زیستن تا کے — ز خویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

اقبال مزدور کے جذبہ غیرت کو ابھار کر اسے موجودہ نظام کو درہم برہم کر دینے پر آمادہ کرتے ہیں اور اس کی خودداری سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ان پرانے بتوں کو مسمار کر کے ایک نئی طرح ڈالے وہ اسے طواف غیر سے آزاد ہو کر اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ ایک عرصہ تک اس سرمایہ دارانہ استبداد کا شکار ہو چکا ہے لیکن آخر نا بھڑکے وہ انتقام کی آگ پوری طرح روشن ہو چکی ہے۔ اقبال اسے تیز تر کر دینا چاہتے ہیں۔

"جاوید نامہ" اقبال کا بہترین شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے جس میں دماغی اور روحانی کیفیت کے لئے اچھا سامان موجود ہے۔ اقبال نے کافی عرصہ تک اس کا خاکہ اپنے ذہن میں کھینچا اور پھر اپنے جوش وجدان سے مستفید ہو کر ان نقوش کو صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیا جو اس کی ذہنی سطح پر قائم ہو چکے تھے۔ آسکر وائلڈ نے کہا ہے کہ "فن کار کا عمل اس کی یگانہ سرشت کا یگانہ ثمر ہوتا ہے" جاوید نامہ کو اگر اقبال کی دماغی کاوش کا یگانہ ثمر کہا جائے تو یقیناً اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس میں اقبال نے اپنی قوت تخلیق کا پورا ثبوت دیا ہے

اور فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ شہرت کے عنصر کو قائم رکھا ہے۔ جاوید نامہ میں اقبال نے پیر رومی کے ساتھ افلاک کی سیر کی ہے اور اسی سلسلہ میں مختلف روحوں سے ملاقات کا منظر دکھایا ہے۔ اس کا نقشہ کسی قدر ڈوائن کامیڈی (Divine Comedy) اور دوسری کتابوں سے ملتا ہے۔ مگر اس سے اقبال کی جدتِ طبعی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس کے تخیل کا اچھوتا پن، اندازِ بیان کی ندرت اور طرزِ تحریر کا سحر اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ جس کے ساتھ اس کی شاعرانہ عظمت کا دامن وابستہ ہے۔ ڈوائن کامیڈی نے دانتے کو بین الاقوامی شہرت کا مالک بنا دیا۔ اور جدید ترین تحقیقات کی بنا پر یہ ثابت ہو جانے کے بعد بھی کہ دانتے اسلامی حکما کے خیالات اور معراج کے واقعات سے بے انتہا متاثر ہوا تھا اس کی شہرت اپنی جگہ قائم ہے۔ اقبال بھی اپنی اس کتاب کی بدولت صدیوں یاد رکھے جائیں گے اور دنیا ہمیشہ ان کے لازوال کارناموں سے اکتسابِ فیض کرتی رہے گی۔

"جاوید نامہ" میں موجودہ حالات پر بھی بڑے اہم مباحث موجود ہیں۔ اشتراکیت کے متعلق اقبال کا نظریہ ہم ابھی واضح کر چکے ہیں۔ اقبال کو اس بات سے خوشی ہے کہ اشتراکیت نے قیصریت کے چراغ کو گل کر دیا ہے اور سرمایہ داری کی بنیادوں پر کاری ضرب لگائی ہے۔ یہاں تک اسلامی نظریہ اشتراکیت بھی اس کا موید ہے۔ مگر ہر تخریب کے بعد تعمیر کا عمل ضروری ہے۔ ورنہ کوئی کارآمد راہِ عمل پیدا نہیں ہو سکتی۔ لا کی تخریب کے بعد اِلّا کی تعمیر ضروری ہے۔ ہم لامحدود نظریوں کے ہجوم میں کھوئے جاتے ہیں۔ اور کسی مستقل نظریہ کو اپنا نصب العین نہیں بنا سکتے۔ موجودہ تحریکِ اشتراکیت کی بے راہ روی اور شورش انگیزی کا سبب یہی ہے۔ اشتراکیت کی بنیاد نفی سے شروع ہوتی ہے۔ خدا کی نفی، کلیسا کی نفی، املاک کی نفی، ملوکیت کی نفی، حکومت کی نفی (یعنی کمیونزم کے انتہائی دور میں) انسانی زندگی کی نفی، تدبیرِ منازل کی نفی۔ اس نفی کے گرداب میں آج وہ تمام قومیں گرفتار ہیں جنہوں نے اشتراکیت کے دامن میں پناہ ڈھونڈی ہے۔ اگر اشتراکیت میں نفی کے بعد اثبات کے عنصر کو بھی داخل کر لیا جائے تو پھر حقیقی روح پیدا ہو سکتی ہے جو موجودہ بے چینیوں اور ہنگامہ آرائیوں کا ایک حد تک خاتمہ کرنے والی ہو جائے گی۔ اقبال نے "جاوید نامہ" میں انہی خیالات کو یوں پیش کیا ہے ؎

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی   دل ز دستورِ کہن پرداختی

ہم ما اسلامیاں اندر جہاں	قیصریت را شکستیم استخواں
تا بما فرزدی چراغ اندر ضمیر	عبرتے از سرگذشت ما بگیر
کرد کار خدا وندان تمام	بگذر از لا جانب الا خرام

۔ تمہید آسمانی میں آسمان کی زبان سے زمین کو جو طعنہ دیا گیا اور اس طعنہ کو سن کر جب زمین خجل ہوئی جاتی تھی تو خدا کی طرف سے تسلی کی یہ ندا آئی ؎

اے امینے از امانت بیخبر	غم مخور اندر ضمیر خود نگر
رستہ از نور جان نقش امید	نور جان از خاک تو آید پدید
عقل آدم بر جہاں شبخون زند	عشق او بر لامکاں شبخون کند

۔ فلک زحل" میں ایک مقام اقبال نے ان ارواح رذیلہ کے لئے وقف کر دیا ہے جنھوں نے ملک و ملت کے ساتھ غداری کی۔ اقبال نے ان کی انتہائی مذمت کی ہے۔ اقبال نے اس مقام پر جعفر بنگالی اور صادق دکنی کو رکھا ہے جن کی پیشانیوں پر کلنک کا ٹیکہ لگا ہوا ہے یہی وہ غداران ملت ہیں جنھوں نے اپنی ناجائز خواہشات کی بر آری کے لئے سرزمین ہند میں نفاق کے بیج بوئے اور اپنی مذموم حرکات سے اپنی فطرت کے جوہر کو زنگ آلود کیا۔ اقبال نے اسی سلسلہ میں ہندوستانیوں کو تنبیہ کی ہے کہ وہ اپنے ننگ انسانیت انسانوں سے خبردار رہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان میں سے ظلمت و ادبار کی گھٹائیں نہیں چھٹ سکتیں جب تک کہ یہ روح ان کے جسم میں موجود ہے اس لئے لکھتے ہیں ؎

کے شب ہندوستاں آید بروز	مرد جعفر زندہ روح او ہنوز
تا ز قید یک بدن وا مے رہد	آشیاں اندر تن دیگر نہد
گاہ او را با کلیسا ساز باز	گاہ پیش دیریاں اندر نیاز
دین او آئین او سوداگری ست	عنتری اندر لباس حیدری ست
ظاہر او ز غم دیں دردمند	باطنش چوں دیریاں زنار بند
جعفر اندر ہر بدن ملت کش است	ایں مسلمانے کہن ملت کش است

اقبال نے بڑے لطیف انداز میں تمام نام نہاد ملت پرستوں پر نکتہ چینی کی ہے اور انھیں ملت کے نظام میں ایک زہریلا عنصر قرار دیا ہے۔

سعید حلیم پاشا کی زبان سے ترک نوجوانوں کو جو پیام دیا گیا ہے وہ پوری ملت اسلامیہ کے لئے جو صراط مستقیم سے ہٹ گئی ہے اور اپنے نصب العین سے غافل ہے صحیح راہ عمل کا کام دے سکتا ہے جس پر چل کر وہ اپنی کھوئی ہوئی سطوت و شوکت کو دوبارا حاصل کر سکتے ہیں اور اس مرتبہ پر پہونچ سکتے ہیں جو ان کے شایان شان ہے ؎

چون مسلمانان اگر داری جگر — در ضمیر خویش و در قرآں نگر

صد جہان تازہ در آیات اوست — عصر ہا پیچیدہ در آیات اوست

یک جہانش عصر حاضر را بس است — گیر اگر در سینۂ دل معنی رس است

بندۂ مومن ز آیات خدا ست — ہر جہاں اندر برِ او چون قبا ست

چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانے دیگرش

"جاوید نامہ" کے تین سال بعد "بال جبرئیل" نکلی اور اس کے ایک ہی سال بعد "ضرب کلیم" نمودار ہوئی "بال جبرئیل" اور "ضرب کلیم" میں اقبال نے فلسفہ خودی کو اُجاگر کیا ہے۔ اسرار مرگ و زیست کی عقدہ کشائی کی ہے۔ تہذیب حاضر کا خاکہ کھینچا ہے۔ ہندی مکتب اور ہندی طالب علم کی نبض ٹٹولی ہے سیاسیات مشرق و مغرب پر گہری تنقید کی ہے اور اپنے آئیڈیل مسلمان کے کردار کے نقوش کو چمکا کر دکھایا ہے۔

"بال جبرئیل" میں فلسفہ زیادہ ہے مگر زبان کی سلاست، پختگی اور شیرینی نے فلسفہ کے چہرہ پر رنگین پردہ ڈال دیا ہے۔ "ضرب کلیم" میں شعریت کا عنصر قطعاً مفقود ہے لیکن اس کے باوجود دلکشی کے اعتبار سے یہ اپنی جگہ موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "ضرب کلیم" میں اقبال کا آرٹ رو بہ انحطاط ہے۔ میری رائے میں اگر یہ "ارمغان حجاز" کے متعلق اس قسم کا خیال ظاہر کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ "ضرب کلیم" میں شعریت کا عنصر مفقود ہونے کے باوجود بعض جگہ سلاست اور برجستگی کے اچھے نمونے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا اشہب قلم ابھی تک اپنی تگ و تاز سے تھکا نہیں ہے اور اس میں جولانی موجود ہے۔ "ضرب کلیم" میں شعریت کی کمی کی وجہ

یہ بھی ہے کہ لوگ اقبال کے کلام کو جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لئے پڑھنے لگے تھے۔ حالانکہ ان کا آرٹ کلیتہً زندگی کے تابع ہے۔ چنانچہ انھوں نے ضرب کلیم کے پیش لفظ میں ناظرین کو تنبیہ کی ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ضرب کلیم کے اشعار میں شعریت یا موسیقیت کے بجائے زندگی اور حقائق زیادہ ہیں۔ اپنے ان پیغامات کو جنھیں پہلے وہ شعریت کے پردے میں سنا کر لوگوں کو متوجہ کرنا چاہتے تھے اب لوگوں کو متوجہ دیکھ کر انھیں سیدھا سیدھا بیان کر دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہم اسے انحطاط نہیں کہہ سکتے بلکہ ان کے ذہنی ارتقاء کی ایک کڑی۔

بال جبریل میں اقبال نے فلسفۂ خودی کو نئے انداز سے بیان کیا ہے اور اسے زندگی کی نشو ونما کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ دنیا کی ہر شئے اپنے وجود کو اجاگر کرنا چاہتی ہے شعور ذات ہی اصل حیات ہے جس کا انجام روحانی اور اخلاقی قوت ہے۔ اس سے انسان کی دبی ہوئی طاقتیں بروئے کار آتی ہیں اور ارتقاء نفس کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہی زندگی کا جوہر ہے۔ اور جب یہ انسان میں پوری طرح نشو ونما پالیتی ہے تو وہ خود اپنی تقدیر کی ہیئت کو بدل سکتا ہے اور خدا کا راز داں بنجاتا ہے

ہر چیز ہے محو خود نمائی　　ہر ذرہ شہید کبریائی
بے ذوق نمو زندگی موت　　تعمیر خودی میں ہے خدائی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی کے زور سے دنیا پہ چھاجا　　مقام رنگ و بو کا راز پاجا
برنگ بحر ساحل آشنا رہ　　کف ساحل سے دامن کھینچتا جا

یہ موج نفس کیا ہے؟ تلوار ہے　　خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے؟ راز درون حیات　　خودی کیا ہے؟ بیداری کائنات

(بال جبریل)۔

جب انسان کا احساس ذات تربیت حاصل کر لیتا ہے تو پھر اس پر ترقی کے لازوال امکانات کھل جاتے ہیں۔ اور وہ دونوں جہان سے بے نیاز ہو جاتا ہے ؎

نہ میں عجمی، نہ ہندی، نہ عراقی، نہ حجازی — کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

اور پھر اس کا مرتبہ جس قدر بلند ہو جاتا ہے وہ بھی اقبال ہی کی زبان سے سنئے ؂

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی — نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب — خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر

اقبال نے خودی کا جو تصور پیش کیا ہے اس کے لئے فقر ضروری ہے جس سے اس میں اصل قوت پیدا ہوتی ہے ؂

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی — ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ!

اس فقر اور معمولی فقر میں امتیاز بھی اقبال کی زبان سے سنئے ؂

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری — اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری — اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری — میراث مسلمانی، سرمایۂ شبیری

خودی کی تکمیل کے لئے نت نئی آرزوؤں کے پیدا ہونے کی ضرورت ہے۔ ایک لازوال کشمکش اور کسک کا دل میں رہنا ناگزیر ہے۔ اقبال نے سوز ناتمام کو اپنے فلسفہ کا ایک جزو قرار دیا ہے۔ وہ ایک ایسی دنیا میں رہنا چاہتے ہیں جہاں خدا اور شیطان دونوں موجود ہوں ان کا نظریہ ارتقا تضاد کا پابند ہے۔ وہ جنت کو اس لئے پسند نہیں کرتے کیونکہ وہاں یہ سوز اور دردمندی جو زندگی کی اصل روح ہے ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ اسے ایسی متاع گراں مایہ سمجھتے ہیں کہ اس کے آگے شان خداوندی کی بھی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ مقام بندگی میں انہیں یہ چیز حاصل ہو سکتی ہے ؂

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزومندی — مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

عقل و عشق اقبال کا بڑا دلپسند موضوع ہے جس پر انھوں نے متعدد مرتبہ اظہار خیال کیا ہے۔ اقبال نے عشق کو ایک خاص مفہوم میں استعمال کیا ہے عقل سے مراد ظاہری علم ہے جس سے خارجی اشیاء کا ادراک بالواسطہ کیا جاتا ہے عشق سے مراد وہ جذبہ اندرونی ہے جس سے حقیقت کا مشاہدہ

بلا واسطہ کیا جا سکتا ہے۔ تصوف میں عشق سے مراد وجدان ہے جس کا تعلق روحانیت سے ہے۔ انہی دو کو اصطلاحوں یعنی عقل اور عشق کو خبر اور نظر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ اقبال نے ایک جگہ عقل کے متعلق کہا ہے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں

اقبال عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ عقل کا مشاہدہ محدود ہے اور حقیقت بینی اس کے بس کا کام نہیں وہ زمان و مکان کی حد بندیوں میں محصور ہے اور اس کی پرواز صرف اس عالم رنگ و بو تک محدود ہے اقبال نے "بانگ درا" میں عقل و دل کے عنوان سے ایک نظم میں نہایت دلکش طریقہ سے دونوں کا فرق ظاہر کیا ہے۔ دل عقل سے کہہ رہا ہے ؎

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے ۔۔۔ اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے ۔۔۔ اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے ۔۔۔ تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی ۔۔۔ اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفل صداقت کی ۔۔۔ حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا ۔۔۔ طائر سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا ۔۔۔ عرش رب جلیل کا ہوں میں

عقل کی محدود صلاحیتوں کی نسبت "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" میں متعدد اشعار ملتے ہیں حقیقت کے مشاہدہ کے لئے جس جرأت رندانہ کی ضرورت ہے عقل اس سے بالکل تہی دست ہے۔ زمانہ عقل و دانش کے چکر میں پھنسا ہوا ہے اور اس جنون کو مضحکہ خیز ٹھیراتا ہے جس کی سرحد عقل کے بعد شروع ہوتی ہے۔

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ ۔۔۔ کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک!

عشق کے جرأت رندانہ کی ایک جھلک اس شعر میں دیکھ لیجئے ؎

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام ۔۔۔ اس زمین و آسمان کو بے کراں سمجھا تھا میں

اور اس کے مقابلہ میں عقل کی بے بسی اور تنگ نظری بھی ملاحظہ کیجئے ؎

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے　　خرد کیا ہے؟ چراغ رہگذر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا　　چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے؟　(بال جبرئیل)

اسی لئے اقبالؔ کی تلقین یہ ہے ؎

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور　　چراغ راہ ہے، منزل نہیں ہے

اقبالؔ نے جو تصور پیش کیا ہے اس کے مطابق عشق ہی اصل چیز ہے۔ عشق ہی سے وہ نظر پیدا ہوتی ہے جو زندگی کے راز آشکارا کرتی ہے۔ ارتقائے نفس اور معرفت الٰہی جو انسان کا انتہائی نصب العین ہے اور جسے اقبالؔ نے جگہ جگہ پیش کیا ہے عشق کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ راہ معرفت میں عقل کی لاچاری صاف عیاں ہے۔ اس راہ میں عشق ہی اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ عشق کسی احتیاط کا قائل نہیں۔ وہ ان چیزوں سے بالاتر ہے۔ منطق اور فلسفہ صرف عقل کے لئے ہیں۔ عشق کا ہتھیار وجدان ہے جس کے سامنے یہ موشگافیاں بازیچۂ اطفال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ زندگی کی صحیح روح کا اندازہ صرف عشق ہی کی وساطت سے لگایا جا سکتا ہے۔ عقل اس معاملہ میں عاجز ہے ؎

عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات　　عشق سے نور حیات، عشق سے نار حیات

علم جو عقل کا نتیجہ ہے باطنی گہرائیوں تک نہیں پہونچ سکتا۔ اس کی نظر سطحی اور غیر حقیقی ہوتی ہے۔ علم ہمارے "ذوق آگہی" کی مکمل تسلی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی تحقیقات ادھوری ہوتی ہیں" ضرب کلیم" میں علم اور عشق کے فرق کو یوں دکھایا ہے ؎

عشق کی گرمی ہے معرکۂ کائنات　　علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات　　علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب
شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام　　شورش طوفاں حلال، لذت ساحل حرام
عشق پہ بجلی حرام، عشق پہ حاصل حرام　　علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب

لیکن اقبالؔ عقل کا مخالف نہیں ہے۔ اس کے نزدیک عقل و عشق میں تضاد نہیں ہے۔ بلکہ وہ دونوں مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں جو لوگ اقبالؔ کے کلام میں تضاد کا اعتراض پیش کرتے ہیں انہیں سمجھنا

چاہئے کہ اقبالؔ عشق کو عقل کا انتہائی معراج سمجھتے ہیں۔ ان دونوں کے باہمی امتزاج سے تمام اخلاقی اور مابعد الطبیعاتی مسائل کا حل سمجھ میں آسکتا ہے۔ جہاں عقل کی سرحد ختم ہوتی ہے وہیں سے عشق کی منزل شروع ہوتی ہے۔ ان کے خیال میں اگر کسی انسان میں ان دونوں کے درمیان ہم آہنگی نہیں ہے تو وہ کمال انسانیت سے عاری ہے "نگاہ شوق" کے عنوان سے ایک نظم میں لکھتے ہیں۔

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا　　　کہ ذرہ ذرہ میں ہے ذوق آشکارائی
کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبار جہاں　　　نگاہ شوق اگر ہو شریک بینائی
نگاہ شوق میسر نہیں اگر تجھ کو　　　ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی

شاعر عقل سے پورے طور پر سیر ہو چکنے کے بعد خدا سے دعا کرتا ہے ؎

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں　　　مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اقبالؔ ملائے حرم سے بے حد بیزار ہے کیونکہ اس نے مذہب کی صحیح روح کو سمجھے بغیر اس کی محافظت کا دعویٰ کیا ہے اس کے گفتار و کردار میں اقبالؔ کو جو تضاد نظر آتا ہے وہی اس کی نظروں میں سب سے زیادہ کھٹکتا ہے۔ بحث و تکرار اور بدگوئی و غیبت اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے۔ اس کے دل میں ایمان کی گرمی نہیں، گفتار میں سوز نہیں، قلب میں حرارت نہیں اور نظر میں وسعت نہیں۔ مسجدیں اس کی احمقانہ گفتگو کے لئے خاص مقام ہیں۔ اس لئے اقبالؔ کا خیال ہے کہ جنت میں باوجود حور و شراب کے اس کے لئے کوئی دلکشی نہیں کیونکہ جنت بحث و تکرار اور لڑائی و فساد کے لئے نہیں ہے۔ "بال جبریل" میں ان ظاہر پرست ملاؤں پر بڑی سخت نکتہ چینی کی ہے۔ انداز بیان بالکل نرالا ہے ؎

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبط سخن کر نہ سکا　　　حق سے جب حضرت ملا کو ملا حکم بہشت
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف　　　خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لب کشت
نہیں فردوس مقام جدل و قال و اقوال　　　بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا　　　اور جنت میں نہ مسجد، نہ کلیسا، نہ کنشت

ان ظاہر پرست ملاؤں کی روح حقیقت کے نور سے تہی ہے۔ ان کی اذان میں کوئی کشش کوئی

جذب نہیں۔ سجدوں میں ذوق وشوق نہیں، اور دروں میں خلوص کی تابندگی نہیں۔ ان تمام کمزوریوں کا سرچشمہ یہ ہے کہ ان میں جذب اندروں باقی نہیں رہا۔ اُن کے دل کے سوتے صداقت سے خشک ہو چکے ہیں۔ "ضرب کلیم" میں ملائے حرم کے عنوان سے ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو　　تری نگاہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام

تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال　　تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

اقبالؔ مذہب کی ظاہری نمائش سے بیزار ہے وہ گفتار اور کردار میں ہم آہنگی دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ فلسفی سے اس لئے نفرت کرتا ہے کیونکہ اس کا دل مردہ ہے۔ صوفی کے اس لئے خلاف ہے کیونکہ اس میں صرف مستئ احوال ہے۔ ملّا کو اس لئے برا کہتا ہے کیونکہ اس کے یہاں صرف وعظ ونصیحت کی گرما گرمی ہے اس کے یہاں خبر اور نظر میں فساد ہے۔ شاعر کی نواؤں میں صرف مستی ہے زندگی اور حرکت نہیں۔ اس کی ترنگ میں نشہ ہے جو انسان کو عالم خود فراموشی میں پہونچا دیتا ہے۔ حیات اور عمل کا پیغامبر اقبالؔ اسی لئے ان سب سے کنارہ کش ہے کہ وہ انسان کی قوت ارادی کو خواب آور نشہ کے ذریعہ سلا دیتے ہیں۔ ان میں حرکت اور اضطراب کی بجائے جمود اور تعطل ہے۔ سرگرمی کی بجائے سرمستی ہے۔ بیداری کی بجائے خواب ہے اقبالؔ ان سب سے منہ موڑ کر اور ناامید ہو کر اک مرد مجاہد کا متلاشی ہے جو ایک قلب تپاں، ایک چشم بینا، ایک خلیلی روح، ایک کلیمی نظر رکھتا ہو۔ "ضرب کلیم" میں اس نے خود کہا ہے ؎

صوفی کی طریقت میں فقط مستئ احوال　　ملّا کی شریعت میں فقط مستئ گفتار

شاعر کی نوا مردہ وافسردہ وبے ذوق　　افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار

وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو　　ہو جس کی رگ وپے میں فقط مستئ کردار

اقبال زندگی کو ایک مسلسل حرکت سمجھتے ہیں جس میں سکون وثبات نہیں۔ زمانہ ایک قسم کی دائمی گردش ہے۔ موت انسانی زندگی کا خاتمہ نہیں کر دیتی بلکہ یہ صرف ایک منزل ہے۔ حقیقی زندگی موت کے بعد شروع ہوتی ہے اور روح کا ارتقا برابر جاری رہتا ہے اسے ایک جوئے رواں سے تعبیر کر سکتے ہیں جو ازل سے ابد تک جاری رہنے والی ہے۔ زندگی کا دھارا ہمیشہ گردش میں رہتا ہے اور زمانہ اس کے بہاؤ

کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔ زندگی اور موت اس کے دو نشان ہیں لیکن اس سے اس کا بند ٹوٹتا نہیں اور نہ اس میں سکون پیدا ہوتا ہے موج کی لہریں اسے ہمیشہ تازہ دم رکھتی ہیں اور اس کی روانی بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہتی ہے۔ اقبال نے اسی تسلسل کے متعلق ایک جگہ بڑے بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے ؎

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

اس زندگی کے لئے اقبال انقلاب کو لازمی ولابدی سمجھتے ہیں ؎

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

برگساں کا تخلیقی ارتقاء کا نظریہ اقبال کے خیالات سے بہت قریب ہے۔ اس کے نزدیک تغیر و انقلاب کائنات کی بنیادی حقیقت ہے۔ حیات ایک مستقل اور مسلسل تخلیق ہے جو بعض مخصوص قوانین اور نوامیس کی پابند ہے۔ برگساں زمانہ کو ایک استمرار یا دوران سے تعبیر کرتا ہے جو دائمی حرکت میں ہے تغیرات کی ایک لڑی ہماری زندگی میں موجود ہے۔ زندگی ایک تخلیقی تحریک ہے جو ہر چیز کو ارتقائی رنگ دیدیتی اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے عقل سے زیادہ وجدان کی ضرورت ہے کیونکہ علم کا حقیقی سرچشمہ وہی ہے۔ اسی سے نشوونما کا سلسلہ قائم رہتا ہے اور زندگی بڑھتی اور پھیلتی رہتی ہے۔ اقبال نے اسی حرکت دوام کے متعلق ایک دوسری جگہ یوں اشارہ کیا ہے ؎

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوق پرواز ہے زندگی

سفر زندگی کے لئے برگ و ساز سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

سخت کوشی زندگی کا اولین اصول ہے اس سے زندگی کی تزئین و آرائش ہو سکتی ہے ؎

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

"ساقی نامہ" بال جبریل کی بڑی مشہور نظموں میں سے ہے۔ اس میں شروع میں اقبال نے بہار کا نقشہ کھینچا ہے جو ادبی مصوری کا بہترین نمونہ ہے منظر کشی کا ابتدائی انداز جو "بانگ درا" میں نظر آتا ہے اور "پیام مشرق" میں اپنے شباب کو پہونچا "بال جبریل" میں اور زیادہ حسین اور دلکش ہو کر سامنے آگیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی!
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

ڈاکٹر اقبال مغربی تہذیب کے بڑے اچھے مبصر ہیں عموماً جو لوگ اس پر تبصرہ کرتے ہیں ان کے یہاں تعصبات زیادہ کام کرتے ہیں اس لئے وہ گہری تنقید کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ اور اساسی حقائق تک ان کی نگاہ نہیں پہونچتی۔ قیام یورپ کے زمانہ میں اقبال نے یورپی تہذیب کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور چونکہ انھوں نے خود اسے برتا تھا اس لئے ان کی نظر میں اس کی تمام کمزوریاں نمایاں ہوگئیں۔ انھوں نے خود کہا ہے ؎

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

وہ اس تہذیب کی مادیت سے بیزار ہیں ان کا خیال ہے کہ جس تہذیب کی سرشت میں مادی عناصر ہوں گے وہ کبھی ہماری زندگی میں توازن اور ہم آہنگی نہیں پیدا کر سکتی۔ انھیں مغربی تہذیب پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس میں صرف "عقل فسوں پیشہ" پر زور دیا گیا ہے۔ دماغی نشوونما کے پہلو بہ پہلو وہ دل کی تربیت پر بھی زور دیتے ہیں زندگی کی اعلیٰ اقدار اور مقاصد کا تعین صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔ اس تہذیب کی ظاہری چمک دمک میں اقبال کو دل کی موت کے سامان نظر آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب نے جس معاشرتی نظام کی بنا ڈالی ہے اس میں بے ربطی، انتشار اور اضطراب کے سوا اور کچھ نہیں ؎

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مے "لا" سے مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ "الا"

"ضربِ کلیم" میں مغربی تہذیب کے متعلق لکھتے ہیں ؎

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس میں مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید — ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

وہ اس تہذیب سے پیدا شدہ نظامِ معاشرت کی بھی دھجیاں اڑا دینا چاہتے ہیں کیونکہ اس نے انسانیت کے ارتقا میں رکاوٹیں ڈالدی ہیں۔ علم و ہنر کی روشنی کے باوجود یورپ میں زندگی کا شعلہ سرد پڑا ہوا ہے۔ دماغ روشن و براق ہیں مگر دل تیرہ و تار، زبانوں پر آزادی اور مساوات کے نغمے ہیں۔ مگر ہر طرف فرنگی مدنیت نے نظامِ زندگی کو درہم برہم کر رکھا ہے اس انتشار اور بدنظمی کی وجہ یہ ہے کہ اس تہذیب کے پیچھے کوئی زبردست اخلاقی و روحانی طاقت نہیں ہے جو اعتدال کا راستہ پیدا کر کے قلب و نظر میں ہم آہنگی اور مطابقت قائم کرے۔ وہاں کوئی ایک نصب العین نہیں جس سے افراد کی زندگی میں نظم و ضبط پیدا ہو۔ ہر ایک کی راہ الگ ہے۔ بلند تر انسانیت کا کوئی نظریہ ان کے سامنے نہیں جس کے حصول کی طرف تمام افراد کی کوششیں مرکوز ہوں۔ ان کے اعمال کو پرکھنے کے لئے کوئی کسوٹی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کی تمام قوتیں تعمیر کی بجائے تخریب میں مصروف ہیں اور کسی نتیجہ پر منتج ہونے کی بجائے لہو لعب پر صرف کی جا رہی ہیں۔ "بالِ جبریل" میں اقبال نے کہا ہے ؎

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت — پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت — احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

"عہدِ حاضر کے انسان" کے متعلق "ضربِ کلیم" میں چند بہت بلند اشعار کہے ہیں ؎

"عشق نا پید و خرد می گزدش صورتِ مار" — عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

"آ زنگ زدہ" کے عنوان سے ایک نظم میں تنقید کا پیرایہ بالکل مختلف ہے ؎

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا (ضربِ کلیم)

اقبال موجودہ تہذیب کے اس خیال کو بھی ناپسند کرتے ہیں کہ مذہب اور سیاست دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ اسلامی نظریۂ سیاست کے مؤید ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سیاست کو سیدھے راستہ پر رکھنے کے لئے مذہب کی باگ ڈور ضروری ہے۔ مذہبی اور اخلاقی قیود انسانی افعال کو انتہا پسندی اور بے جا تشدد کی طرف مائل ہونے سے بچائے رکھتی ہیں۔ سیاست قوت کے اعتدال اور تنظیم کا نام ہے لیکن اگر اسے بے لگام چھوڑ دیا جائے تو وہ بازیگری ہو جاتی ہے اور اقتدار و غلبہ کی خواہش سے مجبور ہو کر انسان بہت سی ایسی حرکات کر گزرتا ہے جو کسی طرح بھی جائز و محمود نہیں کہی جا سکتیں۔ ہر نظام سیاست کو اجتماعی زندگی کی ایک مضبوط قوت بنانے کے لئے ایسی پابندیاں ضروری ہیں۔ ورنہ یہی حالت چنگیزیت میں بدل جائے گی۔ "موجودہ" لادین نظریۂ سیاست میں، اقبال مستقبل کی تاریک تصویر کو صاف دیکھ رہے ہیں اور اسی لئے انھوں نے واضح طور سے کہا ہے ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

موجودہ سیاست لادین کے متعلق کہتے ہیں ؎

مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں
کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر

ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمِ آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیوِ بے زنجیر

"دین و سیاست" کے عنوان سے ایک نظم میں اقبال نے اسلامی اور یورپی نظریہ سیاست پر اظہار خیال کرتے ہوئے موجودہ نظریہ پر کاری ضرب لگائی ہے اور دین و سیاست کی دوئی کو "چشم تہذیب حاضر کی نابصری" سے تعبیر کیا ہے۔ اگر ان دونوں عنصروں کو علیحدہ کر دیا جائے تو نتیجہ تباہی کی صورت میں نمایاں ہوگا۔ اقبال تہذیب حاضر کے شیدائی کو اسلامی نظریہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں جس نے ان دونوں عناصر کو ملا کر ایک بہترین امتزاج پیدا کیا ہے ؎

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی — سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں — کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی — دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا — بشیری ہے آئینہ دار نذیری (بال جبرئیل)

اقبال ہندی مکتب سے بہت مایوس ہیں۔ موجودہ نظام تعلیم نے جو ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں رائج ہے غیر شعوری طور سے پورے نظام زندگی کو جامد، پرسکون اور بے روح بنا دیا ہے۔ زندگی میں کوئی وسعت نہیں رہی۔ دماغوں سے جدت اور قوت تخلیق کا مادہ ختم ہوگیا۔ اور انفرادی زندگی کی تمام ابھرنے والی قوتیں کمزور ہو کر رہ گئیں۔ ایسے ماحول میں مفکر اور جدت پسند شاعر اور ادیب کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں؟ اور اقبال کا پیغام اس فضا کے لئے کیسے سازگار ہو سکتا ہے۔ اقبال جن بلندیوں پر پرواز کرتے ہیں اور جہاں وہ دوسروں کو بھی لے جانا چاہتے ہیں اس کا ادراک ہندی مکتب کے ان ممولوں کی نظر کہاں تک کر سکتی ہے؟ وہ اس کی نواؤں کی تاب کہاں لا سکتے ہیں؟ احساس ذات اور شعور نفس کا یہاں کیا گزر؟ اور خودی کی نشوونما کے مقالات کس طرح ایسے مکتب کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکتے ہیں ؂

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا — موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بے چارے ممولوں کی نظر سے — پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

اقبال موجودہ نظام تعلیم کے خلاف اپنی زہر فشانی سے تھکتے نہیں کیونکہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ اس نے کس طرح سے پوری قوم کی زندگی کو تباہ کر دیا ہے اور ان کی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو بیکار بنا دیا ہے۔ اس نوع کی تعلیم نے نوجوانوں کی شخصیت کو مسخ کر دیا ہے اور ان کی زندگی کے آئندہ تمام امکانات خواب ہو کر رہ گئے ہیں۔ اعلیٰ مقاصد کے حصول کا جذبہ جو صحیح تعلیم کا لازمی نتیجہ ہوا کرتا ہے، فکر معاش نے مردہ کر دیا ہے۔ وہ اس ذہنی اپج، تیزیٔ ادراک اور جوش وجدان سے محروم ہو گئے ہیں۔ جن کی بدولت وہ اپنی فطرت کی پوری بلندی تک پہونچ سکتے ہیں اور جس سے ان کی شخصیت کا پورا خاکہ تیار ہوتا ہے

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نظامِ تعلیم ان کی تاریخی روایات قومی نفسیات اور روحانی ضروریات کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ اور ان کے نرم و نازک دماغوں کو ایک غیر مانوس اور غیر طبعی سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اعتماد، یقین اور وثوق کے بلند جذبات جو کامیابی کے لئے لابدی ہیں ان کے دماغوں سے محو ہو گئے ہیں۔ زندگی میں کوئی سوز حرارت اور گرمی نہیں اور سخت کوشی کی جگہ عیش پسندی کا دور دورہ ہے ؎

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش

اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش

فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

ان مکتب سے نکلے ہوئے طالب علموں کی حالت یہ ہے ؎

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں
نہ ادائے کافرانہ! نہ تراشِ آذرانہ!

اقبال کو ان کی حالت پر سخت افسوس ہے۔ ایک نوجوان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

ان کے لئے اقبال کی دعا یہ ہے ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

اور اس کا پیام یہ ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے مرا نورِ بصیرت عام کر دے

"فرمانِ خدا" کے عنوان سے ایک نظم میں اقبال نے مزدوروں کی حمایت میں بڑے سہانے گیت گائے ہیں اور بدلتے ہوئے حالات کو سامنے رکھ کر مزدور کے مستقبل کا تابناک چہرہ دکھایا ہے۔ وہ اب "پیرانِ کلیسا" کے استبداد کو ٹھکرا کر سلطانیٔ جمہور کا جھنڈا نصب کر دینا چاہتا ہے۔ اور تیسریت کے اس طلسم زار میں اپنی پرشوکت آواز بلند کر کے مزدور کو دلاسا دیتا ہے۔ اسے غریبوں کے ساتھ اتنی ہی ہمدردی ہے جتنی کسی بڑے اشتراکی کو ہو سکتی ہے۔ وہ ان کے لہو میں یقین اور اعتماد کا سوز پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ اپنی ہستی کا ادراک کر سکیں اور اپنے آپ کو اونچا ہوتے دیکھیں ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو (بالِ جبریل)

اقبال کی نظم "شعاعِ امید" میں ہمیں ایک بار پھر "ترانۂ ہندی" اور "نیا شوالہ" کے نوجوان کی تصویر نظر آتی ہے جس میں وہ جوش اور گرمی تو نہیں جو اس زمانہ شاعری کے ساتھ مخصوص ہے البتہ پختگی سلاست اور ریاض کا رنگ ٹپکتا ہے جس سے ایک کہنہ مشق شاعر اور محبِ وطن کا نقشہ کھنچ جاتا ہے جس احساس نے اقبال سے "بانگِ درا" کی وہ نظمیں لکھوائی تھیں وہ اب بھی باقی ہے۔ البتہ ذہنی نشو و نما کے ساتھ ساتھ خیالات میں بھی تدریجی ارتقا ہوتا گیا۔ پہلے اقبال وطن کے لئے بے تاب تھا اور وطن ہی یہاں اس کے لئے سب کچھ تھا۔ حبِ وطن کا جذبہ اب بھی باقی ہے بلکہ زیادہ پختہ ہو گیا ہے مگر پہلے وطنیت مقصود بالذات تھی۔ اب بین الاقوامیت کعبۂ مقصود ہے جس میں حبِ وطن منطقی طور سے شامل ہے کیونکہ کل میں جزو ہمیشہ شامل ہوتا ہے۔ پہلے وہ وطن کی محبت میں سرشار تھا اور اسے تمام فضا میں یہی سرزمین نظر آتی

تھی۔ اب بھی اس کا دل مسرت سے لبریز ہے۔ اب اس کی نگاہ زیادہ وسیع ہو گئی ہے۔ پہلے اس نے جغرافیائی حد بندیوں میں اسے محصور کر دیا تھا مگر اب اس نے خود یہ خبریں مٹا ڈالی ہیں اور ان کی بنیاد تاریخی واقعات اور طبعی حالات پر رکھی ہے لیکن اس کے بین الاقوامی نغموں پر کسی محدود ذہنیت کا پابند ہونے کا الزام لگانا سراسر ظلم ہے جس کے لئے کوئی جواز نہیں پیش کیا جا سکتا بھارت ماتا کے وسیع میدانوں لمبے لمبے دریاؤں، زرخیز وادیوں، سورج کی تابناک شعاعوں، اونچے پہاڑوں اور حسین منظروں کو دیکھ کر اس کے دل میں اب بھی کیف و سرور کی موجیں اٹھتی ہیں۔ اس کی تاریخی روایات پر اب بھی فدا ہے اس خاک سے جو سپوت اُٹھے ہیں اور جن کے علم و فضل کے کارناموں نے شہرت دوام حاصل کی ہے ان کیلئے اس کے دل میں اوروں سے زیادہ احترام اور عظمت موجود ہے اس کا سینہ اب بھی اپنے وطن کا نام سن کر پھول جاتا ہے اور وہ اُس کی سربلندی، یکجہتی اور قوت کا دل سے متمنی ہے

اک شوخ کرن، شوخ مثال نگہ حور — آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو — جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہانتاب
چھوڑوں گی میں ہند کی تاریک فضا کو — جبتک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز — اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی — جن کیلئے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں — محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانہ کے دروازہ پہ سوتا ہے برہمن — تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب

اس پُر شوکت نظم کا ہر شعر اقبال کے جذبات کا آئینہ دار ہے جس سے اس کے قلب کی وسعت اور فکر کی گہرائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نام نہاد قوم پرستوں کی نگاہ میں اقبال کے حجازی نغموں میں ہندی کے لئے کوئی گنجائش نہیں اور اس کا دل حب وطن کے جذبات سے خالی ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے اور اقبال کے جذبات میں خلوص کی تابندگی کہاں تک نمایاں ہے اقبال نے اپنے آئیڈیل مسلمان کا جو تصور پیش کیا ہے اس سے ان کی تعلیمات کا خلاصہ

میں آجاتا ہے وہ عام انسانوں سے بلند ضرور ہے مگر مافوق الفطرت نہیں۔ اس کے کردار میں وہ تمام خوبیاں پائی جائیں گی جو زندگی کے لوازمات میں سے ہیں۔ وہ اپنی سرشت میں یگانہ ہوگا اور اس کا کردار تمام انسانوں کے لئے نمونہ کا کام دے گا۔ ایمان خودی عمل سخت کوشی اور عالمگیر اخوت کے اصول پر اس کی تمام زندگی کا دارومدار ہوگا۔ اقبال کا یہ مردمومن نطشے کے "فوق البشر" سے مختلف ہوگا۔ نطشے نے اپنے "فوق البشر" کا ان الفاظ میں خاکہ کھینچا ہے؛

"زمانہ آئندہ کا یہ مرد میدان جو مستقبل بعید میں ظاہر ہوگا اور زندگی کا کامل مظہر ہوگا ہمیں موجودہ نصب العین اور اس کے نتائج سے آزادی دلائے گا، اور اُن قوتوں کو فنا کرنے والا ہوگا جو زندگی کے خلاف مصروف عمل ہیں وہ اپنے ساتھ ایک انقلاب عظیم لائے گا جس کی بدولت دنیا میں حیرت انگیز تبدیلیاں واقع ہوں گی جو ہماری قوت ارادی کو آزادی عطا کرے گا، اور کائنات کو اس کے صحیح مقام پر قائم کرے گا بنی نوع آدم کے اندر بہترین تمنائیں پیدا کرے گا۔ وہ مسیحیت کا مخالف اور تباہ کرنے والا ہوگا اور کائنات کی حقیقت کو ظاہر کرے گا۔ الغرض یہ فوق البشر جو غیر معمولی قوتوں کا مالک ہوگا۔ ایک دن دنیا میں ظاہر ہو کر رہیگا

اقبال اور نطشے دونوں کے نزدیک یہ مادی دنیا خودی کی جدوجہد کے لئے ایک وسیع میدان ہے۔ وہ دونوں مسیحی فلسفہ اخلاق کے سخت مخالف ہیں کیونکہ یہ فلسفہ خودی کو کمزور کر دیتا ہے اور رہبانیت کی تعلیم دے کر تمام خداداد صلاحیتوں کو برباد کر دیتا ہے۔ اقبال بھی نطشے کی طرح مظہر قوت کا دلدادہ ہے اس کے نزدیک کمزوروں کو دنیا میں رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ وہ جب کبھی اور جہاں کہیں قوت دیکھتا ہے اس کا دل مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ وہ "خواہش اقتدار" کو کائنات کی بنیادی حقیقت سمجھتا ہے۔ اور اسی لئے اس کا پیام زندگی اور قوت کا حامل ہے۔

اقبال کے "مردمومن" کے مزاج میں سختی اور نرمی دونوں کا امتزاج موجود ہے۔ اس کے ہاں جلال بھی ہے جمال بھی، توانائی بھی اور حسن بھی، لیکن نطشے کا فوق البشر" اگر وہ کبھی پردۂ کائنات پر ظاہر ہو گیا تو یقیناً ظالم اور سنگدل ہوگا۔ اقبال کے "انسان کامل" کے سامنے خدا کی ذات موجود ہے اور چونکہ وہ غیر محدود

ہے۔ اس لئے اس کی ترقی کے امکانات بھی ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہیں نطشے کا "فوق البشر" اپنی ذات میں محدود ہے۔ اس کے سامنے کوئی مطمح نظر نہیں چونکہ وہ خدا کے وجود کا قائل نہیں۔ اس لئے اس کی کوششوں کا میدان بہت تنگ ہے۔ اقبال کے مرد مومن کے تصور میں عبدالکریم جیلی کے خیالات کی جھلک نظر آتی ہے۔ "ضرب کلیم" میں انھوں نے مرد مومن کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و جباری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریل امین بندۂ خاکی — ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز — آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمان

"مدنیت اسلام" کے عنوان سے ایک نظم میں اس نقش کو یوں پیش کیا ہے ؎

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے — یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں
طلوع ہے صفت آفتاب اس کا غروب — یگانہ اور مثال زمانہ گونا گوں
حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی — یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسم افلاطوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوق جمال — عجم کا حسن طبیعت عرب کا سوز دروں

"ضرب کلیم" میں اقبال نے آرٹ کے نظریہ کو بھی پیش کیا ہے۔ وہ آرٹ برائے آرٹ کے نظریہ کو پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ جو ادب محض جمالیاتی ذوق کی تسکین کرے۔ وہ ہماری زندگی کی قوت محرکہ نہیں بن سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ ادب دماغی کیف کے لئے ضروری ہے۔ اور اس میں اس ضرورت کو پورا کرنے کا سامان موجود ہونا چاہئے لیکن جو ادب محض رنگ و بو کا مجموعہ ہو اور محض دماغی تعیش کا سامان مہیا کرے وہ ہمیں "ذوق عمل" اور "ذوق تپش" سے محروم کر دیتا ہے جو اصل روح حیات ہیں۔ جن نغموں

میں مستی کے ساتھ حیتی نہ ہو وہ ہماری زندگی کو تقویت پہونچانے کی بجائے اسے کمزور کر دیتے ہیں اقبال اسی لئے حافظ کے مخالف ہیں کیونکہ حافظ کی غزلیں پڑھ کر عموماً نوجوان کاہلی عیش اور بے راہ روی کے شکار ہو جاتے ہیں اور حقیقت کی شاہراہ سے ہٹ کر مجاز کی گلی میں ہو لیتے ہیں جس سے ان کی زندگی کے سرچشے خشک ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عالمگیر کے زمانہ میں دیوان حافظ کے مطالعہ کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ اقبال ایسا ادب چاہتے ہیں جو نوجوانوں میں تازگی اور تنو مندی پیدا کرے انہیں زندگی اور عمل کے لئے اکسائے اور ان کی مخفی قوتوں کو بروئے کار لائے۔ ان کے نزدیک آرٹ میں جمال اور جلال دونوں کا امتزاج موجود ہونا چاہئے اور ان دونوں میں سے کسی ایک کی کمی ہمارے مقصد کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔

دلبری بے قاہری جادوگری است　　　دلبری باقاہری پیغمبری است

انہوں نے ایک جگہ نہایت صاف الفاظ میں اپنے مفہوم کو واضح کیا ہے لکھتے ہیں۔

"بلند ترین آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر قوت ارادی کو بیدار کر دے تاکہ ہم زندگی کی مشکلات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ وہ تمام علوم و فنون جو خواب آور ہیں۔ جو ہمیں ان حقائق گرد و پیش سے غافل کر دیں جن کے حصول پر زندگی کا انحصار ہے۔ وہ دراصل بربادی اور موت کا پیغام ہیں۔ آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر بیداری کی قوت پھونکے نہ کہ وہ جو ہم پر حالت سکر طاری کر دے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آرٹ کا منتہائے مقصود خود آرٹ ہے وہ دانستہ طور پر ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے لئے از بس ضروری ہے کہ ہم ایسے نادان دوستوں سے ہوشیار رہیں

خود نوازی کہ فنگ داد مرا　　　ہمہ آفتاب لیکن اثر ضیاء دارد

اسی خیال کو ایک دوسری جگہ یوں بیان کیا ہے ۔

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے　　　یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا　　　اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو　　　جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں　　　جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

"ضرب کلیم"

اقبال آرٹ کے حیاتیاتی پہلو پر زور دیتے ہیں، اور "آرٹ برائے زندگی" کے نظریہ کے قائل ہیں مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ خود ان کے آرٹ میں حیاتیاتی اور جمالیاتی دونوں عنصر ایک دوسرے سے زیادہ طاقتور اور موثر ہیں۔

"ارمغان حجاز" اقبال کی آخری تصنیف ہے جس میں شاعر نے دریائے خیال کو بڑے سلیقہ کے ساتھ شعر کی لڑیوں میں پرو دیا ہے مگر یہ ایک چابکدست مصور کی موقلم کے آخری نقش ہیں جن میں پختگی زیادہ اور تابناکی کم ہے۔ اس مجموعہ میں اقبال کا آرٹ ایک حد تک زوال پذیر ہوگیا ہے اور قلم کی ہر جنبش میں تھکن اور بے کیفی کے آثار نمایاں ہیں۔ ہر شاعر اور ادیب کا اشہب قلم ایک خاص بلندی تک پرواز کرتا ہے جس کے بعد اس میں وہ ندرت اور تازگی نہیں رہتی۔ بالکل اسی طرح اقبال کے ہاں جو تازگی تخیل "جاوید نامہ" اور "بال جبرئیل" میں ہے وہ "ارمغان حجاز" میں بالکل نہیں ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ اقبال کی یہ تصنیف شعر و سخن اور خیالات کا کوئی کم وقعت مجموعہ ہے بلکہ کہنا صرف اس قدر ہے کہ آرٹ کی وہ بلندی جو "بال جبرئیل" میں ہے "ارمغان حجاز" میں دب کر رہ گئی ہے۔ جہاں تک زندگی کے حقائق کا تعلق ہے اقبال کا ہر شعر اپنی جگہ مستقل چیز ہے اور اس کی اہمیت لازوال ہے۔ "ارمغان حجاز" میں کم وبیش انہیں مضامین کو دہرایا گیا ہے جو ہمیں "بال جبرئیل" اور "ضرب کلیم" کے صفحات میں نظر آتے ہیں۔ خودی، فقر و عشق، ملائے حرم، تہذیب حاضر، مکتب، زمانہ حاضر کا مسلمان اور اشتراکیت پر بڑے اچھے خیالات ملتے ہیں اور حالات حاضرہ پر جو تنقیدیں کی ہیں وہ اس زمانہ میں خاص اہمیت رکھتی ہیں جن سے اقبال کی بالغ نظری، عمق فکر اور وسعت مشاہدہ کا پتہ چلتا ہے۔

"ارمغان حجاز" میں ہمیں اس بڑے مفکر کے آخری پیغام کے نمونے ملتے ہیں۔ اور اس میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی شخصی اور ملی زندگی کے لئے ایک ایسا نصب العین اور لائحہ عمل موجود ہے جو اُن کی پوری زندگی پر پھیلا ہوا ہے۔ اقبال کا سب سے اہم پیام جسے انھوں نے شروع سے آخر تک مسلمانوں کے سامنے پیش کیا وہ یہی تھا کہ وہ اپنی خودی کو بیدار کریں تاکہ وہ اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا کر سکیں۔ اُن کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کا سبب یہی ہے کہ وہ خود اپنی ہستی سے ناواقف ہیں اور نہیں جانتے کہ ممکنات زندگی کی کس قدر قوتیں ان کے اندر پوشیدہ ہیں۔ انھیں اگر شعور ذات کا احساس ہو جائے تو وہ روحانی اور اخلاقی مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد میں کامیاب ہو سکتے ہیں چنانچہ کتاب کے

شروع میں اقبال نے مسلمان کو مخاطب کرکے کہا ہے ؎

دل تو داغ پنہانے نہ دارد	تب و تاب مسلمانے نہ دارد
خیابان خودی را دادہ آب	ازاں دریا کہ طوفانے نہ دارد

آگے چل کر مسلمانوں کی حالت زار پر یوں اظہار خیال کیا ہے ؎

آتی ہے دم صبح صدا عرش بریں سے	کھو گیا کس طرح تیرا جوہر ادراک!
کس طرح ہوا کند ترا نشتر تحقیق	ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک!
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار	کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلام خس و خاشاک؟
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں	کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک!
اب تک ہے گرچہ رواں لہو تیری رگوں میں	نے گرمی افکار، نہ اندیشۂ بیباک؛
روشن تو وہ ہوتی ہے، جہاں بیں نہیں ہوتی	جس آنکھ کے پردوں میں نہیں ہے نگہ پاک؛
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری	اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری!

مسلمان کی شان تو یہ تھی ؎

حدیث بندۂ مومن دل آویز	جگر پرخوں، نفس روشن، نگہ تیز
میسر ہو کسے دیدار اُس کا	کہ ہے وہ رونق محفل کم آمیز

مگر ملائے حرم نے اسے موجودہ حالت تک پہونچا دیا۔ اسی ملائے حرم کے متعلق اقبال کا خیال ہے ؎

زمن بر صوفی و ملا سلامے	کہ پیغام خدا گفتند ما را
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت	خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را

عقل کی ناتوانی اور عشق کی پختہ کاری کے متعلق ایک رباعی میں کہا ہے ؎

خبر عقل و خرد کی ناتوانی	نظر دل کی حیات جاودانی
نہیں ہے اس زمانے کی تگ و تاز	سزاوار حدیث لن ترانی

عصر حاضر کے کمالات ذہنی اور مدارج ترقی کے متعلق بڑے لطیف انداز میں اشارہ کیا ہے ؎

مسلماں فقر و سلطانی بہم کرد | ضمیرش باقی و فانی بہم کرد
ولیکن الاماں از عصر حاضر | کہ سلطانی با شیطانی بہم کرد

اور مغربی تعلیم اور مکتب کی کور ذوقی، تنگ نظری اور محدود مشاہدہ کے متعلق اپنے حکیمانہ انداز بیان میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے ؎

تب و تابے کہ باشد جاودانہ | سمند زندگی را تازیانہ
بہ فرزنداں بیاموز ایں تب و تاب | کتاب و مکتب افسون و فسانہ!

اشتراکیت اور اسلام کے موضوع پر بھی بڑے دلپذیر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ اگر اسلامی معیشت کے اصول آشکارا ہو گئے تو پھر اشتراکیت کا چراغ بہت جلد گل ہو جائے گا مگر مسلمان ابھی تک الہیات کی گتھیاں سلجھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ انھوں نے زمانہ کی روش کو ابھی نہیں پہچانا ہے۔ اقبال اسلامی اصول میں موجودہ دنیا کی اقتصادی اور سیاسی پریشانیوں کا علاج دیکھتے ہیں۔

"دختران ملت" کے عنوان سے ایک نظم میں اقبال نے مسلمان لڑکیوں کو جن پر مغربی سحر کا اثر آہستہ آہستہ ہو رہا ہے۔ بڑا روح پرور پیام دیا ہے جس پر عمل کر کے وہ زندگی میں وہ بہت اہم ذمہ داریوں کو پورا کر سکتی ہیں۔ اور ملت اسلامیہ کی واماندہ رگوں میں خون حیات دوڑا سکتی ہیں۔ انھیں مغربی تمدن سے تابانی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسلام نے ان کے سامنے ایک مکمل پروگرام پیش کر دیا ہے جو ان کی زندگی کے ہارے کو صحیح راہ پر لگا سکتا ہے۔

ضمیر عصر حاضر بے نقاب است | گشادش در نمود رنگ و آب است
جہاں تابی ز نور حق بیاموز | کہ او با صد تجلی در حجاب است
زشام ما برون آور سحر را | بہ قرآں باز خواں اہل نظر را
تو میدانی کہ سوز قرأت تو | دگرگوں کرد تقدیر عمر را

اسی میں آئندہ نسلوں کی صحیح تربیت کا طریقہ ہے۔ اسی میں ملت کی سربلندی کا راز مضمر ہے!

اقبال کی تصانیف پر جو اظہار خیال ہم نے صفحات ماقبل میں کیا ہے۔ اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شاعر کا تخیل کس طرح ظلمت وادیوں میں سے ہو تا ہوا اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گیا ہے

میں جس افتاد طبیعت کے نقش "بانگ درا" میں نظر آتے ہیں، وہی جلد اُجاگر ہو کر دوسری تصانیف میں زیادہ رعنائی وزیبائی کے ساتھ نمایاں ہو گئے ہیں۔ خیالات کے مختلف دھارے جو شاعر کے ذہنی نشو و نما اور مختلف معاشرتی، سیاسی اور تمدنی تحریکوں سے اثر پذیر ہوئے ہم آہنگی، ہمواری اور تسلسل کے ساتھ بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تخیل کی گہرائی اور پختگی اور انداز بیان کی جدت ہر آنے والی تصنیف میں پہلی تصنیف سے زیادہ قوت کے ساتھ نمایاں ہے مگر زبان کا حسن ہر جگہ اپنی جلوہ ریزی کر رہا ہے۔ اقبال کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے فلسفہ اور شعر کو اس طرح سمویا کہ ان کے امتزاج سے ایک ایسی بلند چیز پیدا ہو گئی جو فلسفہ اور شعر دونوں سے فروں تر ہے۔ خودی، فقر اور عمل اقبال کے پیام کا نچوڑ ہے۔ انہی تینوں چیزوں کو انہوں نے رنگارنگ انداز میں پیش کیا ہے جس سے ہر مرتبہ ایک نئی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اقبال نے رومی، نطشے اور برگسان کے خیالات پر اپنے فلسفہ کی بنیادیں اٹھائی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ان تینوں فلسفیوں کے خیالات سے بے انتہا متاثر ہوا ہے مگر اس کے فلسفہ کی حسین وادیاں سرزمین حجاز کے دریاؤں کی آبیاری کی ممنون احسان ہیں۔ اور اس کے کشت زار شاعری کی بہار انہی کے فیض سے وابستہ ہے۔ اس کے مضراب کے تاروں میں سے وہی حجازی نغمے نکل رہے ہیں۔ ساغر عجمی سہی مگر بادۂ کہن وہی ہے جس میں کھجور کا افشردہ ملا ہوا ہے۔

بحیثیت ایک آرٹسٹ کے بھی اقبال کا پایہ بہت بلند ہے۔ آرٹ کے بعض بہترین نمونے "بانگ درا" کی نظموں میں ملتے ہیں۔ "اسرار و رموز" اور "پیام مشرق" اور "بال جبریل" میں وہ اور زیادہ جاذب توجہ ہو گئے ہیں۔ شاعر کی قوت فکریہ اور جوش بیان جو اس کی شخصیت کا نمایاں پہلو ہیں اشعار میں صاف نظر آتے ہیں۔ کارلائل کے نظریہ کے مطابق اگر یہ کہنا درست ہے کہ "ہر شخص کی تحریر میں اس کی شخصیت کا رنگ جھلکنا چاہئے" تو اقبال اپنی نظموں میں آسانی کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔ مگر انہیں پہچاننے اور سمجھنے کے لئے خیال اور نظر کے درمیان سے تمام رنگین پردوں کو اٹھا دینا ہوگا اور اس کے لئے گہری بصیرت کی ضرورت ہے۔ ان کے قلم کی ہر جنبش میں لطیف ترنم اور دقیق نکتہ سنجی کے متضاد عناصر کے ساتھ حیات نو کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس میں حرکت اور زندگی ہے تعطل اور سکون نہیں۔ اقبال نے فلسفہ اور شاعری میں خیالات کی جو طرحیں ڈالی ہیں اور اپنی غیر معمولی فنکارانہ قوت سے کام لیکر جو گلکاریاں کی ہیں انہوں نے شاعر کی شخصیت کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

اسلوب احمد صاحب انصاری متعلم مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

اشتراکیت اور اشتمالیت

۱۹۱۴ء کے بعد

۱۹۱۴ء کے آخر جولائی اور شروع اگست کے دنوں میں جبکہ یورپ کے سفارت خانوں میں دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ تمام ملکوں کے اشتراکی متحد ہو کر امن و آشتی کا نعرہ لگا رہے تھے لیکن سیاست کا پانسہ کچھ اس طرح سے پھینکا گیا کہ بندھے ہوئے جھنڈے لہرانے لگے۔ جنگی نقار خانوں کی آواز سے فضا گونج اٹھی۔ اس وقت لوگوں کی آنکھیں بند تھیں کوئی بھی نہ دیکھ سکا کہ مزدوروں کے ان مظاہرات میں کس درجہ اتحاد عمل موجود ہے۔ "اشتراکی وطن خطرہ میں ہے" کا نعرہ لگاتے ہوئے ایک علم کے نیچے جمع ہو گئے وہ آخر وقت تک اپنی اپنی حکومتوں کی مدد کرتے رہے۔ مگر جب شکست کے امکانات کے ساتھ ساتھ معاشی اور اقتصادی تباہ کاری نے ان کی حالت کو ابتر کر دیا تو وہ ان تمام حکمرانوں کے مخالف بن گئے جنھیں آخری لمحہ تک جنگ جاری رکھنے میں لطف آتا تھا۔

برطانیہ میں آزاد مزدوروں کی جماعت ابتدا ہی سے جنگ کی مخالف تھی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جنگ سرمایہ دار طاقتوں کی خفیہ سازشوں کا نتیجہ ہے لیکن لیبر پارٹی مسٹر اسکوئتھ کی لبرل حکومت کے ہمیشہ حامی رہی اور اس جماعت کے لوگ آنے والی حکومتوں میں عہدۂ وزارت پر متمکن کئے گئے۔ یہی سیاسی چال فرانس اور بلجیم میں بھی چلی گئی۔ جرمنی میں بھی معاشری جمہوریت پسندوں نے اکثریت میں قیصر کا ساتھ دیا اگرچہ کارل لبکنخت نے (جو کہ اکیلا پارلیمنٹ کا ممبر تھا اور جس نے ۱۹۱۴ء میں جنگی قرض کی مخالفت کی تھی)، مخالفین جنگ کی ایک چھوٹی سی جماعت بنائی تھی۔ اس جماعت کی شدت مخالفت جنگ روز بروز بڑھتی رہی۔

لیکن اٹلی میں ہوا کا رخ بدلا ہوا تھا کیونکہ وہاں اشتراکی جماعت کی اکثریت جنگ میں شریک ہونے کے خلاف تھی۔ صرف ایک چھوٹی موٹی سی با اقتدار اور باہمت اقلیت بنیٹو مسولینی کی قیادت میں (جو کہ اشتراکیت کے آرگن اخبار کا سابق ایڈیٹر رہ چکا تھا) اس امر کی متمنی تھی کہ جنگ کے خطرات اور اس کے مفید نتائج میں حصہ لے۔ تین سال گزر گئے مگر اشتراکیت پسندوں نے لڑنے والے ملکوں میں نہ تو قومی حکومت کی پالیسی کو [illegible]

دھرایا اور نہ اس پر عمل کیا بلکہ خاموشی اختیار کئے رہے لیکن ۱۹۱۷ء کے موسم بہار میں صورت حالات بالکل بدل گئی اس طرح نسل انسانی کی تاریخ میں ایک نیا باب شروع ہوا جس کی اہمیت کا اندازہ بعد میں ہوا۔ روسی سپاہی شکست سے ہمت ہار کر اور کشت و خون سے بدحواس ہو کر ایک لا علاج پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ اس لئے انہوں نے بکریوں کی طرح مذبحِ شہنشاہیت پر بے سود ذبح ہو جانا پسند نہ کیا بلکہ جنگ کی صفوں سے علیحدہ ہو گئے ان میں بددلی کی لہر پھیل گئی۔ ملکی حکومت کی دیواریں بیٹھ گئیں اس کی جگہ ایک لبرل سوشلسٹ حکومت برسر اقتدار آگئی جسکو ہمیں طبقۂ خواص کی حکومت کہنا چاہیئے۔ اس طرح انقلاب روس کی ابتدا ہوئی۔

عموماً واقعات کے اس ردوبدل نے اشتراکیت کے حامیوں کو اچنبھے میں ڈال دیا۔ ہر ایک ملک میں وہ ایک سماجی انقلاب کا خواب دیکھ رہے تھے اس مقصد کے لئے انہوں نے احتجاج بھی کیا اور اکثر مقامات پر انھیں دکھ درد کی تنگ گھاٹیوں سے گزرنا پڑا۔ روس ایسے غیر معروف ملک میں جو سیاسی و صنعتی حیثیت سے دنیا کے تمام ملکوں سے پیچھے بھی تھا ایک ایسے انقلاب کا برپا ہو جانا خود نظریہ اشتراکیت کی صحت کے خلاف ہے لوگوں کا خیال تھا کہ سب سے پہلے یہ آگ جرمنی یا فرانس یا انگلستان میں بھڑکے گی جہاں سرمایہ داری کے زوال کی علامتیں صاف صاف ظاہر ہو رہی تھیں اور جہاں اشتراکی اصول و عقیدے کی انتہائی جوش اور استقلال سے تبلیغ کی جا رہی تھی۔

روس کو مغربی تہذیب میں کوئی درجہ حاصل نہ تھا۔ صنعت و حرفت کی شکل سے ابتدا ہوئی تھی تجارت کی اتحادی مجالس کی تنظیم ممنوع تھی۔ کسان اپنی جہالت اور بے علمی کی وجہ سے اپنے اضلاع کے معاملات میں اس درجہ الجھے ہوئے تھے کہ انہوں نے ملکی فلاح و بہبود کو اپنے ذاتی اغراض پر قربان کر دیا تھا۔ اشتراکی پروپیگنڈا صرف شہر اور قصبوں کے مل مزدوروں تک ہی محدود تھا اور اس کے علاوہ سائبریا بھیج دئے جانے یا اس سے بھی زیادہ برے نتائج بھگتنے کے ڈر سے صرف خفیہ تبلیغ ہو سکتی تھی۔

بہر حال روس سرمایہ داری کے زنجیر کی سب سے کمزور کڑی تھا۔ آئندہ کے واقعات سے واقف ہونے کے بعد زار کے انحطاط اور اس کے نظام حکومت کے تہ و بالا ہونے کی علت بتلائی جا سکتی ہے۔ یہ حکومت طویل عرصے سے دم توڑ رہی تھی جس کو نحوست و ادبار، زوال یا انحطاط نے گھیر لیا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں بھی

ایک چھوٹا سا انقلاب برپا ہوا تھا مگر ناکامیاب رہا لیکن یہ آنے والے ڈرامے کی ایک باقاعدہ مشق تھی۔

لینن نے اپنے۔ غیر ملک سے بھیجے ہوئے خطوط، میں جو ۱۹۱۷ء مارچ اور اپریل میں سوئٹزرلینڈ سے لکھے گئے تھے ایک جگہ لکھا ہے"۱۳ انقلاب نے زمین کو ہموار کر دیا اور صدیوں کی تنگ نظری اور تعصب کو جڑ سے اکھاڑ دیا" اس نے لاکھوں مزدوروں اور کروڑوں کسانوں کے مردہ قالب میں سیاسی بیداری کی روح پھونک دی لینن کو اس انقلاب میں کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جو غیر معمولی اور قابل دید ہو اسی لئے ان لوگوں کو جو اس کی خفیہ انقلابی تحریک سے واقف تھے اور جو اس کی فہم و ذکا کے قائل نہ تھے اس کے بعد اس رویہ پر سخت تعجب ہوا۔ بے انتہا بدنظمی ۱۹۱۷ء کے سخت ضابطہ، روس اور اس کے شرکا جنگ کی مسلسل جنگی ناکامیاں یہ سب مل کر لوگوں کو بدحواس کر دینے کے لئے کافی تھیں۔ پس روس کے فاقہ زدوں نے متحد ہو کر روٹی امن اور آزادی کا ایک پرجوش مطالبہ کیا۔ یہ ایک خلاف معمول ایک تواریخی قیاس تھا جو اشتراکی روس کے وجود کا باعث ہوا لینن اور اس کے رفقار کار وہاں کے سیاسی حالات پر پوری طرح حاوی تھے۔ وہ اس موقع کو ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اے ایف کرنزکی کی قیادت میں پہلی انقلابی حکومت روس کی فضا میں بڑی مشکلوں سے صرف چھ مہینے تک سانس لے سکی اس کے بعد حکومت کی باگ بالشویک جماعت کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ جو بہت دنوں سے این لینن اور لیون ٹراٹسکی کی رہنمائی میں معاشری جمہوریت پسندوں کے درمیان کام کر رہی تھی۔ مزدوروں کسانوں اور سپاہیوں میں سوویٹ کی تبلیغ کرنا ان کا لائحہ عمل تھا۔ پس مارکس کے اصولوں پر ایک ایسے ملک میں عمل کیا جانے لگا جو معاشرتی خرابی کے قعر مذلت میں پہونچ گیا تھا۔

۸ نومبر ۱۹۱۷ء کو لینن کا پہلا فرمان صادر ہوا جس کے مطابق تمام اراضی قوم کی ملکیت بنا دی گئی۔ اور کاشت کے لئے کسانوں کو سپرد کر دی گئی۔ اس کے بعد اندرونی تجارت میں ریاست کو پورا پورا دخل حاصل ہو گیا اور ۱۹۱۸ء کی جولائی میں تمام اقتصادی نظام ریاست کے سپرد کر دیا گیا اور اس کی جگہ قومی کاروبار کی بنا ڈالی گئی۔ خرید و فروخت۔ بازار اور مقابلہ سب منسوخ کر دئے گئے۔ ان کی جگہ ایک ایسے نظام مبادلہ نے لی جس کے ماتحت دیہی اور شہری پیدا کرنے والوں کے درمیان افسران حکومت کے ذریعہ اشیاء کو

تبادلہ ہو جایا کرتا تھا۔ یہ جنگی اشتمالیت کا دور کہلاتا ہے جبکہ ٹراٹسکی ایک ہی وقت میں بالشویک سپاہیوں کو سولہ محاذوں پر لڑا رہا تھا۔ اس وقت بے چارے کسانوں کا ایک ایک دانہ غلہ، سرخ پوش سپاہیوں کے قبضہ میں آگیا تھا۔

خانہ جنگی فتح و نصرت لئے ہوئے ختم ہوئی لیکن اس فتح کی اہم قیمت کسانوں کی علیحدگی کی شکل میں ادا کرنی پڑی جب سفید پوش سالاران لشکر آخری مرتبہ علیحدہ کر دئے گئے تو لینن نے ایک نئی اقتصادی پالیسی کو جاری کیا۔ جبری غلہ کی فراہمی کا سدباب اور صنعت و حرفت پر حکومت کی جانچ پڑتال اور قبضہ و قدرت میں تخفیف۔ انفرادی سہم اور ذاتی تجارت کی اجازت اس نئی پالیسی کا طغرائے امتیاز تھا۔ اتحاد و باہمی کی انجمنوں کو بھی ترقی دی گئی اور یہ کچھ ہی دنوں میں ملکی کاروبار کے ایک بڑے حصہ پر حاوی ہو گئیں۔

اس نشو و نما میں بہت سے عناصر ایسے تھے جو اشتراکی ضمیر کے لئے حد سے زیادہ تکلیف دہ تھے مارکسٹ لینن کی بری طرح نکتہ چینی کرنے لگے لیکن وہ حقیقتاً اپنے زمانہ اور اپنی نسل کا بہت بڑا آدمی تھا۔ اس کی چند سالہ حکومت میں روس نے جنگ عظیم اور خانہ جنگی اور قحط کے نقصانات کو پورا کر لیا۔ جنوری ۱۹۲۴ء میں اس کا انتقال ہوا۔ روس کے لوگ اسے اپنا ہادی اور رہبر تصور کرتے ہیں کیونکہ اسی نے نئے روس کی طرح ڈالی تھی۔ کریملین کی دیوار در کے نیچے اس کی قبر ہے جسے اشتمالی عقیدے کے لوگ اپنا کعبہ خیال کرتے ہیں اصطلاحی رعایت کو ملحوظ نہ رکھتے ہوئے ہم اس وقت کی ریاستی سرمایہ داری کے نظام کو اشتراکیت کے لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتے ہیں۔ جوزف اسٹالن لینن کا جانشین ہوا اس کے برسر اقتدار آنے کے فوراً ہی بعد ایک نمایاں تغیر واقع ہوا نیپمین اور کلاک پر سارا غصہ اتار گیا۔ ان کو اذیتیں پہونچائی گئیں اور آخر کار ان دونوں طبقوں کو ختم کر کے ایک نیا اقتصادی پروگرام بنایا گیا۔ اس کے پیچھے یہ مقصد پوشیدہ تھا کہ ملک خود اپنی کفالت کر سکے اور کسانوں کی ذاتی آراضی اور املاک بھی منسوخ ہو جائیں۔

پانچ سالہ پروگرام ۱۹۲۸ء میں شروع کیا گیا۔ جون ۱۹۳۲ء میں پہلی اسکیم کی میعاد ختم ہوئی ایک دوسرے پروگرام کا نفاذ عمل میں آگیا۔ یہ دونوں پروگرام غیر معمولی طور پر کامیاب ہوئے لیکن وہ باب جس میں کلاک کے مٹائے جانے کے واقعات درج ہیں انسانی قربانی کے صحیفہ میں کم ہولناک نہیں۔

انقلابی شورش کے وقوع پذیر ہونے کے بیس برس بعد ہم دیکھتے ہیں کہ اشتمالیت نہ سہی اشتمالیت پسند حضرات ۸ کروڑ ڈھائی لاکھ مربع میل کی وسعت میں جس کی آبادی ۱۹ کروڑ نفوس پر مشتمل ہے مکمل طور پر حاوی ہو گئے ہیں۔ روس بھی دوسرے مغربی سرمایہ دار ممالک کی طرح صنعتی دور سے گذر رہا ہے لیکن یہاں باگ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ ایسے مجنونانہ جوش عمل رکھنے والوں کے ہاتھ میں ہے جو ایک نئے مذہب کے پیروکار ہیں جس کو مسٹر جے۔ ایم کینس نے ۱۹۲۵ء میں لینیت کے مذہب کے نام سے یاد کیا تھا۔ اس نے اپنی کتاب "روس پر سرسری نظر" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ لینیت بھی دیگر مذاہب کی طرح اپنی طاقت و اقتدار کے لئے پُرجوش معتقدین کے ایک چھوٹے سے گروہ پر منحصر ہے اس بے روادار مگر پرجوش جماعت کا ہر فرد سینکڑوں بے پروا اور بے عمل لوگوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس مذہب کے ماننے والے بھی دوسرے مذاہب کے پیروکار کی طرح اپنے مخالفین کو بلا رحم و انصاف بری طرح اذیت دیتے ہیں۔ اس دین اشتراکیت کی بھی چند سالہ تاریخ مذہبی مظالم کی سنگین داستانوں سے خالی نہیں ہے۔

مسٹر کینز کو جو کہ برطانوی سرمایہ دار طبقہ کا متبحر ماہر اقتصادیات تھا اس نئے مذہب کی تصوراتی بنیادوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ وہ لکھتا ہے "میں ایک ایسے عقیدے کو کس طرح تسلیم کر سکتا ہوں جس کے ماتحت ایک متروک صحیفہ اقتصادیات کو تقدس اور وقعت میں انجیل کا درجہ دیا گیا ہو اور جس کتاب کو نقد و تبصرے بالاتر بتلایا گیا ہو جو کہ نہ صرف بہت حد تک غلط ہے بلکہ زمانہ حاضر کی دنیا میں غیر مفید اور ناقابل عمل بھی ہے۔ میں ایسے مسلک کو کس طرح اختیار کر سکتا ہوں جو کیچڑ کو مچھلی پر ترجیح دے اور جو جاہل اور غیر مہذب عوام الناس کو متوسط درجہ کے شہریوں اور ساہل الرائے پر فوقیت دے۔ اس متوسط طبقہ میں تمام نقائص اور خرابیوں کے باوجود زندگی کی خوبیاں اور انسانی نشوونما کے بیج پائے جاتے ہیں۔ غرضیکہ میرا خیال یہ ہے کہ اگر نئے مذہب کی ضرورت بھی ہو تو ان سرخ پوشوں کے کتب خانوں میں اس کی تلاش بے سود ہے۔"

اشتمالیت اور اشتراکیت میں امتیاز کرنا بڑا ہی مشکل کام ہے یہاں تک کہ لوگ ابھی تک یہ طے نہ کر سکے کہ روس کا تجربہ اشتمالیت پر مبنی تھا یا اشتراکیت پر۔ جو لوگ تغیر کلی پیدا کرنے میں عملاً مشغول ہیں وہ اس منزل سے

اور آگے نہیں جانا چاہتے جہاں تک کہ وہ اشتمالیت کے راستہ پر چل کر پہونچ چکے ہیں۔ سرمایہ دار نکتہ چین کہیا پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں کہ انھیں رہائش کے لئے بہتر مکان اور تھیٹر میں سب سے اچھی جگہ کیوں دی جاتی ہے اور سرمایہ داروں کے طریق کار کے مانند بے چارے مزدوروں کو زیادہ اجرت، انعام واکرام کا دلاسا دلا کر آن ملوں فیکٹریوں کانوں اور آلات ساز کارخانوں میں ضرورت سے زیادہ چیزیں کیوں بنوائی جاتی ہیں۔ ان اشتمالیوں پر ان اعتراضات کا کوئی اثر نہیں ہے۔ روما ایک دن میں تعمیر نہیں ہوا تھا اور اس طرح اشتمالی روس کی تعمیر کے لئے دوسرے زیادہ پنج سالہ اقتصادی پروگرام کی ضرورت پڑے گی۔

لینن نے ۱۹۱۸ء میں اپنی کتاب "ریاست اور انقلاب" میں لکھا ہے کہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کبھی بھی خاموشی اور پرسکون طریقہ سے ایک بڑی اور صحیح تر جمہوریت کی طرف ترقی نہیں کرسکتی۔ جیسا کہ اعتدال پسند ماہرین سیاست کم ظرف اور حقیر طبقہ متوسط سے تعلق رکھنے والے ابن الوقت کہا کرتے تھے۔ کسی ملک کے اس دور تغیر میں جبکہ اشتمالی نظام سرمایہ داری کی جگہ لے رہا ہے جمہوریت کی اس طور پر اصلاح کرنی چاہئے کہ وہ مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچا سکے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں پھر ایا دور لوٹ نہ آئے۔ مزدوروں کو ظالموں نا جائز فائدہ اٹھانے والوں اور سرمایہ داروں کے خلاف مسلح رہنا چاہئے"

<u>ریاست کا تدریجی انحطاط</u> لینن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ سرمایہ داروں کی مدافعانہ طاقتوں کے یکسر مٹا دینے سماج سے طبقاتی تفریق کو اٹھا دینے غرضکہ سرمایہ داروں کے وجود کو یکسر قلع قمع کر دینے کے بعد ہی حقیقی ریاست کی طرح ڈالی جا سکتی ہے۔ اسی وقت اور صرف اسی وقت آزادی پر گفتگو کرنا بھی کوئی معنی رکھتا ہے۔ صحیح اور مکمل جمہوری راج بھی صرف اسی وقت قائم ہو سکتا ہے شہنشاہیت خود بخود مٹ جائے گی کیونکہ انسانیت سرمایہ داری کے ناجائز منافعوں کی غلامی، ذہن میں نہ آنے والے انجانے تشددات، بربریت اور حماقتوں سے رہائی حاصل کر کے معاشری زندگی کے ابتدائی اور سادہ اصولوں پر غور کرنے کی عادی ہو جائے گی۔ اس وقت ساری تلاش اور جستجو کسی اوپری دباؤ یا خوف کی وجہ سے نہ ہوگی اور نہ جبر و ظلم کا کوئی آلہ ہوگا جس کو ریاست کہہ سکیں۔

اشتراکی سماج میں ـــــ پرولتاری آمریت جس کی ایک ضروری تمہید ہے ـــــ نہ طبقاتی تفریق ہوگی اور نہ ذاتی املاک رکھنے کا حق یا ذرائع پیداوار کا ذاتی انتظام۔ نہ نظام مقابلہ اور اقتصادی بے چینیاں

ہوں گی اور نہ تباہ کن اور غارت کرنے والی جنگیں۔ چند سربرآوردہ تجار کو مالا مال کرنے کے لئے وحشی قبائل سے ناجائز منافع حاصل کرنے کے سارے امکانات ختم ہو جائیں گے۔ صرف کماتے پیتے لوگ ہی تعلیمی سہولتیں نہ حاصل کر سکیں گے محنت ضرور ہوگی لیکن اس کے ثمرات کی تقسیم ایک خاص اصول کے ماتحت عمل میں آئے گی "ہر ایک سے بقدر استعداد اور ہر ایک کو بقدر ضرورت"

وہ معاشرتی نظام جس کا خاکہ ایک خاص نقطہ نظر کے مطابق ڈالا گیا ہے مروجہ سماج سے بہت مختلف ہے لیکن یہ صرف خیال پرستی ہی نہیں ہے جیسا کہ امرا کا خیال ہے اور جو اشتراکیوں کا محض اس لئے مذاق اڑاتے ہیں کہ وہ فرداً فرداً ہر شہری کو سماج کی طرف سے بغیر کسی ذاتی محنت کا خیال کئے ہوئے پیانو، موٹر اور آرائش کا دیگر سامان وغیرہ دینے کا وعدہ کرتے ہیں۔ بیشک اس کی کامیابیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اشتمالیت اپنے اعلیٰ اور بلند ترین منزل کو پہونچ چکی ہے لیکن ہنوز روس کا مسافر منزل کی پہلی سیڑھی پر ہے۔ سچ ہے کہ پیدا کرنے والی قوتیں ابھی اتنی زیادہ منظم اور ترقی یافتہ نہیں ہیں کہ ضرورت اور استعداد کے مذکورہ بالا اصول پر کاربند ہو کر لوگوں کو پورے طور پر ساز و سامان بہم پہونچایا جائے۔ اسی لئے مختلف اور جبری قوانین کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔ شہر اور دیہات کے تنازعات ابھی تک حل نہیں ہوئے ہیں اور حقیقی مساوات و اخوت کی منزل ابھی تک گم ہے۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل کا منشور جو ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا خود گویا ہے کہ کوئی بھی ایسی سماجی قوت نہیں ہے جو پرانی سماج کی بچی بچائی یادگاروں کی حفاظت کرتی ہو۔ چونکہ وہ پیدا کرنے والی قوتوں کے ایک خاص درجہ ارتقاء کی پیداوار ہے۔ اس لئے وہ اتنی جلد معدوم ہو جائیں گی جتنی جلد انسانیت سرمایہ دارانہ نظام کی زنجیروں سے چھوٹ کر قدرت کی قوتوں پر حاوی ہو جائے گی اور جتنی جلد انسانیت اشتراکیت کے راستہ سے گذر اشتمالیت کی وادی میں پہونچ جائے گی جس شخص نے ۱۸۴۸ء کے اشتمالی منشور اور کارل مارکس کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے۔ اسے اس میں اور آج کل کے اشتمالی بیانات میں خیالات، جذبات اور زبان کی موزونیت اور یکسانیت ملے گی۔ مسٹر کینز کا خیال ہے ـــــــ "سرمایہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک متروک اقتصادی درسی کتاب ہے مگر اس کا متروک ہونا اس کے مقبولیت کے راستہ میں کسی طور پر حائل نہیں ہو سکتا۔ اس کے مقابلہ میں کوئی ایسی نئی کتاب نہیں پیش کی جا سکتی جس نے اول الذکر

سے زیادہ اثر کیا یا اثر کرتی ہو۔ اسی لئے لینن، اسٹالن اور اس کے ہم خیال ساتھی مارکسی خیالات کی حرف بہ حرف تقلید پر زور دیتے ہیں۔ گلیڈسٹن نے جو کچھ سنہ ۱۸۶۰ء یا سنہ ۱۸۸۰ء میں اعلان کیا تھا اس کی اب کوئی وقعت اور اہمیت باقی نہیں ہے لیکن مارکس نے سنہ ۱۸۶۰ء میں جو کچھ لکھا تھا وہ اب بھی کروڑوں انسانوں کے لئے بہت اہم ہے۔

بایں ہمہ یہ امر مسلم ہے کہ حالات کے تغیر کے ساتھ ساتھ کسی مصلح کے ارشادات میں اگر ترمیم نہیں تو کم از کم اضافہ کرتے رہنا لازم ہو جاتا ہے لیکن اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے لینن کے نظریہ اشتراکیت کے متعلق چند جملے لکھ دینا غیر موزوں نہ ہوگا۔

شہنشاہیت کے متعلق لینن کے خیالات | مارکس کے انتقال کے وقت مغربی دنیا کی عظیم طاقتیں اپنے سامراجی مقبوضات کو وسیع کرنے کے لئے کمر بستہ رہی تھیں میں ہی برس کے اندر صنعتی سرمایہ داری کے عہد اور مالیاتی سرمایہ داری کے عہد میں آسانی سے تفریق کی جا سکتی ہے۔ مالیاتی سرمایہ داری ایک ایسا نظام ہے جس میں آزاد مقابلہ کا امکان بالکل جاتا رہتا ہے تجارت پر اجارہ ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں سرمایہ کی برآمد اس پر سود کی مانگ، کارگاہوں کی تعداد میں اضافہ اور ان اشیاء کی فروخت کے لئے جن کی اپنے ملک میں کوئی مانگ نہیں تھی، منڈیوں کی ضرورت۔ یہ سب چیزیں باہم مل کر کمزور اور کم ترقی یافتہ ممالک کو سرمایہ دارانہ طاقتوں کا شکار بنا دیتی ہیں۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں اجارہ داری کی یہ صورت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ لینن نے جنگ عظیم کو سامراجی جنگ قرار دے دیا۔ یہ سوچنا قطعاً غلط ہے کہ اس وقت اگر کوئی مدبر سیاست داں یا ایک بہتر منظم اشتراکی جماعت موجود ہوتی تو یہ جنگ یا تو ملتوی ہو جاتی یا ہمیشہ کے لئے رک جاتی لینن نے اس توہم کو قطعاً باطل خیال کیا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ یہ جنگ برسوں کے اقتصادی نظام کے فاسد مادہ کا نتیجہ ہے جو پھوڑا بن کر اس شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ لینن نے اپنی کتاب "شہنشاہیت۔ سرمایہ داری کی بلند ترین منزل" میں لکھا ہے کہ "شہنشاہیت" سرمایہ داری کی اس منزل کا نام ہے جبکہ تجارت اور کاروبار میں اجارہ داری کو دخل حاصل ہو جاتا ہے۔ پیداوار اور اشیاء کی جو بھی مقدار بازار میں موجود ہوتی ہے یہ سب اجارہ داری کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔

اس طرح انسانوں کی اقتصادی نیز سیاسی تقدیر چند ساہوکاروں کے رحم و کرم پر مبنی ہوتی ہے چند سرمایہ دار طاقتیں ساری دنیا کی منڈیوں کو اپنے نفع کے لئے آپس میں تقسیم کر لیتی ہیں۔ مارکس نے بتلایا تھا کہ اس زمانہ کی صنعتی سرمایہ داری کو فنا کرنے کے لئے خود بخود ایک انقلاب برپا ہوگا جو مزدوروں کی آمریت کا دروازہ کھول دے گا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اشتمالیت ساری دنیا میں پھیل جائے گی۔

ابھی تک تو ہم نے صرف روس میں اشتراکیت کے نظریہ و عمل کے ارتقاء پر بحث کی ہے ۱۹۱۷ء میں یہ ایک عام خیال تھا خصوصاً لینن، ٹراٹسکی اور اس کے معاون سرداروں کا کہ اشتراکیت سرمایہ داری کی دنیا میں نہیں پھیل سکتی۔ وہ کہتے تھے کہ انقلاب اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب عالمگیر ہو لیکن زار کی حکومت کے بیس برس بعد بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اشتراکیت صرف ایک ہی ملک میں پھیل سکی گرچہ وہ خطہ رقبہ آبادی اور ذرائع پیداوار کی دولت کے لحاظ سے عظیم ترین ہے۔ بہت سے دوسرے ملکوں میں بھی شورشیں ہوئی ہیں یا کم سے کم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہت سے مقامات میں اشتراکی حکومتیں بھی قائم ہوئی ہیں۔ مگر وہاں لوگ آخر وقت تک صلح و آشتی کا دامن پکڑے رہے۔ اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ سوویٹ کی تقلید اور مارکسٹ کی پرستش کا خیال ابھی تک عالمگیر نہیں ہوا ہے

ایک نیا مدمقابل اس کے برعکس اشتراکیت کے مقابل میں ایک نیا دشمن کھڑا ہو گیا ہے جو واقعی اشتراکیت کی موجودگی کے بغیر وجود میں نہ آتا۔ یہ تحریک اٹلی سے اٹھی اس کی اہمیت اس لئے اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ ایک ایسے دماغ کی پیداوار ہے جو برسوں تک خود اشتراکیت کے بائیں بازو کا پرجوش رکن رہا ہے یعنی مسولینی جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ جنگ عظیم کے زمانہ میں اٹلی کے شریک جنگ ہونے کے مسئلہ پر اطالوی اشتراکی جماعت سے بیزار ہو کر علیحدہ ہو گیا اور صلح کے بعد بھی اختلافات کی خلیج ہموار نہ کی جا سکی گویا اس طرح مارچ ۱۹۱۹ء میں ایک لوہار کے لڑکے نے فاشستی جماعت کی طرح ڈالی جو کہ یقینی ایک ترقی پذیر سیاسی اور معاشری اصلاح کی حامل تھی۔ اس زمانہ میں اشتراکیت کی پرجوش تبلیغ کی جا رہی تھی۔ اطالوی بالشویکیوں نے بھی روس کے نقش قدم پر چل کر کسانوں کی بغاوت اور مزدوروں کی ہڑتال کا بڑے پیمانہ پر چلن کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں نے بہت سی ملوں اور فیکٹریوں پر قبضہ کر لیا لیکن وہاں ٹراٹسکی ایسی کوئی شخصیت نہ تھی جو اس تحریک کو چلاتی وہاں صرف مسولینی ہی ایک ایک

ممتاز شخصیت تھی لیکن اطالوی اشتراکی اپنے اختلاف کی وجہ سے اسے اپنا لیڈر نہ بنا سکے۔ پس انقلاب کے لئے ان کی ساری جدوجہد منت کش تعبیر نہ ہوئی بلکہ انھوں نے اپنا وقار بھی کھو دیا۔ طرں سے ان کے اخراج نے سماجی جمہوریت پسندوں کی کمزوری کو نمایاں کر دیا اور آپس کی خوفناک رقابت میں کامیابی کا سہرا فاشتی جماعت کے سر رہا۔ پرانے سپاہی اور نیچے درمیانی طبقہ کے لوگ مسولینی کے جھنڈے کے نیچے گروہ در گروہ جمع ہو گئے۔ آخر کار اشتراکی اور فاشتی طاقتیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ خانہ جنگی کی ابتدا ہوئی اور اطالیہ کی سڑکیں اور گلیاں خون کے چھینٹوں سے لالہ زار ہو گئیں۔

فاشیت اور اشتمالیت | اس دور کش مکش میں فاشیت کے نظریے اور اس کے طریق کار بھی ترقی کرتے رہے بین الاقوامی اشتراکیت کے عقیدے پھٹے پرانے کپڑوں کی طرح اتار دئے گئے۔ مگر اس کی جگہ مرمع قومیت اور ایک ایسے ریاست کے تخیل نے لی جو تمام چیزوں پر قادر ہو۔ اور جو ملک کے گوشہ گوشہ میں جاری اور ساری ہو جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کا احاطہ کرے فاشیت اور اشتراکیت میں کچھ وجوہ مماثلت بھی پائی جاتی ہیں۔ دونوں جگہ حکومت کی باگ ایک ہی جماعت کے ہاتھ میں ہے اور صرف ایک ہی آدمی حکومت کرتا ہے۔ چاہے روس میں وہ اسٹالن ہو یا اٹلی میں وہ مسولینی۔ دونوں جگہ پارلیمنٹی جمہوریت مفقود ہے اور جمہوریت کے پیچھے ریاست مطلق کا عقیدہ کارفرما ہے

جب ہم مقاصد کو معرض بحث میں لاتے ہیں تب کہیں جا کر پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں نظام قطعاً ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ ایک اشتراکی اپنے نقطہ نظر کے مطابق غیر طبقاتی سماج کو پسند کرے گا جس میں ریاست کو زیادہ اہمیت نہیں دی جائے گی۔ ملک کا تخیل اور اس کے تمام لزومات انسانوں کی بین الاقوامی برادری کے عقیدہ پر قربان کر دئے جائیں گے۔ فاشیت کے حامیوں کا یہ خیال ہے کہ اصلی تہذیب بغیر نظام کے نہیں پیدا ہو سکتی اور نظام بغیر حکومیت کامل کے بہتر طور پر نہیں چل سکتا۔ وہ ضابطہ اور قواعد کو آزادی۔ وطنیت کو بین الاقوامیت اور آمریت کو جمہوریت پر ترجیح دیتے ہیں۔ دونوں تحریکیں ایک قلیل مدت میں بہت زیادہ ترقی کر گئی ہیں — ایسی دو تحریکیں جو ابتدا میں ایک ہی تھیں۔ دونوں شخصیتیں برٹش میوزیم کے دار المطالعہ کے گوشوں میں بیٹھ کر مارکس کی تصنیفات سے خوشہ چینی کرتی رہی ہیں۔ ایک جنبش کا فاتح ہوا اور دوسرے نے

روس کو از سرِ نو تعمیر کیا۔

اگر اشتراکیت پسند حضرات کی نالائقی ایک طرف فاشیت کی افزائش کا سبب ہوئی تو دوسری طرف نازیت کو اپنے مدمقابل کھڑا کر لینے کی کچھ کم ذمہ دار نہیں ہے۔ قیصر کی فراری کے بعد ایبرٹ (جو دراصل ایک زین ساز تھا) نے اعصار حکومت اپنے ہاتھ میں لئے یہ سوشلسٹ بھی تھا۔ چنانچہ اشتراکی جمہوریت کے علمبردار ریخ پر مکمل طور پر حاوی ہو گئے۔ کارل لیکنکٹ اور روزلگزمبرگ نے بغاوتیں کیں مگر ان کو بری طرح پسپا کر دیا گیا اور آخر میں پولیس نے انھیں گولیوں سے ختم کر دیا۔ ویریا کی ایک اشتراکی جمہوریت بھی اسی بے رحمی کے ساتھ ختم کر دی گئی۔

یہ جماعت ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک اکثریت میں رہی اور کئی دفعہ برسرِ اقتدار ہوئی۔ اور اس کا اثر اس وقت زائل ہوا جب ۱۹۳۳ء میں ہٹلر نے طاقت حاصل کرتے ہی پارلیمنٹری طرزِ حکومت اور ویمر کے دستور اساسی کو پاش پاش کر دیا۔ اُن کی اعتدال پسندی ہی اُن کے زوال کا باعث ہوئی لیکن ان کے خلاف ابتدا ہی سے کچھ جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ایک اشتمالی جماعت روس کی رہنمائی میں ان کے خلاف کام کر رہی تھی۔ لوگ صلحنامہ ورسائی کی ساری ہتک اور بے عزتی انھیں کے سر تھوپ رہے تھے۔ گرچہ حقیقتاً وہ لوگ اس صلحنامہ کی ندامتوں کے کسی طور پر ذمہ دار نہیں تھے۔ اشتمالی کش مکش اور اعتدال پسندوں کی دشمنی اور مرکز کی مخالفت میں جب قومی اشتراکیوں (جو کہ وطن پرست سچ مچ تھے اور اشتراکی محض نام کے) کا اضافہ ہو گیا تو اول الذکر جماعت کا زوال بھی لازم ہو گیا اگرچہ یہ تدریجی طور پر ہوا۔

آج فاشیت اور اشتراکیت یورپ کی سرزمین میں نظر آ رہے ہیں۔ اب سماجی و اقتصادی و سیاسی تبدیلی چاہنے والے رسماً اشتراکی جماعت میں داخل نہیں ہوتے۔ فاشتی حضرات بھی لوگوں کو تبدیلیوں کا سبز باغ دکھاتے ہیں لیکن صرف وہ تبدیلیاں جن میں وطنیت کا عنصر شامل ہو۔ ابھی بیس برس پہلے نوجوانوں میں سرخ رنگ بہت مرغوب تھا مگر اب وہ بادامی یا سیاہ رنگ کی قمیص کو (جو فاشتی اور نازی جماعت کا نشان امتیاز ہے) بہت پسند کر رہے ہیں۔ سڈنی ویب جو کہ برطانوی اشتراکیت کا قابل ترین مفسر ہے لکھتا ہے کہ "صرف فیبین اشتراکیت (جس کا وہ مخصوص طور پر علمبردار ہے) ہی کامیاب ہو سکتی ہے۔ فیبین اشتراکیت بالفاظ دیگر اُس عقیدہ کا نام ہے کہ ذرائع پیداوار کا ہر شعبہ تدریجی طور پر حکومت کے زیرِ اقتدار ضرور بالضرور آ جائے گا۔

سوشلسٹ اور کمیونسٹ حکومت کی تدریجی اقتدار پر یقین رکھتے ہیں۔ مگر لفظ ضرور یا بالضرور کی مخالفت کرتے ہیں۔ اکثریت کی فتح جمہوری ملکوں میں اتنی ہی دور ہے جتنا کہ وہ ایام جبکہ قومیت پر بحث ہوتی تھی۔ جبکہ اسے پبلک بورڈ، انجمن امداد باہمی، اور اسی قسم کی انجمنوں کے ذریعہ ذاتی ملکیت اور دولت کی فراہمی کا پُرامن آلہ سمجھا جاتا تھا۔

دو انٹرنیشنل میں رقابت | فاشیت اشتراکیت کے مستقبل کی ترقی میں ایک زبردست رکاوٹ ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خوف کے مارے ہر اشتراکی خواہ وہ کسی بازو یا طبقہ سے تعلق رکھتا ہو متحد ہو کر اس مشترک دشمن کے خلاف محاذ قائم کرنا چاہتا ہے۔ بالشویک حضرات کا خیال تھا کہ ۱۹۱۷ء میں جو شورش برپا ہوئی تھی وہ ایک عالمگیر انقلاب کی نقیب ہو گی اسی لئے ۱۹۱۹ء میں ایک نئے انٹرنیشنل کی بنیاد ڈالی گئی۔ جس کا مرکز ماسکو تھا جس کو تیسرے یا انتہائی انٹرنیشنل کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ انقلابی تحریکات کی ہر ملک میں تبلیغ کی جائے۔ یہاں تک کہ ان ممالک کو بھی اس کے دائرہ عمل میں داخل کر لیا جائے جہاں پہلے سے اشتراکیت کی تحریکات مزدوروں میں چل رہی تھیں اور جو دوسرے انٹرنیشنل سے ملحق بھی تھے۔ یہ دونوں انٹرنیشنل مدتوں تک قائم رہے اور ان میں سے ہر ایک اشتراکیوں کی مدد کا متلاشی تھا اس طرح وہ اپنی بہت زیادہ طاقت بجائے قومی تحریکات کے چلانے میں صرف کرنے کے آپس کی سازشوں اور فضول بکواس میں خرچ کرتے رہے۔ یہ دونوں ہنوز علیحدہ علیحدہ وجود رکھتے ہیں لیکن ہٹلر کے میدان میں کود پڑنے کے بعد سے آپس کی دشمنی مدہم ہونے کے ساتھ ساتھ محو ہوتی جا رہی ہے۔ اب ماسکو سے جمہوری ملکوں کے اشتراکیوں اور سرمایہ داروں کے خلاف بدعتی ہونے کا فتویٰ نہیں صادر ہوتا اس کے برعکس اسٹالن کی طرف سے ہدایتیں شائع ہوتی ہیں کہ انتہائی پروپگنڈے میں نرم بیانی سے کام لیا جائے۔

۱۹۳۶ء کے فرانس میں انتہائی و اشتراکی و نیز ریڈیکل جماعتیں متحد ہو کر برسر اقتدار آگئیں تھیں اس وقت مرسیو بلوم کی زیر قیادت یہ جماعتیں کام کر رہی تھیں۔ اسپین میں بھی اشتراکی جماعتیں ۱۹۳۶ء میں فاشستی اتحادیوں سے عرصہ تک مصروف پیکار رہیں۔ مگر آخر میں اس کی محکوم ہو گئیں۔ جرمنی، آسٹریا، اٹلی میں یہ تحریک جبراً دبا دی گئی۔ اس کے قائدین یا تو جلاوطن کر دئے گئے یا جیل خانوں میں ٹھونس دئے

گئے۔ اور اشاعت بھی سختی سے ممنوع قرار دے دی گئی۔ گرچہ فرانس میں اشتراکی جماعت بہت زیادہ طاقتور تھی۔ مگر پھر بھی اسے اپنے مخالفین کے مقابلے میں اکثریت حاصل نہ ہوئی۔ یہی جملہ انگلستان کے لئے بھی موزوں تھا۔ ۱۹۲۴ء و ۱۹۲۹ء میں مزدوروں کی جماعت کو دو مرتبہ وزارت سپرد کی گئی مگر دونوں وزارتوں کا دور ملا کر تین سال سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس عہد میں وہاں کے قانون سازی کے نتائج بھی بہت افسوسناک رہے ہیں۔ دوسرے جمہوری ممالک مثلاً بلجیم، ہالینڈ۔ ڈنمارک۔ سوئیڈن، ناروے آسٹریا میں بھی اشتراکی جماعتوں کو اکثر و بیشتر انتخاب میں فتح ہوئی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بھی اس جماعت نے بہت آگے تک قدم جمالیا ہے اور جنوبی امریکہ میں اس کی مختلف پارٹیاں موجود ہیں۔

ابھی تک اشتراکیت کی کہیں فتح ہوئی ہے تو کہیں شکست۔ کہیں اشتراکی قوانین نافذ کئے گئے ہیں اور کہیں ان کی ساری محنت جھگڑا فساد اور معمولی معمولی باتوں میں صرف ہوتی رہی ہے۔ ان ناموافق عناصر کو پیش نظر رکھ کر اشتراکیت کے مستقبل پر صحیح خیال آرائی کرنے کے لئے دقیق النظری اور دوربینی کی سخت ضرورت ہے جن کے لئے دمن اور دولت ایک خوش آئند خواب ہے اور جو رزق کی کش مکش میں بری طرح پسپا کردئے گئے ہیں ان کے لئے اشتراکی جدوجہد بہت ہی حسین اور خوشنما ہے لیکن جو دولتمند ہیں انھیں اس کش مکش میں کوئی دلچسپی نہیں۔ لوگ محسوس بھی کرتے ہوں گے کہ فاشیت کے وجود میں آجانے کی وجہ سے اشتراکیت کا مستقبل اس قدر پیچیدہ اور مبہم ہوگیا ہے کہ اس کے متعلق کوئی پیشین گوئی بھی نہیں کی جاسکتی۔

مترجمہ ملک حامد حسین صاحب
متعلم مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

نئی تعلیم کا نفسیاتی اثر

جن مدرسوں میں حرفوں کے ذریعہ تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ وہاں کے بچوں میں خاص زندگی اور رجحان نظر آتی ہے۔ بچے تعلیم میں خوشی اور شوق سے حصہ لیتے ہیں۔ بچوں کو ایک دوسرے پر کام کرنے کے بجائے نئے نئے طریقوں اور منصوبوں کے ذریعہ کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ اپنے استادوں سے بہت زیادہ مانوس ہوجاتے ہیں اور ان کو اپنا ہمدرد اور مربی سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ سیکھتے ہیں۔ بچوں کے شوق اور دلچسپی کی وجہ سے استاد بھی بچوں کو بڑی شفقت اور مہربانی سے کام کرانے لگتا ہے وہ مدرسہ کے بعد بھی اپنی مرضی سے اپنا بیش قیمت وقت ان کی تعلیم و تربیت پر صرف کرتا ہے حرفوں کے ذریعہ تعلیم دینے میں دونوں کا شوق اور دلچسپی برابر بڑھتی جاتی ہے۔ دونوں چیان بین میں مصروف رہتے ہیں۔ اور نئی نئی باتیں اس طرح معلوم کرتے رہتے ہیں۔ کتابی تعلیم کے برخلاف جہاں صرف دوسروں کا تجربہ بار بار پڑھتے پڑھتے استاد اور شاگرد دونوں کو کوئی لطف نہیں آتا وہاں حرفہ کی تعلیم میں نت نئی باتیں معلوم ہونے سے دونوں توجہ اور انہماک سے کام کرتے ہیں یہاں تک تعلیم بامقصد ہوجاتی ہے۔

حرفوں کے ذریعہ تعلیم دینے میں نہ صرف حصول علم کا شوق بڑھ جاتا ہے بلکہ بچوں کے اخلاق و عادات کی تربیت بھی بہتر طریقہ پر ہونے لگتی ہے۔ بچے مل کر کام کرنے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں بغیر اس طریقہ کے یہ اندازہ کرنا ہی مشکل ہے کہ بچے آپس میں مل کر کام کرتے ہیں یا نہیں۔ جب کام تقسیم ہوتا ہے تو دو ایک بچے ایسے ہوتے ہیں جو دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنا پسند نہیں کرتے۔ ممکن ہے یہ صورت اسی وجہ سے پیدا ہوئی ہو کہ دوسرا ساتھی اس کام میں نکما ہو لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں میں کسی بات پر آن بن ہوگئی ہو۔ عموماً دو بہترین کام کرنے والوں میں یہ کشمکش پیدا ہوجاتی ہے لہذا استاد اس بات کا علم ہوتے ہی مل کر کام کرنے کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ یہ بہت معمولی بات ہے لیکن یہ بات آگے چل کر بہت بڑی خوبی بن سکتی ہے۔ ملک کے دو بہترین دماغ رکھنے والے اور بہترین کام کرنے والے جب مل کر کام کرتے ہیں تو کام میں بہت ترقی نظر آتی ہے۔ ہمارے مدرسہ میں

بچے اس بات کو اچھی طرح سمجھتے اور برتتے ہیں چنانچہ ایک لڑکا لکھتا ہے۔

"حرفہ کے کام میں میل جول اور بھائی چارہ پیدا ہوتا ہے یعنی جب ایک جگہ بیٹھ کر کام کرتے ہیں تو ذرا قینچی دینا یہ گتا کاٹنا ہے، تمہارا چاقو لے رہا ہوں، اپنی پیالی میں سے ذرا سی لئی ہمیں بھی دینا بھئی تمہیں ریگمال تو نہیں چاہئے، تمہارے بورڈ پر ہم بھی کام کئے لیتے ہیں۔ آپس کے اس لین دین، گفتگو اور پاس بیٹھنے سے میل جول پیدا ہوتا ہے۔ امیر، غریب، چھوٹے بڑے سب کا فرق مٹ جاتا ہے" (سلطان احمد ابتدائی پنجم عمر ۱۲ سال)

ایسے مدرسوں میں جہاں تمام بچے شہر سے آتے ہوں مدرسہ اور بچے کا لگاؤ بہت تھوڑے عرصہ کے لئے ہوتا ہے۔ ان کا زیادہ وقت مدرسہ سے باہر اپنے گھر پر گذرتا ہے۔ وہاں ان کے لئے اگر کچھ کام نہ ہو تو ان میں کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں مثلاً وہ بیکار وقت ضائع کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ وہ گھر میں اپنے سے چھوٹے بھائی بہن کو پریشان کرنے لگتے ہیں۔ محلے کے لڑکوں کے ساتھ وہ نامناسب کھیل کھیلنے لگتے ہیں یعنی ان کی زندگی بے نظام ہو جاتی ہے۔ حرفوں کے ذریعہ تعلیم کا انتظام کرنے سے بچے نہ صرف مدرسہ کے بعد چھٹیوں میں بھی مدرسہ میں کام کرنے آتے ہیں بلکہ وہ اپنے گھروں میں بھی حرفہ کا کام کیا کرتے ہیں اور تھوڑا سامان جمع کرکے اس میں اپنے آپ کو مشغول رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک لڑکا لکھتا ہے

"جب ہم اس کام کے کرنے کے لئے بیٹھتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ بس اسے ہی کرتے رہیں جب کوئی چیز بنالیتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں اور اگر کوئی تعریف کردے تو اتنے خوش ہوتے ہیں جیسے کوئی قلعہ فتح کرلیا ہو۔ ہم نے گھر پر بھی بہت سی چیزیں بنائی ہیں، انشاء اللہ اور بہت سی بنائیں گے۔" (عبدالحامد ابتدائی چہارم عمر ۱۰ سال)

ایک دوسرا طالب علم لکھتا ہے

"مجھے حرفہ تمام کاموں سے اچھا لگتا ہے اور خالی وقت میں میرا جی چاہتا ہے کہ میں حرفہ کا کام کروں۔ خالی وقت میں جب میں کوئی فضول کام کرتا ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس وقت یہ کام کرنے کی بجائے حرفہ کا کام کر رہا ہوتا تو کیا اچھا ہوتا۔" (محمد علی ابتدائی پنجم عمر دس سال)

اس طرح کام کرانے کے دوران میں ایک اور تجربہ ہو رہا ہے یعنی بچے بہت دیر تک کام کرنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ اکثر بچے بڑی مستقل مزاجی سے کام کرتے رہتے ہیں اور جب تک کام ختم نہیں ہو جاتا اس میں لگے رہتے ہیں۔ نئی تعلیم کی یہ خوبی بھی بہت اہم ہے۔ ہمارے ہونہار بچوں میں اگر مستقل مزاجی اور جم کر کام کرنے کی عادت پیدا ہو جائے تو بہت بڑی بات ہے اس لئے کہ کام کا شروع کر دینا بہت آسان ہے لیکن اس کو تکمیل تک پہونچانا بہت مشکل۔ حرفہ کے ذریعہ اس خوبی کے پیدا ہونے کا امکان خود بخود ہوتا جا رہا ہے بچے کام کو پورا کئے بغیر اٹھنا ہی نہیں چاہتے ہیں چنانچہ ایک طالب علم یہ لکھتا ہے :-

"لکھتے لکھتے پڑھتے پڑھتے جی اکتا جاتا ہے لیکن کارڈبورڈ کا کام ایسا نہیں ہے۔ اسے صبح سے لے کر شام تک کئے جاؤ لیکن کچھ نہیں جی گھبراتا ہی نہیں اس کے علاوہ اس کام سے ہمارے ہاتھوں میں صفائی بھی آتی ہے" (محمد سلطان ابتدائی چہارم عمر ۹ سال)

بچوں میں سوچنے اور غور کرنے کی عادت بھی پیدا ہو رہی ہے۔ وہ مختلف کاموں کے متعلق اپنی تجویزیں پیش کرتے ہیں۔ اور ان تجویزوں کے متعلق دلیلیں بھی دیتے ہیں۔ وہ اپنی بات کو اس قدر وزنی خیال کرتے ہیں کہ بغیر کافی وجہ کے اس سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ اپنی تجویزوں کے لئے دوسروں کو ہم خیال بھی بنا لیتے ہیں۔

حرفہ کراتے وقت بچوں میں بڑی آمادگی نظر آتی ہے۔ اچھا استاد اس آمادگی اور تیاری سے بہت زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ایسے موقع پر بچے حرفہ کے کام کے متعلق ہر ہدایت سننے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ وہ ڈرائنگ بنانے اس کے متعلق کسی کتاب پڑھنے اور مضمون لکھنے کیلئے سو فی صدی تیار نظر آتے ہیں اچھے استاد کی رہنمائی میں بچے تعلیم میں خاطر خواہ آگے بڑھتے ہیں کسی بات کا مطالعہ ان کے لئے بار نہیں ہوتا اگر کسی رسالہ یا کتاب میں ان کو کوئی بات مل جاتی ہے تو خود بخود بڑے شوق سے پڑھتے ہیں اور استاد کو بھی بتلاتے ہیں۔ ان میں مطالعہ کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔

بچوں میں صفائی اور چیزوں کو قرینے سے رکھنے کا خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر طالب علم رومال رکھنے کا عادی ہو جاتا ہے اور کام کرنے کے بعد ہاتھ منھ دھو کر رومال سے صاف کرتا ہے چیزوں کو ان کی مقررہ جگہ پر

رکھنے کا سلیقہ ساتھ ساتھ پیدا ہو جاتا ہے۔اور گھر جا کر بچے اپنی چیزوں کو ادھر اُدھر نہیں ڈالتے بلکہ قرینے سے رکھتے ہیں تب بچے خود اپنے ہاتھوں سے کمروں میں جھاڑو دیتے ہیں۔باغیچہ سے کنکر پتھر اور پتے وغیرہ اٹھا کر خود ہی باہر پھینکتے ہیں تاباغیچہ کے صاف ستھرا رکھنے کی ذمہ داری انہیں پر ہوتی ہے عجب ترمیت ہے کہ جو بچے اپنے مکان پر تمام کام اپنے ملازم سے لیتے ہیں مدرسہ میں ان تمام کاموں کو خود کرنے میں ذرا پس وپیش نہیں کرتے۔

حرفوں کے ذریعہ تعلیم میں بہت سی خوبیاں مضمر ہیں لیکن یہ سب کچھ اچھے استاد پر منحصر ہے نہ صرف اچھے استاد پر بلکہ اچھے استاد کی لگاتار محنت اور کوشش پر یہ ہو سکتا ہے کہ استاد بہت اچھا ہو لیکن محنت اور دل لگا کر کام نہ کرتا ہو۔ایسے استاد کے کام کا نتیجہ یقیناً ان خوبیوں پر مشتمل نہ ہوگا جو حرفوں کے ذریعہ تعلیم میں پائی جاتی ہیں۔ایسی صورت میں خوبیوں کی جگہ خرابیاں پیدا ہونے لگتی ہیں اور ایسے برے نتائج ظہور میں آسکتے ہیں۔جو اس تعلیم کی خوبیوں کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔

عملی کام میں خواہ بچوں کو تکلی سکھائی جا رہی ہو خواہ باغبانی کرا رہے ہوں خواہ کارڈ بورڈ سے چیزیں بنوا رہے ہوں ہر بچہ کے لئے کام کا مہیا ہونا نہایت ضروری ہے۔نہ صرف یہ کہ ہر بچہ کے لئے کام کا مہیا ہونا ضروری ہے بلکہ ہر بچہ کی حسب ضرورت اس کے کام میں مدد بھی کی جا رہی ہو۔اگر استاد ایک دو طالب علموں پر توجہ دیگا تو دوسرے طلبا اپنے کام سے بد دل ہو جائینگے اور کام کو بہت خراب طریقہ پر کرینگے اور مجوزہ خوبیاں حاصل نہ ہو سکیں گی۔

ابتدائی جماعتوں میں اس صورت حال پر قابو پانا بہت مشکل ہوتا ہے اور بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس لئے کہ ہر بچہ کام سے ناواقف ہوتا ہے اور جب استاد مجوزہ حرفہ سکھانا چاہتا ہے تو ہر بچہ سیکھنے کے لئے بیتاب ہوتا ہے۔اب اگر اس وقت ایسی صورت اختیار نہ کی جائے جس سے تمام بچوں کی تشفی ہو سکے تو جماعت میں بڑی گڑبڑی پیدا ہو جاتی ہے اور استاد کہہ اٹھتا ہے کہ حرفہ کے ذریعہ تعلیم کا ہونا بالکل ناممکن ہے لیکن آپ دو باتوں پر غور فرمائیں۔بچوں کو حرفہ کس طرح سکھایا جائے؟ حرفہ کے کام میں بچوں کی کس حد تک نگرانی کی جائے؟ ان دو باتوں پر غور کرنے سے آپ سہولت سے تمام دشواریوں کا حل معلوم کر سکیں گے۔

سید احمد علی صاحب۔

مسئلہ تعلیم اور والدین

میرا خیال ہے کہ بچوں کی تعلیم کا فرض صرف اور صرف درسگاہوں ہی پر عائد نہیں ہوتا بلکہ اس اہم فرض کا وافر حصہ والدین سے بھی وابستہ ہے۔ یوں سمجھئے کہ درسگاہ کے معلم اور طلبا کے والدین جب تک دوش بدوش کام کرنے کے لئے اپنے اپنے فرائض کی اہمیت کا احساس نہ کریں گے۔ اس وقت تک بچوں کی صحیح معنوں میں تعلیم کا مقصد مکمل حاصل نہیں ہو سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ والدین درسگاہوں کے نظم و نسق میں زیادہ سے زیادہ دخل کی اہلیت و لیاقت رکھتے ہیں لیکن بات ذرا غور طلب ہے کہ باوجود اس اہلیت اور لیاقت کے وہ اپنے بچوں کی تعلیم میں کہاں تک دلچسپی لیتے ہیں اور "چراغ تلے اندھیرا" کی مثل کا ان پر کہاں تک صحیح اطلاق ہوتا ہے۔ شاید میرا اندازہ مبالغہ پر مبنی نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ ۹۹ فی صدی والدین اپنے بچوں کی تعلیم میں کما حقہ دلچسپی نہیں لیتے اور وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے مشکل ترین فرض کی تکمیل کی صرف اور صرف درسگاہوں سے ہی توقع رکھتے ہیں۔ بہت کم والدین ایسے ملیں گے جو اس بات کو محسوس کرتے ہوں گے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے باب میں ہماری دلچسپی بھی کتنی اہم اور لازمی ہے اور ہماری توجہ کسی درسگاہ کے فرائض کو بہ حسن و خوبی انجام دینے میں کتنی اہمیت رکھتی ہے

والدین چاہے وہ جاہل ہوں یا تعلیم یافتہ، وہ اعلیٰ عہدوں پر ممتاز ہوں یا کاروبار سے وابستہ اگر ان میں اس بات کا احساس نہیں ہے کہ وہ بھی اپنے بچوں کی تعلیم میں اسی توجہ اور دلچسپی کے ذمہ دار ہیں جتنا کہ کسی درسگاہ کے معلم تو پھر مجھے کہنے دیجئے کہ ان حضرات سے زیادہ بد احساس اور نا فرض شناس اور کوئی نہ ہوگا۔ بچہ کی پیدائش کے بعد سے والدین عجیب و غریب اور ایک نئی فکر کو جس طور سے محسوس کرنے لگتے ہیں اُسے آپ ان کی زندگی کا سب سے پہلا تجربہ کہئے تو بے جا نہ ہوگا۔ پھر اس بچہ کی پرورش اور کچھ عرصہ کے بعد اس کو کسی کام یا کسی درسگاہ کی جانب رجوع کرنے کی فکر ان احساسات سے بھی والدین کو فطرتی لگاؤ ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ صورت حالات میں اختلاف کی بنا پر والدین کی فکریں بھی

مختلف ہوں ظاہر ہے کہ مزدور اور جاہل والدین اپنے بچوں کی پرورش اور ان کے مستقبل سے متعلق اس طرح نہیں سوچ سکتے جس طرح کہ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدوں پر ممتاز والدین لیکن جہاں تک والدین کی فکر کا تعلق ہے اس احساس سے ہر فرد بشر کا دو چار ہونا فطری ہے۔ دراصل بچوں کی زندگی کا یہی ابتدائی دوران کی زندگی کا اہم ترین دور ہوتا ہے اور اس کا تمام تر تعلق والدین کی انفرادی اہلیت و لیاقت سے ہوتا ہے لیکن زمانہ عام طور سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ والدین اپنے بچوں کو آنکھیں بند کر کے محض رسم کے طور پر کسی درسگاہ میں داخل کرا دیتے ہیں اور خود معاش اور کاروبار کی الجھنوں میں اپنے آپ کو اس طرح اور اس قدر گھرا رکھتے ہیں کہ جیسے درسگاہ میں ان کے بچہ کا وجود ہی نہیں ہے یا نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد کم ہوتی ہے جو خود کو بھی بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے درسگاہ کے معلمین کی طرح ہی ذمہ دار سمجھتے ہیں۔

والدین اور درسگاہ کا اشتراک اصل میں یہی وہ موزوں ترین وقت ہوتا ہے کہ جب بچوں کے والدین کو بھی اپنے اہم فرض کا بدرجہ اتم احساس کرنا چاہئے۔ بڑی ضرورت ہے کہ والدین اس درسگاہ سے جس میں ان کا بچہ تعلیم پا رہا ہے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ متعلق رکھیں۔ اس موقع پر میں ایک بات کو اور صاف کر دوں کہ والدین کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہی ہوں۔ بلکہ علم سے بے بہرہ اور کم تعلیم یافتہ حضرات بھی درسگاہ سے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ وابستہ رکھ سکتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کا اہم فرض جس طور سے درسگاہ کے معلمین پر عائد ہوتا ہے بالکل اسی طرح والدین پر بھی عائد ہوتا ہے۔ بچوں کی خاطر خواہ تعلیم و تربیت کے لئے والدین کا معلمین کے ساتھ اشتراک عمل بے حد ضروری چیز ہے۔ یہ اشتراک والدین کو درسگاہ کے مقاصد اور اپنے بچوں کی وقتی حالت سے جہاں ان کو آگاہ کر سکتا ہے وہاں ان کے قلوب میں درسگاہ سے ہمدردی اور تعلیم سے محبت اور دلچسپی کے جذبات بھی پیدا کر سکتا ہے معلمین کے ساتھ اشتراک عمل میں سو فیصدی والدین کا ہی فائدہ ہے۔ بچہ کو درسگاہ میں داخل کرا دینے کے بعد بے توجہی اور بے نیازی اختیار کر لینا اصل میں بنیادی غلطی ہے جو بچوں کے لئے زہر قاتل ثابت ہوتی ہے۔ بچے سے باز پرس نہ کرنا اور معلمین سے بے تعلق رہنا یہی باتیں بچوں کی زندگی کو تباہ کرنے کا باعث بن جاتی ہیں

گھر اور درسگاہ کا اشتراک ہندوستان میں گھر اور درسگاہ کے درمیان جو خلیج حائل ہے وہ بھی معلمین اور والدین کی بے تعلقی ہے اور جب تک اس خلا کو گھر اور درسگاہ کے درمیان گہرا ربط پیدا کر کے پُر نہیں کیا جائے گا۔ اس وقت تک اچھی سے اچھی درسگاہ بھی تعلیم کے صحیح مقصد کو پورا کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کے اچھے اسکولوں تک کے بہت سے طلبا کیرکٹر کے اعتبار سے بہت گرے ہوئے ملیں گے حالانکہ ان اسکولوں میں معیاری اور عمدہ طریقۂ تعلیم اخلاقی ہدایات اور کھیل وغیرہ کی کمی نہیں ہوتی۔ اس خامی اور اہم نقص کا دار و مدار سراسر والدین اور معلمین کے درمیان بے ربطی اور بے تعلقی پر ہے۔ طلبا کے کیرکٹر میں اگر سفاہت پائی جاتی ہے تو اس کی ذمہ داری والدین اور معلمین دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ اگر آپ تعلیم کے خوشگوار اور مفید نتائج دیکھنے کے آرزومند ہیں تو کوشش کیجئے کہ گھر اور درسگاہ میں زیادہ سے زیادہ ربط پیدا ہو سکے اور والدین اور معلمین ایک دوسرے سے قریب تر ہو سکیں۔

”والدین کو یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے در اصل حقیقی ذمہ دار وہی ہیں۔ درسگاہ تو محض ان کے بار کی سبکدوشی میں بطور مدد کے کام آسکتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ درسگاہوں کے معلمین آزاد ہیں اور ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ ان کے فرائض بھی بہت اہم ہیں۔ انھیں اپنی زیادہ سے زیادہ توجہ بچوں کے والدین سے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے میں صرف کرنی چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض درسگاہوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے اور جہاں بھی والدین اور معلمین کا اشتراک عمل ہو سکا ہے۔ وہاں نہایت ہی خوشگوار نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ یہ ہمارے ملک کی بدنصیبی ہے کہ والدین اور معلمین کا اشتراک عمل ابھی عام نہیں ہوا ہے اور یہ اہم ترین چیز ابھی بہت ہی تنگ دائرہ میں محدود ہے۔ بڑی ضرورت ہے کہ اس دائرہ کو زیادہ سے زیادہ وسیع کیا جائے۔ معلمین کے فرائض میں سے ایک فرض یہ بھی ہونا چاہئے کہ وہ عام والدین کو یہ سمجھائیں کہ ان کے بچے درسگاہ کی چہار دیواری سے باہر رہ کر کوئی ترقی نہیں کر سکتے درسگاہ ہی ان کے بچوں کو ملک و قوم کا مایہ ناز فرزند بنائے گی۔ وہ انھیں سیاستداں، بیرسٹر، مصنف، انجینیر، ڈاکٹر، پروفیسر، آرٹسٹ، میکینک حتی کہ ایک ماہر تجار بنا سکتی ہے برخلاف اس کے درسگاہ کے باہر رہ کر ان کے بچے ننگ ملک و قوم بنیں گے۔ بداخلاق اور بدتہذیب کہلائے جائیں گے یہاں تک کہ چور، اچکے، بدمعاش، آوارہ اور قاتل بھی ان کے بن جانے کا زیادہ

سے زیادہ امکان ہے ———— ایک درسگاہ کو ملک وقوم کے بچوں کے لئے نہ صرف ذریعہ بیداری ہی ہونا چاہیئے بلکہ اسے ملک وقوم کے لئے باعث ناز اور سرمایۂ امید بھی ہونا چاہئے۔

پہلا عملی قدم | اس باب میں جو پہلا عملی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ درسگاہ کے تمام بچوں کے ورثا سے ملاقات کی صورت پیدا کی جائے۔ درسگاہ کے صدر مدرس کا یہ فرض ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ طلبا کے والدین سے واقف ہو اور اسی طرح درسگاہ کے ہر معلم کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ ان طلبا کے والدین سے ضرور واقف ہو جن کو وہ پڑھاتا ہے۔ طلبا کے والدین سے گاہ بگاہ ملاقات جسے رفتہ رفتہ خوشگوار اور پرخلوص تعلقات میں تبدیل کیا جا سکتا ہے نتائج کے اعتبار سے بچوں کے لئے، والدین کے لئے اور معلمین کے لئے یکساں طور سے مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن صرف یہی کافی نہیں ہو سکتا کہ معلمین طلبا کے سرپرستوں سے واقف ہو جائیں بلکہ طلبا کے والدین کو بھی آپس میں ایک دوسرے سے واقف ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ضروری ہے کہ سرپرست اور معلمین کا وقتاً فوقتاً دوستانہ اور ہمدردانہ باہمی اجتماع بھی ہوتا رہے۔ ان ہمدردانہ اجتماعات کے نتیجہ میں جو خوشگوار ماحول تیار ہو سکے گا وہ کسی درسگاہ کے مقاصد کی تکمیل میں زیادہ سے زیادہ مدد دے سکے گا۔ میرے خیال میں درسگاہوں کو اکثر و بیشتر اس قسم کے اجتماعات کے مواقع نکالنے چاہئیں کہ جہاں معلمین اور والدین ہمدردانہ طور پر تبادلہ خیالات کر سکیں۔ ایسے اجتماعات کے اہم مواقع پر معلمین کا فرض ہے کہ وہ طلبا کے سرپرستوں کا نہایت گرم جوشی سے خیر مقدم کریں۔ بغیر کسی تفریق سے متاثر ہوتے ہوئے اور کسی امتیاز کو جائز رکھتے ہوئے معلمین کا فرض ہے کہ وہ مزدور اور کم تعلیم یافتہ والدین کا بھی اسی گرم جوشی سے خیر مقدم کریں جتنا کہ وہ خوشحال اور اعلیٰ تعلیم یافتہ والدین کا کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو درسگاہ کی سیر کرائی جائے اور درسگاہ کے پروگرام اور کام سے انہیں آگاہ کیا جائے۔ بچوں کی حالت سے انہیں آگاہ کیا جائے۔ بچوں کی سخت نگہداشت کے لئے ان سے درخواست کی جائے۔ اس کے علاوہ درسگاہ سے متعلق ضروریات کو ان کے علم میں لایا جائے ایسے مواقع پر درسگاہ کے صدر مدرس یا پھر کسی اچھے مقرر نائب مدرس کا یہ فرض ہے کہ وہ نہایت واضح طور پر طلبا کے سرپرستوں کے سامنے ایسی تجاویز پیش کرے جو ان کے لئے بچوں کی تعلیم و تربیت کے باب میں مددگار ثابت ہوں اگر درسگاہ سے متعلق کچھ مشکلات ہیں تو ان کا بھی ایسے مواقع پر ذکر کرنا ضروری ہے لیکن

ساتھ ہی وہ طریقے اور ذرائع بھی سرپرستوں کے گوش گذار کئے جائیں جن پر عمل کرنے سے وہ درسگاہ کی مشکلات کو ختم کرنے میں منتظمینِ درسگاہ کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ ایسے اجتماعات میں طلبا کے والدین کو بھی خیالات کے اظہار کا ضرور موقع دیا جائے۔ ان سے نہ صرف تقریر کرنے کی درخواست کی جائے بلکہ اس اجتماع کی صدارت بھی انھیں میں سے کسی اہل اور موزوں شخصیت کے لئے وقف ہونی چاہئے۔ یہ زیادہ بہتر اور موثر ثابت ہوگا اگر طلبا کے سرپرستوں میں سے ہی کوئی صاحب درسگاہ سے متعلق ضروریات اور مشکلات پر روشنی ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس قسم کے اجتماعات بے معنی ثابت نہ ہوں گے اور درسگاہ کے لئے والدین کی محبت و ہمدردی کو زیادہ سے زیادہ حاصل کر سکیں گے۔ اور یہی اجتماعات آخر کار "والدین اور معلمین" کی ایک "انجمن" کے مستقل قیام تک ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جو ہمارا اعلیٰ قدم ہو سکتا ہے کہ جس کے ذریعہ ہم اس خلا کو پورا کر سکتے ہیں جو درسگاہ اور والدین کے درمیان عرصہ دراز سے قائم ہے اور جس کو پُر کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

امید ہے کہ والدین انجمن مذکور کو ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھیں گے۔ اور ان کے اور معلمین کے باہمی اجتماعات کے مفید اور خوشگوار نتائج کے متعلق اچھی رائے قائم کرنے میں بخل سے کام نہ لیں گے والدین بخوبی اندازہ کر سکیں گے کہ ان کا معلمین کے ساتھ اشتراک عمل اور تبادلہ خیالات ان کے بچوں کے لئے کس طور سے اور کس قدر مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ خوشگوار اور مفید نتائج دیکھنے کے بعد والدین خود بھی ان اکثر و بیشتر وقوع پذیر اجتماعات میں دلچسپی لیں گے اور انجمن مذکور کو کوئی فرد واحد بھی بیکار اور سطحی جماعت کہنے کی ہمت نہیں کر سکے گا لیکن باوجود ان تمام باتوں کے کسی درسگاہ کو انجمن مذکور کے قیام پر ہی قناعت نہ کرنی چاہئے بلکہ اسے اپنا نظم و نسق زیادہ سے زیادہ دلچسپی اور جوش کے ساتھ قائم رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اس کا بھی امکان ہے کہ والدین اور معلمین کا اشتراک وہ خوشگوار اور متوقع نتائج نہ پیدا کر سکے جن کے متعلق انجمن مذکور کی تشکیل سے پیشتر بہت ہی امید افزا رائے قائم کی گئی تھی۔ سوسائٹیوں، انجمنوں، اتحادوں اور لیگوں کی فی زمانہ تشکیل اس قدر عام ہو گئی ہے کہ ان جماعتوں کا زرین مقصد، چاہے وہ کوئی تعلیم یافتہ حضرات کی جماعت ہو یا وہ کوئی جاہل مزدور طبقہ کے افراد کا گروہ ہو پورا نہیں ہونے پاتا۔ اکثر

ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کی جماعتوں کی تعمیر سے بجائے اس کے کہ مفید نتائج برآمد ہوں برخلاف اس کے مشکلات میں اور پیچیدگی کا باعث بن جاتی ہے۔ اور بچوں کی تعلیم و تربیت کو بہتر و برتر طریقہ پر انجام دینے کی خاطر اگر اس والدین اور معلمین انجمن کا بھی حسب معمول یہی حشر ہونے والا ہے تو پھر تو اس صورت میں یہی بہتر ہے کہ اس کی تشکیل کے متعلق سوچا تک نہ جائے لیکن باوجود ان خطرات کے دنیا بہ امید قائم ہے کے مصداق ہمیں انجمن مذکور کے قیام کی کوشش کرنی چاہئے۔ اور والدین اور معلمین کو اپنے اپنے طور پر سعی کرنی چاہئے کہ ان کی یہ مشترکہ جماعت اپنے زرین مقاصد میں کامیاب ہو کر رہے۔

<u>انجمن کا نظام عمل</u> والدین اور معلمین کے اجتماع کا انعقاد ایک ماہ میں دو دفعہ تو غالباً بہت زیادہ ہو جائیگا لیکن ایک ماہ میں ایک دفعہ تو غالباً بے حد ضروری ہے۔ ان اجتماعات میں کام کے نظام اور بحث و مباحثہ کے لئے موضوع کا دار و مدار مقامی صورت حالات اور درسگاہ کی مخصوص مشکلات پر مبنی ہونا چاہئے لیکن عام طور سے بحث و مباحثہ کا موضوع جن باتوں پر مشتمل ہونا چاہئے وہ اس قسم کی ہوں تو بہتر ہے مثلاً مختلف عمر کے بچوں کے ساتھ کس کس قسم کا طرز عمل اختیار کیا جائے مختلف جماعتوں کے بچوں کی اہلیت و لیاقت اور ان میں تعلیم کے لئے زیادہ سے زیادہ شوق پیدا کرنے کے متعلق تبادلہ خیالات کیا جائے۔ بچوں کی اخلاقی حالت کیا گھر میں اور کیا درسگاہ میں بلند کرنے کے متعلق ذرائع سوچے جائیں۔ ان ذرائع پر غور کیا جائے جو بچوں کو درسگاہ کے باہر کے مہلک اثرات سے محفوظ رکھ سکیں۔ اس باب میں انجمن ایسے ذرائع کو عملی جامہ پہنا سکتی ہے جو بچوں کو درسگاہ کے باہر خراب اثرات سے محفوظ رکھ سکیں گے۔ مثال کے طور پر سینما دیکھنے کی عادت کو لیجئے بعض ناقص اور فحش قسم کی تصاویر سے چھوٹے چھوٹے بچوں اور کمسن طلباء کے ذہنوں پر جو خراب اثرات پڑتے ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس چیز سے بچوں کو کیوں کر بچایا جائے اس قسم کی اور بہت سی باتوں کا والدین اور معلمین کی مشترکہ جماعت اپنی متفقہ کوشش سے سدِ باب کر سکتی ہے۔ درسگاہوں نے اکثر و بیشتر طلباء کے والدین سے درخواست کی کہ آپ اپنے بچوں کو سینما دیکھنے سے باز رکھیں لیکن ان کی التجا صدا بہ صحرا ثابت ہوئی اور والدین نے اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ والدین اور معلمین کی مشترکہ انجمن خاص عمر تک کے بچوں کے سینما میں داخلہ کو قانوناً بند کرا سکتی ہے۔ وہ فلم کمپنیوں سے درخواست کر سکتی ہے کہ وہ

بچوں کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر چند فلمیں تیار کرے۔ دوسری عام خراب عادت جو درسگاہوں کے بچوں میں پائی جاتی ہے وہ تمباکو نوشی کی عادت ہے۔ تمباکو فروش حضرات اور سینما ہاؤس کے منیجر صاحبان کو اپنے کاروباری نقطہ نظر سے یہ پابندیاں ضرور قابل اعتراض ہوں گی لیکن انجمن جب ان پابندیوں کو اُن کے سامنے معلمین اور والدین کی طرف سے پیش کرے گی تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ انجمن کی کوششوں کو نہ سراہیں کیا کوئی باپ یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے بچے اوباش اور آوارہ مزاج بن جائیں؟ آخر تمباکو فروش حضرات اور سینما کے منیجر صاحبان بچوں کے باپ بھی تو ہوتے ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سی فحش اور عریاں چیزوں کو بچوں کی نظروں کے سامنے سے ہٹایا جا سکتا ہے۔ اور یہ سب باتیں والدین اور معلمین کی انجمن بخوبی اور بآسانی انجام دے سکتی ہے بشرطیکہ معلمین اور والدین دونوں اپنے اپنے فرائض کا صحیح طور سے احساس کریں۔ ان کا باہمی ایثار، ان کی باہمی توجہ اور دلچسپی اور ان کی باہمی کوششیں ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہیں۔ انجمن کا یہ بھی ایک فرض ہوگا کہ وہ بچوں کے لئے مصروفیات کا ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرے جو بچوں کو ہمہ وقت گھرا رکھے اس لائحہ عمل کے مطابق بچوں کو گھرا رکھنے کا فرض معلمین اور والدین دونوں پر عائد ہوتا ہے۔ والدین کی سخت نگہداشت بچوں کو بہت سی مہلک باتوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ اس انجمن کے ذریعہ معلمین کا سب سے اہم فرض یہ ہے کہ وہ والدین اور عام پبلک کی درسگاہ اور اس کے نظام کے متعلق زیادہ سے زیادہ ہمدردی حاصل کرنے کی امکانی کوشش کریں اس طرح والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی خاطر معلمین اور درسگاہ کے کام میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینے کی امکانی کوشش کریں اکثر دیکھا گیا ہے کہ والدین درسگاہ کی بہت سی باتوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ نکتہ چینی کرنا بری بات نہیں ہے لیکن تعلیم کے بہت سے موجودہ طریقوں پر (جو بچوں کی نطرت کا برسوں مطالعہ کرنے کے بعد محققین فن تعلیم نے وضع کئے ہیں) محض ناواقفیت کی بنا پر نکتہ چینی کرنا ضرور بری بات ہے۔ درسگاہ میں جسمانی سخت سزا عام طور سے ممنوع قرار دیدی گئی ہے لیکن اتفاق سے کسی درسگاہ کا کوئی معلم ضرورت و مصلحت کی بنا پر یا غلطی سے کسی طالب علم کو سخت سزا دیدیتا ہے تو والدین کی دنیا میں عجیب و غریب قسم کی چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ والدین کا یہ ہنگامہ کہاں تک جائز اور درست ہے؟ کون نہیں جانتا والدین کا بچوں کو گھروں میں ذرا ذرا سی

بات پر سزا دیتے رہنا آئے دن کی بات ہے۔ انجمن مذکور اس قسم کی غلط فہمیوں کا بھی ازالہ کرتی رہے گی۔

والدین کی مشکلات اور ان کا حل ۔ دو تین اور چار سال کی عمر کا بچہ جہاں والدین کے لئے ایک خوبصورت کھلونے کا کام کرتا ہے وہاں اس کی بعض حرکات ان کے لئے وبال جان بھی بن جاتی ہیں چھوٹے سے بچہ کی فطرت میں تجسس کا مادہ بالکل قدرتی ہوتا ہے وہ کیا جانے کہ کانچ اور چینی کے برتن بھی ٹوٹنے کی اشیاء ہوتی ہیں۔ اسے ان کے توڑنے میں ایک خاص قسم کی مسرت سی محسوس ہوتی ہے۔ والدین کا اس قسم کی اشیا کو بچہ کی زد سے بچا کر کسی اونچے مقام پر رکھتے رکھتے ناک میں دم آجاتا ہے لیکن باوجود احتیاط کے بچہ خاموشی سے کسی کونہ میں پہونچ کر کوئی تیل سے بھری ہوئی بوتل کے گرانے میں کامیاب ہو ہی جاتا ہے اور اس کی اس بھولی بھالی حرکت کے نتیجہ میں سارے گھر میں ایک ہنگامہ سا بپا ہو جاتا ہے بعض بچہ کی فطرت سے ناواقف حضرات اس قسم کی حرکات پر بچہ کو کافی سے زیادہ سزا بھی دیتے ہیں ساکثر والدین کو عجیب عجیب قسم کی الجھنوں میں مبتلا ہونا پڑتا ہے جبکہ ان کے بچے آپس ہی میں گھر میں ایک دوسرے سے لڑتے ہیں یا پڑوسیوں کے بچوں سے کشتم کشتا کر بیٹھتے ہیں۔ ایک معلم بچہ کی ان حرکات کو اس کی اچھی تندرستی اور شوخئ طبع پر مبنی سمجھ کر ان سے بہتر اور اچھے طریقہ پر کام نکالنے کی کوشش کرے گا۔

چند سال بعد پھر وہ زمانہ آتا ہے جبکہ بچوں کو لڑکوں اور لڑکیوں کے نام سے پکارا جانے لگتا ہے بچوں کا یہ دور والدین کیلئے اور بھی الجھن کا باعث ہوتا ہے۔ لڑکے یا لڑکیاں جو اپنی عمر کی دس منزلیں طے کرنے کے بعد گیارہویں اور بارہویں منزل میں قدم رکھ چکے ہیں۔ اکثر والدین کیلئے غور و فکر کا موضوع بن جاتے ہیں۔ اگر بچوں کی حرکات و سکنات اور ان کی شکل و شباہت سے شرمیلا پن، سادہ لوحی اور مردہ دلی کا اظہار ہوتا ہے تو یہی چیز والدین کی پریشانی کا باعث بنجاتی ہے۔ ان کا بہت زیادہ وقت ان بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ دراصل بہت سے بچوں کی فطرت سے ناواقف والدین غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ بچوں کی اس عمر (گیارہ بارہ سال) کا فطری تقاضا یہی ہوتا ہے۔ دراصل سب سے زیادہ دقت طلب وقت والدین کیلئے ہوتا ہے جبکہ ان کے لڑکے سولہ سے اوپر اور ان کی لڑکیاں چودہ سے اوپر پہنچتی ہیں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا گھر ہوتا ہوگا جہاں کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی اس عمر کا دور والدین کیلئے الجھن اور بے چینی کا باعث نہ بنا ہو ورنہ عام طور سے دیکھا گیا

ہے کہ اس عمر کے لڑکے اور لڑکیاں جس طرح سے والدین کو ذہنی تکلیف پہونچاتے ہیں اس قسم کی تکلیف سے انھیں زندگی بھر میں دوچار ہونا نہیں پڑتا ہوگا۔ ان کی عجیب وغریب اور مخصوص انفرادی حرکات ومصروفیات ان کی آزاد خیالی، دوستوں کا انتخاب، ان کا ادبی ذوق، ان کا لباس غرضکہ ان کی ہر ایک بات والدین کیلئے ایک عجیب قسم کی کشمکش اور الجھن کا باعث بن جاتی ہے۔ اس عمر کے بچوں سے ادائیگی فرض میں جو لغزشیں عمل میں آتی ہیں وہ اکثر وبیشتر والدین کو روحانی اور قلبی صدمہ پہونچانے کا باعث بن جاتی ہیں۔ بہت کم والدین اپنے بچوں کو معیوب باتوں سے باز رکھنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں ورنہ اکثر تو یہ گتھی ان کے لئے سلجھانا بہت مشکل ہوجاتا ہے بعض والدین تو بچوں کی بری عادتوں کو لاعلاج مرض سمجھ کر ان سے بے نیازی اختیار کرلیتے ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ طریقہ قابل اعتراض ہے۔ والدین کی ان تمام مشکلات اور الجھنوں کا واحد حل والدین اور معلمین کی انجمن کے قیام میں مضمر ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ والدین اور معلمین کچھ عرصہ کے اشتراک عمل کے بعد ایک ماہر نفسیات معلم کی مدد حاصل کرنا مناسب سمجھنے لگیں۔ اس معلم کا کام ہوگا کہ وہ والدین اور معلمین کو باقاعدہ جماعتوں کے ذریعہ بچوں کی فطرت اور ان کی تعلیم وتربیت سے متعلق لکچر کی صورت میں درس دیا کرے ان جماعتوں کا انعقاد اگر ہفتہ میں دو دفعہ بھی ہو تو مناسب ہے ورنہ بعد میں ضرورت اور دلچسپی کے لحاظ سے اس میں توسیع کی جاسکتی ہے۔ یہ تجویز بعض حضرات کو شاید عجیب وغریب اور اجنبی سی معلوم ہو لیکن اس تجویز کے نتائج غور کرنے پر اچھی طرح معلوم ہوسکتے ہیں۔ انجمن کی تشکیل شہر کی متعدد درسگاہوں سے نمائندہ معلمین اور نمائندہ والدین کی طے کردہ تعداد پر مشتمل ہوگی چند حضرات کو محکمۂ تعلیم کی طرف سے نامزد بھی کیا جاسکتا ہے۔

فی زمانہ والدین کو جس خاص دقت سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ بچوں کے لئے ان کے رجحان طبع کے مطابق کام اور پیشہ کا انتخاب ہے۔ ہندوستان میں غلط انتخاب کی وبا جس قدر عام ہے وہ ظاہر ہے۔ انجمن والدین کو ان تمام الجھنوں سے نجات دلاسکتی ہے۔ انجمن کے قیام کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بہت سے سرمایہ کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ والدین اور معلمین کی بہت سی باہمی توجہ اور کوشش۔ اس قسم کی انجمنیں نہ صرف ہمارے طلبا کے حق میں مفید ہوں گی بلکہ ملک میں ایسے نوجوان پیدا کرسکیں گی جو اس کے لئے باعث فخر وعزت ہوں۔

توکل صاحب بی۔ اے۔ ڈبائیوی

کچھ اپنی شاعری کے متعلق

حسب ارشاد اپنی شاعری کے متعلق یہ چند سطور حاضر خدمت کر رہا ہوں شاید آپ اور قارئین جامعہ انہیں دلچسپ پائیں میری شاعری کے متعلق اسے مفصل بیان نہ سمجھنا چاہئے۔ پھر بھی امید ہے کہ کافی اشارے ان سطور میں مل جائیں گے جو میرے اشعار کی چند خصوصیتوں کو نمایاں کرنے میں اور ان کی طرف توجہ دلانے میں کچھ کارگر ثابت ہوں۔ آپ شوق سے ان سطور کو جامعہ میں شائع کر سکتے ہیں ساتھ ہی پونے دو سو اشعار کے قریب اپنے مجموعے سے خود منتخب کر کے بھیج رہا ہوں تاکہ میری یہ سطور ان اشعار پر روشنی ڈالیں اور یہ اشعار ان سطور پر روشنی ڈالیں۔

نگار لکھنؤ نے کئی زندہ اردو شعرا کا خود کردہ انتخاب حاصل کر کے اس بار اپنا سالنامہ مرتب کیا ہے اس میں بہت سے شعرا نے اڈیٹر نگار کی دعوت پر کچھ اجمال اور تفصیل کے ساتھ اپنے اور اپنی شاعری کے متعلق بھی لکھا ہے جو ہر ایک کے انتخاب کلام کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ میرے منتخب کردہ دو سو اشعار کے قریب اور میرے خود نوشتہ حالات بھی شائع ہوئے ہیں۔ میں نے یہ کچھ نگار کو آپ سے چھ ماہ پہلے بھیجا تھا۔ موجودہ انتخاب اور اس بیان کو اس انتخاب اور بیان پر اضافہ سمجھئے جو نگار میں نکلے ہیں۔ جو اشعار آپ کے حسب ارشاد اب بھیج رہا ہوں ان میں نوے فیصدی تو نگار میں اپنا انتخاب بھیج چکنے کے بعد کہے گئے ہیں اور میرے تازہ ترین اشعار میں سے ہیں)

جناب نیاز فتحپوری نے نگار کے مذکورہ بالا شمارے میں ہر شاعر کے کلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے میری شاعری سے اپنی انتہائی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے وہ یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ شاعری سے قطع نظر کر کے میرے اشعار کی چند خوبیاں انہیں متاثر کرتی ہیں۔ میری شاعری کی روش اور انداز کو دیکھتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس کی پختگی کے متعلق انہیں شبہ معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے نہایت خلوص سے لکھا ہے۔ انہوں نے اب سے چار برس پہلے میری شاعری پر ایک مفصل اور مستقل مضمون نگار میں

شائع کیا تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ مجھے اردو شاعری کے کس دبستان اور کس رنگ شاعری سے متعلق کیا جائے یہ طے کرنا مشکل ہے۔ میرے اشعار کی داخلیت پر غور کرتے ہوئے انھیں کچھ مومن کی جھلک ان میں نظر آئی۔ پھر بھی انھوں نے میرے یہاں اتنے انداز بیان پائے اور مضامین میں اتنا تنوع پایا کہ ان کے نقادانہ ذوق کو کچھ حیرت سی ضرور ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ میرے اشعار کو اتنا گوناگوں پاکر ہی جناب نیاز فتحپوری نے میری شاعری کی پختگی کے متعلق یہ کہا ہے کہ "ڈر لگتا ہے۔ ان کے اس کہنے کو اگر خفیف سا اعتراض بھی سمجھا جائے تو مجھے یا کسی کو برا ماننے کی بات نہیں۔

شاعری میں اور شخصیت میں یکرنگی اور یکسانیت کی کئی شکلیں ہوتی ہیں داخلی اور خارجی دونوں لحاظ سے جہاں تک میری شاعری کا تعلق ہے۔ اگرچہ وہ کل کی کل میری زندگی کے مرکزی اثرات اور میری خاص افتاد مزاج کے تحت میں کہی گئی ہے۔ پھر بھی چند امور قابل غور ہیں۔ امیر اور داغ کے مرنے کے بعد سے یا یوں کہئے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے یہی نہیں ہوا کہ اردو شاعری کا ایک پرانا دور ختم ہو گیا اور ایک نیا دور شروع ہوا۔ بلکہ اس دور میں اپنے گوناگوں کوائف اور محرکات بیک وقت نظر آتے ہیں۔ ہماری زندگی اور ہمارے ادبیات میں اتنے پہلو پیدا ہو گئے ہیں کہ پہلے ادوار کی محدود یکرنگی کو دیکھتے ہوئے حیرت ہو جاتی ہے۔ اس دور میں کوئی ایک دبستان شاعری نہیں ہے جس سے ہم آج کل کے شعرا کو متعلق کر سکیں۔ اقبال۔ اصغر، جوش ملیح آبادی۔ جگر مراد آبادی، فانی بدایونی، حسرت موہانی، آنند نرائن ملا وغیرہ اور دیگر شعرا ان معنوں میں ہم آہنگ اور ہم رنگ نہیں ہیں جن معنوں میں گذشتہ ادوار کے شعرا ہوا کرتے تھے۔ امیر و داغ، آتش اور ناسخ، غالب و ذوق اور مومن، انشا اور مصحفی، میر اور سودا ان سب ادوار کی شاعری میں جو یکرنگی اور یکسانیت ہے وہ آج نظر نہیں آتی۔ آج کی اردو شاعری ہندوستان کی تغیر پذیر بلکہ انقلاب پذیر زندگی کی آئینہ دار ہے

اس دور کے شعرا میں یہ ضرور ہے کہ ہر ایک کا انداز بیان اور اس کی جولانگاہ خیال دونوں بہ آسانی پہچانے جا سکتے ہیں۔ ان کی نظمیں باہم ہم آہنگ اور ہم رنگ ہیں پھر بھی اقبال کی بانگ درا اور بال جبریل اور پھر دوسرے مجموعے باہم میل نہیں کھاتے۔ اب جہاں تک میری شاعری کا سوال ہے خود میری زندگی

کئی داخلی لحاظوں سے بدلتی رہی ہے۔ اس کے سینکڑوں مختلف محرکات اور اثرات رہے ہیں۔ وہ مختلف پہلوؤں سے اثر پذیر ہوتی رہی ہے۔ اور میرا نظریہ یا فلسفہ حیات وکائنات ساکن نہیں بلکہ متحرک رہے ہیں۔ میں ٹوٹا بھی گیا ہوں، آگے بھی گیا ہوں، بگڑا بھی گیا ہوں، بنتا بھی گیا ہوں۔ ماضی کے بوجھ کو ہلکا کرنا اور اسے حال میں سمیٹ بھی لینا اور رخ مستقبل کی طرف کرکے چلنا، یہ تینوں کام ایسے تھے کہ کبھی کبھی پاؤں تھرتھرائے اور ڈگمگاتے نظر آئیں تو زیادہ جائے حیرت نہیں ہیں قدما کی یکسانیت اور دور حاضر کے اصغر، جگر اور حسرت موہانی یا فانی بدایونی۔ یا یگانہ کی یکرنگی اپنے یہاں نہیں لا سکا۔ میرے یہاں صرف ایک رنگ پختہ سے پختہ تر ہوتا ہوا نہیں چلا گیا بلکہ ایک رنگ آتا تھا تو ایک رنگ جاتا تھا۔ میرا رنگ کچھ سے کچھ ہوتا رہا۔ لیکن میں ایک بے جان پتھر کی طرح زمانہ کی زدوکوب سے اِدھر اُدھر مارا مارا نہیں پھرا ہوں۔ ماضی کو حال کی رو میں اور مستقبل کی کشش میں بھولا نہیں۔ دیکھئے یہ اشعار ؎

کر عمر گذشتہ کو شریک غم امروز خاکستر ماضی سے کچھ اٹھتا ہے دھواں بھی

نئی منزلوں کو سکون وطن دے ٹھہرنا نہیں ہے یہ ہے دور جانا

مٹا ہے کوئی عقیدہ تو خون تھوکا ہے نئے خیال کی تکلیف اٹھی ہے مشکل سے

رکیں تو پاؤں نہ مانیں چلیں تو منہ کی کھائیں کریں تو کس سے کریں راہ عشق کا شکوہ

ان سطور کے ساتھ جو بہت سے اشعار میں بھیج رہا ہوں ان میں خود عشقیہ زندگی کے متعلق ایسے کئی شعر ملیں گے جن میں بیک وقت یاد ماضی کیفیت حال اور خواب مستقبل سب موجود ہیں۔ تکرار و تجدید کے سلسلے لامتناہی ہیں مٹ مٹ کے زندگی اپنے کو بنایا کرتی ہے۔ غالباً یہی دیکھ کر جناب نیاز فتحپوری کو میرے کلام کی بےتکی کی طرف سے ڈر معلوم ہوا جہاں تک یکرنگی اور یکسانیت تک میرے کلام کے محدود نہ رہنے کا تعلق ہے ان کا یہ کہنا صحیح ہے لیکن کیا میرے یہاں یہ مختلف رنگ کچھ پھیکے یا ہلکے ہیں۔ یا بدرنگ ہیں۔ ممکن ہے یہ عیب بھی میرے کچھ اشعار میں ہوں۔ وہ شاعر جس کے یہاں اتنا تنوع ہوگا اور جو اتنا کہے گا کبھی کبھی کمزور شعر بلکہ غلط شعر بھی ضرور کہہ دے گا۔ انگریزی شاعر پوپ کا یہ مصرعہ ضرب المثل ہو گیا ہے کہ کبھی کبھی ہومر بھی اونگھنے لگتا ہے، اور کچھ راسخ العقیدہ مگر اللہ کو بھی چھیڑنے والے منچلے مسلمان قرآن پاک کو مسلسل نہ پاکر

کہ اُٹھتے ہیں کہ خضر میاں کیا سے کیا کہنے لگے۔ سوال یہ ہے کہ اگر مختلف باتیں مختلف انداز سے مختلف اسلوبوں سے میں نے کہی ہیں تو کیا اس کا بہت کچھ حصہ پختگی حاصل کر سکا ہے یا نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جو باتیں میں کہنا چاہتا ہوں جن داخلی احساسات کو میں اپنے اشعار میں جگہ دیتا ہوں ان کے اظہار میں وہ پختگی برجستگی بے ساختگی یا تکمیل بیان آ ہی نہیں سکتی جو داغ کی جادو بیانی میں نظر آتی ہے لیکن کیا کبھی کبھی اور بہتوں کی رائے میں اکثر داغ کی آواز بھی گرفتہ نہیں ہو جاتی۔ میرا ہر شعر زبان میں نہیں ہے لیکن بغیر اپنے شاعرانہ معیار کو نیچا کئے ہوئے میں نے بہت سے شعر زبان میں بھی کہے ہیں لیکن عام طور پر میرا لب و لہجہ مانوس اور سامعہ نواز ہوتا ہوا بھی اگر کچھ غیر معمولی معلوم ہو یا کچھ اجنبیت اس میں نظر آئے تو اسے کبھی کبھی میرا عجز بیان سمجھئے لیکن زیادہ تر ایسا میرے تخیل اور میرے احساس کے اچھوتے پن کی وجہ سے ہوا ہے۔ انگریزی تنقید میں ایک مقولہ یہ بھی ہے۔ A clear idea is a small idea. یعنی بہت صاف خیال ایک چھوٹا خیال ہوتا ہے۔ خود مومن کے کلام میں کتنی ناہمواری پیدا ہو گئی ہے لیکن مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ میں ناہمواری کو پسند نہیں کرتا اور نازک راہوں سے گذرتا ہوا بھی اپنی چال کو ناہموار بنانے سے بچتا ہوں اپنے اس معیار کو برتنے میں جن آزمائشوں سے مجھے دوچار ہونا پڑا ہے انہیں میں خود بیان کرنا چاہوں تو بیان نہیں کر سکتا۔ اپنا ایک شعر پیش کرتا ہوں ؎

کھلیں نہ حسن کی فطرت کے راز عاشق سے　　　برت خلوص بھی، جھوٹی قسم بھی کھائے جا

معشوق کی فطرت کے غیر شعوری یا تحت الشعور رموز اس شعر میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے خلوص کی تعبیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی۔ اسی لئے اس کا برتاؤ اور سلوک باخلوص ہوتے ہوئے بھی اس کے قول و قسم کمزور ثابت ہوتے ہیں ؎

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا　　　کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا۔

بات تو غالب نے بھی یہی کہی تھی مگر غالب اس مسئلہ سے کھیل کر رہ گئے ہیں۔ میرے شعر میں جو اس بظاہر ان ہونی بات پر حیرت چھپی ہوئی ہے وہ قابل غور چیز ہے۔ اپنے تین چار اور شعر اسی نازک موضوع پر حاضر کرتا ہوں

نثار پیمان دوستی کے گر ہے گردش میں آسماں بھی　　　جو یاد ماضی پہ منحصر ہو وہ عہد کیا استوار ہوگا

بیوفا تو نہیں اے دوست، جسے عشق کہیں — تجھے اُس شدتِ احساس کی برداشت نہیں
سچ جھوٹ کا سوال نہیں حسن و عشق میں — گر ہے کوئی سوال تو عنوانِ شوق کا

"عنوان شوق" کی نئی ترکیب ذرا مشکل سے ہاتھ آئی ہے۔

عشق میں سچ ہی کا رونا ہے — جھوٹے نہیں تم جھوٹے نہیں ہم

بقول ہیگل (Tragedy is conflict of good against good) المیہ میں نیکی کا تصادم نیکی سے ہوتا ہے۔

اپنا ایک اور شعر عرض کرتا ہوں ؎

حسن کے ہر تپاک میں جذب تھیں لاکھوں متیاں — کون کسی کو یاد تھا کس نے کسے بھلا دیا

اب میں ان نازک باتوں کو داغ کی زبان میں آمیر کی زبان میں بلکہ غالب اور حسرت اور مومن کی زبان میں بھی کیونکر ادا کروں یا خود اپنے ان اشعار کی زبان میں کیونکر ادا کروں جن کی زبان زیادہ سادہ اور صاف ہے میں اس کی بھی کوشش کرتا رہا ہوں کہ خود اپنا اور اپنے آنی کا بوجھ کچھ ہلکا کروں۔ اس لئے ادھر کچھ دنوں سے اپنے رجحانات سے ذرا بچتے ہوئے دنیا کے ادب کے ان حصوں پر نظر ڈالی جو خواہ مخواہ میرے مزاج اور مذاق اور محدود فطری تاثرات کی ترجمانی نہیں کرتے۔ ہر ایک کو اپنی چشم تنگ کو کثرت نظارہ سے وا کرنا چاہئے۔ کسی انگریزی نقاد نے کہا ہے:۔

In literature you can have preferences but no exclusions.

ڈکٹر ہیوگو کا قول ہے:۔

Let the artist go where he will. He will find only one law healing power. اسی لئے میں نے اپنی محدود شخصیت کی زنجیروں کو ڈھیلا کر کے جدید ترین فکریات کے میدان میں قدم رکھنا شروع کیا۔ اس سے حسن و عشق کا نظریہ بھی وسیع ہو جانا لازمی تھا اور حسن و عشق کے علاوہ حیات و کائنات و اخلاقیات کے وہ پہلو بھی سامنے آئے جو محض رومانی حسن پرستی یا شاعرانہ کیف بے خودی سے حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ اجتماعی زندگی کے قانون محض اچھی یا احساس طبیعت پالنے سے یا محض شاعرانہ

نیک نیتی سے معلوم نہیں ہوا کرتے سوچئے کہ ان اشعار کے کہنے میں میری کیا گت بنی ہوگی ؎

غفلت ہو تو کوئی چونکائے جاگے ہوؤں کو کون جگائے ہائے وہ کار جہاں خود جن سے نکلیں بے عملی کے بہانے

گھوڑے بیچ کے سوئے ہیں پس ماندوں کا پوچھ نہ حال

جولانگاہ حیات کہیں ختم ہی نہیں منزل نہ کر حدود سے دنیا بنی نہیں

"حدود سے دنیا بنی نہیں" کا ٹکڑا سامنے کا ٹکڑا نہیں تھا ہیگل کا فلسفہ اس ٹکڑے میں موجود ہے۔ بقول اکبر الٰہ آبادی

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں عقیدے عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

تجھے دنیا کو سمجھنے کی ہوس ہے اے کاش تجھے دنیا کو بدل دینے کا ارماں ہوتا

منازل ارتقا کے دھوکے زمانہ پہلے بھی کھا چکا ہے کسی کو جس کی خبر نہیں ہے وہ انقلاب ایک بار ہوگا

ہر ہر شکست ساز میں صد لحن سرمدی یا نغمۂ حیات ازل گا رہی ہے آج

حیات اور کائنات اور سماج کے متعلق ان اشعار میں محض شدت احساس اور جمالیات کو دخل نہیں ہے کچھ سوجھ بوجھ کو بھی دخل ہے اور وہ بھی سوجھ بوجھ جبلی طور پر میرے وجدان کو حاصل نہیں ہو سکتی تھی اسی لئے میرے ایسے اشعار کی زبان میں ایک ہلکا سا اٹکاؤ کچھ لوگوں کو اور خود مجھے بھی نظر آ سکتا ہے پختگی کی کمی نظر آ سکتی ہے اور کچھ آورد کی جھلک بھی۔

اب اپنی زندگی اور وجدان کے مرکزی اثر کا کچھ ذکر کر دوں۔ اگرچہ بچپن ہی سے کئی باتوں پر میں جلا اٹھتا تھا اور کچھ لوگوں کو دیکھتے ہی بلکہ ان کی تصویر دیکھتے ہی یہاں تک کہ ان کے بارے میں ایسی باتیں سن کر بھی جن میں بظاہر کوئی برائی نہ تھی مجھے سخت نفرت پیدا ہو جاتی تھی اور یہ جذبات دائمی ہوتے تھے۔ پھر بھی اس سنسار سے اتنی محبت تھی کہ میں اسے سینہ چیر کر اپنے کلیجے میں رکھ لینا چاہتا تھا۔ میں ترک دنیا کا قائل نہیں لیکن اپنے کو اشرف المخلوقات سمجھ کر دنیا کو محض استعمال کی چیز یا اپنے زیر نگیں رکھنے کی یا محض اپنی زندگی کا پس منظر نہیں مان سکتا تھا۔ میں زمین دریا، پہاڑ، نباتات اور حیوانات کو یعنی پورے سنسار کو اتنا پاک اور اہم سمجھتا تھا کہ کسی آسمانی خدا کو یا انسان کو سنسار سے زیادہ نہیں پوج سکتا تھا۔ یہ نظریہ عمرانیت کے نظریہ سے الگ ہے یہ نظریہ قبولیت (Affirmation and Acceptance) کا نظریہ رہا ہے میں اس

ٹھوس دنیا کی پاکیزگی کے احساس کو ہندو کلچر کا وہ قیمتی جزو سمجھتا رہا ہوں جو دنیا بھر کے لئے خیر و برکت کا پیغام ہے جو زندگی کو امرت میں نہلا سکتی ہے اسی احساس نے میرے اشعار میں بقول حضرت نیاز فتحپوری شاعری اور پختگی یا فنیت سے قطع نظر کرکے ایک حلاوت نرمی اور معصومی پیدا کردی ہے اور ایک ننگی بھی۔ کائنات سے ہم آہنگی ہی یہ بات میرے اشعار میں پیدا کرسکتی تھی میں شاعر نہیں فن کار نہیں ہاں داخلی طور پہ انسان ہونا ضرور چاہتا رہا ہوں۔ جو مٹی کی عزت نہیں کرسکتا شاید وہ خدا اور انسان کی بھی عزت نہیں کرسکتا خدا کی پرستش اور انسان کی خدمت ممکن ہے کرسکتا ہو۔ مجھے شعر کہنے سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ یہ سمجھوں کہ قدروں کے لحاظ سے دنیا اور زندگی کیا ہیں۔ میں برائیوں اور مصیبتوں کے وجود کا قائل ہوں میں فطرت اور انسان دونوں کے مظالم کا دشمن ہوں لیکن دنیا اور انسان میں برائیاں پاتے ہوئے بھی ان کا اجمالی اور بنیادی تصور مجھے ہمیشہ وجد میں لاتا رہا۔ اسی سے اگرچہ دکھ اور غم و حسرت کا شدید احساس میرے اشعار میں موجود ہے پھر بھی میرے اشعار میں وہ نرمی وہ صفت بھی شاید موجود ہے جسے ایک قوت شفا کہہ سکتے ہیں۔ خیر و برکت کا دامن میں نے اپنے اشعار کو نہیں چھوڑنے دیا۔ اسی سے دکھ اور غم کا احساس میرے اشعار کو فانی بدایونی کے کلام سے الگ کردیتے ہیں۔ میں نہ غم کا شاعر ہوں نہ خوشی کا شاعر ہوں۔ دنیا کے حسن و قبح کا احساس رکھتے ہوئے یعنی آنکھ کھول کر دنیا سے محبت کا شاعر ہوں۔

تحیر کا عنصر بھی میرے اکثر اشعار میں موجود ہے۔ میرے نزدیک تحیر ہم آہنگی اور محبت کے تحت میں کسی چیز کے وجود کے شدید احساس اور ادراک کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بقول افلاطون فلسفہ کا آغاز حیرت سے ہوتا ہے ہاں تو میں دنیا کو محض سیرگاہ یا سرائے فانی یا عارضی منزل نہیں سمجھتا۔ اپنے انفرادی وجود کو اشرف المخلوقات کہہ کر کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ میں مٹ جاؤں گا تو کیا میری حقیقت تو یہ دنیا ہے ۔

ملتی رہتی ہے مجھے اپنی خبر شام و سحر ہوتے رہتے ہیں حقائق جلوہ گر شام و سحر

مادر گیتی سب کچھ ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ اسی کی کوکھ سے پیدا ہوکر پھر اسی کی کوکھ میں جذب ہوجانا ہی ہمیشگی اور نجات ہے۔ ہمارے وجود کی بھی تجدید اور اپنے سہاگ کو نیا کرنا یہ دونوں کام مادر گیتی ہمیں مٹاکر دوسری نسلوں کو جنم دے کر کرتی رہتی ہے اس لحاظ سے ہم دنیا کے لئے ہیں دنیا ہمارے لئے نہیں ہے۔

میرے اشعار میں حسن و عشق یا زندگی یا سنسار کے مخصوص اور محدود پہلوؤں کے بیان میں آپ کو وہ اشارے ملیں گے جو کائنات کے ڈرامائی کیفیات کا پتہ دیتے ہیں عموماً میرے اشعار کے لہجے سے یہ بات پیدا ہو جاتی ہے۔ بغیر اس کے شاعری میں آفاقیت کی صفت اور عالمگیر ہونے کی صفت پیدا نہیں ہو سکتی حسن کا احساس قدروں کے علم کے لئے ضروری ہے اور حسن کا احساس ہی محدود کو لامحدود بنا تا ہے ؎

ہر دور ایک منزل معراج عشق ہے — درد اُس نگاہ ناز سے اُٹھتا ہے آج بھی

اپنی زندگی کے جس ابتدائی اور بنیادی تاثر کا میں نے ذکر کیا ہے، وہ تاثر ترقی پذیر چیز ہے۔ یہ تاثر کلچر کی سانس ہے اور جیسے جیسے کلچر میں تنوع، وسعت، بلندی اور رزور پیدا ہوتا جاتا ہے۔ جیسے جیسے کلچر کی تکمیل ہوتی جاتی ہے یہ سانس بھی گہری ہوتی جاتی ہے ؎

سرِ راہِ محبت آدمی کی سانس کیوں اُکھڑے — نفس کی موج کو دیسے ادائے کم روی اپنی

اسی ادائے کم روی میں حرکت اور سکون کی انتہائی منزلیں چھپی ہوئی ہیں۔

انتخاب اشعار

تو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہوا — اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اُٹھے

چھڑ گئی ان آنکھوں کی بات — دنیا میں اب دن ہے کہ رات!

جینے والے جی لیں گے — اب نہ ملو گے، اچھی بات

ہجر میں پہلی نگاہ کا ذکر — کب یاد آئی کب کی بات

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں — لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

مدتیں گذریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں — اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست! — آہ اب مجھ سے تجھے رنجش بے جا بھی نہیں

شوخئ پرسشش کو بھی نذرِ تغافل کیوں کیا — جورِ پنہاں کو بھی کیوں جورِ نمایاں کر دیا

رنگ بو والو کچھ اس کا درد بھی تم پہ کھلا — جس تبسم نے گلستاں کو گلستاں کر دیا

جو زہر ہلاہل ہے امرت بھی وہی لیکن — معلوم نہیں تجھ کو انداز ہیں پینے کے

میں یہ کہہ کے کرتا ہوں عرض تمنا — نگاہ محبت کے دھوکے نہ کھانا

وہی ہم وہی تم وہی درد لیکن — محبت محبت، زمانا زمانا

دبدبا پیدا کر دے دلوں میں ایمانوں کو دے ٹکرانے — بات وہ کہہ اے عشق کہ سن کر سب قائل ہوں کوئی نہ مانے

امن و اماں کی دنیا میں ایسوں کو کب ملتے ہیں ٹھکانے — کئی بار تو عشق گیا ہے موت کے منہ میں جان بچانے

اسی درد کا گھر گھر چرچا اسی درد سے دنیا غافل — ایک شب غم کی سو راتیں ایک محبت سو افسانے

کبھی برس بھی پڑے گا غم محبت کو — ابھی تو ابر سر کوہسار ہونے دے

لبوں پہ اہل محبت کے ہیں گلے کیا کیا — کرے وہ جور تو منہ اس کا دیکھتے رہ جائیں

کہاں وہ خلوتیں دن رات کی اور اب یہ نوبت ہے — کہ جب ملتے ہیں دل کہتا ہے کوئی تیسرا ہوتا

میں آسمانِ محبت سے رخصتِ شب ہوں — ترا خیال کوئی ڈوبتا ستارا ہے

فراق اپنی محبت پہ ناز کرتے ہو — ہر اک تمہیں سا جو ہوتا جہان مٹ جاتا

تجھ سے حیات عشق نے اُف کیا اثر لیا — ہستی تمام شکر شکایت ہے ان دنوں

جہاں بھی جستجوئے دوست میں ٹھہر جاتے — یقین جان کہ منزل قریب ہی ہوتی

تمہیں تو اہل ہوس امتحاں سے بھاگ چلے — یہ کیا ضرور کہ ہوتی تو موت ہی ہوتی

فراق زندگیٔ غم کے راز کیا کہیے — اگر یہ موت نہ ہوتی تو زندگی ہوتی

کل پھر عشق نہ روٹھ سکے گا — آج منا لے آج منا لے

میں تجھ کو پا کے بھی کچھ منتظر سا ہوں تیرا — یہ دل کا قول ہے تو آپ اپنی آہٹ ہے

اشک سا دیدۂ انجم میں جھلک جاتا ہے — یہ بھی اک راز ہے انسان کی قسمت کی طرح

مشکلیں عشق کی آسان ہوئی جاتی ہیں — تجھ سے چھٹتا ہوں میں چھٹتی ہوئی ہمت کی طرح

چپ ہو گئے تیرے رونے والے — دنیا کا خیال آ گیا ہے

یہ بزم عام بھی اے دوست بزم عام نہیں — نگاہیں اٹھتی ہیں لیکن کسی کسی کے لئے

نہیں نصیب جو رنگینیٔ جمال کو بھی — وہ بانکپن ہے محبت کی سادگی کے لئے

حرارتیں ہیں انداز آتش رخسار　　ترا ڈئیں تری زلفوں کی ابتری کے لئے
جراتِ نشاط کا آغوش ہم سے کھل جاتا　　تو بے قرار ہے کس ربط باطنی کے لئے
احساس دیدہ و دل یہ ہے بدن کو اُسکے　　دیکھیں تو حیرتیں کچھ مانوس ہو رہی ہیں
تمام شبنم و گل ہے وہ سر سے تا بہ قدم　　رکے رکے سے کچھ آنسو رکی رکی سی ہنسی
نکھار اس کے بدن کا فراق کیا کہئے　　ز فرق تا بہ قدم خندہ ہائے زیرِ لبی
جسم تیرا ہے راگ دیپک کا　　تو جو آتا چراغ جل جاتے
وہ رنگ رخ تھا اٹھائی نگاہ جب اس نے　　شراب جیسے چھلکتے چھلکتے رہ جائے
کوئی اس طرح مسکراتا ہے　　چمک اٹھتا ہے جیسے میٹھا درد
حسن کی نرمیوں نے رو دیا ہی　　مسکرانا ترا ہے یاد مجھے
عشق کیا حسن کا خلوص نہاں　　حسن کیا ایک عشق کی جھنکار
جہاں سے دیکھو وہ گویا ہے بول اُٹھنے کو　　وہ جسم سر سے قدم تک تمام جلوۂ رخ
یقین یہ ہے کہ تو سامنے ہے محو سکوت　　گمان یہ ہے کہ کچھ کہہ رہا ہے تو مجھ سے
میں تجھ کو سوچ رہا ہوں کہ دیکھتا ہوں تجھے　　تو سر سے تا بہ قدم ایک خواب مستقبل
رگوں میں گردشِ خوں ہو کہ لے ہو نغمے کی　　وہ زیر و بم کا ہے عالم کہ جسم گاتا ہے
آگاہ ہوں کو ہوش جب اپنا نہیں رہا　　اس دم شعورِ غیب ترا حسن بن گیا
اور ہوئے گا مآل عشق کا رد عمل　　جب بے نیازی بھی دھوکا ہے تو پچھتائیں گے کیا
کسی کے حسن کو آئی ہوئی تھی نیند سی جیسے　　مرے اشعار میں انگڑائیاں لیتا اٹھا کوئی
آنکھیں کس کو دیکھ رہی ہیں　　روشنی، روشنی، اور روشنی!
جہاں سے دیکھ اُسے جیسے آنکھ لگ جائے　　فراق جسم ہے اس کا نگاہِ ناز تمام
بجا یہ ضبط بھی لیکن محبت میں کبھی رو لے　　دبانے کیلئے ہر درد اے ناداں نہیں ہوتا
ترا فراق تو اس دم ترا فراق ہوا　　جب ان سے پیار کیا میں نے جن سے پیار نہیں
کون یہ لے رہا ہے انگڑائی　　آسمانوں کو نیند آتی ہے

دوزخ میں آدمی آئی قیامت
جب یہ کھلا جنت بھی یہی ہے

نثار وعدہ دیدار پھر بھی سوچ یہ ہے
تجھے بھی بھول نہ جاؤں میں دیکھ کر تجھ کو

رہا ہوں عشق میں غمگیں بھی خوش بھی ہوں لیکن
غم و خوشی اسے کہنے میں کچھ تامل ہے

جو دل میں عشق کے ہے آرزوئے لطف و کرم
کسے خبر کہ وہی حسن میں تغافل ہے

زندگی کیا ہے آج اسے اے دوست
سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

میری تنہائیاں بجا لیکن
حسن کا بھی تو کوئی دوست نہیں

تنہائیوں میں اکثر گذرا یہ گماں خود کو
ہم جتنا سمجھتے ہیں کچھ اس سے زیادہ ہیں

جو آئینے میں دکھایا وہی تھا حسن ترا؟
کہ وہ جو اب مرے اشعار میں نمایاں ہے

روپ روئیں بھاگ کھائیں حال دنیا کچھ نہ پوچھ
عشق کو اپنی پڑی ہے یہ عجب اندھیر ہے

وصل کے کچھ لمحوں کی قیمت ہجر کے اجلے آنسو ہیں
حسن سے جو کچھ بھی پایا تھا کوڑی کوڑی ادا کیا

مجھ کو تم کو کیا معلوم وقت کا پانی مر کے بتائے
میں ہوں کتنے پانی میں تم ہو کتنے پانی میں

گریۂ ہجر پہ نہ جا اے دوست
عضو ہیں کر رہیں گے کام اپنا

رہ گئی تلملا کے روح نشاط
ادھ سنا گیت ہے کہ حسن ترا

تو غور و فکر میں دن رات سر کھپائے جا
بڑے خیال مگر دل میں ہوتے ہیں پیدا

حسن کا ماضی کچھ بھی رہا ہو
مستقبل تو عشق کا ہے

مرے اشعار پہ اے دوست تو ہے وجد میں تجھ کو
خبر بھی ہے مرا کیا حال ہے رشک و رقابت سے

آئے نہ نظر لکیر ایسی
نیکی و بدی کے درمیاں ہے

دل کا پُرسا لے رہا ہوں حسن کی باتوں سے آج
ڈبڈباتی ہیں جب آنکھیں مسکرا دیتا ہوں میں

روگ پیدا کر لے کوئی زندگی کے واسطے
صرف صحت کے سہارے زندگی کٹتی نہیں

ہو کے نکما اک مدت سے
عشق کے ٹکڑے توڑ رہا ہوں

تو بھی خوش میں بھی کچھ اداس نہیں
یہ کوئی زندگی نہیں اے دوست

جنس حسن جب سے لٹتے دیکھی دولت والے دوڑ پڑے
قیمت دنیا پڑ جائے تو آٹے دال کا بھاؤ کھلے

نام اُن کا لے کے رہ گئے دیکھا ہے جب انھیں
آ کے وہ آج بھولی ہوئی یاد کی طرح

جھجک تو دور ہوئی ڈر یہ ہے کہیں دل میں
لگا دے آگ نہ تیرا رکا رکا سا تپاک

خطا ہے ناداں یہی تسکین بھی ہو
ترا یہ درد کبھی اپنی یاد بھی ہوگا

نہ گئیں سرگرانیاں تیری
آج یہ مہربانیاں تیری!

اب اتنے پر بھی کیوں رہتی شکایت کس بیری کی
مرے تم ہو گئے مجھ کو بھی گر اپنا بنا لیتے

آہ یہ چشم توجہ تری غفلت آمیز
عشق سرتا بہ قدم شکر شکایت آمیز

دئے جاتا ہوں تیری یاد کو راہ
تجھ کو سو سو طرح بھلاتا ہوں

یونہی سا کچھ وصال و ہجر، لذت عشق، دردِ عشق
آ کے یہاں یہ قرب دوست ہجر دوام بن گیا

دکھا گئی تری قربت مصیبت دوری
بتا گیا ترا کھلنا رکاوٹیں کیا ہیں

جفائے حسن یاد آنا، وفا کا درد سر جانا
ہوس کیا ہے خمار بادۂ الفت اتر جانا

بے وفا تو نہیں اے دوست جسے عشق کہیں
تجھے اس شدت احساس کی برداشت نہیں

ریاض دہر میں بوئے نشاط پھیل گئی
نہال غم کے بھی کیا کیا گل و ثمر نکلے

عجب نہیں کہ جگا دیں تجھے مرے اشعار
سنا کے اِن کو تجھے اٹھ گیا ہوں دنیا سے

ہجر کی شب ترس گئی یوں تو ترے پیام کو
آج مگر فسانۂ دار و رسن سنا دیا

راہ طلب میں وہ نگاہ رہزن بے نیاز ہے
جس نے جہاں صبر و ہوش لوٹ لیا، لٹا دیا

اور نگاہ شوق ہو صرف جمال کس طرح
تیری قسم تجھی پہ آج میں نے تجھے لٹا دیا

نرگس یار میں نہیں دشت و چمن کی وحشتیں
ایک نگاہ ناز نے ہوشِ جنوں اڑا دیا

اس درجہ اختلاط اور اتنی مغائرت
تو میرے اور اپنے کبھی درمیاں بھی ہو

عشق ہی سے ہیں منزلیں آباد
کارواں کارواں پکار بھی ہے

سر بسر غرق نور ہو لیکن
زندگی اکتسابِ نار بھی ہے

آ گیا عشق بدگماں آخر
حسن کے لے کئے بہانوں میں

تھا ذکر کرم فراق اس کا
کیوں آنکھ لگی ہے ڈبڈبانے

آدھا گلزار ہے قفس میں
ویراں پڑے ہیں آشیانے

اک ذرا عشق سبک روح گرانبار سہی
نگہ ناز میں کچھ شرم کے آثار سہی

بڑھ بڑھ کے رہ گئی ہیں دلوں میں محبتیں
اٹھ اٹھ کے آج بیٹھ گئیں ہیں قیامتیں

عشق تو دنیا کا راجا ہے
کس کارن بیراگ لیا ہے

یہ ضبط و اضطراب میں کیا ساز باز ہے
کچھ مختصر بھی ہے شب غم کچھ دراز ہے

غم حیات وہی دور کائنات وہی
جو زندگی نہ بدل دے وہ زندگی کیا ہے

بس اک فریب نظر ہے یہ سب قرار و ثبات
جمود عالم ہستی بھی موج دریا ہے

عشق کے صدق و صفا رشک جہاں ہیں لیکن
کوئی الزام دیا چاہے تو الزام بہت

لب جاناں ہیں پھر تبسم ریز
ہو گئی نبض کائنات بھی تیز

دیکھ رفتار انقلاب فراق
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

تجھ میں کچھ زندگی کا رس بھی نہیں
اے غم عشق تجھ میں جس بھی نہیں

آج اس کی بے خبری سے
پوچھ لے دنیا بھر کا حال

تکیہ چھوڑے مدت گذری
اب تو غم سجادہ نشیں ہے

سر بسر جسم کے امکان میں ہر جاں ہوتا
رگ ہستی کو نہ آیا ابھی لرزاں ہونا

رشک صد لطف و کرم ہر یہ نیا رنگ ستم
کچھ ہیں جان سکے تیرا پشیماں ہونا

کچھ اس کا رنگ رخ سے مل ہی گیا
یہ میرا خون سر تیغ دار یہ نہ سہی

غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

کسی کے دیکھنے والے کسی کو دیکھتے ہیں
اٹھائیں کس لیے زحمت نظر اٹھانے کی

صبح شب فراق ہوئی اور ابھی فراق
بیٹھا ہے اپنے گھر کو کئے رہگذر تری

جام دل کی تہ میں مدت خون ہی اکثر رہی
اپنی قسمت میں کوئی چھلکا ہوا ساغر کہاں

اشاروں پر جنوں کے چل رہے ہیں تیرے زندانی
عجب بے ساختہ پن آج ہے شور سلاسل میں

کوئی جوتا ہے دل سے دو گھڑی صبر جانے دو
تمہیں اگر فراق اب ہیں رہا ہوں بڑی منزل میں

تھوڑی بہت محبت سے کام نہیں چلتا اے دوست
یہ وہ معاملہ ہے جس میں یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں

دھیان آنکھ پھیرنے کے جو آئے ہوئے سے ہیں
یہ نقش بھی تو دل پہ بٹھائے ہوئے سے ہیں

مرہون احتمال نظر ہے حیات عشق
روکے ہوئے ستم بھی تو ڈھائے ہوئے سے ہیں

اہل وفا اب اور نکالیں فنا کی راہ
اہل ہوس بھی خود کو مٹائے ہوئے سے ہیں

اکثر سکوت شب میں اگر غور سے سنیں
آتی ہیں یہ صدائیں ہم آئے ہوئے سے ہیں

حیات عشق کے ہاتھوں ابھی حیات نہیں
غم و خوشی کے لئے آدمی کی ذات نہیں

خطا کے بعد ندامت بھی عشق کو نہ ملی
نگاہ ناز یہ کہتی ہے کوئی بات نہیں

ہماری بت شکنی کے الگ فسانے ہیں
حدیث غزنوی و ذکر سومنات نہیں

اس آئینے سے نہ لڑ جائے تیری آنکھ کہیں
تو اپنے شیشۂ دل پر جلا تو کرتا ہے

شعور عشق کی تکمیل ہو چکی شاید
نہ بھولتا ہے کوئی اب نہ یاد آتا ہے

گر ہوا خاک تو غیرت وہ اکسیر ہے عشق
چھوڑ دیتا ہے وہ ہڈی کو اگر خام رہا

اے سوز عشق اپنے مقدر کو کیا کہوں
جلنے کا غم کسے ہے مگر دل غلط جلا

جنت کے مکینوں کو بھی تم رشک میں لائے
اے اہل جہنم تمہیں جلنا نہیں آیا

شعر نامکمل تھا یہ جہاں اس دم تو
یوں نظر پڑا گویا سامنے کا مصرعہ تھا

فراق اسی کو تو کہتے ہیں عشق کے آثار
ہے دل میں درد بھی آنکھیں بھی کچھ، گلابی ہیں

بس ایک آنچ محبت میں بھی ہے حسن میں بھی
نیاز و ناز ہیں جلنے کے مختلف انداز

فسردگی محبت بھی راز ہے کوئی
جلا دے دونوں جہاں، ہے وہ آگ دل میں دبی

نصیب عشق کی خوبی یہ بیوفائی حسن
وہ جسم قول و قسم ہے تمام کیا کہئے

درد و راحت جب ایک سے فراق
نکھر آئے تو جسم تھا اس کا

تو آئینے میں ذرا وصل کے کرشمے دیکھ
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

شب وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ ذرا
ترے جمال کی معصومیاں نکھر آئیں

اگرچہ خوب ہے دوشیزگی شباب کی بھی
اب آ گئے ہو تو آؤ تمہیں خراب کریں

کبھی دامانِ بادِ صبح بھی آلودہ ہوتا ہے ۔۔۔ بچا لیا ہے حسن نے خود دوشیزگی اپنی

سرِ راہِ محبت آدمی کی سانس کیوں اکھڑے ۔۔۔ نفس کی موج کر دیتی ہے ادا کم رَوی اپنی

اے دوست تجھکو چھیڑیں اس طرح وصل کی شب ۔۔۔ دوشیزگی کو تیری دوشیزگی بنا دیں

بوجھ یہ جلتے جلتے آنسو ۔۔۔ کس برتے پر تتّا پانی

ملتا ہے تو کہاں اب لیکن یہ رو رہا ہوں ۔۔۔ پا کر بھی تجھ کو شاید اب خوش نہ ہو سکوں گا

تنہائیوں میں رہتے ہیں خوش کس طرح فراقؔ ۔۔۔ یہ راز کوئی اس کی طبیعت سے سیکھ لے

علم و عمل کے راز کھلے اہلِ عشق پر ۔۔۔ سو مدرسوں سے بڑھ کے تیرے غم کا مدرسہ

فراقؔ دیکھنے والوں کے کان بجتے ہیں ۔۔۔ جہاں سے دیکھ اسے اک نرم بول پڑے وہ جسم

بیانِ حالِ پریشاں میں تیرا نام آیا ۔۔۔ کچھ اور بڑھ گئیں بے ربطیاں فسانے کی

شہود و غیب کا یہ اتحاد کیا کہنا ۔۔۔ تمام جلوہ گری ہے بدن حجاب تمام

تو جا رہا ہے تو جا، الفراق، شرط یہ ہے ۔۔۔ اگر ملیں تو نہ اک دوسرے کو پہچانیں

صبر و سکوں کے راز کچھ باتوں میں کھل گئے مگر ۔۔۔ عشق کو بھی خوشی نہ تھی حسن بھی شادماں نہ تھا

خوشی کے بھی تھے عناصر مزاج میں لیکن ۔۔۔ بغیر غم کے توازن نہ ہو سکا پیدا

شعور و درک کو گہرا بنا دیا اس نے ۔۔۔ ترا قصور کہ غم کو قنوطیت سمجھا

مزاجِ حسن سے ملتا ہے عشق کا بھی مزاج ۔۔۔ وہ اعتدال و توازن کہاں سے پیدا ہو

یہ میں بھی جانتا ہوں مگر تم نہ یہ کہو ۔۔۔ "میرا مزاج اور تمہارا مزاج اور"

حسین بھی ہو تم اچھے آدمی بھی ہو مگر یہ ہے ۔۔۔ تمہیں اہلِ محبت سے محبت ہے مگر کم کم

زندگی اور واقعاتِ زندگی میں گر فراقؔ ۔۔۔ کچھ ہم آہنگی ہوئی پیدا تو غم ہی سے ہوئی

اک جاگی ہوئی دنیا اک عالمِ حیرت ہے ۔۔۔ ان دونوں کا مل جانا دنیائے محبت ہے

جو بجلیاں ہماری رگوں میں لرزاں جو ہیں ہمارے دلوں میں روشن ۔۔۔ ہمارے کاموں میں بھی وہ شعلے دہکتے ہونگے لپکتے ہونگے

بھلا چکا ہوں تری یاد کو خیال یہ ہے ۔۔۔ کچھ اور سوچ کے شاید اداس ہو جاؤں

میں تیرے آنے سے خوش بھی ہوں کچھ اداس بھی ہوں ۔۔۔ نہ میرا جرم ہے اس میں نہ کچھ قصور ترا

میں دیر تک تجھے خود ہی نہ روکتا لیکن — تو جس طرح سے اٹھا ہے اسی کا شکوہ ہے

ترے خیال میں تیری جفا شریک نہیں — بہت بھلا کے تجھے کر سکا ہوں یاد اس طرح

کسی سے چھٹ سکے یہ تحلیل رنج و غم کی فراق — رہی ہے دیر تک اب پھر اداس ہو جاؤ

اتنی تھوڑی دیر کو ملتے تھے جب تک تم رُکے — بس ابھی سوچا کیا میں اب چلے جاؤ گے تم

ہم تم ملتے تھے لیکن ہو جاتے تھے جلد جدا — دیر تک اب رہتے ہیں جو ساتھ کچھ گھبرا سے جاتے ہیں

دل کو دُکھنے کے آئے اس گھڑی نئے انداز — مل کے تیرے جاتے وقت میں نے جب کہا "اچھا"

کچھ ایسا فرق نہیں دونوں حالتوں میں فراق — بہت اداس رہا ہوں تو شاد بھی ہو لوں

خطاب پھر نہ کیا تیری بے نیازی سے — تھکی تھکی سی وہ عرض وفا ہے یاد مجھے

ہزار طرح ترا حسن حسن ہو کے رہا — وہ ہم تھے عشق کو جو کر سکے نہ عشق کبھی

ترے ہجر میں جی سنبھلتا نہ تھا — جو سوچیں تو کچھ ہی دنوں کی ہے بات

پوچھتے ہیں فائدہ کیا عشق سے — پوچھئے کیا فائدے سے فائدہ

اب کہاں عشق جا کے جان بچائے — موت کے منہ میں بھی پناہ نہیں

ہے یوں تو محبت کہیں پہلے سے زیادہ — کیوں تجھ سے جدا ہو کے بھی رونا نہیں آتا

ایک عمر کے بچھڑے آج ملے ہیں پھر نہ بچھڑنے کو — لیکن تھوڑی دیر کے بعد فرقت کا سا عالم ہے

ہر شخص چاہتا ہے کہ سچ ہو مری طرف — سچ کی طرف مگر کوئی ہوتا ہے شاذ بھی

ہے کامیابی وہ بدنصیبی کہ جس سے کم لوگ بچ سکے ہیں — مگر بہت بدنصیب ہیں جو انہیں بہت جلد ملتی ہے یہ

دنیا میں انہیں کیا کیا نہ ملا دولت، عزت، عشرت، ثروت — پیچیدہ طبیعت والوں کو اک سیدھی سادی خوشی نہ ملی

دنیا میں خوشی کی تلاش بجا برحق یہ خوشی کی کوشش بھی — انسان خوشی کیلئے لیکن پیدا نہ ہوا تھا دنیا میں

وہ جسم زسر تا پا خود عکس خود آئینہ — کچھ اشک کے قطروں میں موجیں ہیں تبسم کی

رنگ رخ کھلا اس طرح آنچ عشق کی کھا کر — پھول جس طرح نکھرے سوکھنے سے شبنم کے

زندگی میں ہر اک کو بس یہی تو حیرت ہے — عمر بھر نہ ہاتھ آئیں سامنے کی چیزیں بھی

نوٹ:- میں نے مندرجہ بالا سطور میں حضرت نیاز فتحپوری کی اس رائے کا ذکر کیا ہے کہ انہیں میری شاعری کی تشنگی کی

طرف سے ڈر معلوم ہوتا ہے کیونکہ میں بجائے ایک اسلوب اور طرز کے کئی اسلوب اختیار کر لیتا ہوں لیکن حضرت نیاز نے اس کی دوسری وجہ بتائی ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں "فراق کی شاعری پختگی سے قبل ایک ایسی حلاوت اپنے اندر رکھتی ہے کہ ہمیں اس کی پختگی کی طرف سے ڈر معلوم ہوتا ہے" یعنی حلاوت کی بیش قیمت صفت جو میرے اشعار میں ہے اور زندگی و محبت پر لطیف و عمیق تبصرہ جس کا ذکر بھی میرے اشعار پر اظہار رائے کرتے وقت حضرت نیاز نے کیا ہے یہ وہ معنوی اور داخلی محاسن ہیں جنھوں نے مجھے اپنے اشعار میں پختگی پیدا کرنے کے باب میں کسی قدر لاپروا کر دیا ہے۔ پختگی سے مراد اشعار میں وہ انتخاب الفاظ کی و نشست الفاظ، بندش کی وہ چستی وہ برجستگی، انداز بیان کا بیک وقت نیا ہونا اور فطری ہونا یعنی لسانی لحاظ سے شعر کا مکمل ہونا ہے۔ میرے مشہور معاصرین میں پختگی کی یہ صفت یگانہ، حسرت، اصغر مرحوم، جوش ملیح آبادی فانی بدایونی، آرزو، ثاقب لکھنوی، جگر مرادآبادی آزاد انصاری اور کچھ حضرات کے یہاں بھی نمایاں طور پر موجود ہے شاید ان حضرات کا تخیل اپنی آخری منزلیں طے کر چکا ہو یہ پوری بات کہتے ہیں میں ان باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہوں جو پوری طرح بیان نہ ہو سکیں۔ میرے اشعار پر اگر آپ نظر ڈالیں گے تو بیان کا یہ رچاؤ یہ سجاوٹ اور نکھار بدلی ہوئی شکل میں نظر آئیں گے میرے اشعار کا حسن ذرا بدن چور ضرور رہے۔ میرے پسندیدہ اشعار میں بھی کئی مقامات پر بجائے قدرت بیان کے عجز بیان کا احساس ہوگا معانی الفاظ پر حاوی نظر آئیں گے شعر کچھ کھویا کھویا سا نظر آئیگا۔ اکثر یہ احساس ہوگا کہ پوری بات یا تو میں کہہ نہیں سکا یا بات ہی ایسی تھی کہ پوری طرح کہی نہ جا سکے کبھی کبھی تو یہ معلوم ہوگا کہ میرے الفاظ معنی کی طرف گونگے اشارے ہیں۔ جہاں معانی میں ماورائیت اور معصومی کے ساتھ انتہا کی نزاکت ہوتی ہے اور وجدان پر ناقابل اظہار حیرت طاری ہو جاتی ہے وہاں معانی اور الفاظ کا ربط نازک سے نازک تر ہو جاتا ہے۔ خود الفاظ میں ایک گم شدگی آنے لگتی ہے۔ حضرت نیاز کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ میری شاعری میں پختگی سے قبل ہی ایک ایسی حلاوت اپنے اندر رکھتی ہے کہ ہمیں اس کی پختگی کی طرف سے ڈر معلوم ہوتا ہے" جیسے پکنے سے پہلے ہی کوئی پھل بہت رسیلا او رمیٹھا ہو جائے پھل کا رنگ روپ ابھی نکھر کر پختہ نہ ہوا ہو اور اندر سے وہ رسسا اٹھے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میری شاعری میں رنگ روپ یعنی بیان کی پختگی کا جتنا امکان ہے وہ پوری طرح ابھی اجاگر نہیں ہوا لیکن میں اس طرف سے لاپروا نہیں ہوں میری شاعری ایک داخلی لگاؤ رکھتی ہے اور وہ اندر سے پختہ اور پختہ تر ہونے والی چیز ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ خارجی پختگی میرے اشعار کی داخلی پختگی کے ساتھ پیدا ہوتی جائے گی۔ داخلی پختگی دیر طلب اور دقت طلب چیز ہے بلکہ ایک بہت دور رس سلسلہ ہے۔ اس کی کوئی منزل آخری منزل نہیں ہے اسی سے میرے الفاظ بھی بجائے مستقل سنگ میل کے غبار راہ معلوم ہوتے ہیں یعنی ذرا ڈانواڈول میری شاعری میں بیان کی پختگی شاید تدریجی طور پر بہت آہستہ آہستہ آ رہی ہے اتنا آہستہ کہ یہ سوچ کر حضرت نیاز کی طرح میں بھی ڈر جاتا ہوں کہ پختگی کبھی آ بھی چکے گی لیکن میرے خوف سے امید کے عناصر بالکل غائب نہیں

(رگھوپتی سہائے صاحب فراق گورکھپوری)

تجلیات

نہ پوچھ گردشِ و نیرنگیٔ جہاں کی خبر
نہیں ہے مجھ کو تو اپنے بھی جسم و جاں کی خبر

اسیرِ عشق کی پوچھو نہ خود فراموشی
کچھ آشیاں کی خبر ہے نہ گلستاں کی خبر

عجیب مستیٔ جاوید دل پہ طاری ہے
بہار کی ہے خبر کچھ نہ کچھ خزاں کی خبر

یہی دعا ہے الٰہی! ہجومِ مستی میں
مری جبیں کو رہے تیرے آستاں کی خبر

وہ ہو رہے ہیں گذر ریاضِ عشرت سے
جنھیں ہوئی ہے مرے دردِ جاوداں کی خبر

یہ کچھ تو بات خراب مئے محبت میں
کہ لا رہا ہے وہ یوں سات آسماں کی خبر

میں اپنی رو میں ہوں دیوانہ وار گرمِ سفر
نہ کارواں کی نہ ہے گردِ کارواں کی خبر

زبانِ شوق و محبت ہے گریۂ خونیں
نہیں ہے اس کو گل افشانیٔ بیاں کی خبر

اثرؔ کے دل میں تری آرزو رہی تا زیست
ہوئی تجھے بھی کچھ اس کے غمِ نہاں کی خبر!

(اثرؔ صہبائی)

جام صہبائی

(۱)

اے شوکت قیصری سے ڈرنے والو! شاہوں کے حضور سجدے کرنے والو!
اللہ کو چھوڑ کر ملا کیا تم کو اک دن میں ہزار بار مرنے والو!

(۲)

اے کاش وہ جان آرزو مل جائے اے کاش وہ خلد رنگ و بو مل جائے!
اس مستی و بے خودی پہ سو ہوش نثار جس مستی و بے خودی میں تو مل جائے!

(۳)

اک جلوۂ نور ہے محبت اے دوست! اک خندۂ حور ہے محبت اے دوست!
کھل جاتے ہیں جس سے دو جہاں کے اسرار وہ کیف و سرور ہے محبت اے دوست!

(۴)

انوار ہیں سرخوشی میں جانے کیا کیا! اسرار ہیں عاشقی میں جانے کیا کیا!
مجھ سے مرے اشعار کی تفسیر نہ پوچھ کہہ جاتا ہوں بیخودی میں جانے کیا کیا!

اثر صہبائی

اسلامی تقویم

اسلامی تقویم کی ابتدا سے ہم چاند کے دیکھنے کے محتاج رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔ چاند کی مرضی کے ہم کیسے کیسے محتاج رہے ہیں۔ انتیس اور تیس کے جھگڑوں پر آپس میں نفاق بھی ہوا ہے ناچاقیاں بھی ہوئی ہیں اور اطمینان تو ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔ چاند کچھ شرمیلا رہتا ہے طرح طرح کے انداز دکھاتا ہے کہیں نقاب سحاب میں ہے تو کہیں سرے سے بالکل غائب۔ ایک جگہ ظاہر ہوتا ہے دوسری جگہ بالکل نہیں۔ غرضکہ اس کا تلون بڑی مصیبتوں پریشانیوں اور دقتوں کا باعث رہا ہے۔ اب تک تو خیر جس طرح اس کی ناز برداری کرتے رہے اور اپنی ناواقفیت کی بنا پر اس کے پابند رہے لیکن اب جبکہ علم ہیئت اس قدر ترقی پذیر ہو چکا ہے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اب بھی اس کے پابند رہیں اور اس کے محتاج رہ کر اس کے منہ دیکھی باتیں کریں۔

علم ہیئت کی رو سے ہر قمری مہینہ تقریباً ۲۹ ½ دن کا ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کہیں چاند ابر غلیظ کی وجہ سے نظر نہ آئے یا کہیں اس قدر باریک ہو کہ دکھائی نہ دے۔ چونکہ اس کی گردش زمین کے گرد محض ۲۷ ⅓ دن کی ہوتی ہے۔ اس لئے گڑبڑ یہ ہوتی ہے کہ کسی خطہ زمین میں تو یہ انتیسویں تاریخ کو نظر آ جاتا ہے اور کہیں تیس کو۔ پورا قمری سال ۳۵۴ دن کا ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ کہ اگر ہم ایک مہینہ انتیس اور ایک تیس کا مقرر کرلیں تو چاند دیکھنے کی پابندی سے نجات پا سکتے ہیں اور اپنے حساب میں زیادہ صحیح رہ سکتے ہیں۔ میں نے جو یہ اعداد پیش کئے ہیں اس میں صحیح گھنٹوں کا حساب چھوڑ دیا گیا ہے لیکن جب اس کا باقاعدہ انتظام کیا جائے تو ان کو اس میں شامل کرنا ضروری ہے اور اس حساب کو اور بھی باقاعدہ کرنا ہوگا۔

لیکن یہ ایک آدمی یا کسی ایک ادارہ کے بس کی چیز نہیں ہے۔ ضرورت ہے مسلمان ہیئت دانوں کی ایک باقاعدہ کمیٹی اس پر غور و خوض کرنے کے لئے بنائی جائے جو اس مسئلہ پر اپنی تحقیقات ملک اور علما کے سامنے پیش کرے۔ میرے خیال میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں یہ کام بہتر ہو سکتا ہے۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ

یونیورسٹی بھی ساتھ ہے وہاں علم جغرافیہ کے کافی ماہرین مجتمع ہیں۔ اس لئے ان کو اس مشکل کو حل کرنے اور اس مسئلہ کو سلجھانے میں آسانی ہوگی۔ یا پھر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اس چیز کو اپنے پروگرام میں لا سکتی ہے۔ دراصل سب سے زیادہ حق مسلم لیگ کو ہے۔ اگر وہ سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ اس قسم کے اصلاحی پروگرام کو اپنے سپرد کرلے تو مسلمانوں کو فائدہ عظیم ہو سکتا ہے۔ میرا مطلب محض اس فہرست کو گنانے سے یہ ہے کہ ایسا کام جب تک باقاعدہ اور ذمہ داری کے ساتھ نہ کیا جائے نتیجہ مقبول عام اور اچھا نہیں ہو سکتا۔

صرف ہندوستان ہی کے اندر نہیں بلکہ تقویم کا معاملہ تو تمام ممالک اسلامیہ سے تعلق رکھتا ہے اس لئے جو کمیٹی یہاں ہندوستان میں بنے وہ دیگر ممالک اسلامیہ کو بھی اپنے اس مقصد و کوشش سے باخبر رکھے نیز ان کی رائیں بھی اس مسئلہ پر طلب کرے۔ اگر تمام ممالک اسلامیہ تقویم کے اس مسئلہ پر توجہ کریں اور اسے درست کرنا چاہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ مسئلہ جلد از جلد طے نہ ہو جائے اور ہمیشہ کے لئے آئندہ نسلیں اس پر عمل نہ کیا کریں۔

سنا ہے حیدرآباد میں اس قسم کی کوشش ہو رہی ہے اور وہ اس طرح کہ وہاں سے ہر صوبہ کو ایک ایک آدمی بھیجا جائیگا تاکہ وہ وہ بذریعہ ٹرنک ٹیلیفون حیدرآباد کو چاند کی رویت یا عدم رویت کے متعلق مطلع کر سکے میرے خیال میں یہ چیز کامیاب نہ ہو سکے گی کیونکہ یہ یقینی ہے کہ چاند اپنی مخصوص گردش کی وجہ سے ہر جگہ انتیس کو دکھائی نہیں دیتا اس کے علاوہ یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ مطلع صاف ہو ایسی صورت میں کیا کیا جائے گا اگر چند صوبوں میں چاند دکھائی دیا اور چند میں نہیں۔ ان دقتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے میرے خیال میں وہی طریقہ اختیار کیا جائے جو میں نے اوپر پیش کیا ہے اور حیدرآباد چونکہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے نیز اس کا اثر ہندوستان کے باہر بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کے لئے بہت موزوں ہوگا اگر وہ ہیئت دانوں کو جمع کرکے ان سے اس مسئلہ پر ایک رپورٹ مرتب کرائے اور اس طرح ایک اسلامی تقویم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بن جائے۔

امید ہے کہ علما بھی اس مسئلہ پر تحقیق سے نظر ڈالیں گے اور ایک اسلامی تقویم کی تعمیر میں سب سے زیادہ عملی قدم اٹھائیں گے اگر انھوں نے اس میں سرگرمی دکھائی تو مجھے قطعی یقین ہے کہ یہ کام جلد تر اور بوجہ احسن انجام پائے گا کیونکہ وہ اتنے بڑے اہم اور اتنے عالمگیر مسئلے کو زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ اور ناسمجھ مذہبی معترضین کو دندان شکن جواب بھی دے سکتے ہیں۔

مصطفےٰ علی صاحب بیرسٹر ایٹ لا۔

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

شہنشاہیت :- مترجمہ جناب مظفر خاں صاحب ظفر یوسفی، مکتبہ برہان نئی دہلی، صفحات ۲۰۰، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت عہ کاغذ کتابت اور طباعت بہت اچھی۔

یہ کتاب مشہور ہندی کتاب "سنسار کی راج نیتی میں سامراجواد کا ننگا ناچ" کا ترجمہ ہے جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوکر مقبول عام ہوچکی ہے۔ آج کل اس قسم کی کتابوں کی اُردو میں بھی بہت ضرورت ہے بلکہ تعجب ہے کہ ابھی تک کیوں شائع نہیں ہوئیں شاید جنگ کے ختم ہو جانے کا ناشرین انتظار کر رہے ہوں تاکہ اس قسم کے مسائل پر مواد مکمل ہوکر سامنے آجائے۔ حالانکہ موجودہ جنگ کے حالات کو دیکھتے ہوئے سرمایہ داری، شہنشاہیت، اشتراکیت اور بحر روم کی پالیسی اور اسی قسم کے دیگر سیاسی مضامین پر کتابوں کا شائع کرنا ملک کی معلومات کو بدرجہ اتم اور بڑے مناسب وقت پر بڑھانا ہوتا۔ مکتبہ برہان نے بہت اچھا کیا کہ ایسے موقع پر ایسی دلچسپ اور با معلومات کتاب کا ترجمہ شائع کیا۔

سرمایہ داری اور شہنشاہیت کس طرح سے ملک، مذہب، تمدن و تہذیب اور انسانیت کی آڑ میں اپنا فائدہ شروع سے کرتی رہی ہے یہ اب کوئی مخفی راز نہیں رہا ہے۔ اس نے ملک، تہذیب اور انسانیت کو فائدہ بھی پہونچایا ہے لیکن یہ فائدہ، فائدہ پہونچانے کی خاطر نہیں پہونچا یا بلکہ ضمناً حاصل ہوگیا۔ دراصل مقصد کسی ایک کی ذاتی منفعت تھا یا چند مشترکہ سرمایہ داروں کا۔ زیر نظر کتاب نے اس قسم کی مکارانہ چالوں کا پول کھولا ہے۔ شہنشاہیت کیا ہے؟ صنعتی انقلاب اور توسیع شہنشاہیت، جس میں تمام ممالک کی شہنشاہی ذہنیت کو آشکارا کیا ہے، شہنشاہیت کے اسٹیج کے کھلاڑی، ۱۹۱۴ء، ۱۸ء کی جنگ عظیم، دور اشتراکیت، فاتحین کی فریب کاریاں، فسطائیت اور نازیت کا دور اور ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۸ء تک کے خاص خاص حالات اس کے خاص ابواب ہیں۔

باوجودیکہ سرمایہ داری کی بہت کچھ مخالفت میں کہا جا سکتا ہے لیکن کسی علمی مسئلہ کو جذباتی نقطۂ نظر سے دیکھنا عصبیت کا الزام وارد کرا دیتا ہے۔ محض موافق واقعات کا انتخاب کر لینا اور ان کو جذباتی اسلوب بیان سے پیش کرنا۔ ایک اچھا جرنلزم تو کہلایا جا سکتا ہے لیکن اچھی تحقیق نہیں۔ زیر نظر کتاب میں صرف یہی کمزوری ہے واقعات کا احاطہ خاصا کیا ہے لیکن ان میں علمی شان نظر نہیں آتی محض ایک کامیاب انتخاب کہا جا سکتا ہے مزید یہ کہ موجودہ جنگ اور اس کے مقاصد کو بھی اگر مترجم صاحب شامل کر لیتے تو کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا اور وقت کی چیز ہو جاتی پھر بھی ان معمولی کمیوں کے باوجود کتاب واقعی دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے

یورپ کی مہابھارت :۔ از مسٹر حامد علی صاحب ایم۔ اے۔ اُردو کلب جامع مسجد دہلی صفحات ۱۰۴ سائز ۱۸/۲۲×۱۸ قیمت ۸ ر، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی۔

حامد علی صاحب نے خواجہ حسن نظامی صاحب کے ایما پر یہ مفید کتاب موجودہ جنگ کے متعلق لکھی ہے۔ شروع جنگ سے جولائی سنہ ۱۹۴۰ء تک کے واقعات کا اچھا احاطہ کیا ہے لیکن زیادہ تر جن کتابوں اور رسالوں سے انھوں نے مدد لی ہے وہ صرف تصویر کا ایک رخ دکھا سکتے تھے۔ صحیح تنقیدی فیصلہ دونوں کے نقطۂ آرا پر بے تعصبانہ دلائل کے بعد آنا چاہئے تھا ورنہ ممکن ہے کہ یہ کتاب مدلل مداحی کے زمرہ میں نہ آ جائے دلچسپ واقعات کی فہرست اچھی دی ہے۔

ترقی کی پہلی سیڑھی :۔ از مسٹر ایس۔ اے خالق صاحب دہلوی، اُردو کلب جامع مسجد دہلی صفحات ۱۴۴ کاغذ معمولی کتابت و طباعت اچھی۔

یہ کتاب بھی خواجہ حسن نظامی صاحب نے طبع کرائی ہے۔ خالق صاحب دہلوی ایک اچھے جرنلسٹ ہیں۔ دلچسپ واقعات یا قصوں سے یہ اپنا ہر مطلب زیادہ بامزہ بنا دیتے ہیں مقصد اس کتاب کا تجارت کو مقبول بنانا اور تجارت کے گر بتانا ہے۔ خالق صاحب اس وادی کے بڑے مسافر رہ چکے ہیں اور ان کو اچھے اچھے اُصول یاد ہیں امید ہے کہ یہ کتاب لوگوں کے لئے مفید ثابت ہو گی۔ صفحہ ۷۰ پر اگر خواجہ صاحب کے قرآن شریف کا اشتہار نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

تعلیمات اقبال:۔ مرتبہ یوسف خاں صاحب سلیم چشتی، شائع کردہ دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور، قیمت عہ، صفحات ۱۳۶

یہ سلسلہ مطبوعات اقبال اکیڈمی کی تیسری کتاب ہے۔ اس میں اقبال کی تعلیمات کا نچوڑ اور ان کی اسلامی خدمات کا مرقع پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شروع میں مولانا عبد المجید صاحب سالک مدیر روزنامہ انقلاب لاہور کا پیش لفظ ہے۔ اس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اقبال ان نفوس قدسیہ میں سے تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے موجودہ دور میں تبلیغ پیغام مصطفوی کے لئے چن لیا تھا۔ مولانا نے اقبال کی اسلامی خدمات کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ہمیں سلیم صاحب کی اس کتاب میں نظر آتی ہے۔ پیش لفظ میں اخباری یا صحافتی اردو کا رنگ ذرا زیادہ ہو گیا ہے تعقل و تعشق وساوس، تمسک، عہود و اعصار، شکست و ریخت، برق و دخان وغیرہ کو اور آسان بنا کر بھی لکھا جا سکتا تھا۔

سلیم صاحب نے اقبال کے کلام کا بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے علامہ مرحوم کی صحبت سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ اقبال کو اپنا مرشد کہتے ہیں۔ اقبال کی تعلیم کو عام کرنا انھوں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد قرار دیا ہے۔ چنانچہ ان کا ارادہ گیارہ چھوٹی چھوٹی کتابوں کے ذریعہ سے اس کام کو پورا کرنے کا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔

مقدمہ کے تین حصے ہیں۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ خودی کا مسئلہ ہر قوم و ملک کے لئے اہم ہے اور ہر قوم نے اپنی صلاحیت و فطرت کے مطابق اس کا حل کیا ہے۔ اقبال چونکہ آب و رنگ والے شاعر نہ تھے بلکہ وہ انداز آفاقی رکھتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اس مسئلہ پر خاص طور سے توجہ کی اور اس کو اپنے فلسفۂ حیات کا مرکز قرار دیا۔ مردہ قوم میں جان ڈالنے کی یہی صورت ان کو نظر آئی۔

آغاز سخن، مقام اقبال کی تشریح سے ہوتا ہے۔ اس میں بہت زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ اقبال صرف شاعر نہیں تھے۔ گویا صرف شاعر ہونا اقبال کی ذلت کا باعث ہے حالانکہ اقبال نے خود اپنے شاعر ہونے پر فخر کیا ہے اور ان کے حیرت انگیز اثر کا باعث ہی آب و رنگ شاعری ہے

ہاں وہ آب و رنگ شاعری کو سب کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ اس سے ایک خاص کام لینا چاہتے تھے۔

اقبال کے پیغام کو سلیم صاحب نے چار عنوانوں میں تقسیم کیا ہے۔ دعوت اسلام، اصلاح عقائد تنبیہات اور ہدایات۔ ان میں سے ہر عنوان کے تحت میں کئی مباحث آگئے ہیں۔ اگرچہ ہر موضوع پر بحث چند اشعار اور چند تمہیدی کلمات سے آگے نہیں بڑھتی۔ غالباً ایک چھوٹی سی کتاب میں اس سے زیادہ تفصیل ممکن بھی نہ تھی

کتاب کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں ہدایات کے عنوان سے اقبال کے بہت سے اچھے اشعار درج کر دئے گئے ہیں۔

سلیم صاحب کی اقبال سے دلچسپی عقیدت کی حد تک پہونچ گئی ہے۔ اس سے کتاب کی ادبی حیثیت کم ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی یہ دور اقبال کی پرستش کا دور ہے۔ اُن پر صحیح تنقید کا وقت بعد میں آئے گا

(س، ۲۰۲)

شعر العرب: مولفہ حکیم محمد ہبۃ اللہ صاحب، ادارہ ترقی تعلیم اسلامی حیدرآباد دکن، صفحات ۳۲ قیمت ۶ر سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ کاغذ اچھا، کتابت و طباعت معمولی۔

یہ چھوٹا سا رسالہ ادارۂ ترقی تعلیم اسلامی حیدرآباد نے شائع کیا ہے واضح ہے کہ اس کا مقصد اس موضوع پر کوئی بسیط کتاب لکھنا نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کو عربی شعر سے روشناس کرانا ہے

شروع میں مطلق شاعری پر مختصر اور سادہ الفاظ میں تبصرہ کیا گیا ہے اور اس کی تاریخ اور خصوصیات بتانے کی کوشش کی گئی ہے اس کے بعد لغت عربیہ پر مختصر نوٹ ہے بعد میں عربی شاعری کے مختلف ادوار قائم کئے گئے ہیں۔ یعنی دورِ جاہلیت، دورِ اسلامی، دورِ عباسی، دورِ حکومت ترکیہ اور نیا دور بعدہٗ غزل، فخریہ کلام، مدح، حکیمانہ کلام اور نیچرل شاعری کا بھی مختصراً تذکرہ کیا گیا ہے۔

لیکن یہ موضوع تو ایسا ہے کہ بغیر بسیط کتاب کے اس سے قطعی تسکین نہیں ہو سکتی۔ ہماری رائے میں ہبۃ اللہ صاحب کو اس موضوع پر سیر حاصل تالیف پیش کرنی چاہئے۔ اُردو میں اس کی بڑی سخت ضرورت ہے۔

شذرات

منظر عالم صاحب سکریٹری انجمن اسلام ریاست گوالیار نے ایک اطلاع نامہ ہمارے پاس بھیجا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود مہاراجہ کے اردو کے موافق ہونے کے وہاں کے حکام میں اُردو کے خلاف اتنی عصبیت پیدا ہو گئی ہے کہ تقریباً ہر محکمہ میں اُردو کے بجائے سنسکرت آمیز ہندی رائج کر رہے ہیں۔

گوالیار ان مشہور ریاستوں میں سے رہی ہے جس نے ہندو مسلم تعلقات ہی بہترین نہیں رکھے ہیں بلکہ فارسی اور اُردو کی پرانی بہی خواہ اور مربی رہی ہے گوالیار میں اردو زبان ایسی زبان ہے جو نہ صرف ہندوؤں مرہٹوں اور مسلمان مردوں کی مادری زبان رہی ہے بلکہ ان ہر سہ مذاہب کی عورتیں اور لڑکیاں بھی اردو کیا معمولی فارسی سے بھی واقف رہی ہیں ایسی حالت میں وہاں سنسکرت آمیز ہندی رائج کر دینا مصلحت اندیشی نہیں۔

ممکن ہے کہ یہ مہاسبھائی ذہنیت زمانہ آئندہ میں چند اور ریاستوں کو بھی اپنا ہمنوا کر لے کیونکہ شخصی ریاستیں جمہوریت کے بجائے عصبیت کا زیادہ لحاظ رکھتی ہیں خصوصاً موجودہ ہندوستانی ریاستیں۔ اپنے وزیروں پر زیادہ اعتماد رکھتی ہیں لیکن یہ واضح ہے کہ کوئی زبان محض سیاسی طاقت پر نہیں بنا کرتی اور آج کل کے معاشی دور میں تو خصوصاً یہ چیز اور بھی زیادہ ناممکن ہو جاتی ہے۔ سیاسی طاقت تو بطرف معاشیات تو مذہبیت سے بھی آج کل بالاتر ہوتی جا رہی ہے ظاہر ہے کہ ایسے دور میں نہ صرف ہندوستان ہی جیسے مختلف النوع اور وسیع ملک میں ایک مخلوط زبان ہو جائیگی جسے الفاظ دیگر اُردو کہیئے بلکہ امید یہ بھی ہے کہ تمام دنیا کی ایک آفاقی زبان زمانہ آئندہ میں ضرور پیدا ہو جائے گی جسے ہم اردو تو ابھی نہیں کہہ سکتے ہیں لیکن وہ ایک مخلوط زبان یقینی ہوگی مختصر یہ کہ موجودہ عہد ایک تجارتی اور معاشیاتی عہد ہے اس میں محض سیاسی یا اکثریت کے زعم میں آکر ایک مصنوعی اور کرخت اور کریہہ الصوت زبان بنا کر رائج کرنے یا چند دیہاتی بولیوں کو رواج دینے سے کسی ملک کی زبان نہیں بدل سکتی جبتک ہندو مسلمان ہندوستان میں قائم ہیں ایک کو دوسرے کی مدد کی ہمیشہ ضرورت رہے گی یہ باہم میل ملاپ معاشیاتی اور تجارتی ضرورتوں کے ماتحت سیاسی ضرورتوں سے ہمیشہ بلند اور زیادہ اہم رہے گا مصنوعی تو دراصل یہ سنسکرت آمیز زبان ہے جسے یہ مہاسبھائی پیدا کر کے رائج کر رہے ہیں یہ ایک فعل عبث ہے جس کی بے اثری کا امید ہے انھیں بہت جلد احساس ہو جائے گا اور جیسا کہ اکثر جگہ انھیں اب بھی ہو رہا ہے۔

ناصبیت

مصنف — شاہد حسین [illegible]

مصنف نے یہ بتایا ہے کہ ناصبیت [illegible]

ہیں۔ یہ سمجھنا کہ ناصبیت کا تعلق شیعوں کی نا سمجھی پیداوار ہے [illegible]

تو ناصبیت خود بخود فنا ہو جائے گی بالکل غلط ہے بلکہ یہی [illegible]

کہ [illegible] ناصبیت کی پیداوار ہے اور یہ [illegible] ایک [illegible]

[illegible] ہے جسے [illegible] پر [illegible] چڑھایا

مصنف نے آخر میں ناصبیت کے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مکتبہ [illegible]

[illegible]

مطبوعات ندوۃ المصنفین

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اسلام کا اقتصادی نظام — مولانا حفظ الرحمٰن صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible]

سوشلزم کی بنیادی حقیقت [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ملنے کا پتہ

[illegible]

نازیت

مصنف [illegible]

مصنف نے یہ بتایا ہے کہ نازیت اور ہٹلر ہم معنی لفظ نہیں ہیں یعنی کہ نازیت محض ہٹلر کی ذہنی پیداوار ہے اور ہٹلر نہ رہے تو نازیت خود بخود ختم ہو جائے گی، بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہٹلر نازیت کی پیداوار ہے اور یہ نظریہ دراصل ایک جدید استعمار کا نتیجہ ہے جسے ہٹلر نے پروان چڑھایا۔

مصنف نے آخر میں نازیت کے اچھے اور برے پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نازیت کا عروج اتفاقاً ایک بحرانی کیفیت میں ہوا ہے اس لئے ہٹلر کے ختم ہونے سے قطع نظر اس کا دم توڑنا مشکل ہے۔ قیمت [illegible]

مکتبہ جامعہ

[illegible]

جامعہ

زیرِادارت:- نورالحسن ہاشمی ایم-اے

جلد ۳۴ نمبر ۴ | بابتہ ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ ۵ر فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی-اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی

ضروری اطلاع

(۱) رسالہ جامعہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے جو تمام خریداروں کے پاس ۵ تاریخ تک ضرور پہنچ جاتا ہے جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ براہِ کرم ۱۵ تک خط لکھ کر دوبارہ دفتر سے منگالیں۔ ۱۵ تاریخ کے بعد رسالہ روانہ نہ کیا جاوے گا۔

(۲) تمام خریداروں کے نمبر خریداری تبدیل ہوگئے ہیں۔ جدید نمبر خریداری ہر رسالے پر پتے کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ براہِ کرم اسے کسی یادداشت میں نوٹ فرمالیجئے۔

(۳) خطوط و منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر مع نام و پتہ ہمیشہ تحریر فرمایا کیجئے جو خطوط بغیر نمبر خریداری کے موصول ہوں گے ان کی تعمیل سے دفتر قطعاً معذور ہوگا جس سے غالباً آپ کو بھی شکایت ہوگی اور ہمیں بھی رنج ہوگا۔

منیجر رسالہ جامعہ، دہلی

ہماری تعلیم کے دو رخ

ہماری ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم میں ایسے اصولی نقائص پائے جاتے ہیں جن سے ہماری انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں پر مہلک اثر پڑ رہا ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ ایک ہی چیز کے نہ ہونے سے ہماری ابتدائی تعلیم نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے اور اسی چیز کے ضرورت سے زیادہ ہو جانے کی بنا پر ہماری اعلیٰ تعلیم کشمکش حیات میں بیکار ہو کر رہ گئی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ذیل کی چند سطروں میں پیش کی جاتی ہے۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ ہمارے بزرگ نئی تعلیم سے بھاگتے تھے اور خانقاہوں اور مکتبوں میں "بغدادی قاعدہ" سے شروع کر کے "میزان الصرف"، "کریما" اور "انوار سہیلی" سے گذرتے ہوئے "دُرّہ نادرہ" اور "سبعہ معلقہ" پر پہونچتے اور پھر فارغ التحصیل ہونے کی سند حاصل کر کے دستار فضیلت سر پر باندھے پھرتے رہتے تھے۔ ان "علماء" سے مسجدیں تو شاید آباد تھیں لیکن فراہمی روزگار کے جتنے دروازے تھے ان پر بند تھے۔ اس وقت قوم کے رہنماؤں اور زمانہ کے نبض شناسوں نے تاکید کی کہ اگر یہاں زندہ رہنا ہے تو "لندن جاؤ اور انگریزی پڑھو" یا لندن نہ جا سکو تو بہرحال انگریزی ضرور پڑھو۔ پھر یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ ہر جدید شے لذیذ ہوتی ہے یہ نسخہ جو ہمارے ہاتھ لگا تو ہم نے اس کا ایسا استعمال کیا کہ مرض تو شاید گیا ہو یا نہ گیا ہو لیکن مریض تو دین اور دنیا دونوں سے جاتا رہا۔ ابتدا کھاتے پیتے گھرانوں سے ہوئی اب ان کی دیکھا دیکھی متوسط طبقہ اور معمولی خاندانوں میں بھی یہ رواج بڑھتا جاتا ہے۔ بچہ ایک دو سال کا ہوتے ہی اس پر والدین کی حیثیت کے مطابق "گورنس" (Governess)، "نرس" یا "آیا" مقرر کر دی جاتی ہیں جو نہ صرف ہمارے مذہبی عقائد اور تمدنی روایات سے بلکہ شریف گھرانوں کے رسم و رواج سے بھی ناواقف ہوتی ہیں، یا ناواقفیت جتلانا اپنے پیشہ کی بقا اور ترقی کے لئے ضروری سمجھتی ہیں۔ کیوں کہ ان کا تقرر ہی اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہ بچے کے دماغ میں مغربی خیالات جما دیں اور اس کو سمندر پار کے طرز بود و رہائش کا عادی بنا دیں۔ ظاہر ہے کہ ان "آیا لوگ" کے ساتھ رات دن گذارتے ہوئے بچے نے خدا اور رسول کا نام کبھی کاہے کو سنا ہوگا اور اپنی قوم کی قدیم یا جدید تاریخ اور تہذیب کی کوئی بات اس کے کانوں تک کبھی

کیوں پہونچی ہوگی۔ ان میں سے اکثر والدین کی تو یہ تمنا ہوتی ہے کہ ان کا بچہ شکسپیر نہیں تو کم از کم برنارڈ شا ضرور ہو جائے۔ اس لئے گھر کے تمام رہنے والے آپس میں عام طور پر اور بچہ کے سامنے خاص طور پر انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں تاکہ بچہ کی گھٹی میں ہی۔ اے۔ بی۔ سی۔ ڈی پڑ جائے۔ اور برخوردار کی زبان کھلے تو چٹ پٹ انگریزی بولنے لگیں اور بوڑھی دادی کی بات کو جانوروں کی بولی کی طرح سمجھ نہ سکیں

بچہ کی عمر مدرسہ جانے کے قابل ہوئی تو سب سے پہلے کسی "کانونٹ" یا مشن سکول کی تلاش ہوتی ہے جہاں کی فضا خالص مغربیت سے بھری ہوئی ہو اور جہاں اپنے مذہب، اپنے رواج اور اپنی زبان کی ہوا بھی لگنے نہ پائے۔ لڑکوں کی عمر کا سب سے اثر پذیر حصہ جب اس ماحول میں گذرے گا تو اس میں سے فارغ ہو کر نکلنے والے لڑکوں سے قوم اور جماعت کو کیا توقع ہو سکتی ہے۔ خاندان والوں کو اس پر فخر ہوتا ہے کہ ان کا لڑکا انگریزی میں فصیح گفتگو کر سکتا ہے۔ اس کا لب ولہجہ بالکل انگریزوں کا سا ہے (Scriptures) اسے لفظ بلفظ حفظ ہیں، ۱۰۶۶ء سے آج تک کی ساری تاریخ انگلستان پر دہ عبور رکھتا ہے۔ یورپ کے ہر دریا کا طول وعرض اسے معلوم ہے۔ اس کی طرف شاید والدین کی کبھی نظر نہیں پڑتی کہ صاحبزادہ کو اپنے مذہب، اپنی قوم اور اپنے ملک کے متعلق کچھ بھی معلومات حاصل نہیں ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ پیغمبر اسلام کس زمانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم کے بنیادی اصول کیا ہیں؛ خلفائے راشدین کون تھے؛ اسلام کہاں کہاں پھیلا اور اس کی ترقی کے اسباب کیا تھے؛ ہماری تاریخ کے اہم دور کیا ہیں۔ اور آج کل کن چیزوں کی کمی نے ہمیں علم وہنر اور مال ودولت کے لحاظ سے ہمسایہ قوموں کی بہ نسبت کمتر کر رکھا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ان "اسکولوں" میں پڑھنے والے صاحبزادوں کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ بھی کسی قوم کے فرد ہیں اور ان کی قوم کی حالت زار زبوں ہے۔ ان کی حد نظر صرف خاندان کے ان افراد تک اور اپنے حلقہ کے ان نوجوانوں تک ہوتی ہے جو ان سے قریبی تعلق رکھتے ہیں اور جو انھیں کی طرح فارغ البالی اور عیش وعشرت کے ساتھ زندگی گذار رہے ہیں۔ اپنی جماعت کی کمزوری کا علم اس لئے انھیں نہیں ہوتا کہ خدا کے فضل سے ان کے والدین دولتمند ہیں اور اس لئے ان کی ہر حاجت رفع ہو جاتی اور ان کی منہ مانگی مراد بر آتی ہے۔ اگر اتفاقاً کبھی ان کی نظر اپنی جماعت کی تباہی پر پڑ جاتی ہے تو ان کا دل ٹس سے مس

نہیں ہوتا کیونکہ بہر حال وہ اور ان کے خاندان کے لوگ بخیر و عافیت ہیں۔ اب انھیں کون سمجھائے کہ جب ان کی جماعت کے اکثر افراد تباہ و برباد ہو جائیں گے تو وہ کس کے بل بوتے پر عیش و عشرت کریں گے اور پھر انھیں کون چین سے رہنے دے گا۔

یہ تو ہوا ان سکولوں کے تعلیم یافتہ لڑکوں کا معاشرتی پس منظر۔ اب ذرا اس پر توجہ کیجئے کہ ان کی تعلیمی حالت کیا ہوتی ہے اور ان کی زندگی کے اقدار کیا ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی لکھنا پڑھنا انھیں ایک حد تک آجاتا ہے۔ اور اس زبان میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں جن میں سوائے انہی روزمرہ پیش آنے والے واقعات کے کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوتی۔ ان کی زندگی کی لذتیں زیادہ تر یہی ہوتی ہیں کہ نفیس لباس پہنیں، جدید ترین ماڈل کی موٹر گاڑیوں میں سواری کریں۔ زیادہ سے زیادہ تعداد میں سینما اور تماشے دیکھیں اور آئے دن بمبئی، کلکتہ یا مری کی سیر کریں۔ علمی اور ادبی کتابوں کا تو کیا ذکر کوئی معمولی ناول بھی ان کے ہاتھوں میں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ کتابوں سے دلچسپی پیدا کرنے اور لطف اٹھانے کا فن انھیں آتا ہی نہیں اور پھر غیر زبان آخر غیر زبان ہی ہے۔ اس نوعمری میں کسی غیر زبان کی اعلیٰ پایہ کی کتابوں کا سمجھنا اور ان سے لطف اٹھانا ان کی بساط سے باہر ہے۔ ہر زبان کا ادب اس زبان بولنے والی قوم کے تمدن اور اس کی روایتوں اور تاریخ کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ہمارے نونہال انگریزی مصنفوں کی تلمیحیں تمثیلیں اور استعارے کیسے سمجھ سکتے ہیں جو ان کتابوں سے محظوظ ہو سکیں۔ پس اگر روزانہ کی سیر و تفریح سے وہ اکتا جائیں تو ان کے مبلغ علم میں کوئی اور ایسی چیز نہیں ہوتی کہ انھیں اپنی طرف کھینچ سکے کسی انسان کی اور خصوصاً ایک ناتجربہ کار نوعمر شخص کی زندگی میں یہ نفسیاتی کیفیت کس حد تک خطرناک ہوتی ہے اس کی تشریح کا یہ موقع نہیں لیکن میرا یہ خیال ہے کہ اکثر سمجھدار والدین اس کیفیت سے ناواقف نہیں۔

ادھر یہ حال اور پھر اس پر طرہ یہ کہ خود اپنی زبان سے انھیں عار ہے۔ وہی ٹوٹے پھوٹے دو چار جملے گھر میں یا باہر اتفاقاً سیکھ لئے ہوں تو ہوں ورنہ لکھنا پڑھنا تو درکنار وہ چند منٹ مسلسل گفتگو بھی نہیں کر سکتے۔ دوستوں اور ملاقاتیوں سے والدین فخریہ طور پر کہا کرتے ہیں کہ برخوردار کو اردو نہیں آتی لیکن ماشاء اللہ انگریزی میں طاق ہے کہ اچھے اچھے انگریزوں کو مات کر دے۔ اگر کوئی ان بھلے مانسوں اور ان سکولوں میں تعلیم دینے والے

"صاحب نما" استادوں سے یہ نہیں پوچھا کہ حضرت انگلستان میں اگر کوئی انگریز لڑکا فرنچ زبان اچھی طرح جانتا ہو لیکن انگریزی زبان گنواروں کی طرح بولے تو یہ آپ کے صاحب بہادر اس کو کیا کہیں گے تعلیم یافتہ مہذب تو بہرحال نہیں سمجھیں گے نا؟ پھر آپ نے اپنے صاحب زادوں کا یہ کیا حال کر رکھا ہے کہ کوئی قسمت کا مارا ناواقفیت کی بنا پر ان کے سامنے کبھی غالبؔ یا حالیؔ کا ایک شعر پڑھے تو ایسا محسوس کرنے لگتا ہے گویا بھینس کے آگے بین بجا رہا ہے!

سچ پوچھئے تو میں نئی نسل کے اِن افراد کو بڑا بدقسمت سمجھتا ہوں کہ وہ اس انتہائی لذت و سرور سے ناآشنا ہیں جو ہمارے ادب کے جواہر پاروں کو پڑھ کر اور سمجھ کر انھیں حاصل ہو سکتی تھی اور جس کو وہ ہوٹلوں اور تماشا خانوں میں بے سود تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ان سطحی اور جلد فنا ہو جانے والی لذتوں میں وہ اسی لئے اُلجھے رہتے ہیں کہ ان کے سامنے زندگی کی کوئی اعلیٰ اقدار نہیں اور وہ کوئی گہری اور دیرپا لذت حاصل کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

اگر ان نوجوانوں میں کچھ بھی سمجھ ہوتی تو وہ اپنے سرپرستوں سے اس کا گلہ کرتے کہ کیوں ان کو اس پیدائشی حق سے محروم کر دیا گیا۔ آپ غور تو فرمائیے کہ علم و ادب کے کیسے انمول خزانے ہیں جو ان پر ہمیشہ کے لئے بند ہیں اور ان کی بدبختی پر آنسو بہائیے کہ وہ لاہوتی کیفیت ان کے قلب پر کبھی طاری نہیں ہوتی جو سعدیؔ یا اقبالؔ کے ایک شعر پڑھنے سے کسی مردِ خدا پر طاری ہو جاتی ہے۔

یہ تو ان نوجوانوں کا انفرادی نقصان ہے لیکن اس سے کہیں بڑھ کر وہ اجتماعی نقصان ہے جو قوم اور جماعت پر ان نوجوانوں کی زندگیوں کے بیکار ہو جانے کی وجہ سے عائد ہوتا ہے۔ ان کی سطحیت پسندی اور قدیم اور جدید علوم سے ناواقفیت اِنھیں مادیت اور الحاد کی طرف لے جاتی ہے اور اس طرح ان کے وجود سے جماعت کو تقویت ہونے کی بجائے اس کی جڑیں کمزور ہونے لگتی ہیں۔ اس کے ذمہ دار یہ نوجوان نہیں بلکہ ان کے والدین اور سرپرست ہیں جن کی فرنگیت میں مبتلا ذہنیت ہمیشہ صاحب بہادری کے خواب دیکھا کرتی ہے۔ اور اولاد کی تعلیم و تربیت میں بھی ان سے غلط اصول کی پابندی کرواتی ہے۔

غیر زبان کے سیکھنے میں معمول سے زیادہ دشواریاں پیش آتی ہیں تو بچہ میں احساس کمتری پیدا ہونے لگتا ہے جو نہ صرف اس ابتدائی منزل پر بلکہ اس کی نشو و نما کے بعد کی منزلوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور بچہ کی ذہنی ترقی کو بڑی حد تک روک دیتا ہے۔ ایک عرصہ کے مشاہدہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جو لڑکا

اپنی زبان اور قواعد سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے اس کے لئے غیر زبانوں کا سیکھنا بھی کافی سہل ہو جاتا ہے۔ اسلئے میری رائے ہے کہ بچہ کی تعلیمی عمر کے ابتدائی سال کلیتاً اپنی زبان کے سیکھنے کے لئے وقف ہونے چاہئیں اور کم سے کم پرائمری منزل میں یعنی تقریباً آٹھ نو سال کی عمر تک کوئی غیر زبان نہیں سکھانی چاہئے بلکہ اگر غیر زبانوں کی تعلیم کو فوقانی جماعتوں تک یعنی بارہ تیرہ سال کی عمر تک ملتوی رکھا جا سکے تو اور بھی بہتر ہے۔ اس طرح جو وقت بچ رہے گا وہ اپنی زبان کے اچھی طرح سیکھنے میں استعمال کیا جا سکتا ہے تاکہ کالج اور جامعہ کی تعلیم کے زمانہ میں زبان کے سیکھنے پر وقت صرف نہ ہو۔ فوقانی درجوں میں غیر زبانیں سکھلائی جا سکتی ہیں لیکن اس میں بھی پہلے ہی سے ایسی زبانوں کی تعلیم کے مقصد کو معین کر لینا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ہر لڑکے کو ہم کسی غیر زبان کا ادیب، ماہر یا انشا پرداز نہیں بنا سکتے اور نہ بنانا چاہتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ کافی ہے کہ ہمارا ایک اوسط طالب علم وقت ضرورت اس زبان میں کاربراری کر سکے یعنی جامعہ کی تعلیم ختم کرنے تک اسے یہ زبان اس حد تک آ جائے کہ وہ کسی علم و فن کی کتاب کو اچھی طرح سمجھ سکے اور اس زبان میں خط و کتابت کر سکے یہاں میرا مطلب ایک عام طالب علم سے ہے۔ ظاہر ہے کہ چند طالب علم اپنے رجحان اور مذاق کے مطابق اس زبان کی اعلیٰ تعلیم حاصل کریں گے۔ ہمارے تعلیمی نظام میں ان چند طالب علموں کے لئے بھی اپنے شوق کو پورا کرنے کا انتظام ہونا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے ہاں غیر زبانوں کی موجودہ تعلیم میں یہی بڑا نقص ہے۔ اول تو ابتدائی جماعتوں ہی سے متعلم کو غیر زبان سکھائی جانے لگتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہنس کی چال چلنے میں اپنی چال بھی بھول جاتا ہے۔ غیر زبان پر تو وہ کیا خاک مہارت حاصل کر سکتا ہے اپنی زبان بھی اسے اچھی طرح نہیں آتی۔ پھر کوشش ہوتی ہے کہ ہر طالب علم کو اس زبان کی ابتدا اور انتہا سب کچھ معلوم ہو جائے۔ جو لوگ اس تعلیمی نظام سے گذر چکے ہیں وہ گواہی دے سکتے ہیں کہ ان کی تعلیمی عمر کا ایک بہت بڑا حصہ اسی غیر زبان کی نام نہاد مہارت حاصل کرنے میں صرف ہو جاتا ہے جو زیادہ مفید طور پر کسی علم یا فن کی مہارت حاصل کرنے میں صرف ہو سکتا تھا۔ اگر اور قوموں کی مثال دینا یا ان کے نظام تعلیم سے استدلال کرنا ضروری ہی سمجھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام تمدن یافتہ قومیں اسی اصول پر عمل کرتی ہیں۔ یعنی ہر ملک میں یہی قاعدہ رائج ہے کہ تمام بچوں کو ابتدا میں صرف اپنی زبان سکھائی جائے اور اپنی روایات بتلائی جائیں۔ ہم نے انگلستان میں کہیں نہیں دیکھا کہ پرائمری یا

ثانوی مدرسوں میں تمام بچوں کو فریج پڑھائی جاتی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے لئے موجودہ حالات کے تحت بعض غیرزبانوں کا سیکھنا ناگزیر ہے لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے یہ تعلیم دس بارہ برس کی عمر سے پہلے نہیں شروع کرنی چاہئے اور وہ بھی اس حد تک جس کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے۔

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے واضح ہوگیا ہوگا کہ ہمارے بچوں کی ابتدائی تعلیم میں غیرزبانوں کے سیکھنے پر اور غیرقوموں کی سیاسی اور معاشرتی روایات کے واقف کرانے پر جو زور دیا جاتا ہے اس کی وجہ سے لڑکوں کی توانائی کا اکثر حصہ ضائع ہوجاتا ہے اور اس کے علاوہ ان کی ذہنیت اور فطرت پر اس کا جو اثر پڑتا ہے وہ انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے سخت مضر ہے۔ اس ابتدائی تنزل میں ہمارے متعلم اپنی زبان اور ادب سے بڑی حد تک ناواقف ہوتے ہیں یہ تو تھا تفریط کا درجہ۔ اب اس کے دوسرے رُخ یعنی تعلیم کے اعلیٰ مدارج پر غور کریں تو ہمیں اسی چیز کی افراط نظر آئے گی۔ کالجوں اور جامعات میں ہم اکثر طلبا کو زبان ادب یا تاریخ اور قانون کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں جس کا اثر یہ ہے کہ ہمارے اکثر نوجوان شاعری مضمون نگاری اور لیڈری کر رہے ہیں اور جسے دیکھو شہرت کا طالب یا رونق محفل بننے کا آرزومند نظر آرہا ہے۔ میں یہاں اس سے بحث نہیں کروں گا کہ یہ چیزیں بذات خود اچھی ہیں یا نہیں۔ زبان و ادب کے متعلق میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ میرے دل میں ان کی کس قدر وقعت ہے۔ یہاں میں صرف یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آیا اس وقت جامعات میں ہمارے نوجوانوں کی بڑی تعداد زبان اور ادب، تاریخ اور قانون کی تعلیم حاصل کرے یا سائنس، ٹکنالوجی، طب اور صنعت و حرفت میں مہارت حاصل کرے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا تاریخ اور ادب وغیرہ میں بی۔ اے، ایم۔ اے کی حد تک معلومات حاصل کرنے کے لئے جامعہ کی تعلیم کے چار پانچ سال وقف کرنا ضروری ہے، کیا یہ معلومات ایک اوسط دل و دماغ کے انسان کو خانگی طور پر فرصت کے اوقات میں مطالعہ سے نہیں حاصل ہوسکتیں؟ قدیم زمانہ کا تو کیا ذکر ہے، کیا موجودہ زمانہ کے بڑے بڑے ادیب اور انشاپرداز سب کے سب یا بڑی تعداد میں جامعات کے ڈگری یافتہ ہیں؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ہر ملک کے تمام نہیں تو اکثر ادیبوں، شاعروں اور مضمون نگاروں نے جامعات کے باہر رہ کر ہی بقائے دوام حاصل کی ہے؟ اس بیان سے میرا مقصد قطعاً یہ نہیں ہے کہ جامعات میں تاریخ ادب اور زبانوں

وغیرہ کی تعلیم اور تحقیق کا انتظام نہ کیا جائے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں ہر علم و فن کے لئے پورا انتظام
ہونا چاہیئے۔ تاکہ اگر معدودے چند افراد بھی کسی علم سے واقعی ذوق یا شغف رکھتے ہیں تو وہ اپنے شوق کی
تکمیل کر سکیں۔ مجھے جو کچھ اختلاف ہے وہ اس امر سے ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد اپنی سیکھنے
اور سمجھنے کی عمر نیچر پر قابو حاصل کرنے کی ترکیبوں سے واقف ہونے اور ان کو دریافت کرنے کی بجائے
سکندر اعظم کی زندگی کے واقعات پڑھنے یا گجرات میں کسی زبان کے ارتقا کا کھوج لگانے میں صرف
کر دے۔ بے شک سکندر کی زندگی سے بہت کچھ سبق سیکھ سکتے ہیں اور گجرات میں زبان کے ارتقا سے
واقفیت ہمیں اپنی زبان کی ماہیت سکھلاتی ہے لیکن کیا گھر میں بیٹھے ہوئے فرصت کے اوقات میں ماہرین
کی کتابیں پڑھ کر ہم یہ معلومات حاصل نہیں کر سکتے؟ مدرسہ کی تعلیم کا اس کے علاوہ اور کیا مقصد ہوتا ہے۔
کہ ہمیں اس قسم کی معلومات حاصل کرنے کے قابل بنا دے؟ مدرسہ کی تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی اگر ایک طالب العلم
اپنی زبان میں لکھی ہوئی تاریخ، سیاسیات، ادب اور قانون کی کتابیں خود پڑھ کر سمجھ نہ سکے تو مدرسہ کی ساری
تعلیم سے کیا حاصل؟ البتہ چند لوگ جو ان علوم سے حقیقی شوق رکھتے ہیں اور ان میں تحقیق کرنے اور اضافہ
کرنے کی خواہش اور صلاحیت رکھتے ہیں وہ جامعات میں ضرور ان چیزوں کی طرف رجوع ہوں لیکن
ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوگی اور استادوں، والدین، ارباب جامعہ اور حکومت کا یہ فرض ہونا چاہیئے
کہ ان علوم سے واقعی دلچسپی رکھنے اور ان میں تحقیقی کام کرنے کی صلاحیت رکھنے والوں کو پہچاننے
کے طریقے معلوم کریں اور سوائے ایسے طالب علموں کے دوسروں کو ان جماعتوں میں داخل ہونے کی
اجازت نہ دیں۔ کیونکہ ان دوسرے طالب علموں کو ان علوم کا بی اے، ایم اے بنانا نہ صرف ان کا انفرادی
نقصان ہے بلکہ قومی نقصان بھی ہے۔ انفرادی نقصان اس طرح کہ جو معلومات وہ خود ذاتی طور پر بھی
حاصل کر سکتے تھے وہی معلومات انھوں نے جامعہ میں حاصل کیں حالانکہ اسی زمانہ میں وہ جامعہ میں ایسے
ہنر سیکھ سکتے تھے جو کوئی انسان خانگی طور پر نہیں حاصل کر سکتا۔ قومی نقصان اس طرح کہ اگر یہی طالب العلم
جامعہ میں سائنسی اور فنی تعلیم حاصل کرتے جو خانگی طور پر محال ہے تو ان میں سے چند ایک افراد کی
ایجادوں اور انکشافوں سے ملک اور قوم کو فائدہ ہوتا۔

اس موقع پر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سر مورس گوائر نے حال میں جامعہ عثمانیہ کے تقسیم اسناد کے موقع پر جو خطبہ دیا ہے اس میں موصوف نے جامعہ میں تاریخ اور سیاسیات کی تعلیم پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے حالانکہ اگر وہ کسی قدر غور فرماتے تو ان پر روشن ہو جاتا کہ وقت اور زمانہ کی ضرورت یہ ہے کہ سائنس اور فنی تعلیم کی اہمیت جتلائی جائے۔ تاریخ اور ادب، قانون اور سیاسیات کی ان معلومات کو حاصل کرنے کے لئے جو ان علوم کے اوسط درجہ کے گریجویٹ میں پائی جاتی ہیں اچھے کتب خانوں کا وجود کافی ہے جہاں سے وہ معیاری کتابیں کافی تعداد میں گھر لے جا کر مطالعہ کر سکیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس اوسط درجہ کے گریجویٹ کو پیدا کرنے کے لئے یونیورسٹی کے پیچ در پیچ نظام کی کیا ضرورت ہے۔ اگر یہ انتظام ناگزیر ہے تو پھر ایچ جی ویلس اور برٹرانڈ رسل جیسے افراد کے لئے کیسے ممکن ہو سکا کہ جامعہ میں سائنس اور ریاضی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تاریخ، معاشیات اور عمرانیات اور طریقہ تعلیم وغیرہ پر معیاری کام کر سکیں

حاصل کلام یہ کہ میری رائے میں ارباب تعلیم کی یہ پالیسی جس کے تحت جامعہ میں داخلے کے وقت سائنس پڑھنے والے طلباء کی تعداد محدود کر دی جاتی ہے اور تاریخ و ادب وغیرہ پڑھنے والے طلبا کی تعداد پر کوئی حد بندی عائد نہیں کی جاتی وقت کے متضاد اور ملک و قوم کی ضرورت کے منافی ہے بلکہ حقیقت میں عمل اس کے برعکس ہونا چاہئے یعنی یہ اصول بنانا چاہئے کہ صرف چند طلبا کو جو خاص رجحان اور صلاحیت ثابت کر سکیں جامعہ میں تاریخ و ادب وغیرہ کے شعبوں میں داخلہ کی اجازت دی جائے اور باقی تمام طلبا کو مختلف سائنسوں اور فنون (فن بمعنی ٹکنالوجی) کی تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب کیا جائے، شاعر، مضمون نگار، لیڈر اور سیاسی رہنما ویسے بھی ہماری قوم میں کافی سے زیادہ ہیں ہماری سب سے بڑی ضرورت اس وقت یہ ہے کہ ہم میں سائنس اور فن جاننے والے زیادہ سے زیادہ تعداد میں موجود ہوں تاکہ ان ہی میں ماہرین کی ایک جماعت نکل سکے۔ ظاہر ہے کہ ابتدا ہی میں سائنس پڑھنے والوں کی تعداد کو محدود کر دیا جائے تو آخری یعنی تحقیقی کام کرنے کی منزل پر پہونچتے پہونچتے طلبا کی تعداد کتنی کم رہ جائے گی پھر کیا تعجب ہے کہ ہمارے ہاں ماہرین سائنس کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ اور اگر اکا دکا ہیں بھی تو وہ ہماری قومی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ ممکن ہے کوئی صاحب اعتراض کریں کہ بہت

سے طلبا میں سائنس پڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور نہ وہ سائنس سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میٹرک تک تو سائنس پڑھائی ہی نہیں جاتی یا اگر پڑھائی جاتی ہے تو بالکل ابتدائی چیزیں پھر کیسے قیاس کر لیا گیا کہ عام طلبا کو سائنس سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ کیا کسی علم کی مبادیات کسی ایک طالب علم کے لئے بھی دلچسپ ہوتی ہیں؟ ہم نے تو آج تک ایک انسان بھی ایسا نہیں دیکھا جس پر الف، بے سیکھتے وقت یا گردانیں یاد کرتے وقت ذوق و شوق کے مارے جذب اور وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہو!

جامعات میں سائنس کے پڑھنے والوں کے مقابلہ میں تاریخ و ادب وغیرہ پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ ہونے کے چند اسباب ہیں۔ اول تو ارباب تعلیم کی یہی پالیسی جو ہم نے اوپر بیان کی ہے اور جس کی بنا پر شروع سے ہی سائنس پڑھنے والوں کی تعداد محدود کر دی جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ملک کی فضا ابھی عام طور پر سائنسی نہیں ہوئی ہے جس کی وجہ سے محفلوں میں شاعری اور لفاظی کرنے والوں کی قدر منزلت زیادہ ہوتی ہے۔ حلقۂ احباب میں بھی محفل گرمانے والے دوستوں کی بڑی آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ پھر چونکہ شہرت اور ہر دلعزیزی کی تمنا ہر فرد بشر کے دل میں کم و بیش پائی جاتی ہے اس لئے نوجوان عام طور پر وہی مضمون چننا چاہتے ہیں جن سے شہرت ہر دلعزیزی حاصل کرنے میں مدد ملے۔ اس عام رجحان پر غالب آنے کے لئے ضروری ہے کہ اہل ملک کی ذہنیت سائنسی یعنی حقیقی معنوں میں حکیمانہ بنائی جائے تاکہ لوگ سطحی باتوں سے مرعوب نہ ہوں اور چرب زبانی کے مظاہرے کرنے کی بجائے قدرت کے اسرار کا کھوج لگانے میں زیادہ محو ہو جائیں

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

علم اشیا علم الاسماستے ہم عصا و ہم ید بیضاستے

علم اشیا داد مغرب را فروغ حکمت او ماست می بندد ز دوغ (اقبالؔ)

ایک تیسری اور اہم وجہ سائنس کے مضامین پر دوسرے مضامین کو ترجیح دینے کی یہ ہوتی ہے کہ سول سروس اور اسی قسم کے دوسرے مقابلے کے امتحانوں میں جو حکومت کی طرف سے لئے جاتے ہیں اور جن میں کامیابی کی بنا پر اعلیٰ ترین عہدے سرفراز ہوتے ہیں آرٹس کے طالب علم سائنس کے طالب علموں سے زیادہ نمبر حاصل کرتے ہیں کیونکہ ایسے امتحانوں میں ساری قابلیت کا معیار تقریر اور تحریر کی نوشت ہے یہی

سمجھ میں اب تک نہیں آسکا کہ محض اردو یا انگریزی میں اچھا لکھنا، اچھا بولنا، حکومت کے کاروبار میں کہاں تک ممد و معاون ہو سکتا ہے۔ اور مضمون نگاری اور تعلقداری (Collectorship) میں کیا رشتہ اور تعلق ہوتا ہے۔ اگر ارباب اقتدار چاہتے ہیں کہ ملک کے نوجوانوں میں سائنس کی طرف زیادہ رغبت ہو تو انہیں یہ پالیسی بھی بدلنی چاہئے اور اختیاری مضامین کا یا کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ سائنس کے طالب علم کو حکومت کے ہر شعبہ میں داخل ہونے کا زیادہ نہیں تو کم از کم اتنا ہی موقع ملے جو آرٹس کے طالب علم کو ملتا ہے۔ غور کرنے پر ایسے دوسرے ذرائع بھی معلوم کئے جا سکتے ہیں کہ ملک میں سائنسی اور فنی تعلیم کا رواج بڑھتا جائے اور اب جس طرح سائنس کے گریجویٹوں کے مقابلہ میں آرٹس کے گریجویٹ کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس سائنس کے گریجویٹ زیادہ نکلنے لگیں۔ کیونکہ ان ہی گریجویٹوں میں سے سائنس کے ماہرین اور موجد پیدا ہو سکتے ہیں اور جتنی زیادہ تعداد میں سائنس کے طالب علم آنے لگیں گے اسی قدر ایسے ماہروں اور موجدوں کے پیدا ہونے کا امکان بڑھتا جائے گا۔ اس واقعہ سے شاید ہی کوئی سمجھدار شخص انکار کر سکے کہ ہماری قوم اور ملک کو اس وقت آرٹس کے مقابلہ میں سائنس کی بے انتہا زیادہ ضرورت ہے

پھر میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد آرٹس یعنی تاریخ ادبیات اور اسی قسم کے علوم کی اہمیت کو گھٹانا نہیں ہے بلکہ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص کو چاہے وہ سائنس داں یا انجینیر ہی کیوں نہ ہو تاریخ اور ادبیات وغیرہ کی اتنی معلومات ضرور حاصل کرنی چاہئے جتنی ان مضمونوں کے ایک معمولی طیلسانی گریجویٹ کو حاصل ہوتی ہے۔ اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص کے لئے اس قدر معلومات اپنی فرصت کے اوقات میں حاصل کرنا اچھی طرح ممکن ہے۔ اس کے برخلاف سائنسی اور فنی تعلیم صرف جامعات یا اسی قسم کے منظم اداروں میں حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لئے اگر ایک اوسط ذہن اور دماغ کا شخص اپنا یا سرکار کا پیسہ خرچ کر کے اور اپنی عمر کے بہترین سال صرف کر کے جامعہ میں تعلیم حاصل کرے تو ایسے علوم کیوں نہ سیکھے جو ذاتی طور پر یا خانگی طور پر حاصل نہیں ہو سکتے۔

اس مضمون کے پہلے حصہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ تعلیم کے ابتدائی زمانے میں لڑکوں کو غیر زبانوں اور غیر قوموں کی روایات اور آداب معاشرت کی بجائے اپنی زبان اور اپنی قومی اور مذہبی روایتوں

سے اچھی طرح واقف کرانا چاہئے دوسرے حصہ میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کالجوں اور جامعات میں سوائے چند خاص اہلیت رکھنے والے طلبا کے باقی تمام طلبا کو سائنس اور انجینری، طب اور صنعت وحرفت کی کی تعلیم دلانی چاہئے۔ اس دوسرے حصہ میں میرا تمام استدلال اس نکتہ پر مبنی ہے کہ اس وقت ہماری سب سے بڑی ضرورت سائنس اور ٹکنالوجی میں مہارت حاصل کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اکثر اہل ملک اس سے اتفاق کریں گے لیکن اگر بالفرض اہل ملک ایسا نہیں سمجھتے تو پھر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں زمانہ خود ان سے سمجھ لے گا۔

ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی

(۱۰ادبیات کی تعلیم" کے عنوان سے ادبیات کی تعلیم کے نقائص پر جامعہ کے پچھلے پرچوں میں بھی زور دیا جاچکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری قوم اور ملک کی بھلائی سائنسی تعلیم میں مضمر ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ گورنمنٹ کو اچھے کلرکوں کے لئے ادبیات ہی کے طالب علموں کی ضرورت ہوتی ہے اور مفلسی ہم ہندوستانیوں کو کلرکی کرنے پر مجبور کئے ہوئے ہے) (مدیر)

تاریخ کا مادّی نظریہ

مختلف زمانوں میں تاریخ کی تعریف اور تشریح کے مختلف نظریات پیش کئے گئے لیکن کچھ عرصہ قبل تک تمام مورخین اس کو واقعہ نگاری کے قائم شدہ اصول یا حالات موجودہ کو برقرار رکھنے کے ایک استدلالی فلسفہ سے زیادہ اہمیت نہ دے سکے ہیگل نے اس کو سائنس کے مرتبہ تک پہونچایا۔ بقول ہیگل "تاریخ خیالات کی ایک رفتار ہے جو کہ استغنا اور آزادی عمل تک پہونچاتی ہے۔ استغنا خود شعوری سے وابستہ ہے اور خود شعوری خدا سے" چنانچہ تاریخ خدا کی آپ بیتی ہے۔ ۱۸۸۹ء میں برنہیم نے کہا کہ تاریخ انسان کے ارتقا، اور عمرانیت کی سائنس ہے۔ تبنر کے خیال کے مطابق تاریخ ایک سائنس ہے جو ہمدردانہ نظر سے زندگی کے مظاہر کی جستجو کرے اور اس کو بیان کرے۔ لیکن ان تمام مورخین کی تشریحات اور نظریات نہ صرف دھندلی ہیں۔ بلکہ غیر مکمل بھی سب نے تاریخ کو زندگی کے فلسفہ غایاتی سے ملانے کی کوشش کی آخر کار مارکس اور انگلس نے تاریخ کے مادی نظریہ کو واضح کیا۔ اب یہ مسئلہ صاف ہوگیا کہ نہ تو انسان جنت سے نکالا ہوا ایک گنہگار رہے نہ سماج کی ابتدا ایسے متبرک حیاتیات پر ہوئی جو پے در پے طوفان عظیم سے بچ سکے اور نہ کسی حاکم مطلق نے کائنات کو خوش طبعی کی حالت میں بنایا بلکہ سماج کی ابتدا تنازع للبقا کے اصول پر ہوئی

زمانہ حال کی رائے یہ ہے کہ تاریخ بذات خود نہ کچھ کرنے کی اہل ہے نہ خوشنما ذخیروں کی معدن ہے اور نہ وہ جنگ کر سکتی ہے۔ دراصل یہ انسان ہی ہے حقیقی جاندار انسان جو عمل کرتا ہے۔ تاریخ اپنے اغراض کے حصول کے لئے انسان کو کام میں نہیں لاتی (گویا کہ انسان اس سے ایک علیحدہ شے ہے) بلکہ تاریخ خود کوئی شے نہیں سوائے انسان کی اپنے اغراض کے حصول کے لئے ایک جستجو۔

انسانی ضروریات ہی قوت عمل کا پیش خیمہ ہیں۔ ضروریات ہی انسان کے لئے دشواریاں پیدا کرتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کے حل کرنے کی طاقت دیتی ہیں۔ وہی انسان کو ہر طرح کا شعور دیتی ہیں۔ بلکہ یہ صحیح ہے کہ انسان اپنی تاریخ خود بناتا ہے لیکن کوئی فرد تاریخ نہیں بنا سکتا یہ ایک اتفاقی امر ہے کہ ایک غیر معمولی انسان جب اور جہاں چاہتا ہے ظاہر ہوتا ہے لیکن سائنٹیفک مورخ اس کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا

کہ ایک غیر معمولی یعنی بڑا شخص خود بخود کسی اعلیٰ طبقہ کا نمائندہ ہو جاتا ہے۔ طبقے کسی فرد کو نمائندہ نہیں بناتے ہاں وہ اس کو بڑا بننے کے موقعے اور ان موقعوں کو کامیاب بنانے کے ذرائع دیتے ہیں۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مذہب انسان میں نطرتاً موجود ہے اور یقین کرنا انسان کی عادت ہے۔ لیکن یہ کہنا تاریخ کے سخت متضاد ہے۔ انسان نطرتاً غیر مقلد ہے اور اس کی عادت یقین کرنا نہیں بلکہ تحقیق کرنا ہے۔ فلسفہ کی پیدائش قدیم انسان کی اسی عادت کی مرہون منت ہے۔ تحقیق اور تدقیق کی اہلیت نے انسان کو دیگر ادنیٰ جانداروں سے افضل کیا ہے۔ اس کا وجود ہی کائنات سے مسلسل کش مکش کا نتیجہ ہے۔ جب انسان کسی شے کی تشریح اور اس کے اسباب و علل اپنی لاعلمی کی وجہ سے بیان نہیں کر سکتا تو اس کو کسی ایسے ماوق الفطرت وسیلہ کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ جو کہ الجبرا کی ء x کے مثل ہے۔ چونکہ مذہب کی بنیاد اعتقاد پر ہے۔ جس کا دوسرا نام لاعلمی ہے۔ اس لئے مذہب اور اعتقاد دنیا کی ہر قوم اور فرقہ میں موجود تھا۔ خواہ وہ گرم ملک ہو خواہ سرد۔ اینگلس نے مذہب کی تعریف یوں کی ہے "مذہب کوئی چیز نہیں بجز ایک خیالی عکس کے جو کہ ان کے دماغ پر ان بیرونی طاقتوں کی وجہ سے پڑتا ہے جو کہ انسان کے روزمرہ کے افعال پر قابض ہیں۔ ایک ایسا عکس جس میں ارضی طاقتیں سماوی طاقتوں کا روپ اختیار کر لیتی ہیں"۔ لیکن جدید سائنس کی مدد سے انسان اس شدید لاعلمی سے پیچھا چھڑا سکتا ہے۔ طبعی سائنس اور خصوصاً علم طبیعیات کے ذریعہ وہ بہت سے مظاہر کی تاویل مادی اصطلاح میں کر سکتا ہے

مارکسی فلسفہ کی رو سے انسان خدا کے فرائض انجام دیتا ہے۔ سائنس کی تحقیقات کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ انسان کے خیالات، اعتقادات، کردار اور ارتقا سب زندگی کے ماحول سے تشکیل پاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسان ان ماحول پر ردعمل کرتا ہے اور ان کو اپنے موافق بناتا ہے۔ وہ محض اسٹیج کا ایک ایکٹر نہیں ہے جو کہ اسٹیج سے علیحدہ رہتا ہے بلکہ وہ اسٹیج کا ایک جزو ہے۔ اس کے حرکات اس کے ماحول سے اس قدر وابستہ ہیں جس قدر اس کا وجود۔ چنانچہ وہ صرف اپنے ماحول اور وجود کا بنانے والا ہی نہیں ہے بلکہ تاریخ کا بنانے والا ہے۔

تمدن نتیجہ ہے انسان کی اس جدوجہد کا جو وہ طبعی طاقتوں (Forces of Nature)

پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے۔ جدوجہد کی یہ اہلیت ہی اس کو دیگر ادنیٰ جانداروں سے علیحدہ کرتی ہے۔ جانور طبعی طاقتوں کے غلام ہوتے ہیں لیکن انسان ان کے خلاف جدوجہد کرتا ہے اور ان پر اپنا قبضہ کر لیتا ہے۔ شروع میں تو وہ محض معاش ہی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے لیکن جوں جوں وہ ان طاقتوں پر قابض ہوتا جاتا ہے وہ ثقافی قدر (Cultural value) پیدا کرتا ہے۔ فرصت ثقافت کی پہلی شرط ہے۔ جب تک انسان مہذب نہیں ہو جاتا وہ ثقافت نہیں پیدا کر سکتا۔ پس ثقافت نتیجہ ہے، تمدن سبب ہے یہ کہنا کہ ہندوستان کی ایک روایاتی ثقافت ہے لیکن تمدن نہیں، قطعاً غلط ہے۔ سماجی اور ذہنی ارتقا کے ایک خاص دور میں جبکہ انسان سوائے مذہبی خیالات کے اور کچھ نہیں سوچ سکتا ثقافی قدر بھی مذہبیت کے رنگ میں رنگ جاتی ہیں لیکن جوں جوں طبعی طاقتوں پر انسان قبضہ کرتا جاتا ہے وہ مذہبی خیالات کو چھوڑ کر سائنٹفک استدلالی اور معقولی خیالات قبول کرتا جاتا ہے۔ ثقافی قدر بھی ایسی حالت میں مذہبی جواز کو چھوڑ دیتی ہے جس طرح سے کہ ایک مہذب شخص کی ثقافت ایک عظیم الشان وحشی کی ثقافت سے برتر ہوگی اسی طرح دور حاضر کی ایک مہذب قوم کی ثقافت ایک ایسی قوم سے بہتر ہوگی جس پر اب تک مذہبی خیالات کا غلبہ ہو۔ سماج کے نشوونما کے کسی خاص وقت میں اس کا قانون اور اخلاقی نظام اپنے زمانہ کے اقتصادی نظام کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ قوانین اور اخلاق نفع اٹھانے والا فرقہ (Exploiting Class) بنایا کرتا ہے اور جس کے ذریعہ وہ اپنی نفع گیری کو روا رکھتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ سیاسی رواج اور قانون جن کے ذریعہ نفع گیری روا رکھی جاتی ہے نہ صرف اقتصادی نظام پر مبنی ہے بلکہ اس کا آئینہ دار ہے۔ یہی اخلاقی شعور کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے۔ غلامی اور رعیت پن (Serfdom) اس سماج میں روا رکھا جاتا تھا جہاں اس کی رسم تھی ظاہر ہے کہ جب اقتصادی نظام اس کے موافق تھا تو اخلاقی شعور نے بھی اس کو روا رکھا۔

اس پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ کے مادی نظریہ کی ابتدا اسی اصول سے ہوتی ہے کہ سماج کی بنیاد پیداوار اور اس کی تقسیم کے طریقہ پر مبنی ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت سماجی تبدیلیوں اور سیاسی انقلابات کے اسباب نہ تو انسان کے دماغ میں اور نہ اس کے انصاف

اور حق پسند جذبہ میں ڈھونڈنا چاہیئے بلکہ پیداوار اور اس کی تقسیم کے طریقوں کی تبدیلیوں میں دیکھنا چاہیئے تمام گذشتہ تاریخ (بجز تاریخ قدیم کے) طبقہ وارانہ کش مکش کی تاریخ ہے جو کہ اُس زمانہ کے اقتصادی نظام پر مبنی ہے۔ سماج کا پورا نظام اسی محور پر گردش کرتا تھا۔

حرارت، غذا، حفاظت اور لباس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے انسان نے خام اشیاء کو استعمال کرنا سیکھا چنانچہ انسان اور اشیاء کے درمیان ایک بنیادی تعلق قائم ہو گیا یہی ایک انسان کا دوسرے انسان سے تعلق کا باعث ہوا۔ یہ کیونکر؛ محنت (Labour) کی تقسیم و تخصیص کی وجہ سے بعض لوگوں کے حقوق اور بعض کے اس کے متعلقہ فرائض قائم ہو جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں بعض اشیاء پر بعض لوگوں کی ملکیت ہو گی جبکہ دوسرے اس سے محروم رہیں گے۔ سماج کے نشو و نما کے کسی خاص وقت میں افراد کے تعلقات آخر کار ایسے نظام پر مبنی ہوتے ہیں جس میں اشیاء کی ملکیت اور محرومیت ہو۔ چنانچہ سماج دو مخالف فرقوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ تعلقات یکساں رہتے ہیں لیکن مختلف اوقات میں سماج مختلف چولے بدلتی رہتی ہے مثلاً غلامانہ سماج، جاگیری سماج اور سرمایہ داری سماج۔ اول الذکر دو سماجوں میں انسانی تعلقات ان دو فرقوں کے درمیان قائم ہو جاتے ہیں جس میں ایک خام اشیاء کا مالک ہونے کی وجہ سے اقتصادی اور سیاسی طاقت رکھتا ہے اور دوسرا خام اشیاء کو مال میں (Commodity) تبدیل کرتا ہے۔ کام کرنے والا فرقہ اس کام میں قدر زائد (Surplus value) پیدا کرتا ہے جس کے بدلے میں اس کو معمولی اجرت مل جاتی ہے۔ موخر الذکر سماج یعنی سرمایہ داری میں حالانکہ تعلقات بدلتے نہیں لیکن حالات اور طریقوں میں کچھ تبدیلی ہو جاتی ہے اب پیداوار کا منشا استعمال نہیں بلکہ تجارت ہو جاتا ہے اور دلال پیدا کرنے والے اور استعمال کرنے والے کے درمیان کی ایک کڑی ہو جاتا ہے

اگر تاریخ طبقہ وارانہ کش مکش کی تاریخ ہے تو آخر یہ کش مکش ہوتی ہی کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان معاش حاصل کرنے کے لئے اپنے اوزاروں کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ نئی نئی پیداواری طاقتوں (Productive Powers) اور نو ایجاد اوزاروں کی ملکیت کی وجہ سے

اس کو ان دیگر لوگوں سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے جو ابھی تک پرانے اوزاروں سے کام کرتے ہیں ان نئی طاقتوں کا مالک اقتصادی طاقت کا بھی مالک ہوجاتا ہے۔ جب آپس کی مخالفت تیز ہوجاتی ہے تو ایک معاشرتی انقلاب ہوتا ہے جس میں یا تو سماج برباد ہوجاتی ہے یا فتح اُس گروہ کی ہوتی ہے جس کا نظام زیادہ منظم اور مرتب ہوتا ہے۔

اب ہم کو دیکھنا چاہئے کہ سماج کا ارتقا کیوں کر ہوا یعنی قدیم اشتمالی سماج سے سرمایہ داری سماج اور پھر اشتراکی سماج کس طرح عمل میں آئے۔ سماج کی بنیاد اس وقت پڑتی ہے جبکہ انسان زراعت کے ذریعہ زمین سے پیدا کرنا سیکھتا ہے۔ گروہ در گروہ انسان زرخیز مقامات پر بس جاتے ہیں اور آپس میں زمین اجتماعی طریقہ پر تقسیم کرلیتے ہیں ملکیت مشترکہ ہوتی ہے اور زیادہ پیدا کرنے کی ہوس نہیں ہوتی۔ ہر شخص اپنی استطاعت کے موافق کام کرتا ہے اور اپنی ضروریات کے بموجب پاتا ہے۔ سکونت حاصل کرلینے کے بعد برادری کے افراد فرصت کے وقت ثقافتی قدر پیدا کرتے ہیں اور ان گدھ اوزار بناتے ہیں۔ ان اوزاروں کے ذریعہ وہ تنہا کام کرنے لگتے ہیں اور اپنی محنت کے پھل آپ ہی کھاتے ہیں۔ بس یہاں سے انفرادی ملکیت کی شروعات ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ برادری میں اجتماعی منافع ختم ہوجاتا ہے اور اس وقت ایسے قانون کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے جس کے ذریعہ آپس کے تعلقات اور تصادم خیز مفاد کی نگرانی کیجا سکے مذہب پہلے پہل سماج میں داخل ہوکر ایک خدائی قانون پیش کرتا ہے جس کی روسے کوئی ایک مافوق البشر طاقت انسان کے تعلقات پر حکمرانی کرنے لگتی ہے چنانچہ سورج، چاند اور دوسرے مظاہر ایک مافوق الفطرت وسیلہ قرار دئے جانے لگتے ہیں۔ قدیم اشتمالی سماج درہم برہم ہوجانے کے بعد زمین قبیلوں اور خاندانوں کے سرداروں میں منقسم ہوجاتی ہے اور سر قبیلی سماج (Patriarchal Society) ابرانی سماج کی جگہ لے لیتی ہے۔ سردار قبیلہ آخر کار جاگیردار بن کر نیابت الٰہی (Divine Right) کے سایہ میں ایک اعلیٰ اقتدار قائم کرلیتے ہیں چونکہ مذہب، دینیات اور قانون کا کام قایم شدہ نظام کی محافظت ہوتا ہے اس لئے یہ جاگیردار استبداد کی انہیں مشینوں کے ذریعہ جمہوری آزادی اور ان کے مرتبہ کے خلاف ہر خطرناک تحریک کو دبا دیتے ہیں۔

فتوحات ممالک کے زمانہ میں غلامی کا نظام زور پکڑ جاتا ہے۔ کوڑوں کا ڈر غلاموں کو ہمہ وقت محنت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جس کے بدلے میں ان کو اس قدر خوراک مل جاتی ہے کہ وہ زندہ رہ سکیں اور افزائش نسل کریں تاکہ غلاموں کی تعداد بڑھے۔ جس طرح سے کہ بھیڑ اور بکریوں کے بچے گلہ بان کی ملکیت ہوتے ہیں، اسی طرح سے غلاموں کے بچے مالکوں کی ملکیت ہوتے ہیں۔ یہ غلام زیادہ تر خانگی کام اور آرائش کے سامان بنانے میں لگائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرتی ضروریات التوا میں پڑ جاتی ہیں اور چونکہ اس زمانے میں زراعت ہی پر سب دارو مدار ہوتا ہے۔ اس لئے یہ زراعت عدم توجہ کی وجہ سے اپنا توازن کھو بیٹھتی ہے اور درہم برہم ہو جاتی ہے۔ سماج میں ایک خطرناک موقع آجاتا ہے اور غلامانہ نظام کی پیداوار کا طریقہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔

غلامانہ سماج کے کھنڈرات پر ایک نئی جاگیری سماج (Feudal Society) قائم ہوتا ہے۔ جاگیریت کی بنیاد آزاد کسانوں کو بیدخل کر دینے پر ہے۔ اس نئے نظام میں غلام کے بجائے کسان محنت کرتا ہے۔ جاگیریت کی خصوصیت یہ ہے کہ خود کسان اپنے آلات اور اوزاروں سے محنت کرتا ہے۔ لیکن سوائے معمولی خوراک کے سب کچھ زمیندار کو دیدیتا ہے۔ کسان کو خوراک کے معاملہ میں نیم جان رکھنے سے جاگیریت دوسری صنعتوں کو روکتی ہے لیکن اس کو کامیابی نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ انسان کی روزافزوں ضروریات کو ہمیشہ کے لئے روک نہیں سکتا۔ جدید ایجادات، سائنٹفک نظریات، بڑھتی ہوئی صنعت اور رسل و رسائل کے معاملہ میں لوگوں کا ایک دوسرے پر انحصار جاگیریت کی بیخ کنی کرتے ہیں۔ چنانچہ تجارت کی ترقی جاگیریت کو پیغام اجل ہے۔ جاگیریت میں ایسی طاقت نہیں کہ وہ تجارتی فرقہ کے وجود میں آنے کو روک سکے۔ نئے اوزار اور منظم طریقوں کی وجہ سے اشیا کی طلب سے زیادہ پیداوار ہوتی ہے اور جو سب کی سب استعمال نہ ہو کر مال میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک سرمایہ داری نظام کی بنیاد ڈالتی ہے۔

سرمایہ دار مزدور کی طاقت (Labour Power) خریدتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ کار آمد قدر (Use value) پیدا کرے۔ لیکن اس عمل میں طلب سے زیادہ پیداوار کی وجہ سے

قدرِ زائد (Surplus Value) پیدا ہو جاتی ہے۔ بقول مارکس روپیہ سرمایہ نہیں ہے۔ یہ قدر زاید ہے جو جمع ہو کر سرمایہ ہو جاتی ہے: چنانچہ سرمایہ دار کا کام قدرِ زاید پیدا کرنا ہے۔ جو کہ مشین کے استعمال، طلب سے زیادہ پیداوار، کام کے گھنٹوں میں طوالت اور کم اجرت کی وجہ ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس دور میں روپیہ پیداوار بڑھاتا ہے استعمال کے لئے نہیں بلکہ فروخت کے لئے۔ پیدا کرنے کے لئے سرمایہ دار کو ضرورت ہوتی ہے ایسے لوگوں کی جو محنت کریں۔ چنانچہ کھیت مزدور اور بیدخل کسان اپنی طاقت بیچتے ہیں۔ سرمایہ داری کی خصوصیت یہ ہے کہ دو مخالف فرقے بن جاتے ہیں ایک بورژوا (Bourgeois) جن کے قبضہ میں پیداوار کے ذرائع ہوں اور دوسرا پرولتاری (Proletariat) جو مزدوری کرتا ہے۔ اجرتی مزدور جو اب تک شاذ شاذ تھا بڑھنے لگتا ہے اور سرمایہ داری پیداوار کا وسیلہ ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی اجرت پر کام کرنے والا مزدور اب زندگی بھر کے لئے اجرتی مزدور بن جاتا ہے۔ جاگیریت کا شیرازہ بکھر جانے، تعلقداروں اور روسار کے نوکروں کے برخاست ہو جانے اور کسانوں کے بیدخل ہونے کی وجہ سے اجرتی مزدور کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے۔ اجتماع کی کثرت اور پیداوار کی طاقت میں زیادتی سرمایہ داری کے ظہور کا باعث ہوتی ہے نہ کہ دنیا کی پیداوار میں کسی منظم طریقے یا ہم آہنگی کی وجہ سے۔ وہ ایک ایسی سماج کا نظام ہے جس میں فرقہ وارانہ کش مکش اور تفاوت بے حد سرعت کے ساتھ بڑھ رہے ہوں جس میں امیر امیر تر ہوتا رہے اور غریب، غریب تر۔

پیداوار کے ذرائع (جن پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہے) اور مزدور (جن کے پاس سوائے اپنی طاقت کے کچھ نہیں ہے) کے درمیان مخالفت پوری طرح حائل ہو جاتی ہے۔ معاشرتی پیداوار اور سرمایہ دار لوٹ کھسوٹ کے تعلقات میں تردید کے عنصر کا اظہار بورژوا اور پرولتاری کی دشمنی سے ہوتا ہے۔ پیداوار کی معاشرتی بدنظمی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ آدمی پرولتاری میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ بازار کی بساط طلب سے زیادہ پیداوار کا ساتھ قدم بہ قدم نہیں دے سکتی۔ یہ بیحد نازک وقت ہوتا ہے۔ مال کی گردش کم ہو جاتی ہے۔ اور روپیہ مال کی گردش میں حائل ہو جاتا ہے۔ کل

معاشرتی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ پیدا وار کا طریقہ نفع گیری سے بغاوت کرتا ہے۔ اسوقت طبقہ وارانہ کش مکش سخت ہو جاتی ہے۔ مزدور کام بند کر دیتے ہیں اور عوام کی ایک بغاوت شروع ہو جاتی ہے سرمایہ دار اس کو روک نہیں سکتے کیونکہ تاریخ کا چکر پیچھے واپس نہیں کیا جا سکتا۔ سرمایہ دار اپنی حالت کو کچھ دن اور بدستور قائم رکھنے کے لئے فسطائیت کو فروغ دیتا ہے لیکن کچھ ہی عرصہ بعد مزدور اپنی انجمنوں کی مدد سے سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیتے ہیں اور سیاسی طاقت حاصل کر لیتے ہیں۔ جس میں سرمایہ داری نظام اپنی افادیت سے زیادہ زندہ رہنے کے بعد ایک ایسے نظام کے لئے جگہ خالی کر دیتا ہے جو کہ پیداوار کے ذرائع کی انفرادی ملکیت کو ختم کر دیتا ہے۔ انسان کے معاشرتی افعال کے قوانین جن پر اب تک اس کا کوئی زور نہ تھا بلکہ وہ اس کی حد سے باہر تھے اب انسان کے قبضہ میں آ جاتے ہیں اور وہ ان کو انسانیت کے فائدہ کے لئے استعمال کرتا ہے۔ وہ تمام خارجی طاقتیں جو ابھی تک تاریخ پر حاوی تھیں انسان کے قبضہ میں آ جاتی ہیں اور انسان آزادی کی دنیا میں قدم رکھتا ہے۔

یہ ہے مادی نظریہ کا مختصر سا خاکہ جو کہ آج کل کے مادی فلاسفہ پیش کرتے ہیں۔

علی امام صاحب

منشی پریم چند

ناول اور افسانہ نگاری کا پایہ ہمارے ادب میں زیادہ بلند نہیں اور بدقسمتی سے بہت کم لوگ اس فن کے صحیح مفہوم سے واقف ہیں۔ اس کے مقابل میں مغربی زبانوں میں ناول اور افسانہ نگاری کا فن ادب کا شہکار سمجھا جاتا ہے۔ انگریزی زبان کی ترویج اور مغربی ادب کی اشاعت کی وجہ سے اب ناولوں اور افسانوں کا چرچا عام ہو چلا ہے لیکن اب تک اچھے ناول اور افسانے لکھنے والے ملک میں خال خال نظر آتے ہیں۔ منشی پریم چند افسانہ نگاری کے نئے فن کے امام تھے اور ان کی ادبی کاوشوں نے اس فن کو بہت بلند معیار پر پہونچا دیا ہے۔ انھوں نے ناول بھی لکھے، گو ان کے افسانے ناولوں سے بہت زیادہ کامیاب رہے لیکن ادب کی یہ صنف بھی ان کے ہاں دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

منشی پریم چند ہمارے ادب کے اُن بانیوں میں سے ہیں، جو ادب کو زندگی کا ترجمان سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ساری عمر اس مقصد کے لئے وقف کر دی تھی اور ہمہ تن ادب کے ہو کر رہ گئے تھے۔

افسانہ نویس اور ناول نگار اُس زمانہ کا ترجمان ہوتا ہے جس میں وہ پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت میں وہ ایک شاعر ہے جو نثر میں اپنے جذبات اور تاثرات افسانوں کی جیتی جاگتی تصویر میں پیش کرتا ہے۔ منشی پریم چند کس زمانہ میں پیدا ہوئے؟ اور ان کو کیا زمانہ ملا؟ اور اس ماحول اور زمانہ میں ایک ادیب بننے کے مواقع ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ ایک ادیب اور شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی معاش کی فکر سے آزاد ہو۔ اگر ہم ان سوالات کو ذہن میں رکھ کر منشی پریم چند کی زندگی پر نظر ڈالیں تو ہمیں صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہندوستان میں ادبی ماحول کی ترقی بے حد دشوار معلوم ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ افلاس اور غربت سے ہندوستانیوں کے دماغ کمزور اور حوصلے پست ہو گئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ کشمکش حیات کسی کو اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ خالص ادبی مشاغل میں اپنی زندگی صرف کر سکے۔ اس کے ساتھ

ساتھ ہندوستانی ادب کے قدر دان بھی دن بدن کم ہوتے جارہے تھے اور ان کا میلان دوسری مغربی زبانوں کی طرف بڑھتا جارہا تھا۔ خوش قسمتی سمجھئے یا بدقسمتی ایسے ہی زمانہ میں منشی پریم چند پیدا ہوئے۔ ان کے پاس دولت نہیں تھی علم تھا۔ حقیقت میں منشی صاحب کا نام ان اہل علم میں شمار کیا جا سکتا ہے جو ہمیشہ تنگ حال رہتے ہیں۔ کیونکہ قدرت ہمیشہ دونوں چیزیں یعنی علم اور دولت ساتھ نہیں دیتی۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ جمع ہوگئی ہوں لیکن یہ فخر صرف غربت ہی کو نصیب ہے۔ غربت ہی کے دامن سے ایسے رتن نکلے ہیں جنھوں نے اپنا نام دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک چمکا دیا۔ منشی صاحب بھی اسی ماحول میں پیدا ہوئے اور یہ ثابت کر دیا کہ ایک غریب خاندان کی گود میں پل کر بھی آدمی بہت ترقی کر سکتا ہے۔ انھوں نے اس پست ذہنیت کے خلاف ہر طرح سے انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنی زندگی کی قیمتی گھڑیاں اسی کام میں گذار دیں اور اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔

یہ زمانہ ایسا ہے کہ ہمارا سماج، ہمارا دیس ایک بڑے عجیب وغریب دور سے گذر رہا ہے۔ بڑی چھوٹی طاقتیں آپس میں ٹکرا رہی ہیں جن کی ٹکر فضا کو بے طرح پریشان کئے ہوئے ہے۔ کسی زمانہ میں ایک مہابھارت ایک خاص جگہ میں ہوئی تھی آج تو ایسے مہابھارت دنیا کو چھوڑیئے ہندوستان کے کونے کونے میں ہو رہے ہیں اور ان مہابھارتوں کی تصویر کشی کے لئے ایک مصور کی ضرورت تھی۔ پریم چند ہمارے اس زمانے کے مصور تھے۔ سیوا سدن سے گئودان تک پڑھ جانا ہمارے اس زمانہ کی تاریخ کو پڑھ جانا ہے۔

پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ ۱۸۸۰ء میں موضع منڈھوا سہی پانڈے پور بنارس میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام منشی عجائب لال تھا جن کی تھوڑی بہت کاشتکاری بھی تھی لیکن اس کی آمدنی برائے نام تھی اس لئے آپ ڈاک خانہ میں ڈاک منشی ہوگئے تھے اور ایک اوسط خاندان کی زندگی بسر کرتے تھے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ کایستھ خاندان مسلمانوں سے میل جول رکھنے میں کتنے پیش پیش رہتے ہیں۔ ان کے عادات واطوار اور سماجی زندگی کی بہت سی باتیں مسلمانوں سے ملی جلی ہوتی ہیں۔ ان کو عموماً فارسی اور اردو سے بہت محبت ہوتی ہے۔ پریم چند بھی کایستھ تھے اور ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے جو

موجودہ زمانہ کی فرقہ پرستی سے بہت دور تھا۔ چنانچہ انھوں نے بھی اُردو فارسی کی تعلیم مولوی صاحب کے ہاں شروع کی جس کا ذکر انھوں نے اپنے افسانہ "چوری" میں کیا ہے اور مکتب میں پڑھنے والے بچوں کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔

بچپن :- منشی پریم چند صاحب کے بچپن کے حالات بھی کم دلچسپ نہیں ہیں لیکن ان کے بچپن کے صحیح حالات تو وہی بتا سکتا ہے جس نے ان کا بچپن دیکھا ہے۔ لیکن ہم ان کے افسانوں اور ناولوں کا بغور مطالعہ کریں تو ان کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہر قدم پر دکھائی دے گی۔ منشی صاحب سریع الاثر اور ذکی الحس تھے وہ جو کچھ محسوس کرتے تھے بلا کسی خوف کے قلم بند کر لیتے تھے۔

ہر بڑے شاعر یا ادیب کی زندگی اس کی تصانیف کے پردے میں صاف دکھائی دیتی ہے چنانچہ ایک بڑے ادیب کا قول ہے کہ "اگر مجھے دیکھنا چاہتے ہو تو میری تصانیف کے پردے میں دیکھو" پریم چند کا درجہ بھی انھیں بڑے مصنفین میں ہے وہ جہاں واقعات کی تفصیل اور بچوں کے خیالات کا تجزیہ کرتے ہیں وہاں ان کے بچپن کی تصویر صاف کھنچ جاتی ہے۔ ان کے علاوہ دیگر مصنفین کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیں تو ان کی تصانیف میں بھی یہی بات نمایاں ہوگی۔ گولڈسمتھ (Goldsmith) کے (Deserted Village) میں یا (Vicar of wakefield) یا ڈکنس کی تصانیف (H. G. Wells) ایچ۔ جی۔ ویلس کے افسانوں اور ناولوں پر نظر ڈالنے سے ہر جگہ مصنف کی تصویر اپنے اصلی لباس میں نظر آتی ہے یہ ضرور ہے کہ واقعات لفظ بلفظ صحیح نہیں ہوتے ہیں کیونکہ مصنف انھیں ادبی رنگ میں رنگ دیتا ہے پریم چند اپنے افسانوں میں بچپن کی یادیں تازہ کرتے ہیں "ہائے بچپن تیری یاد نہیں بھولتی! وہ کچا گھر...... وہ برہنہ پا، برہنہ جسم کھیتوں میں گھومنا، آم کے درختوں پر چڑھنا سارے باتیں نگاہوں میں پھر رہی ہیں۔ گھٹیلے جوتے پہنکر اس وقت جو خوشی ہوتی تھی اب فلیکس کے جوتوں سے بھی نہیں ہوتی۔ گرم پتلے رس میں جو لذت تھی وہ اب گلاب کے شربت میں نہیں۔ چوبن اور کچے بیروں میں جو ذائقہ ملتا تھا وہ اب شیر برنج اور انگوروں میں بھی نہیں ملتا۔"

پریم چند میں بچپن ہی سے محبت، ہمدردی اور ایثار کے جذبات موجود تھے قزاقی جو ڈاک خانہ میں

ڈاک کا تھیلا لانے پر ملازم تھا۔ جب انھوں نے اس ہرکارے کو اپنی ملازمت سے علیحدہ ہوتے ہوئے دیکھا تو ان کو بے حد رنج ہوا اور ماں کے پاس باپ کی شکایت لے گئے کہ انھوں نے قزاقی کو علیحدہ کر دیا۔

پریم چند کی طبیعت بچپن ہی سے محبت خلق کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ دوسروں کی تکلیفوں کا انھیں بہت احساس ہوتا تھا۔ ان کے افسانوں میں جا بجا ہمیں دکھائی دیتا ہے کہ کسان روکھی روٹیاں کیونکر کھاتا تھا۔ ایسے سخت جاڑے میں برہنہ جسم کیسے رہتا ہے۔ اپنے جھونپڑے میں کیسے رہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ انکا دل ہمیشہ کسی کی مدد کرنے کو چاہتا تھا۔

پریم چند نے اپنی طفلانہ مسرتوں کا اظہار بھی اکثر جگہ کیا ہے۔ کبھی وہ گلی ڈنڈا کھیلنے میں اتنے مصروف ہیں کہ پران نکلتا ہے لیکن وہ اپنا داؤں نہیں چھوڑتے۔ غرضکہ اس قسم کی باتیں انھوں نے اپنے افسانوں میں جا بجا بیان کی ہیں جو ایک دیہاتی بچے کے لئے مسرت کا باعث ہو سکتی ہیں۔ وہ بچپن کی باتیں بھولے نہیں ہیں تنہائی میں کچھ لکھ کر اپنے گذرے ہوئے بچپن کو یاد کر کے دل خوش کر لیتے تھے۔ یہ تھا ان کا بچپن تعلیمی دور۔ منشی صاحب نے آٹھ سال میں اردو فارسی اچھی خاصی سیکھ لی تھی۔ ان کو بچپن ہی سے ادب سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ پہلے قصے کہانیاں سننے کا شوق پیدا ہوا۔ کہتے ہیں کہ ان کی دوستی ایک تمباکو بیچنے والے کے لڑکے سے ہو گئی تھی روزانہ اس دوست کے گھر پہونچتے تھے اور طلسم ہوشربا پڑھتے تھے۔ آہستہ آہستہ انھیں لکھنے کا شوق بھی پیدا ہو گیا۔ چودہ سال کی عمر ہی میں ایک ڈرامہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کے نام سے لکھا۔

اب منشی صاحب کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا اور دوسرے لڑکوں کی طرح یہ بھی ایک ہائی اسکول میں داخل ہو گئے۔ ادھر ان کا مدرسہ میں داخل ہونا تھا کہ ماں نے اس دنیا کو خیرباد کہا۔ اس کم عمری میں ماں کا دست شفقت سر سے اُٹھ جانا کتنا بڑا دکھ ہے۔ ایک بیٹے کو جو ماں سے محبت ہوتی ہے وہ باپ سے نہیں ہوتی۔ پریم چند بھی اپنی ماں کے لاڈلے بیٹے تھے۔ یہ اپنی ماں کا پیار کیونکر بھول سکتے تھے۔ انھوں نے جذبات کی رو میں آکر ایک جگہ لکھا ہے کہ۔

"مہر مادری تجھے آفریں ہے دنیا میں جو کچھ ہے باطل ہے، ہیچ ہے، مہر مادری ہی حق ہے

غیر فانی ہے، لازوال ہے۔" (افسانہ مندر)

ایک جگہ اور اس کی وفاداری اور شفقت بار بار یاد آتی ہے۔

"ماں تو دھنیہ ہے! تیری سی عقیدت، تیری سی وفا کا دیوتاؤں میں بھی ملنا امر محال ہے۔"

منشی صاحب کی ہنسی خوشی اور کھیل کود کے دن تو بیت گئے۔ اب ان کی زندگی کا سختیوں اور مصیبتوں سے بھرا ہوا باب شروع ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے مصیبت تنہا نہیں آتی۔ ابھی ماں کی جدائی کا زخم تازہ ہی تھا کہ باپ کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ پریم چند یتیم ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ یتیمی کا داغ شہرت کی علامت ہے۔ دنیا کی نامور ہستیاں بچپن ہی سے ماں باپ سے محروم ہو گئیں تھیں۔ پریم چند کو یہ امتحان دینا پڑا اور کامیاب بھی ہوئے۔ ان کی شادی بھی والد نے مرنے سے کچھ ہی دنوں پہلے کر دی تھی۔ اس وقت منشی صاحب کی عمر پندرہ سال کی تھی اور نویں درجہ میں پڑھتے تھے۔ منشی صاحب اس دنیا میں اپنی سوتیلی ماں اور دو سوتیلے بھائی اور بہنوں کے ساتھ اکیلے رہ گئے تھے۔ اب انہیں زندگی کے مشکل ترین امتحان اور حد سے زیادہ تکلیف دینے والی آزمائش سے گذرنا پڑا۔ انہوں نے جا بجا اپنے افسانوں میں بھی یتیم ہونے کا ذکر کیا ہے۔ وہ اپنے افسانہ "شکست کی فتح" میں ایک کیرکٹر کی زبان سے یہ الفاظ ادا کرواتے ہیں۔

"میں آزاد تھا۔ میرے والدین مجھے بچپن ہی سے چھوڑ کر رخصت ہو گئے تھے۔"

پھر ایک موقعہ پر وہ کس مایوسی کے عالم میں لکھتے ہیں۔ جب ساری امیدیں منقطع ہو چکی ہوں۔

"کیلاش کو اپنے ہاتھوں سے کنواں کھود کر پانی پینا تھا جس کے خیال ہی سے اس کا دل پریشان ہو جاتا تھا۔" (ڈگری کے روپے)

اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند اپنے من کی بات کہہ رہے ہیں واقعی اس وقت ان کی حالت ایسی تھی کہ سن کر رونا آتا ہے۔ انہوں نے اپنی سوانح حیات ہنس میں "جیون سار" کے نام سے لکھی ہے اس میں اس مشکل گھڑی کا ذکر کس انداز میں کرتے ہیں۔

"آمدنی ایک پیسے کی نہ تھی، گھر میں جو کچھ تھا چھ ماہ تک والد کی علالت اور اس کے بعد تجہیز و تکفین میں خرچ ہو گیا مجھے ایم۔ اے پاس کر کے وکیل بننے کا ارمان تھا۔ سرکاری ملازمت

اُس زمانہ میں بھی ایسی ہی مشکل سے ملتی تھی جتنی کہ اب، دوڑ دھوپ کرکے شاید دس بارہ
روپے کی کوئی جگہ پا جاتا اگر میاں تو آگے پڑھنے کی دھن تھی مگر پاؤں میں لوہے کی نہیں
اشٹ دہان بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور میں پہاڑ پر چڑھنا چاہتا تھا
پاؤں میں جوتے نہ تھے بدن پر ثابت کپڑے نہ تھے۔ گرانی الگ، دس سیر کے جَو تھے
اسکول سے ساڑھے تین بجے چھٹی ملتی تھی۔ کوئنس کالج بنارس میں پڑھتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب
نے فیس معاف کردی تھی، امتحان سر پر تھا اور میں بانس کے پھاٹک پر ایک لڑکے کو پڑھانے
جایا کرتا تھا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ چار بجے شام کو پہونچ جاتا اور چھ بجے شام کو چھٹی پاتا۔ وہاں سے
میرا گھر پانچ میل پر تھا۔ تیز چلنے پر بھی آٹھ بجے سے پہلے گھر نہ پہونچ سکتا۔ سویرے پھر آٹھ
بجے گھر سے چل دیتا ورنہ وقت پر اسکول نہ پہونچتا۔ رات کو کھانا کھا کر کپی کے سامنے
پڑھنے بیٹھتا اور نہ معلوم کب سو جاتا۔"

میٹرک تو انھوں نے جیوں تیوں پاس کرلیا لیکن ان کو لگن تھی ایم۔ اے پاس کرنے کی اور کالج کی تعلیم کے لئے زیادہ روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس حالت میں منشی صاحب نے ایک ٹیوشن پانچ روپے ماہوار پر کرلیا اس میں سے بھی آدھے اپنی سوتیلی ماں اور بھائی بہن کے پاس بھیجا کرتے تھے اور آدھے میں اپنا خرچ پورا کیا کرتے تھے۔ آخر کار مجبور ہوکر ایک اسکول میں ۱۸ روپے ماہوار کی ملازمت کرلی۔ اس طرح ان کی مالی پریشانی دور ہوگئی اور اپنی تعلیم کو جاری رکھا اور گورنمنٹ سنٹرل ٹریننگ کالج الہ آباد میں داخل ہوئے سنہ ۱۹۰۳-۴ء کے سشن میں تعلیم حاصل کرکے اپریل سنہ ۱۹۰۴ء میں جونیر انگلش ٹیچر سرٹیفکٹ کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا اور سنہ ۱۹۰۴ء ہی میں الہ آباد یونیورسٹی کا اسپیشل ورنیکلر امتحان بھی اردو ہندی میں پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کئی بار بیٹھے لیکن شروع ہی سے ان کو ریاضی سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس لئے فیل ہوتے رہے۔ بعد میں جب یہ مضمون لازمی نہیں رہا اختیاری ہوگیا تو سنہ ۱۹۱۰ء میں ایف اے بھی دوسرے درجہ میں پاس کرلیا اس وقت یہ گورنمنٹ اسکول بستی میں اسسٹنٹ ٹیچر تھے نو سال بعد یعنی سنہ ۱۹۱۹ء میں جب گورکھپور میں ٹیچر تھے تو بی۔ اے کا امتحان بھی دوسرے درجہ میں پاس کرلیا۔ (مضامین انگریزی فارسی اور تاریخ تھے)

منشی صاحب کو اس مدرسی اور طالب علمی کے زمانہ میں کہانیاں لکھنے کا شوق پیدا ہو چلا تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی بعض کہانیوں کا انگریزی سے ترجمہ کیا اور بعد میں زمانہ میں برابر افسانے لکھتے رہے ساتھ ساتھ ناول بھی لکھنے شروع کر دئے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں "سوز وطن (پانچ کہانیوں کا مجموعہ) شائع ہوئی جو گورنمنٹ نے ضبط کر لی تھی۔

۱۹۲۰ء میں جب منشی صاحب گورکھپور میں ٹیچر تھے تحریک عدم تعاون زوروں پر تھی جلیانوالہ باغ کا حادثہ ہو چکا تھا۔ انہی دنوں میں مہاتما گاندھی نے گورکھپور کا دورہ کیا۔ گورکھپور میں مہاتما جی کی ایک تقریر ہوئی جس کا اثر منشی صاحب پر بہت ہوا۔ اس کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں

"مہاتما جی کے درشنوں سے میرے مردہ دل میں جان آگئی اور دو ہی چار دن بعد بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دیدیا"

اور اپنی زندگی دیہات کی خدمت کے لئے وقف کر دی اور دیہات میں بیٹھ کر ادبی خدمت اور پرچار میں زندگی بسر کی۔ آخر کار آپ اس دنیا سے ۹ ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو سدھار گئے۔

ان کے تعلیمی دور کی جھلک بھی ہم ان کے افسانوں میں اکثر مقامات پر دیکھتے ہیں۔ انہوں نے کالج کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے اس میں بتاتے ہیں کہ طلبہ سیدھے سادے لڑکوں کو اور زیادہ پڑھنے والوں کو کس طرح سرمایۂ تفریح بناتے ہیں۔

"وہاں بیشتر طلبا تو معاش کی فکر سے آزاد ہوتے ہیں انہیں خوش وقتی یا خوش گپی اور خوش گذاری کے سوا وہاں کوئی شغل نہیں رہتا .... اگر کوئی صاحب دھرم کرم کے پابند ہوں اور پوجا پاٹ کرنے میں منہمک رہتے ہیں۔ بلا ناغہ نمازیں ادا کرتے ہیں تو انہیں سرمایۂ تفریح بننے میں دیر نہیں لگتی۔ اگر کوئی صاحب کتابوں کے عاشق ہیں مطالعہ میں سعی بلیغ کرتے ہیں تو سمجھ لیجئے ان کی تضحیک کے لئے کسی گوشہ میں سازشیں ہو رہی ہیں"

اسی طرح سے انہوں نے اسکول کی ملازمت کا حال بھی لکھا ہے۔

"پنڈت چندر دھر نے ایک اپر پرائمری مدرسہ کی مدرسی کر تو لی تھی مگر ہمیشہ پچھتایا کرتے

تھے کہ ناحق اس جنجال میں آ پھنسے۔ اگر کسی اور صیغہ میں ہوتے تو اب تک ہاتھ میں چار پیسے ہوتے۔ آرام سے زندگی بسر ہوتی یہاں مہینہ بھر کے انتظار کے بعد کہیں پندرہ روپے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ بھی اِدھر آئے اُدھر غائب نہ کھانے کا سکھ نہ پہننے کا آرام"

ان عبارتوں میں پریم چند کے سچے جذبات کی صحیح تصویر موجود ہے۔ اسی طرح ہم ان کی زندگی کے واقعات کا عکس ان کے افسانوں میں جا بجا دیکھ سکتے ہیں۔

منشی صاحب ایک افسانہ نگار اور ناول نویس کی حیثیت سے مشہور ہوئے لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ وہ ایک تجربہ کار معلم بھی تھے۔ انہوں نے سولہ سال تک سررشتہ تعلیم گورنمنٹ کی ملازمت کی۔

آپ کی معلومات بہت وسیع تھیں جس مضمون کو پڑھاتے تھے اس پر حاوی ہو جاتے تھے۔ لڑکے ان کے گھنٹے میں بہت دلچسپی لیتے تھے کیونکہ وہ جوں ہی کلاس میں آتے زندہ دلی پیدا ہو جاتی تھی۔ لڑکے آپ سے بہت بے تکلف تھے۔ جب کوئی ہنسی کی بات ہوتی بے تکلفی سے ہنستے تھے۔ غرضکہ آپ طلبہ میں بہت مقبول تھے اور ایک اچھے استاد تھے۔

ان کی ادبی زندگی شروع کرنے سے پہلے یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ منشی صاحب کی شادی جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں والد ہی کی حیات میں ہو چکی تھی لیکن یہ اس شادی سے مطمئن نہیں تھے۔ اس سے برسوں الگ رہے اور اسے خرچ برابر بھیجتے رہے۔ اس دوران میں انہوں نے ایک نیا قدم اٹھایا یعنی ایک بیوہ شیورانی دیوی سے رشتہ جوڑ لیا۔ جو حقیقت میں آپ کی رفیق حیات ثابت ہوئیں۔ اور دو لڑکوں اور ایک لڑکی کی ماں بنیں۔ یہ شادی منشی صاحب نے بہت خاموشی سے کی تھی جو کسی خاص جذبہ کا نتیجہ نہ تھی نہ عاشقانہ کہی جا سکتی ہے لیکن یہ قدم اس زمانہ میں جبکہ ہمارا سماج رسم و رواج اور غلط عقیدوں کے پھندے میں پھنسا ہوا ہے۔ یقیناً ایک دلیرانہ قدم تھا۔

پریم چند کی زندگی اصل میں ایک داستان ہے تکلیفوں اور سختیوں کی، نہ ان کا بچپن سکھ سے بیتا، نہ انہوں نے جوانی کے مزے لوٹے۔ انہوں نے ہمیشہ موٹا کھایا موٹا پہنا۔ بی۔ اے پاس کیا اور استاد ہوئے

توان کی زندگی کی کلی مرجھا چکی تھی، مزاج پھیکا پڑ گیا تھا، طبیعت پژمردہ ہو گئی تھی۔ اس زمانہ میں گاندھی جی کا جادو چل رہا تھا۔ لوگ پروانوں کی طرح ان پر گرتے تھے۔ سب ملک پر نچھاور کرنے کے لئے تیار کر رہے تھے۔ پریم چند کو بھی اس جوشیلی آندھی نے ہلا دیا اور ان کی زندگی میں ایک روح پیدا ہو گئی۔ منشی صاحب کی سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ ہم اپنی جنگ آزادی میں کامیاب ہوں۔ ان کو نہ شہرت کی خواہش تھی نہ دولت کی۔ صرف یہی مقصد تھا کہ دو چار بلند پایہ تصانیف چھوڑ جائیں جن کا مقصد بھی حصول آزادی ہو۔ انہیں صرف ادب اور وطن کی خدمت کا دھیان تھا اور آخر عمر تک وہ قومی زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں حصہ لے کر رہنمائی کا فرض ادا کرتے رہے

اب ہم منشی صاحب کی ادبی خدمات پر مفصل بحث کریں گے۔ ان کی ادبی زندگی چار مختلف حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔

۱۔ پریم چند بحیثیت افسانہ نگار
۲۔ " " ناول نویس
۳۔ " " ڈرامہ نگار
۴۔ " " اخبار نویس

منشی پریم چند کی ادبی زندگی کا آغاز بحیثیت افسانہ نگاری کے ہوتا ہے۔ ہندی میں منشی صاحب سے پہلے مختصر کہانیوں (Short stories) کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اردو میں بھی ایک دو حضرات نے ابتدا کی لیکن صحیح معنوں میں مختصر افسانوں کا پودا منشی صاحب ہی نے لگایا جسے آج ہم ایک تناور درخت کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔

افسانہ منشی پریم چند تک پہونچتے پہونچتے معلوم نہیں کن کن گھاٹیوں اور وادیوں سے گذرا اس کی تفصیل بیان کرنے کا تو یہاں موقع نہیں ہے لیکن پھر ایک دھندلی سی تصویر دماغ کے سامنے رکھ لیں تو منشی صاحب کو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

یوں تو اردو ادب میں کہانی کی ابتدا ایک زمانہ سے ہو چکی تھی۔ "داستان امیر حمزہ" "طلسم ہوشربا" وغیرہ

کہانیاں فارسی سے ترجمہ ہوئیں اور کچھ لکھی بھی گئیں۔ لیکن یہ سب کہانیاں افسانوں کی فنی باریکیوں سے خالی تھیں۔ کیونکہ یہ زمانہ مسلمانوں کے انحطاط اور تنزل کا تھا۔ وہ شجاعت اور بہادری کھو بیٹھے تھے۔ رنگ رنگیلیوں چنگ و رباب، شراب و کباب کے نشہ میں سرشار تھے۔ اس لئے اس دور کی کہانیاں غیر فطری اور مافوق الفطرت باتوں پر منحصر تھیں یعنی وہی حسن و عشق کی گھاتیں وہی لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد کی دہرائی ہوئی داستانیں تھیں۔ اس کے بعد بعض ایسے مذہبی مصلح بھی پیدا ہوئے جنھوں نے برائی سے بچنے اور نیکی پر قائم رہنے کی تلقین مذہبی اخلاقی کہانیاں لکھ کر کی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ملک میں بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اگرچہ یہ ایک سیاسی بیداری تھی لیکن اس کا اثر اردو ادب پر بہت پڑا اور پرانی مافوق الفطرت کہانیوں کی جگہ آسان کہانیوں نے لے لی جن میں روزمرہ کی گھریلو زندگی کے واقعات بیان کئے جانے لگے۔ یوں کہنا چاہیے کہ کہانی اب خیال آرائی سے نکل کر حقیقت نگاری کی طرف آگئی۔ اس میدان میں سب سے پہلے نذیر احمد صاحب نے قدم رکھا اور انھوں نے چلتی پھرتی زندگی کی تصویریں پیش کیں لیکن مولوی صاحب اور ان کے مقلدین کی کہانیاں مختصر افسانہ نویسی کی جدید صنف میں نہیں آسکتیں۔ فنی افسانہ تو حال کی چیز ہے شروع میں بعض لوگوں نے انگریزی سے مختصر افسانوں کے ترجمے کئے اور بعد میں خود بھی لکھنے لگے۔

کہتے ہیں مختصر افسانوں کی ابتدا راشد الخیری، سلطان حیدر جوش اور سجاد حیدر نے کی لیکن ان کے افسانے زیادہ تر اصلاحی پہلو رکھتے ہیں اور اس اصلاحی پہلو کی زیادتی کی وجہ سے مختصر افسانہ کا حسن اور دلچسپی قائم نہیں رہی۔

اس کے بعد تاریخ افسانہ نگاری میں ایک انقلاب آیا اور کثرت سے انگریزی سے اردو میں مختصر افسانے ترجمہ ہونے لگے اور ہمارے لکھنے والے بھی اصلاحی افسانوں کے علاوہ دوسری اقسام کے افسانے بھی لکھنے لگے اور سب سے بڑی بات جو پیدا ہوئی وہ یہ کہ افسانہ کی خاص چیز یعنی مقامی رنگ جھلکنے لگا اور اس میں پریم چند کا درجہ اول ہے کیونکہ انھوں نے مقامی رنگ کا خاص طور سے خیال رکھا۔

ہم حق بجانب ہوں گے اگر یہ کہیں کہ منشی صاحب ہندوستانی افسانہ نگاری میں ایک انقلاب عظیم

تھے۔ ان میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو ایک افسانہ نگار میں ہونی چاہیے۔ ان کے بیان میں ادب کی لطیف روح، رنگینی، وسعت و ہمہ گیری، جوش اور متانت، حقیقت کی جھلک سبھی کچھ موجود ہے۔ ان کی تحریر میں گھریلو زندگی کے مناظر اور بیانیہ نثر کی تاثیر جس سے رات دن کی زندگی کے مانوس مناظر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانے انشا پردازی سے بھی پُر ہیں۔ ایک افسانہ پڑھ کر دل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے تو دوسرا پڑھ کر آنسو بھی نکل پڑتے ہیں۔

منشی صاحب نے ۱۹۰۷ء سے نواب رائے کے نام سے زمانہ میں افسانے لکھنے شروع کئے اور یہ تھوڑے ہی عرصہ میں ملک میں بہت مقبول ہو گئے۔ نواب رائے نواب رائے کا چرچا ہونے لگا۔ سب سے پہلے افسانہ کا نام انمول رتن تھا۔ اس کے بعد ۱۹۰۸ء میں پانچ افسانوں کا مجموعہ سوز وطن کے نام کانپور سے شائع ہو۔ اس وقت ملک میں تقسیم بنگالہ کی شورش برپا تھی اور کانگریس میں گرم دلی کی بنیاد پڑ چکی تھی چنانچہ ان پانچوں کہانیوں میں حب وطن کا ترانہ گایا گیا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد ہمیرپور کے کلکٹر نے ان سے یہ کتاب لیکر جلا ڈالی کیونکہ ان کے خیال میں یہ انقلاب انگیز تھی۔

منشی صاحب کو ویسے تو ادب سے بہت ذوق تھا۔ اور جو قوتیں تصنیف و تالیف کی پوشیدہ تھیں یقیناً ایک نہ ایک دن رونما ہوتیں لیکن منشی صاحب کے اتنی جلد لکھنے کی وجہ ان کی مالی مشکلات تھیں۔ انھیں غربت کا احساس بہت شدید تھا۔ وہ بے چین تھے اپنے جذبات کا اظہار اپنی تحریر میں کریں اس میں شک نہیں کہ روپے پیسے کی بھی تنگی تھی جس کی طرف اپنے افسانے "ڈگری کے روپے" میں اشارہ کیا ہے کہ۔

"مجبور ہو کر اسے اپنے قلم کا سہارا لینا پڑا"

اور افسانہ "خلفی کی محبت" میں بھی لکھتے ہیں کہ

"گوپی ناتھ کو اب ضرورتاً تصانیف کا شوق ہو گیا تھا"

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ انھوں نے کتابیں محض روپے کمانے کی غرض سے لکھیں۔ منشی صاحب کے کل افسانوں کی تعداد تین سو سے زائد ہے۔ ان میں منتخب افسانے ذیل

میں درج ہیں۔

۱۔ بڑے گھر کی رانی
۲۔ رانی سارندھا
۳۔ نمک کا داروغہ
۴۔ سوت
۵۔ آبھوشن
۶۔ پرشچت
۷۔ کامنا
۸۔ مندر مسجد
۹۔ گھاس والی
۱۰۔ مہاتیرتھ
۱۱۔ ستیاگرہ
۱۲۔ لاچھن
۱۳۔ مستی
۱۴۔ لیلےٰ
۱۵۔ منتر
۱۶۔ کفارہ
۱۷۔ سوتیلی ماں
۱۸۔ پنچایت
۱۹۔ اناتھ لڑکی
۲۰۔ راجپوت کی بیٹی
۲۱۔ گلی ڈنڈا
۲۲۔ بدنامی
۲۳ حج اکبر
۲۴۔ زیور
۲۵۔ تمنا
۲۶۔ نوک جھونک
۲۷۔ گناہ کا اگن کنڈ
۲۸۔ بینک کا دیوالہ
۲۹۔ ڈگری کے روپے
۳۰۔ فردوس خیال

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منشی صاحب آخر افسانہ کس طرح لکھتے تھے۔ اس کے بارے میں خود منشی صاحب نے نیرنگ خیال کو ایک خط میں لکھا تھا جس کا اختصار ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

"میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں مگر محض کسی واقعہ کے اظہار کے لئے میں کہانیاں نہیں لکھتا میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جب تک اس قسم کی بنیاد

نہیں ملتی میرا قلم اُٹھتا ہی نہیں۔ زمین تیار ہونے پر میں کیرکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں بعض اوقات تاریخ کے مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔ میں جب تک کوئی افسانہ شروع سے آخر تک اپنے ذہن میں جما نہ لوں لکھنے نہیں بیٹھتا .... میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانہ کی بنیاد کسی پُرسطوت واقعہ پر رکھوں۔ اگر افسانے میں نفسیاتی کلائکس موجود ہوں تو خواہ وہ کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو میں اس کی پروا نہیں کرتا .... کبھی کبھی سنے سنائے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر افسانہ کی بنیاد آسانی سے رکھی جاسکتی ہے .... میں کلائکس لازمی چیز سمجھتا ہوں اور وہ بھی نفسیاتی .... جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے میں اس سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں یہی کیفیت افسانہ کی روح ہے میں بہت سست رفتار ہوں مہینے بھر میں نے کبھی دو افسانوں سے زیادہ نہیں لکھے بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا۔ واقعہ اور کیرکٹر تو سب مل جاتے ہیں لیکن نفسیاتی بنیاد مشکل ملتی ہے۔ یہ مسئلہ حل ہو جانے پر افسانہ لکھنے میں دیر نہیں لگتی .... شاعری کی طرح اس کے لئے بھی اور ادب کے ہر ایک شعبہ کے لئے فطری مناسبت ضروری ہے۔ فطرت آپ سے آپ پلاٹ بناتی ہے، ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے، تاثیر لاتی ہے، ادبی خوبیاں پیدا کرتی ہے۔ نادانستہ طور پر آپ ہی کچھ ہوتا رہے گا۔ ہاں قصہ ختم ہو جانے کے بعد میں خود اسے پڑھتا ہوں۔ اگر اس میں کچھ قدرت کچھ جدت، کچھ حقیقت کی تازگی کچھ حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس ہوتا ہے تو میں اسے کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں۔ ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہو گیا۔ .... اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس افسانہ کو میں نے فیل سمجھا تھا اسے احباب نے بہت زیادہ پسند کیا۔ اس لئے میں اپنے معیار پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا۔"

واقعی منشی صاحب کی کہانیوں میں کوئی نہ کوئی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے محض واقعات

ہی نہیں بیان کرتے وہ اس پر بھی زور دیتے ہیں کہ اچھی چیز لکھنے کے لئے وقت درکار ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ منشی صاحب پر فلاں مصنف کا رنگ چڑھا ہے لیکن اس کے متعلق انھوں نے خود لکھا ہے ان پر کسی کی طرز تحریر کا اثر نہیں پڑا ہے اور کسی مصنف کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے فلاں مصنف کی نقل کی ہے یہ اس کی توہین ہے۔ ہر اچھا مصنف اپنا رنگ جدا رکھتا ہے۔ کوئی نہ کوئی جدت ہوتی ہے اور اس میں انفرادیت باقی رہتی ہے منشی صاحب اس خیال کے قائل تھے کہ جس قسم کے خیالات کا اظہار کرنا ہو اس کے لئے ویسا ہی طرز ادا ہونا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ منشی صاحب کے ہاں مختلف قسم کے رنگ نظر آتے ہیں۔ سنجیدہ مضامین لکھتے وقت ان کا طرز بیان بہت سلجھا ہوا اور سادہ ہوتا ہے۔ ان کی نظر بہت وسیع ہے وہ ہندوستان کے ذرہ ذرہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ ان کو جو چیز ٹیگور کے قریب لاتی ہے وہ ہے ان کا مقامی رنگ اور غالباً ٹیگور کے بعد مقامی رنگ سے سب سے زیادہ فائدہ پریم چند نے اٹھایا۔

افسانہ کی چند اہم خصوصیات اور پریم چند :- برانڈر میتھوز نے اپنے مضمون "فلسفۂ افسانہ" میں لکھا ہے کہ۔

> "ایک مختصر افسانہ اس کہانی سے جو صرف مختصر ہو مختلف اور اہم چیز ہے ایک سچا افسانہ ناول سے اپنی مشہور خصوصیت اتحاد اثر کی بنا پر جداگانہ حیثیت اختیار کرتا ہے۔ چونکہ مختصر افسانے میں الفاظ صحیح اور بالکل حسب محل استعمال کئے جاتے ہیں اس لئے تمام ڈراموں میں فرانسیسی زبان کے کلاسک ڈراموں کی طرح تینوں اتحاد دیکھا ہوتے ہیں یعنی اتحاد عمل مکان و زمان"

اس تعریف کے معیار پر اگر ہم پریم چند کے افسانوں کو جانچیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اتحاد اثر پیدا کرنا ہی ان کا پہلا مقصد تھا انھوں نے ہمیشہ کسی اثر کو پیدا کرنے کے لئے کسی واقعہ کو چنا اور پھر اس واقعہ کے لئے جن جن کرداروں کی ضرورت ہوئی انھیں پیش کیا۔ ان کے افسانے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے وہ اس فن میں ماہر تھے۔ مثال کے طور پر ایک افسانہ "سوتیلی ماں" کو دیکھئے۔ اس میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ واقعات کی تعبیر بدگمانی کے رنگ میں نہ کرنی چاہئے (یعنی یہ کہ سوتیلی ماں بچوں کو اچھی طرح نہیں رکھتی اور اب بھی لوگ اس بارے میں بدگمان رہتے ہیں) بلکہ دیکھنا چاہئے کہ حقیقت کیا ہے۔ اس میں انھوں نے چار کردار مقرر کئے ہیں (۱) وہ شخص جس نے پہلی بیوی کے مرنے کے بعد دوسری شادی کرلی ہے۔

(۲) پہلی بیوی سے ایک بچہ (۳) اس لڑکے کی سوتیلی ماں (۴) ایک دوست۔ یہ چاروں کردار بہت ضروری ہیں۔ بظاہر چوتھا کردار بیکار معلوم ہوتا ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ شوہر کو بدگمانی ہے کہ بیوی اس کے بچے کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتی اس کا پتہ لگانا ہے اور وہ صرف بچے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے لیکن بچہ اپنی ماں کے سامنے یہ شکایت کر نہیں سکتا کیوں کہ اس کے ساتھ ماں کا برتاؤ اچھا ہے اور باپ بھی پوچھتا نہیں کیونکہ اسے صرف شبہ ہے۔ اس نے آنکھوں سے تو دیکھا نہیں۔ باپ کی یہ کوشش ہے کہ بچے کی حرکتوں سے معلوم کرلے کہ ماں کا اس کے ساتھ کیا برتاؤ ہے۔ چنانچہ اس چوتھے کردار یعنی دوست کے اس بچے سے ایک ایسی حرکت سرزد ہو جاتی ہے۔ باپ کو پورا یقین ہو جاتا ہے کہ ماں کا بچے کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں ہے۔ اس لئے اس کردار کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ بدگمانی اس وقت دور ہوتی ہے جب بچہ خود ماں کے اچھے برتاؤ کا ثبوت دیتا ہے۔ اس افسانہ میں کوئی بیکار عنصر نہیں ہے۔ چاروں کرداروں کا ہونا لازمی ہے مصنف نے ایک واقعہ سے متاثر ہو کر اپنا پلاٹ بنالیا ہے اور جس اثر کو انھوں نے قبول کیا ہے۔ اسی کو دوسروں تک پہونچانا چاہتے ہیں اور اثر پورے افسانے میں موجود ہے یہ نہیں ہے کہ مختلف اثرات کام کر رہے ہوں اور افسانہ بھونڈا ہو کر رہ گیا ہو۔ منشی صاحب جو جذبات اور کیفیات طاری کرنا چاہتے ہیں وہ بلاشبہ پڑھنے والے پر طاری ہوتی ہیں۔ اس لئے ہم ان کو کامیاب آرٹسٹ کہہ سکتے ہیں۔

منشی صاحب کے افسانوں میں اتحادِ عمل اور اتحادِ مکان و زمان بھی ملتا ہے۔ اگر ان کے افسانوں سے ایک لفظ بھی کم کر دیا جائے تو کمی محسوس ہونے لگے گی۔ پریم چند نے خود لکھا ہے کہ وہ ہمیشہ کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر افسانے لکھا کرتے تھے۔ ابتدا سے انتہا تک وہی مقصد افسانے پر چھایا رہتا تھا اس لئے کوئی تغیر و تبدل تمام افسانے کی تبدیلی کے مرادف ہوگا۔

ترتیب پلاٹ اور اسٹائل کے لحاظ سے بھی ایسی خوبیاں ہیں کہ جنھیں بیان کرنا ضروری ہے پریم چند کے افسانوں کے کردار مثالی ہوتے ہیں جنھیں ہم مشعل ہدایت بنا سکتے ہیں۔ یہ کرداروں کی اچھائیاں اور برائیاں دونوں دکھاتے ہیں لیکن خوبیاں بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں جس سے برائیاں دب جاتی

ہیں۔ان کے افسانوں میں ارتقا ہے جو ایک افسانہ کے لئے حد درجہ ضروری ہے۔ کوئی کردار ایسا کام نہیں کرتا جس کے لئے وہ پہلے ہی سے تیار نہ ہو۔ اس طرح وہ ارتقائی منزلوں سے گذرنے کے بعد ایک بہترین نمونہ بن جاتے ہیں اور انھیں پیش کرنے کا ڈھنگ بھی نرالا ہے۔ انھیں اس وقت پیش کرتے ہیں جبکہ ان کو ہمیشہ دو مختلف چیزوں میں انتخاب کی ضرورت پیش آتی ہے۔ وہ اچھی چیزوں میں سے ایک کو پسند کرتے ہیں اور اس کی کوئی وجہ ہوتی ہے جسے وہ چھپاتے نہیں بتا دیتے ہیں۔ اور یہ وجہ کسی نہ کسی نقطۂ نظر سے ٹھیک ہوتی ہے۔

پریم چند اپنے افسانوں کے کرداروں کو عموماً افسانے کے شروع میں پیش کرتے ہیں اور ان کی نسلی خصوصیات ان کی مالی حالت وغیرہ دیگر خصوصیات ہمیں بتا دیتے ہیں اور پھر انہی خصوصیات کو کرداروں کی زندگی کے واقعات سے ظاہر کر دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں بوڑھوں، بچوں، نوجوانوں، عورتوں، مردوں عالموں جاہلوں، پنڈتوں مولویوں، پروفیسروں، کلرکوں، ججوں اخبار نویسوں غرضکہ سب کو جگہ ملتی ہے۔

ان کے کرداروں کے مکالمے بھی دلچسپ اور پرمعنی ہوتے ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں ہر ایک کا کردار ادا ہو جاتا ہے۔ اور پتہ کی بات معلوم ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے کرداروں میں رانی سارندھا، بڑے گھر کی بیٹی گناہ کا اگن کنڈ، اور نمک کا داروغہ بے حد نمایاں ہیں۔

پریم چند کے افسانوں میں ایک خاص پلاٹ اور اسٹائل بھی ہوتا ہے۔ بہت سے افسانوں میں ترتیب اور عالم میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پڑھنے والا آنے والے واقعات کا مشتاق ہو جاتا ہے۔

مختصر افسانوں میں تفصیلات کو بہت بڑا عیب سمجھا جاتا ہے لیکن اکثر افسانوں میں پریم چند نے تفصیلات سے کام لیا ہے لیکن ان تفصیلات سے افسانہ کا حسن اور بھی دوبالا ہو گیا ہے اور یہ تفصیلات ادب کی تصور آفرینی کو پورا کرتی ہیں

بعض لوگ پریم چند کے یہاں رومان کی کمی محسوس کرتے ہیں لیکن ان کے افسانوں میں کہیں کہیں رومان کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ان کی رومانیت نیاز اور سجاد حیدر کی رومانیت سے مختلف ہے ان کے رومان میں حقیقت اور اصلاح کا مقصد ہوتا ہے۔ حقیقت میں زندگی کے سچے واقعات میں رومان کا مزہ آتا ہے۔ "تریا چرتر"، "امرت"، اور "وفا کا جال" خاص طور سے اس قسم کے رومانس سے بھرے پڑے ہیں۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے سب افسانے یکساں طور پر کامیاب نہیں ہوئے ہیں بہت سے انھوں نے جلدی اور رواروی میں لکھے ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہیں جن میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہئے کیونکہ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا منشی صاحب ہی کے ہاں کہانی نے جنم لیا انھوں نے اسے پالا پوسا اور بلندی تک پہونچا دیا۔ ان کے ہاں شروع کی ان گڑھت کہانیاں ہیں تو بیچ کی ان سے اچھی اور آخر کی تو مکمل کہانیاں ملتی ہیں جو فنی لحاظ سے یورپ کے مختصر کہانی لکھنے والوں کے مقابلہ میں لائی جا سکتی ہیں۔ ان آخری کہانیوں میں "شطرنج کے کھلاڑی"، "گلی ڈنڈا" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جدید کہانی کے متعلق ان کا نقطۂ نگاہ کتنا سلجھا ہوا ہے وہ لکھتے ہیں کہ۔

"کہانی زندگی کے بہت قریب آگئی ہے۔ اس کی زمین اب اتنی لمبی چوڑی نہیں اس میں اب کئی رنگوں کئی تصویروں اور کئی گھٹناؤں کے لئے جگہ نہیں۔ اب وہ صرف ایک طرف، ایک رخ کے ایک جھیلے کی زندہ جاگتی ہوئی تصویر ہے مصنف کو جو کچھ کہنا ہے وہ کم سے کم الفاظ میں کہہ ڈالتا ہے۔ وہ اپنے کیرکٹروں کے جذبات کی تفصیل بیان کرنے نہیں بیٹھتا مگر ان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔"

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند مختصر کہانیوں کی خوبیوں سے اچھی طرح واقف تھے اور اس معیار پر پوری اترنے والی کہانیاں بھی لکھیں جو آج اردو ادب کی زینت بنی ہوئی ہیں۔

منشی صاحب کے افسانوں کو فنی اعتبار سے تو دیکھ لیا اب ہم وہ عام خصوصیات بیان کریں گے جن کی وجہ سے ان کے افسانے بہت بلند ہیں۔

ہندی والوں نے منشی صاحب کو سمراٹ کا خطاب دیا اردو میں بھی انھیں معجز نگار، انشا پرداز، جادو نگار، نباض فطرت وغیرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں یہ افسانہ نگاری کے بادشاہ ہیں۔ ان میں وہ خوبیاں موجود ہیں جو ایک افسانہ نگار میں ہونی چاہئے۔ ان کی طبیعت افسانہ نگاری کے لئے موزوں تھی انھوں نے افسانے کو ہر طرح دلچسپ و دلکش اور سبق آموز بنانے کی کوشش کی۔

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ روزمرہ کی زندگی کا جیتا جاگتا نمونہ اور اس کا کوئی نہ کوئی روشن پہلو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے مافوق الفطرت انسان کی زندگی نہیں پیش کی بلکہ عام انسانوں

کی نفسیاتی خصوصیات بیان کی ہیں اور افسانوں میں جو واقعات ہیں وہ بھی زندگی کے قریب تر ہیں اور وہ بالآخر کسی خصوصیات میں مختلف نہیں انھوں نے امرا اور دولتمندوں کے قصے نہیں بیان کئے ہیں بلکہ متوسط الحال طبقے کی زندگی پیش کی ہے۔ یہ واقعات پڑھنے والے کو ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ جیسے سب کچھ اس پر گذر رہی ہے اور دل پر ایک مقناطیسی اثر پڑتا ہے۔

دوسری بڑی خصوصیت ان کا جذبۂ قومی ہے۔

سیاسی بدنظمیوں کے دور میں اجتماعی ذہنیت انقلاب کی طرف مائل ہوتی ہے۔ ملک میں افلاس و غربت پھیلنے کے بعد اس کا ردعمل لازمی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں غربت اور غلامی کے احساسات بڑھے اور ملک میں سیاسی اور قومی تحریکیں چلنے لگیں منشی صاحب کانگریس کی تحریک آزادی سے بہت متاثر ہوئے اور ہر چیز ملک پر قربان کرنے کو تیار ہوگئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اسکول کی لگی لگائی ملازمت کو بھی تج دیا اور بالکل آزاد ہو کر ملک کی خدمت کی ٹھان لی۔ وہ دیس کے ہر ہر ذرے کو پرستانہ نظر سے دیکھنے لگے۔ ان کے دل میں ہر اس چیز کی عزت ہے جو انھیں ترقی کی طرف لے جاتی ہے وہ اس روحانیت کے پجاری ہیں جو انھیں بلندی کی راہ دکھاتی ہے

یہ زمانہ روحانیت اور مادیت کی کشمکش کا ہے۔ روحانیت دن بدن آنکھوں سے اوجھل ہوئی جارہی ہے اور مادیت کی بنیادیں مستحکم ہوتی جارہی ہیں اگر یہی رفتار رہی تو وہ دن دور نہیں کہ ہم مادہ پرست ہو جائیں۔ ہر شخص اس نئی ترقی کو ترقی سمجھتا ہے اور آنے والے زمانہ کے لئے بیتاب ہے لیکن اپنے پچھلے کارنامے کوئی نہیں دیکھتا جو سراپا روحانیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان پرانی چیزوں کی بلندی اور عظمت کی یاد کسی کو نہیں ستاتی روحانیت مشرق کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ پریم چند کا حساس دل ان کو صرف افسانہ سمجھ کر کس طرح بھلا دیتا ہے۔ وہ ہندوستان کی عظمت کی پچھلی داستانوں کو دہراتے ہیں۔ وہ راجپوتوں کی عظمت شجاعت، جاں بازی وطن پرستی کے قصے بیان کرتے ہیں اور روحانیت کے احساس سے قوم کے دل میں ایک روح پھونکنا چاہتے ہیں بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ پریم چند راجپوتوں کی عظمت اس لئے بیان کرتے ہیں کہ ہندوؤں کے مردہ جذبات میں ایک جان پیدا کر دیں۔ اس طرح سے اسے فرقہ وارانہ رنگ دیا جاتا ہے لیکن یہ خیال غلط ہے

ان کا اصل مقصد ہندوستان کی روحانیت کو اُجاگر کرنا ہے۔ راجپوتوں کی شجاعت اور بہادری ہندوستان کی شجاعت اور بہادری ہے وہ ہمارے دلوں میں ان قصوں سے ایسے جذبات پیدا کرنا چاہتے ہیں جن کو ہم کبھی نہ بھولیں وہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے بتائے ہوئے راستوں پر چلیں اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور بہادری کو پھر حاصل کریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی مردہ رگوں میں پھر سے خون ابل آئے اور ان میں ایک برقی قوت آجائے۔ وہ راجپوت عورتوں کی بہادری، ایثار قربانی، وطن پرستی اور جانبازی کے کارنامے سنا کر عورتوں کو جنگ آزادی کی دعوت دیتے ہیں۔ اس قسم کے افسانوں میں "وکرماوت"، "رانی سارندھا"۔ "راجہ ہردول"۔ "گناہ کا اگن کنڈ" وغیرہ ہیں۔ یہ محض اس لئے لکھے گئے ہیں کہ ہندوستانی اپنی عظمت کو پہچان لیں لیکن ان افسانوں میں پریم چند نے زیادہ تر شعریت سے کام لیا ہے حقیقت دوسرے افسانوں کے مقابلہ میں کم ہے لیکن یہ کمی ایسی نہیں ہے کہ پلاٹ بالکل غیر فطری ہو گیا ہو۔ اسے چاہے کمزوری سمجھئے یا خوبی پھر بھی یہ نقص ایسا نہیں ہے کہ نکتہ چینی کی جائے۔

تیسری خصوصیت ان کا مقامی رنگ ہے منشی صاحب نے اپنے زیادہ تر افسانوں میں اپنے دیس کے واقعات ہی لئے ہیں اور ان میں خاص طور سے راجپوتوں کی زندگی دیہاتیوں کی زندگی اور ہندوؤں کی زندگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان میں زیادہ نمایاں حیثیت دیہاتی زندگی ہی کو ہے۔ انھوں نے دیہاتی زندگی کی ہو بہو تصویر بنائی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب منشی صاحب کا نام سنتے ہیں تو دیہات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے خوب اچھی طرح واقف تھے کہ ملکی آزادی اور ترقی کا راز دیہات کی اصلاح اور ترقی میں مضمر ہے۔ انھوں نے دیہاتیوں کی زندگی سے متعلق بیسیوں کہانیاں لکھی ہیں "پنچ پرمیشور"، "بیٹی کا دھن"، "نمک کا داروغہ" وغیرہ کہانیاں دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ وہ دکھاتے ہیں کہ بھولے بھالے دیہاتی کن کن مصیبتوں میں مبتلا ہوتے ہیں وہ مفلس قلاش قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں۔ ان کی زبوں حالی، زمینداروں، مہاجنوں، پولیس والوں، پٹواریوں اور تحصیلداروں کے مظالم کا حال پڑھ کر بے اختیار آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں لیکن ان کی ہمت کی داد دیجئے کہ وہ نہایت خاموشی اور صبر و شکر کے ساتھ سہتے ہیں۔ اور صرف قدرت ہی کے سہارے جیتے ہیں۔ اسی کی پناہ لیتے ہیں لیکن فطرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ان کو اپنے ہاں بھی پناہ نہیں دیتی ساری بلائیں انھیں پر اترتی ہیں۔ بارش کا وہ اس طرح انتظار کرتے ہیں

جیسے پپیہا پی کے لئے بے چین ہوتا ہے جب بارش ہوتی ہے تو اس کی جان میں جان آتی ہے ——— اور پھر ایسی جھڑی لگتی ہے کہ کھلنے کا نام ہی نہیں لیتی کھیت دریا بن جاتے ہیں سب خانہ ویران ہو جاتے ہیں تو پھر یہ بے چارے معصوم کسان اس فکر میں گردن جھکا کر بیٹھ رہتے ہیں کہ ہم نے گناہ کئے ہیں جن کا کفارہ ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ دوسری فصل آئی اس سے کچھ امیدیں وابستہ کیں اور کھیت سبز ہوتے ہی ان کے جی کی کھیتی بھی ہری ہو گئی لیکن ان کے اس صبر اور مہینوں کے پسینوں پر ایک پالے کے پڑجانے سے پانی پھر جاتا ہے اور رہی سہی امید بھی مرجا جاتی ہے غرضکہ پریم چند نے ان مصیبت زدوں کا حال درد بھرے الفاظ میں ہمارے سامنے رکھا ہے لیکن ان کی اس دکھ بھری کہانی کے ساتھ ساتھ اکثر دیہاتی زندگی کے چند ایسے دلچسپ مناظر پیش کر دیتے ہیں تاکہ غم کی گھٹا چھٹ جائے اور اس طرح ہمارے مضطرب جذبات میں اشتعال کی جگہ شکر اللہ در دپیدا ہو جاتا ہے۔ دیہات کا ایک سین بھی دیکھئے۔ ایک گاؤں ہے اور برسات کا موسم......

"اساڑھ کا مہینہ تھا کسان گہنے اور برتن بیچ بیچ کر بیلوں کی تلاش میں در بدر پھرتے تھے۔ گاؤں کی بوڑھی مینائیں نویلی دلہن بنی ہوئی تھی اور فاقہ کش کمہار بارات کا دولہا تھا مزدور موقع کے بادشاہ بنے ہوئے تھے ٹپکتی ہوئی چھتیں ان کے نگاہ کرم کی منتظر گھاس سے ڈھکے ہوئے کھیت ان کے دست شفقت کے محتاج جسے چاہتے تھے بساتے تھے جسے چاہتے تھے اجاڑتے تھے۔ آم اور جامن کے پیڑوں پر آٹھوں پہر نشانہ بازمنچلے لڑکوں کا محاصرہ رہتا تھا۔ بوڑھے گردنوں میں جھولیاں لٹکائے پہر رات سے ٹپکے کے کھوج میں گھومتے نظر آتے تھے۔ جو باوجود پیرانہ سالی کے بھجن اور جاپ سے زیادہ دلچسپ مشغلہ تھا نالے پر شور ندیاں اتھاہ، چاروں طرف ہریالی اور سبزہ اور نزہت گاہ حسن بسیط انہیں دنوں ٹھاکر صاحب مرگ بے ہنگام کی طرح گاؤں میں آئے۔ ایک سجی ہوئی بارات تھی۔ ہاتھی، گھوڑے اور ساز و سامان لٹھیتوں کا ایک رسالہ تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے یہ طمطراق اور کرّو فر دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ گھوڑے کھیتوں میں اینڈنے لگے اور غنڈے گلیوں میں" (پریم پچیسی جلد ۲ صفحہ ۴۰۶ تا ۲۰۳)

دوسرا منظر "دوسرا اساڑھ آیا تو وہ گاؤں پھر رنگ گلزار بنا ہوا تھا بچے پھر اپنے دروازوں پر گھروندے بنانے لگے مردوں کے بلند نغمے کھیتوں میں سنائی دیتے اور عورتوں کے سہانے گیت چکیوں پر زندگی کے دلفریب جلوے نظر آنے لگے۔"

"سال بھر گذرا جب ربیع کی دوسری فصل آئی تو سنہری بالیوں کو کھیتوں پر لہراتے دیکھ کر کسانوں کے دل لہرانے لگتے تھے سال بھر کی افتادہ زمین نے سونا اگل دیا تھا۔ عورتیں خوش تھیں کہ اس کے سنے نئے گہنے بنوائیں گے۔ مرد خوش تھے کہ اچھے اچھے بیل مول لیں گے اور داروغہ جی کی تو مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی ٹھاکر صاحب نے یہ خوش آئند خبریں سنیں اور دیہات کی سیر کو چلے۔ وہی تزک و احتشام، وہی لٹھیتوں کا رسالہ وہی غنڈوں کی فوج۔ گاؤں والوں نے ان کی خاطر و تعظیم کی تیاریاں کرنی شروع کیں موٹے تازے بکروں کا ایک پورا گلہ چوپال کے دروازہ پر باندھا لکڑی کے انبار لگائے دودھ کے حوض بھر دئے۔ ٹھاکر صاحب گاؤں کے مینڈے پر پہونچے پورے ایک سو آدمی ان کی پیشوائی کیلئے دست بدست کھڑے تھے۔"

پریم پچیسی جلد ۲ صفحہ ۶۷-۶۸

پریم چند کے افسانوں کے انجام اکثر طربیہ ہوتے ہیں وہ اچھے عمل کا نتیجہ اچھا ہی دکھانا چاہتے ہیں لیکن زندگی میں واقعات ہمیشہ اس کے منافی ہوتے ہیں وہ حقیقت پسندی سے کسی قدر ہٹ گئے ہیں۔ لیکن یہ صرف اصلاحی پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔

منشی صاحب کے افسانوں میں ان خوبیوں کے علاوہ جو چیز لوگوں کو کھینچتی ہے وہ خود ان کی ذات ہے۔ ان کی طبیعت افسانے لکھنے کے موزوں تھی یوں کہنا چاہئے کہ پریم چند افسانے لکھنے ہی کے لئے پیدا ہوئے تھے چھوٹی سی چھوٹی اور معمولی سے معمولی چیز کو بہت دلچسپ بنانے کی کوشش کی۔ روزمرہ کی زندگی کے واقعات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان میں شاعرانہ باریکیاں۔ نفسیاتی بلندیاں اور نفسیاتی کمالات محسوس کرتے ہیں۔ انھوں نے صحیح معنوں میں دامن اردو کو انمول افسانوں سے بھر دیا۔

دوسری چیز جو لوگوں کو لبھاتی ہے وہ ان کا طرز بیان اور اسٹائل ہے۔ بہت سادہ اور ستھری زبان میں اپنا مطلب ادا کرتے ہیں جس سے پڑھنے . . . والے کو ایک خاص لطف آتا ہے۔ ہندی فارسی کے لفظوں اور ترکیبوں کی ملاوٹ، تشبیہوں اور استعاروں کا حسن، الفاظ کا صحیح استعمال، ان کے افسانوں کو دوبالا کر دیتا ہے اور ان کی شگفتگی کا رنگ بھی ہر افسانہ پر جھلکتا ہے جس سے عبارت شگفتہ نظر آتی ہے۔ منشی صاحب واقعی افسانہ نگاری کے بادشاہ تھے جنھیں اردو ادب تو کم از کم نہیں بھول سکتا۔

(باقی آئندہ)

محمد اسمٰعیل خاں صاحب بی۔ اے (جامعہ)

با مقصد و مفید تعلیم کا نظریہ

جان ڈیوی نے پیشہ[1] کا ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے جو اس کی تحریروں میں جا بجا مذکور ہے لیکن اس نے اس لفظ کو کسی محدود معنی میں نہیں استعمال کیا ہے جیسا کہ عام طور پر لوگ پیشہ ور اور صنعتی کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔ اس کا نظریہ ہمہ گیر ہے جس کی وسعت میں تمام باکار اور با مقصد تعلیم (جس میں نظری و عملی تعلیم بھی شامل ہیں) آجاتی ہے۔ وہ اس نظریہ کا سب سے بڑا علمبردار ہی نہیں بلکہ مخترع اور موجد بھی ہے۔ اس کا نظریہ تعلیمی دنیا میں اپنا سکہ جما چکا ہے اور اس کا اثر اس صدی میں بہت گہرا ہوا ہے۔

یوں تو افلاطون کے زمانہ سے پیشہ کا لفظ رائج ہے لیکن انیسویں صدی میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ کارل مارکس مصنف "سرمایہ"، کروپاٹکن مصنف "کھیت، کوٹھیاں اور کارخانے" اور جرمن سوشلسٹ ہنریخ شولز مصنف "اشتراکی جمہوریت کی اسکولی اصلاح" وغیرہ مفکرین کی تحریروں نے اسی خیال کی ترویج و تبلیغ کی اور ذہنی و رسمی تعلیم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا لیکن آج کل جو عمومیت اس کو حاصل ہوئی ہے وہ ڈیوی کا اعجاز ہے۔

پیشہ کا مفہوم | حرفتی تعلیم کا سراغ لگایا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ زمانہ قدیم سے یہ خیال مروج تھا کہ ذہنی تعلیم فراغت و فرصت کے ہم معنیٰ ہے۔ علم کو علم ہی کی غرض سے سیکھنا تعلیم کا منتہائے مقصود ہے۔ اسی پر ذہنی اور روحانی ترقی کا انحصار ہے۔ اور اس میں حس و حرکت کو بالکل دخل نہیں۔ کلچر کا مفہوم بھی عصر جدید میں ایک خاص معنی رکھتا ہے وہ شخصی تہذیب اور ذاتی شائستگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس میں بعض ایسی کیفیات اور شعور کی شمولیت ہے۔ جو سماجی افادہ سے معریٰ ہے۔ ڈیوی پیشہ و حرفت کی تعریف یوں کرتا ہے: "وہ مشاغل حیات کی ہدایت کا نام ہے جو انسان کو دوسروں کی عظمت و اہمیت سے شعوری طور پر آگاہ کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے نتائج سے دوسرے متاثر ہوتے اور فائدہ اٹھاتے ہیں"۔ پیشہ کی ضد نہ تو فرصت ہے اور نہ کلچر بلکہ تعلیم کا بلا مقصد اور بلا نصب العین کے حاصل کرنا اور طفیلی کی طرح سماج پر آسرا لگانا اس کا ضد ہے۔ پیشہ عملی تسلسل و حرکت کا نام ہے۔

[1] Vocation

اس کی فرمانروائی میں آرٹ کی فطری قوتوں کی ترقی ہوتی ہے۔ سائنس کی اختراعی قوتیں ابھرتی ہیں مدنیت کی روح پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہے اور خود حرفہ و پیشہ اوج کمال حاصل کرتے ہیں۔

پیشہ کو صرف دائرہ حرفت تک محدود رکھنا سخت غلطی ہے کیونکہ پیشہ و حرفت ہی پیشہ کا منتہائے مقصود نہیں ہے۔ پیشہ کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس کے احاطہ میں وہ تمام انسانی مشاغل آجاتے ہیں۔ جو انسان کے بامقصد شغل کو گھیرے ہوئے ہیں۔ انسان ایک ہی کام کے لئے نہیں پیدا کیا گیا۔ وہ مختلف فرائض حیات کا مجموعہ ہے طرح طرح کے مشاغل انواع و اقسام کے فرائض اس کے ذمہ ہیں جن کا انجام دینا اس کے لئے ناگزیر ہے صرف فنافی الحرفہ ہو جانا سماج کے لئے سم قاتل ہے۔ ہر انسان جو دنیا میں آتا ہے یہاں کی چہل پہل، رونق و زینت، گفتار و کردار، لین دین، آمد و رفت میل و محبت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ کتنا ہی بڑا صاحب کمال اور اپنے فن میں طاق کیوں نہ ہو لیکن گھر بار، خاندان دوست و احباب، پڑوسی اعزہ و اقارب کے ربط و تعلقات سے آزاد نہیں رہ سکتا۔ اور نہ ان فرائض سے منھ موڑ سکتا ہے۔ جس طرح وہ دوسروں کے سہارے اور مدد پر جیتا ہے۔ دوسرے بھی اس کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ اس کے تعلقات دوسروں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اور وہ بھی دوسروں کے تعلق سے متاثر ہوتا ہے وہ فلسفی ہو یا شاعر، مغنی ہو یا مصور، انجینیر ہو یا ڈاکٹر، مدبر ہو یا پروفیسر، ملاح ہو یا نجار، کاشتکار ہو یا مزدور، اس کے لئے کسی عورت کا شوہر، کسی باپ کا بیٹا، کسی بیٹے کا باپ کسی معاشرہ کا رکن، کسی ریاست کی رعایا ہونا ناگزیر ہے۔ جب تک وہ دوسرے شعبہ ہائے حیات سے تعلقات نہیں رکھتا اپنے شغل زندگی میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ باہمی تعلقات و تعاون سے اسے کسی طرح چھٹکارا نہیں، ہمدردی و رواداری کو اس کا مسلک ہونا چاہئے۔ جس کے بغیر زندگی بسر کرنا محال ہے۔

<u>پیشہ کی اہمیت</u> تعلیم ان ہی لوگوں کا فریضہ ہے جو انفرادی حیثیت سے کوئی مشغلہ امتیازی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پیشہ ہی وہ چیز ہے جو انسان کی امتیازی قوتوں اور سماجی خدمات کے درمیان توازن پیدا کرتا ہے۔ انسان اسی وقت خوش و خرم رہ سکتا ہے جب وہ اپنی فطری قوتوں کے مطابق کسی پیشہ کو اختیار کرنے اور اس کو حسن و خوبی سے انجام دینے کی کوشش کرے جب تک انسان اپنے مقصد حیات کو متعین نہ کرے گا ہرگز ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔ صحیح شغل وہی کہا جا سکتا ہے جب انسان کے جبلی رجحانات پوری آزادی کے ساتھ نشوونما پائیں۔

اس کی ترقی کی راہ میں کم سے کم مشکلات حائل ہوں اور زیادہ سے زیادہ سرور و بہجت ہو۔ اس سے عملی فائدہ یہ ہوگا کہ قوم اور معاشرہ کو اس فرد کی پوری خدمت حاصل ہو سکے گی۔ ازمنہ قدیم میں جب کہ غلامی کا رواج عام تھا، خاص طور پر اس بات کی کمی تھی کہ بہت سے بہترین ذی استعداد اور باذاق لوگوں کی خدمت سے سماج مستفید نہ ہو سکی۔

افلاطون کے نقطۂ خیال سے تعلیم کا یہ فرض تھا کہ وہ ہر شخص کی انفرادی قوت وصلاحیت کو جانچے اور ان کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے میں ہر ممکن کوشش کرے کیونکہ اسی ترقی کی بنیاد پر سماج کی ترقی کی عمارت اٹھائی جا سکتی ہے۔ اور یہی وہ ذریعہ ہے جس سے معاشرہ کی ضروریات کے مطابق جامعیت پیدا ہو سکتی ہے۔ یہاں افلاطون نے ایک لغزش کی ہے۔ اس نے پیشہ کے مطمع نظر کو محدود کر دیا ہے۔ ڈیوی کا خیال ہے کہ پیشہ ایک مسلسل بامقصد شغل کا نام ہے اور جو تعلیم صنعت وحرفت کے ذریعہ سے حاصل کی جاتی ہے وہ پائدار اور مستحکم ہوتی ہے۔ یہی علم وعمل کا سنگم ہے۔ اسی سے تمام جبلتوں اور خصلتوں کا ظہور ہوتا ہے اور یہی انفعالیت کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ اس کی ایک ہی منزل مقصود ہوتی ہے۔ وہ بچوں کے قوائے فکریہ سے اپیل کرتی ہے۔ اسی کے سبب تمام کورانہ لائحہ عمل متحرک اور حیاتی عمل سے تبدیل ہو جاتے ہیں اور انفعال اشغال میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ چونکہ مشاغل ترقی پذیر ہیں اور ایک زینے سے دوسرے زینے پر بتدریج پہونچتے ہیں، اس لئے تمام رکاوٹوں اور نامساعد حالات کے استیصال کے لئے فطانت اور غور وفکر کو خضر راہ بنانا ہمارا فرض ہے۔

پیشہ وحرفت سے معلومات وخیالات میں اضافہ ہوتا ہے اور علم وذہن کی ترقی ہوتی ہے۔ وہ ایک محور کی پوزیشن اختیار کرتا ہے جس پر تمام تجربات گردش کرتے ہیں۔ وہ منبع ہے جس سے تمام واقعات ومعلومات کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ وہ ایک گہوارہ ہے جس کی آغوش میں تجربات کی افزائش ہوتی ہے۔ ایک وکیل ایک طبیب ایک معمل کا محنتی۔ ایک سرپرست، ایک شہری جو اپنے مدنی فرائض وحقوق سے دلچسپی لیتا ہے اور اپنے منتہائے مقصود کو پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر اپنے شغل وحرفت کی تکمیل کرتا ہے اور وہی شغل وپیشہ اس کا مرکز ثقل بن جاتا ہے۔

کسی پیشہ کے سیکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ پیشہ کے ذریعہ سے سیکھا جائے تعلیمی طور وطریقہ کا انجام اور حیات امروزہ کا بہترین استعمال ہی انسان کو کسی پیشہ کا ماہر اور کامل بنا سکتا ہے۔ ہر انسان کا ہر زمانہ میں ایک ہی پیشہ رہا ہے اور وہ یہ کہ زندہ رہنے کے ساتھ ساتھ ذہنی اور اخلاقی ترقی کو پیش نظر رکھنا۔ عہد طفولیت اور سن بلوغ میں جب کہ انسان آزاد فضا میں رہتا اور معاشی آزادی کا لطف اٹھاتا ہے اس وقت یہ خیال زیادہ غالب رہتا ہے۔ مگر استبدادی سماج میں دوسری ہی دنیا ہوتی ہے۔ وہاں نئی زمین اور نیا آسمان ہوتا ہے، وہاں نہ تو آزادی اس کی ملکیت میں ہوتی ہے اور نہ ذمہ داری اس کی معین و مونس بنتی ہے۔ اس فضا میں جن لوگوں کی پرورش ہوتی ہے وہ ذہنی ترقی کی چوٹی تک نہیں پہونچ سکتے۔ طبقہ اعلیٰ اور طبقہ ادنیٰ کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہوتی ہے اور اس طرح سماجی زندگی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ اس لئے لازمی ہے کہ ابتدائی دور میں پیشہ کی تعلیم بلاواسطہ ہونی چاہئے جس میں بچے کے صرف فطری رجحانات اور جبلی خواہشات کا لحاظ رکھا جائے۔ ایسے مشاغل منتخب کئے جائیں جو اس کے طبعی میلانات کے مطابق اور اس کی مجموعی ترقی میں معین ہوں۔ یہی طریقہ ہے جس سے بچے کا صحیح فطری میلان بتدریج معلوم ہو سکے گا۔ جس کو وہ آئندہ زندگی میں استعمال کرے گا۔ وہی اس کا مخصوص پیشہ بن جائے گا اور ایک مرتبہ انتخاب کرنے کے بعد وہ اس کی زندگی کا رفیق ہو جائے گا لیکن اس بات کو گرہ میں باندھ لینا ہے کہ جو پیشہ انسان اپنے لئے اختیار کرے اس میں امتداد زمانہ کے مطابق تغیر و تبدل بھی ضرور ہوتا رہے کیونکہ اس تغیر پذیر عالم میں ہر آن اور ہر لمحہ نئی تنظیم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو شخص پیہم نئی تعمیر کرتا رہے گا وہی فلاح کی راہ پر گامزن ہوگا۔

موجودہ مواقع وخطرات گزشتہ زمانہ میں حقیقتاً حرفتی تعلیم کا زیادہ چرچا تھا۔ حالانکہ وہ تعلیم پیشہ کے نام سے موسوم نہ تھی۔ عوام کی تعلیم صنعتی تھی جس کو نو آموزی کے نام سے یاد کرتے تھے یا تحصیل تجربات کے لقب سے پکارتے تھے۔ اسکولوں میں عام طور پر محض لکھنے پڑھنے اور حساب کی تعلیم مروج تھی۔ جس کی ضرورت ہر پیشہ والے کو پڑتی تھی لیکن کسی مخصوص پیشہ میں تیار ہونے کے لئے دوسروں کے دارالعمل میں جانا پڑتا تھا۔ جو اسکول کی تعلیم سے بالکل الگ ہوتا تھا۔ اہل طبقہ کے لوگوں کی تعلیم حرفتی

تھی گو وہ اس کو اس نام سے یاد کرنا معیوب خیال کرتے تھے۔ صرف انہیں پیشوں کو پیشہ تصور کیا جاتا تھا۔ جن میں جسمانی محنت اور عرق ریزی ہوتی تھی جن کا مطمح نظر کسی قسم کا صلہ اور انعام یا کسی بڑے شخص کی خدمت ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جراح اور طبیب کے پیشے کی وقعت حجام کے پیشے سے زیادہ نہ تھی ظاہری نمائش شخصی زیبائش حلقہ احباب کا جمع کرنا بھی ایک پیشہ تصور کیا جاتا تھا۔ آج کل بھی اعلیٰ تعلیم ایک خاص طبقہ کے لئے محدود ہے جس کا حصول انہیں لوگوں کا اعلیٰ مقصد ہوتا ہے۔ وہ تمام تعلیم جس سے معلم ادیب لیڈر پیدا ہوتے ہیں غیر حرفتی خیال کی جاتی ہے اور اس کو کلچر کا مرادف سمجھا جاتا ہے۔ ڈیوی کا خیال ہے کہ "ادبی تعلیم جس سے ایک مصنف، ایک اڈیٹر اور ایک صحیفہ نگار کی تربیت ہوتی ہے۔ یہ لوگ پیشہ کے خلاف کلچر کی آواز بلند کرتے ہیں حالانکہ ان کو یہ نہیں معلوم کہ وہ جس تعلیم کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اس میں وہ خود بھی گرفتار ہیں جس تعلیم کو وہ ذہنی و تمدنی تعلیم کے نام سے پکارتے ہیں وہ خود ایک مخصوص پیشہ ہے جس کی مدد سے وہ اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ انھوں نے خود ایک مخصوص پیشہ کی تربیت حاصل کی ہے۔ اور وہ اپنا کام اس لئے مستعدی سے کرتے ہیں کہ اس کے بغیر معاشی زندگی بسر کرنا ناممکن ہے۔" ذہنی اور حرفتی تعلیم میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ اگر تفاوت ہے تو بامقصد اور بے مقصد تعلیم میں۔ ہر وہ تعلیم جو بامقصد ہوگی، جس سے انسان اختیاری زندگی بسر کرسکے گا۔ جس سے مدنیت کی لیاقت اور معاشرہ کا باکار رہبر بننے کی صلاحیت پیدا ہوگی وہی حرفتی وافادی تعلیم ہوگی، اسی کا نام شغل ہوگا۔ اسی کو ووکیشن کے دائرے میں رکھا جائے گا۔

منصبی وافادی تعلیم پر تاکید | جمہوری اقوام میں یہ خیال عمومیت کے ساتھ پھیل رہا ہے کہ چونکہ ہر مرد و عورت کو سماج سے ذہنی اور اقتصادی مدد ملتی ہے اس لئے اس کا فرض ہے کہ سماج کو بھی مدد پہونچائے۔ اب لوگوں میں اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ محنت قابل ستائش ہے اور خدمت خلق ایک اخلاقی فرض ہے۔ گذشتہ صدی سے صنعتی انقلاب کی بدولت ان تمام پیشوں نے جو صنعتی ہیں کافی اہمیت حاصل کرلی ہے۔ صنعت اور تجارت اب گھریلو نہیں رہے بلکہ ان کی حیثیت اب بین الاقوامی ہوگئی ہے اور ان میں بہترین دماغوں کی کاوش شامل ہے۔ تاجروں، ساہوکاروں اور بنک والوں نے زمینداروں

کی جگہ لے لی۔ سماج کی کشتی کے یہی لوگ کھویا ہیں۔ سرمایہ دار اور مزدور میں ایک خاص تعلق پیدا ہو گیا ہے آج کل کی صنعت و حرفت نے فنی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اور ریاضی، کیمیا، طبیعیات اور نباتات میں خاص تحقیقات کی گئی ہے۔ اقتصادی انقلاب نے سائنس میں تازہ روح پھونک دی ہے۔ صنعتی پیشے دماغی کاوش چاہتے ہیں۔ اور ان میں تمدن کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔ مزدوروں کے لئے بھی سائنس کی تھوڑی سی واقفیت لازمی ہے تاکہ وہ لوگ کامیابی سے کارخانوں میں کام کر سکیں۔ قدیم صنعتوں میں انفرادی علم کو بہت کم فروغ حاصل ہوا تھا۔ لیکن آج کل مشین چلانے والے کو مشین کے مطابق کام کرنا پڑتا ہے۔ مشین کو اس کی رائے کے مطابق استعمال نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیوی نے صنعتی و حرفتی تعلیم کو اسکولوں کے لئے ناگزیر خیال کیا ہے۔

سائنس کا علم تمام تر تجرباتی ہے۔ اس کا انحصار ادبیات پر نہیں۔ اس کی رو سے علم کے طور و طریقہ سے واقفیت زیادہ اہم ہے۔ عام مزدوروں کو دار التجربہ کی تحقیق کی طرح کارخانوں میں تحقیق کی ضرورت نہیں۔ وہاں تو صرف ضرورت کے مطابق کام کرنا ہے۔ اسی بات کو مدنظر رکھ کر ڈیوی نے اسکولوں میں ایسے مشاغل مہیا کرنے کو لازمی خیال کیا جن سے بچے مشینوں، کارخانوں اور سائنس کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لیں۔ بچوں کو یہ تمام معلومات بتدریج دی جائیں تاکہ وہ کھیل کود کی طرح اس کو بھی بآسانی حاصل کر لیں۔ انواع و اقسام کی معلومات کا ذخیرہ مہیا کرنا اور بچوں کے دماغ میں ان کو عملی طور پر ذہن نشین کرنا اسکولوں کا فرض ہے۔ اس طرح بچوں میں ذوق عمل پیدا ہوگا۔ اسکول اور خارجی زندگی میں باہم ربط و تعلق پیدا ہو جائے گا اور وہ اس جذبہ کے ماتحت کام کریں گے ؎

ذوق عمل سے ہے نشاط، مجھ کو نہیں غم حیات
روز نیا ہے آفتاب، روز نئی ہے زندگی

یہاں پر ڈیوی نے ایک غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔ ممکن ہے کہ لوگ اس تعلیم کو تجارتی تعلیم خیال کریں۔ جس سے بچے آئندہ زندگی میں مخصوص پیشہ اختیار کرنے کے لائق ہو جائیں۔ ڈیوی نے بتایا ہے کہ اس تعلیم سے مراد ایسی تعلیم ہے جس سے ہر فرد معاشرہ کا لائق ممبر بن سکے۔ ہر فرد اپنی زندگی خود اختیاری طور پر بسر کر سکے اور دوسرں

کا محتاج و دست نگر نہ رہے بغیر کسی روک کے ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق زندگی گزار سکے۔

افلاس و غربت مصیبت کے مرادف نہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ لوگ اپنے فطرتی رجحان کے خلاف غلط پیشے اختیار کرتے ہیں جن میں وہ کسی قسم کی سرگرمی وانہماک ظاہر نہیں کرتے اور نہ ان کے دل میں فرط و انبساط پیدا ہوتا ہے۔ لوگ صرف روپیہ کمانے کو سامنے رکھتے ہیں ان کا دل کہیں اور دماغ کہیں ہوتا ہے پیشہ کا محدود نظریہ ان تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ اس کی رو سے مزدور و سرمایہ دار اور آقا و غلام کے درمیان ایک خلیج حائل ہو جاتی ہے جو افراد کی ترقی میں روڑے اٹکاتی ہے۔

وہ تعلیم جو پیشہ کی ذہنی و سماجی اہمیت کی معترف ہے وہ اسکولوں میں گزشتہ واقعات کی روشنی میں موجودہ تعلیم کی گتھیوں کو سلجھائے گی۔ سائنس کی تعلیم دے گی تاکہ ذہانت تیز ہو اور مختلف قسم کی اختراع و ایجادات اور صنعت گری میں پیش قدمی کا مادہ پیدا کرے۔ حالات عصریہ سے واقفیت کے لئے معاشیات مدنیات، سیاسیات اور معاشرہ کی اصلاح کا مطالعہ لازمی ہے۔ ان تمام باتوں سے بچوں میں جدید حالات کے مطابق آراستہ ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی اور کورانہ تقلید کے بجائے اختراعی قوت نمودار ہوگی۔ اور اس طور پر ہماری سماجی تشکیل کا انحصار ایک نئی تعلیمی تعمیر پر ہوگا۔

ضیاء الدین احمد صاحب الہ آبادی

حکومتوں کا پروپیگنڈہ

پروپیگنڈے کا ہماری زندگی پر بہت گہرا اثر ہے۔ حالانکہ ہم اس کو محسوس نہیں کرتے۔ ہمارے اخلاق و عادات ہمارے مذہبی اور سیاسی عقاید کی تشکیل اسی کی بدولت ہوتی ہے۔ یہ کوئی نئی ایجاد نہیں اس لئے کہ دنیا کے ہر دور میں مذہبی پیشواؤں سیاسی مدبروں اور جلیل القدر بادشاہوں نے اس کو اپنی کامیابی کا ذریعہ تسلیم کیا ہے لیکن صنعتی انقلاب کے بعد نئی ایجادات اور اختراعات کی وجہ سے پروپیگنڈے کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ ہوگئی ہے اور ہماری زندگی کا کوئی لمحہ اس کے اثر سے باہر نہیں ہے۔ جس طرح آج کل ہر چیز میں خاص مہارت حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اسی طرح پروپیگنڈے کو بھی ایک مکمل فن کے درجہ تک پہونچا دیا گیا ہے۔ ہر حکومت نے باقاعدہ ایک محکمہ مقرر کر رکھا ہے۔ جو اس کے طریقوں اور اصولوں کی اشاعت کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس کے لئے ایک بہت کثیر رقم خرچ کی جاتی ہے تعلیمی اداروں، رسائل اور کتب، پبلک جلسوں اور ریڈیو وغیرہ کی خدمات اس مقصد کے لئے حاصل کی جاتی ہیں۔ موجودہ حکومتوں کے پاس پروپیگنڈے کے لئے جو سب سے مفید حربہ ہے وہ تعلیم عامہ ہے پہلے انیسویں صدی میں مغربی یورپ کے سرمایہ دار تعلیم عامہ کو بہت مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ وہ اس کے مخالف اس لئے تھے کہ اس سے عوام میں بیداری پیدا ہونے کے امکانات تھے بعد میں انھوں نے محسوس کیا کہ تعلیم عامہ بہت کارآمد چیز ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے عوام پر اپنا اقتدار قائم رکھ سکتے ہیں۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ جو خیالات بچپن میں انسان کے دماغ پر نقش ہو جاتے ہیں وہ بڑی مشکل سے زائل ہوتے ہیں اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے موجودہ حکومتیں تعلیمی اداروں کے ذریعہ سے عوام کو اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا سبق دیتی ہیں۔ نصاب تعلیم بھی ایسا رکھا جاتا ہے کہ حکومت وقت کے خلاف کسی قسم کے باغیانہ جذبات نہ پیدا ہو سکیں۔ ہندوستان میں ہم کو برطانوی راج کی تعریف کے گیت سکھلائے جاتے ہیں اور اس پر زور دیا جاتا ہے کہ اس کے بغیر

ہمیں امن وامان نصیب نہیں ہو سکتا۔ انگریز بچوں کو برطانوی سلطنت کے جاہ وجلال کا نشہ پلایا جاتا ہے تاکہ وہ اس میں مخمور رہ کر اس کے تحفظ کے لئے اپنے جان ومال کی قربانی کے لئے تیار رہیں۔ جرمنی کے اسکولوں میں یہ سبق دیا جاتا ہے کہ یہودی دنیا کے ذلیل ترین لوگ ہیں اور وہی جرمنی کی تمام پچھلی مصیبتوں کے ذمہ دار ہیں۔ نازیت دنیا کے لئے بہترین نظام ہے اور چونکہ جرمن قوم سب اقوام سے اعلیٰ وارفع ہے اس لئے دنیا بھر پر حکومت کرنا اس کے مقدر میں لکھا ہے۔ یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ اگرچہ ان تمام سرمایہ دار ملکوں میں خواہ وہ انگلستان ہو یا امریکہ، اٹلی ہو یا جرمنی پروپیگنڈے کے طریقے جدا جدا ہیں اور ان کے فوری اغراض میں بھی اختلاف ہے لیکن ان کے بنیادی مقاصد میں ہم آہنگی ہے یعنی ان سب کا آخری مدعا یہ ہے کہ سرمایہ داری دنیا میں قائم رہے برخلاف اس کے سوویٹ روس کے اسکولوں اور کالجوں میں لڑکوں کو سرمایہ داری کے نقائص سمجھائے جاتے ہیں اور اشتراکیت کی خوبیاں ان کے دماغوں میں جاگزیں کرائی جاتی ہیں۔ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ روس میں نئی پود اشتراکیت کے اصولوں کو اس قدر بہتر اور مکمل سمجھتی ہے کہ ان کے قائم رکھنے اور ان کی تبلیغ کے لئے ہر ممکن قربانی کرنے کو تیار ہے

اب میں چند باتیں مذہبی پروپیگنڈے کے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔ مذہبوں کے پاس ہمیشہ سے پروپیگنڈے کے بہت کارگر طریقے رہے ہیں جن کو انھوں نے اپنا اثر قائم کرنے کے لئے استعمال کیا اور کرتے ہیں۔ مسلمان مسجد سے اذان کے ذریعہ، ہندو مندر سے ناقوس کے ذریعہ اور عیسائی گرجے سے گھنٹے کے ذریعہ اپنے مذہبوں کی دعوت دیتے ہیں۔ مذہبی اجتماع، جلوس اور رسوم اگرچہ انسان کے روحانی جذبات کو تسکین دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ اس کی بے رنگ اور خشک زندگی میں آب و تاب اور رونق بھی پیدا کرتے ہیں۔ مذہبوں کی مقبولیت اور کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے۔ علاوہ اس کے شاندار مذہبی جلوس، پراسرار رسوم اور عالیشان اور خوبصورت عبادت گاہیں انسان کے دماغ پر مذہبیت کا غلبہ اور اقتدار قائم کرنے میں کافی مدد دیتی ہیں۔

لیکن جس مذہب کا اثر عوام پر ہے اس کو اچھے اصولوں کی اشاعت کے لئے نہیں بلکہ رجعت پسندی کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کیلئے بھی استعمال کیا جاتا ہے موجودہ زمانہ میں مذاہب حکومتوں کے تابع

ہو گئے ہیں اور حکمراں طبقہ مذہبی پیشواؤں کو جو چال چاہتا ہے چلاتا ہے اور جس رنگ پر چاہے لگاتا ہے حکومتیں مذہبی اثر اور اقتدار کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ چنانچہ مذہبی رہنما "مذہب خطرے میں ہے"، "تہذیب کو بچاؤ" وغیرہ وغیرہ کے نعرے بلند کر کے عوام کو حکومت کی طرفداری اور حمایت پر آمادہ کرتے ہیں لیکن یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ یہ لوگ بلا وجہ حکومت کا دامن پکڑے ہوئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ اس وجہ سے مروجہ حکومت کے ساتھ ہیں کہ اس سے ان کے مفاد وابستہ ہیں اس کی ترقی ان کی ترقی ہے اس کی بقا ان کی بقا ہے۔ دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

پرانے زمانہ میں حکمراں رعایا پر اپنا وقار اور دبدبہ قائم رکھنے کے لئے عظیم الشان محل اور مقبرے بناتے تھے۔ فوجی مظاہرہ اور دربار شان وشوکت سے منعقد کرتے تھے۔ ایران کے ساسانی بادشاہ، روم کے شہنشاہ اور سیلوکس کے جانشین اسی مقصد کے لئے اپنے آپ کو دیوتا مشہور کئے ہوئے تھے۔ اسی طرح انگلستان میں موجودہ حالات کے اعتبار سے بادشاہ کے اثر کو قائم رکھنے کے لئے ہزارہا مدابیر کی جاتی ہیں۔ اخبار، ریڈیو اور سینما کے ذریعہ سے شاہی خاندان کو ہر دلعزیز بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ برسر اقتدار طبقہ کے لئے لازم ہے کہ وہ عوام پر اپنی افضلیت کا سکہ جمائے تاکہ حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ وہ اپنی اصل حقیقت کو نہیں ظاہر ہونے دیتا بلکہ اس کو پراسرار افسانوں میں پوشیدہ رکھتا ہے اور ہم میں سے بہت ایسے لوگ ہیں جو اس ظاہر جلا کی تہہ کو نہیں پہونچتے کیونکہ ہم سرمایہ داروں کی ظاہرا شان وشوکت اور آرام وآسائش کی زندگی سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اور ہم بھی اسی کا خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ ہم ان کی مخالفت کریں ہم ان کے ہاتھوں بہت تھوڑے داموں بک جاتے ہیں اور اپنے اصولوں کے خلاف ان ہی کا گیت گانے لگتے ہیں۔

موجودہ جنگوں میں پروپیگنڈے کی بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ جس طرح توپیں، بم اور آبدوز کشتیاں دشمن کو شکست دینے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ اسی طرح پروپیگنڈے کا بھی حربہ بھی خدمت انجام دیتا ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم میں انگریزی اور جرمن ہوائی جہاز ایک دوسرے کی فوجوں پر بم کے

گولوں کے ساتھ ساتھ اشتہارات بھی پھینکتے تھے تاکہ سپاہیوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا کریں۔ زیادہ تر کاغذ کے غبارے یہ کام انجام دیتے تھے۔ موجودہ جنگ کے شروع میں انگریزی ہوائی جہازوں نے جرمنی میں لاکھوں رسالے اور اشتہار گرائے تاکہ اس طرح عوام ہٹلر کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جائیں۔ ریڈیو کو پروپیگنڈے کے لئے سب سے پہلے جس ملک نے استعمال کیا وہ سویٹ روس تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۱۷ء کے بعد تمام دنیا روس کے خلاف تھی جتنی بڑی حکومتیں تھیں وہ ایک محاذ قائم کر کے اشتراکی نظام کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ ایسی حالت میں بالشویکوں نے اپنے دشمنوں کا دو طرح سے مقابلہ کیا اول تو اپنی فوجوں سے، دوسرے ریڈیو کی مدد سے۔ ریڈیو کے ذریعہ انہوں نے اپنے اصولوں کی اشاعت کی تاکہ دنیا کے مزدور بجائے ان کے خلاف لڑنے کے ان کی حمایت کریں۔ روس کے لئے آخر میں یہ اخلاقی اور نفسیاتی اثرات جو اس نے دوسرے ملکوں پر ڈالے بہت ہی مفید ثابت ہوئے۔ موجودہ جنگ میں بھی ریڈیو کے ذریعہ ہر ملک اپنے موافق بہت شدت سے پروپیگنڈا کر رہا ہے اور اس قدر جھوٹ اور مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے کہ شیطان بھی کانپ اٹھتا ہوگا۔ پچھلی جنگ میں جرمنی نے غیر ملکوں پر بہت کم زور دیا تھا لیکن ہٹلر نے اس کمی کو محسوس کر کے ۱۹۳۳ء ہی سے پروپیگنڈ کا جال تمام دنیا میں پھیلانا شروع کر دیا۔ چنانچہ جب موجودہ جنگ چھڑی تو اس کو اپنی مہموں کے سر کرنے میں بڑی مدد ملی۔ ریڈیو کے پروپیگنڈے میں بھی وہ اتحادیوں سے بازی لے گیا۔ لیکن اب تھوڑے عرصہ سے انگریزوں کو ہوش آیا ہے اور وہ اس کمی کی تلافی کر رہے ہیں۔

پروپیگنڈہ کرنے کا یہ بھی ایک عام لیکن کارگر طریقہ ہے کہ جس نظریہ کی اشاعت کرنی ہو اُسے کلیۃً بنا کر پیش کیا جائے تاکہ کسی گروہ یا فرقہ کو امتیازی صورت نہ حاصل ہو سکے اور اس کے اثرات محدود نہ ہو جائیں۔ دنیا کی جتنی بڑی تحریکیں ہوئی ہیں ان میں یہ اصول ہمیشہ کار فرما رہا ہے۔ مثلاً ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس میں درمیانی طبقہ نے جو اپنے مفاد کے تحفظ کیلئے جاگیری نظام کے خلاف لڑ رہا تھا آزادی، مساوات اور اخوت کے نعرے بلند کئے تاکہ عوام ان کی طرف آ جائیں حقیقت میں اس طبقہ کا مقصد عوام کو فائدہ پہونچانا نہ تھا بلکہ وہ اس بہانے اپنے لئے آزادی اور مساوات قائم کرنا چاہتا

تھا تاکہ اپنی تجارت اور صنعت کو فروغ دے سکے۔ اسی طرح موجودہ لڑائیاں سامراجی لڑائیاں ہیں۔ لیکن سرمایہ دار عوام کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے کے لئے ان کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں "تمہارا ملک خطرہ میں ہے"۔ "تمہاری آزادی خطرہ میں ہے"۔ "جمہوریت کو بچاؤ" وغیرہ وغیرہ عوام دہوکے میں آکر ان اصولوں کے تحفظ میں اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔ اور طرح طرح کی کلفتیں برداشت کرتے ہیں حالانکہ آخر میں ان کی قربانیوں کا ثمرہ دوسروں کو ملتا ہے۔

پروپیگنڈے کے متعلق ہٹلر کا خیال ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو جنت دوزخ معلوم ہو سکتی ہے اور دوزخ میں جنت کا لطف مل سکتا ہے۔ ہٹلر کا یہ خیال تجربہ پر مبنی ہے۔ اہل جرمنی کچھ عرصہ سے کس قدر تکلیف اور پریشانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لیکن وہ اس کو استقلال کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے دماغوں میں یہ جاگزیں کر دیا گیا ہے کہ اب جرمنی کے لئے عہد زریں آیا چاہتا ہے تھوڑا اور امتحان باقی ہے۔ اگر ہم ہندوستان کی طرف متوجہ ہوں تو ہم دیکھیں گے کہ جہاں پروپیگنڈے کی بدولت ملک میں سیاسی شعور اور بیداری پیدا ہو رہی ہے وہاں اسی کی بدولت ہندو مسلم کش مکش اور ہمارے سیاسی جمود اور اضمحلال کا سماں بھی نظر آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ پروپیگنڈے ہی کی برکت ہے کہ ہمارے مخالفین نے تمام دنیا بھر میں یہ شہرت دے رکھی ہے کہ ہندوستانی خود حکومت کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ ان میں صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو بغیر خارجی مدد کے سنبھال سکیں۔ چنانچہ اس پروپیگنڈے کا یہ اثر ہے کہ نہ صرف غیر اقوام ان باتوں کو یقین کرتی ہیں بلکہ ہم میں خود ایک طبقہ ایسا ہے جو اپنے اہل وطن کو حکومت کرنے کے قابل نہیں سمجھتا اور اپنے ملک کے مستقبل کو امید افزا نہیں سمجھتا۔

لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ پروپیگنڈہ ہمیشہ کامیاب ہوا کرتا ہے۔ ہم کو یہاں پر دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ اول تو یہ کہ اشاعت کے طریقے مختلف ممالک میں جدا جدا ہوا کرتے ہیں۔ جو طریقہ ایک جگہ کامیاب ثابت ہو کوئی ضروری بات نہیں کہ وہ دوسری جگہ بھی کامیاب ہو۔ مثلاً گاندھی جی کی فاقہ کشی ان کی طرز زندگی اور ان کی لنگوٹ بندی صرف اسی ملک کے لئے کارگر ہو سکتی ہے۔ اس لئے

کہ یہاں کے معاشی اور تمدنی حالات کی وجہ سے عوام گیروے تہمد اور آدھ گز کی لنگوٹی کے بہت جلد گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ دوسرے ملکوں میں یہ طریقے باعث تمسخر ہوں گے لیکن چونکہ ہمارے یہاں مذہبیت اور اوہام پرستی کا بہت زور ہے اس لئے ہر وہ پروپیگنڈہ جس پر مذہبی رنگ ہو بہت جلد پھیل جاتا ہے انگلستان اور امریکہ میں ان باتوں سے کام نہیں چلتا اس لئے وہاں قومیت اور جمہوریت کے نعرے بلند کرکے عوام کو جوش دلایا جاتا ہے۔ جرمنی میں گذشتہ جنگ عظیم کے بعد معاشی اور سیاسی حالات نے اس طرح پلٹا کھایا تھا کہ ہٹلر اور اس کی پارٹی نے ایک نیا حربہ استعمال کیا جس نے ان کو آخرکار کامیاب بنا دیا۔ ملک میں جو اشتراکی پارٹی تھی اور جس کا عوام پر بہت زیادہ اثر تھا اس نے رفتہ رفتہ اپنی حماقتوں سے اپنا وقار کھو دیا۔ جس وقت عوام انقلاب چاہتے تھے انھوں نے نہ صرف ان کی رہنمائی نہیں کی بلکہ نہایت غداری سے کام لیا اور باوجود اس کے کہ حکومت کی باگ ڈور ایک عرصہ تک اشتراکی لیڈروں کے ہاتھ میں رہی انھوں نے بیروزگاری اور افلاس اور معاشی کساد کے سوالوں کا کوئی حل پیش نہ کیا۔ آخرکار عوام اپنے لیڈروں سے اس قدر بددل ہو گئے کہ انھوں نے اپنی قسمت کو فسطائیوں کے حوالے کر دیا جن کے وعدوں کو انھوں نے آمنّا اور صدقنا کہکر تسلیم کر لیا۔ ہٹلر مزدوروں سے کہتا کہ ہم تو سوشلسٹ ہیں اور تمہاری حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور مزدوروں کو اپنی طرف کرنے کے لئے پارٹی کا نام بھی "نیشنل سوشلسٹ" رکھا۔ دوسری طرف سرمایہ داروں کی یہ کہہ کر دلجوئی کرتا اور ان سے مالی امداد حاصل کرتا کہ ہم تو اشتراکیت کے جانی دشمن ہیں اور اس کو نہ صرف جرمنی سے بلکہ تمام دنیا سے نیست و نابود کرنا ہمارا نصب العین ہے۔ ہٹلر انسانی نفسیات کا بڑا ماہر ہے۔ اور اس نے اس کو مدنظر رکھکر وہ تمام طریقے اختیار کئے جن سے عوام اس کی طرف راغب ہو جائیں۔ اس نے اہل جرمنی کو ان کے قدیم کارنامے اور روایات یاد دلائے۔ اس نے ان زیادتیوں اور بے انصافیوں کو عوام کے سامنے پیش کیا جو اتحادیوں نے جرمنی کے ساتھ کی تھیں۔ اور لوگوں کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے اس نے یہودیوں کو جرمنی کی تمام مصیبتوں کا ذمہ دار قرار دیا۔ وہ قربانی کا بکرا بن گئے۔ عوام نے اپنے دلوں کے غبار ان بے چاروں پر اتارے اور ان پر سختیاں کرکے اپنے آپ کو تسکین

دی لیکن وہ ان باتوں میں اس قدر غرق ہوئے کہ اپنی زندگی کے مسائل کو بھی بھول گئے مختصر یہ کہ ہٹلر نے مختلف طریقوں سے ملک پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ . . . . لیکن یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ جس طرح "پروپیگنڈے کے طریقہ" کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ملک کے معاشی حالات سے مطابقت رکھے اسی طرح جس چیز کا پروپیگنڈہ کیا جائے اس کی بھی ان باتوں سے مناسبت ہو نازیوں کو جرمنی میں حالات نے مدد دی، انگلستان اور فرانس میں باوجود ہر قسم کے پروپیگنڈے کے فسطائیت کامیاب نہ ہو سکی اس لئے کہ وہاں کے اقتصادی حالات اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے مختصر یہ ہے کہ کسی اصول کی اشاعت کے لئے اگرچہ صحیح قسم کا پروپیگنڈہ بہت ضروری ہے لیکن جو سب سے بنیادی چیز ہے وہ ملک کی معاشی اور سماجی حالت ہے۔ روس میں جاگیرداری اور سرمایہ داری دونوں نیست ونابود ہو گئیں کیونکہ حکمراں طبقہ نئی سماجی قوتوں کی وسعتوں کا اندازہ نہ لگا سکا۔ بالشویک پارٹی کے پاس زار کے مقابلہ میں نہ تو فوجی قوت تھی اور نہ وہ اثر جو صدہا برس کے پروپیگنڈے سے حاصل ہوتا ہے لیکن اس کو پھر بھی کامیابی نصیب ہوئی۔ یہ ضرور ہے کہ بالشویک لیڈروں کی ثابت قدمی ان کی قربانی اور ان کے عاملانہ طریقے انقلاب کے لئے مفید ثابت ہوئے لیکن اصل میں جو شئے پرانے نظام کی ہلاکت کا باعث ہوئی وہ اقتصادی حالات تھے۔ یورپ کی اور خاص کر روس کی اقتصادی اور سماجی ترقی میں بالشویک پارٹی کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ حکومت وقت کے مقابلہ میں کسی باغی جماعت کے ذرائع پروپیگنڈہ بہت محدود ہوتے ہیں اور اگر اقتصادی حالات اس کی مدد نہ کریں تو اس کو کبھی کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔ پروپیگنڈے سے جو اس کو مدد ملتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے عوام پر معاشی ترقی کے تمام سماجی پہلو اور اثرات بخوبی ظاہر کر دئے جاتے ہیں۔ اور ہر طبقہ کی سوسائٹی میں جگہ اور اُن کے اغراض ومقاصد نمایاں ہو جاتے ہیں یہ ایک مفید اور اہم فرض ہے لیکن آج کل دنیا کی حکومتیں خواہ وہ جمہوری ہوں یا نسطائی پروپیگنڈے کا یہ صحیح مصرف نہیں لیتیں۔ بجائے عوام کو فائدہ پہونچانے کے اس کے ذریعہ وہ طوق غلامی دوسروں کے گلوں میں پہناتی ہیں۔ اور پاس کی بہت سی مثالیں دی جا چکی ہیں۔ اور جب تک موجودہ نظام قائم رہے گا یہی صورت رہے گی۔ اس لئے کہ غلط پروپیگنڈہ

کرنا سرمایہ داروں کے اثر اور اقتدار قائم رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہے لیکن جس وقت ایسے معاشرہ کی تشکیل ہوگی جس کی بنیادیں معاشی اور سماجی انصاف پر ہوں جس میں مالی نفع کی ہوس اور طبقاتی کشمکش فنا ہو جائیگی۔ تو اس وقت موجودہ قسم کے پروپیگنڈے کی ضرورت بھی باقی نہ رہے گی لیکن خود پروپیگنڈے کی نہ ضرورت اور نہ اہمیت کم ہوگی بلکہ اس کی قدر و منزلت میں صحیح معنوں میں اضافہ ہوگا۔ نئے سماجی اور اخلاقی اور معاشی نظریوں کو عوام میں زیادہ مقبول بنانے کے لئے ریڈیو، سنیما، اخبار اور رسائل وغیرہ کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ جیسا کہ آج کل سویٹ روس میں ہو رہا ہے۔ ان باتوں کے باوجود اگرچہ اس نئی سوسائٹی میں پروپیگنڈے کے غلط استعمال کا امکان بہت کم ہو جائے گا لیکن اس کا خطرہ رہے گا کہ ایک فرد یا ایک گروہ اپنا ذاتی اقتدار قائم کرنے کے لئے پروپیگنڈہ شروع کر دے۔ بہترین سے بہترین سوسائٹی میں ایسے افراد موجود ہو سکتے ہیں جو معاشی فوائد نہ چاہتے ہوں بلکہ ان کی ہوس سیاسی اقتدار اور اپنی حکومت قائم کرنے کی ہو۔ ایسے لوگوں سے ہوشیاری لازم ہوگی۔ ان سے بچنے کا سوا اس کے اور کوئی علاج نہیں کہ عوام کی تعلیم اور ان کے سیاسی شعور کا معیار اتنا بلند ہو کہ وہ خطرناک اثرات سے محفوظ رہیں۔ اور رائے عامہ اتنی منظم ہو کہ کسی شخص کو جھوٹا پروپیگنڈہ کرنے کی ہمت نہ پڑ سکے ان ہی صورتوں میں انسانی آزادی خطرے سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

محب الحسن خاں صاحب بی۔ اے آنرز (لندن)

نثر اردو کی تدریجی ترقی

(سرسید اور ان کے رفقا تک)

آج اصول ارتقا زندگی کی ہر چیز پر حاوی ہے۔ ہر چیز کی تدریجی ترقی اسی اصول کی کارفرمائی کا نتیجہ قرار دی جاتی ہے۔ پہلے اگر اس کا عمل صرف حیات حیوانی تک محدود سمجھا جاتا تھا تو اب اس کا اثر اخلاقیات اور نفسیات تک بھی پہونچ چکا ہے۔ اور ہر قسم کی علمی تحقیقات میں ارتقائی پہلو کا مطالعہ اہم اور ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔

جبکہ انسانی زندگی تدریجی ترقی اور اصول ارتقا کا نتیجہ ٹھیری تو ادب جس کا انسانی زندگی کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے کیونکر اس اصول سے بچ سکتا تھا۔ ادب زندگی کا آئینہ دار ہے جیسے جیسے زندگی بڑھتی رہی ہے ادب بھی ترقی کرتا رہا ہے۔ زندگی نے جو منزلیں طے کی ہیں ادب بھی ان راہوں سے گذرا ہے۔ لیکن زندگی کا جو حصہ گذر گیا خواہ وہ کتنا ہی دلچسپ اور رنگین کیوں نہ ہو اس کا لوٹنا ناممکن ہے لیکن ادب فانی نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ اور اس کے ساتھ زندگی کی وہ تمام رنگینیاں بھی جن سے وہ گذشتہ ادوار حیات میں گذر چکا ہے۔ اسی لئے ہر زمانہ کا ادب اس عہد کی زندگی کی یادگار رہے اور یہ ایک ایسا مرقع ہے جس میں ماضی و حال کا رنگ مل کر مستقبل کی ہلکی سی جھلک دکھاتا ہے۔

نثر اردو کی ابتدا آٹھویں صدی ہجری سے ہوتی ہے[1] اور ابتدا سے لیکر اس وقت تک اسی اصول ارتقا کے باعث اس میں برابر تدریجی ترقی ہوتی رہی ہے۔ آزاد آب حیات میں زبان اردو کی ترقی پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اردو اس قدر جلد رنگ بدل رہی ہے کہ ایک مصنف اگر خود اپنی ایک سنہ کی تصنیف کا دوسرے سنہ کی تصنیف سے مقابلہ کرے تو زبان میں فرق پائے گا"

یہ بالکل صحیح ہے بلکہ ہمارے خیال میں اردو زبان نے ارتقائی منازل اس سے بھی جلدی جلدی طے کئے ہیں

[1] سنہ ۱۳۰۰ء جس وقت سے ہم اردو کی ابتدا کرتے ہیں سنہ ۱۸۰۰ء یعنی فورٹ ولیم کالج کے قیام تک کوئی منظم

کوشش زبان کو ترقی دینے کی قطعاً نہ کی گئی۔ اس تین چار سو سال کے عرصہ میں زیادہ تعداد میں صوفیائے کرام اور اولیا اللہ نے مذہبی جذبہ سے متاثر ہو کر زیادہ تر تبلیغ کی غرض سے اردو میں ترجمے کئے یا کتابیں لکھیں۔ اور کم تعداد میں تبلیغ کے سوا ادبی موضوع یعنی کہانیاں اور قصے لکھنے پر قلم اٹھایا گیا۔ یہ سب انفرادی کوششیں تھیں اور اس عرصہ میں بغیر کسی اجتماعی کوشش کے جتنا بھی ہو گیا غنیمت تھا۔ یہ اُردو کی فطری صلاحیت اور کشش ہی تھی کہ لوگوں نے اپنے شوق سے اس میں خامہ فرسائی کرنی شروع کی لیکن سنہ ۱۸۰۰ء جب سے کہ اس کی ترقی میں منظم کوششیں ابتداً، شروع کی گئیں!! اس وقت سے آج تک اس نے ان مختصر عرصہ میں اپنی صلاحیت، قابلیت اور ہمہ گیری کا ایسا زبردست ثبوت پیش کیا کہ دوسری پرانی ملکی زبانیں اس دوڑ میں اس سے بہت پیچھے رہ گئیں اور وہ سب پر بازی لے گئی۔

اس مضمون میں ہمیں نثر اردو کی تدریجی ترقی دکھانی ہے اور منازل ارتقا، پوری طرح ذہن نشین کرانے کے لئے ضروری ہے کہ مختلف منازل کی خصوصیات کا لحاظ کرتے ہوئے نثر اردو کے مختلف دور قائم کریں اور پھر ہر دور کو جدا جدا لے کر بحث کریں تاکہ عمل ارتقا کے اندازہ کرنے اور مختلف خصوصیات کے جاننے میں آسانی ہو۔

دور اول	سنہ ۱۴۰۰ء	سے	سنہ ۱۵۹۰ء	تک	خالص مذہبی دور
دوسرا دور	سنہ ۱۵۹۰ء	سے	سنہ ۱۷۰۰ء	تک	مذہبی ادبی دور
تیسرا دور	سنہ ۱۷۰۰ء	سے	سنہ ۱۸۰۰ء	تک	ادبی مذہبی دور شمالی ہند میں
چوتھا دور	سنہ ۱۸۰۰ء	سے	سنہ ۱۸۲۰ء	تک	ادبی دور کلکتہ میں۔
پانچواں دور	سنہ ۱۸۲۰ء	سے	سنہ ۱۸۵۰ء	تک	لکھنؤ کا ادبی عہد (عبوری دور)
چھٹا دور	سنہ ۱۸۵۰ء	سے	سنہ ۱۹۱۴ء	تک	نشاۃ ثانیہ۔ جدید نثر اردو کی ابتدا

یہ ہے ہماری زبان کی اجمالی کیفیت۔ آئیے اب اس کا تفصیلی مطالعہ کریں۔

نوٹ:- یہ سنہ وار جو دور قائم کئے گئے ہیں ان سے یہ مطلب نہیں ہے کہ بالکل معین تاریخ پر ایک دور ختم ہو کر ٹھیک اسی کے بعد سے دوسرا شروع ہو گیا بلکہ اس سے صرف ایک اندازہ لگانا مقصود ہے۔ اگرچہ یہ ضرور ہے کہ معینہ زمانے میں کسی دور کی زیادہ تر خصوصیات ملتی ہیں

نثر اُردو کا پہلا دور

خالص مذہبی

سنہ ۱۴۰۰ء سے سنہ ۱۵۹۰ء

اردو نثر کی ابتدا کے متعلق ابھی تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اب تک جو تحقیقات ہوئی ہے اور دکن کے اہل قلم کی جو کتابیں دریافت ہوئی ہیں ان سے یہ امر صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں نثر نویسی کے شروع ہونے سے کئی سو سال قبل دکن میں اردو زبان کی نہ صرف داغ بیل پڑ چکی تھی بلکہ اس میں نظم و نثر کے بارآور درخت بھی موجود تھے۔ ارتقائی منازل میں یہ وہ زمانہ تھا جب اردو بالکل بچپن کی حالت میں تھی اس وقت تک عدالتی زبان فارسی اور ہندوؤں کی زبان ہندی تھی اور ہندو و مسلمان مذہب، تمدن، معاشرت اور زبان ہر چیز میں بالکل مختلف اور جدا تھے لیکن ایک ملک میں رہنے کے ساتھ اس اختلاف اور علیحدگی کا قائم رہنا بڑا مشکل تھا۔ مذہب چونکہ بالکل انفرادی چیز ہے اس لئے اس نے تو اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ لیکن زندگی کی اور دوسری چیزیں اس میل جول اور ربط و اتحاد کے باوجود کیوں کر جدا جدا رہ سکتی تھیں۔ تمدن اور معاشرت کے جذب و انجذاب سے جہاں ایک نئے تمدن اور معاشرت کی بنیاد پڑی وہاں زبانوں کے ملنے سے ایک نئی زبان وجود میں آئی۔

زبانوں میں اس قسم کی تبدیلیاں غیر شعوری طور پر ابتداً صرف عام گفتگو اور روزمرہ کے کاروبار تک محدود رہتی ہیں لیکن چونکہ میل جول اور ربط و ضبط کی وجہ سے ایک دوسرے کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتا ہے اسلئے ضرورتاً دونوں زبانوں میں ایک دوسرے کے الفاظ لائے جاتے ہیں۔ اور یہ عمل جاری رہتا ہے تاآنکہ ایک ایسی زبان جو دونوں سے مختلف اور دونوں سے مل کر بنی ہو وجود میں آجاتی ہے۔ یہ زمانہ زبان کے بچپنے کا ہوتا ہے۔ الفاظ کا سرمایہ بہت مختصر اور محدود ہوتا ہے۔ ادائے مفہوم کے لئے غیر زبانوں کی دست گیری کی حاجت ہوتی ہے۔ استعارات تشبیہات کی گنجائش نہیں ہوتی علمی مصطلحات اور سنجیدہ اسالیب بیان بھی ناپید ہوتے ہیں۔ چودھویں اور پندرھویں صدی میں اُردو اسی عالم میں تھی اور اپنے عہد طفولیت سے گذر

رہی تھی۔

اس دور کی اردو نثر پر خالص مذہبی رنگ بہت گہرا چڑھا ہوا ہے۔ جتنی کتابیں ملتی ہیں سب مذہبی ہیں اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ اس دور کے علما اور صوفی ہندی نژاد مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی طرف سے بے پروا نہیں تھے اور چونکہ فارسی عربی سے مقصد پورا نہیں ہوتا تھا لہذا ان کی تعلیم کے لئے ان کی زبان کا اختیار کرنا بھی ناگزیر تھا علاوہ بریں چونکہ ان کا مقصد تبلیغ اسلام تھا اور اس مقصد کے لئے دیسی اور عوام کی زبانوں ہی سے اچھی طرح مقصد براری کی امید تھی اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور کی تصانیف میں مقامی بولیوں کا رنگ بیحد نمایاں ہے۔

دوراول کی تصانیف | دکن میں اردو نثر کا ابتدائی دور سلاطین بہمنی کے زمانہ کی یادگار ہے۔ یہ عہد سلاطین بہمنی کی سرپرستی میں گذرا۔ قدیم تذکرہ نگاروں نے فضلی کی دہ مجلس کو اردو نثر کی اولین تصنیف لکھا ہے لیکن جدید تحقیقات کی رو سے ایسے مصنفین ملتے ہیں جو فضلی سے کئی صدی قبل گذرے ہیں۔ ان میں خواجہ اشرف جہانگیر سمنانی علیہ الرحمہ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ حضرت موصوف کی پیدائش سنہ ۶۸۹ھ مطابق ۱۲۸۹ء میں ہوئی آپ کا تصنیف کردہ ایک رسالہ تصوف جس کا سنہ تصنیف ۷۵۸ھ ہے موجود ہے۔ جدید تحقیقات کے بعد اسی کو اردو نثر کی اولین تصنیف قرار دیا جاتا ہے۔ تعجب ہے کہ اس کی زبان باوجود قدامت کے بہت صاف ہے اور آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔

"اے طالب آسمان و زمین سب میں خدا ہے جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بھیتر تمام ذات ہی ذات ہے"

اس عہد کے دوسرے مشہور مصنف حضرت شیخ عین الدین گنج العلم ہیں ان کی زبان اپنے عہد کی دکنی اردو کا نمونہ ہے لیکن حضرت موصوف خود دکنی نہیں تھے۔ آپ کی پیدائش سنہ ۷۰۶ھ میں دہلی میں ہوئی تحصیل علم کے شوق میں گجرات تشریف لے گئے۔ آخر دولت آباد آکر دم لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دولت آباد کی قسمت جاگ رہی تھی اور سلطان محمد تغلق کا دارالحکومت تھا۔ اس وقت یہاں صوفیائے کرام کا اچھا خاصا مجمع تھا جن سے اکتساب فیض کا موقع تھا۔ شیخ عین الدین گنج العلم حضرت علاؤالدین حسینی کے مرید ہوئے اور

حضرت شیخ منہاج الدین علیہ الرحمہ سے اکتساب علوم روحانی کیا۔ تاریخوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ ۷۳۶ھ میں بیجاپور تشریف لائے اور سلطان علاؤ الدین حسن بہمنی اور اس کے چار جانشینوں کا عہد بھی آپ کے سامنے گذرا مؤلف اردوئے قدیم کا بیان ہے کہ

۔ شیخ عین الدین گنج العلم نے چھوٹے چھوٹے کئی رسالے دکنی زبان میں تصنیف کئے تھے منجملہ ان کے تین رسالے ایک مجموعہ میں سینٹ جارج کالج کے کتب خانہ میں موجود تھے۔ ان کے اوراق کی مجموعی تعداد چالیس تھی۔ اور ان میں فرائض وسنن کے متعلق مختلف احکام اور مسائل تحریر تھے۔

اس دور کے دوسرے بہت مشہور مصنف حضرت بندہ نواز خواجہ گیسو دراز علیہ الرحمۃ ہیں۔ ان کی تصانیف یں ویسے تو اور بھی کتابیں ہیں لیکن بہت مشہور کتاب "معراج العاشقین" ہے جو طبع ہو چکی ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۳۹۸ء ہے آپ کی پیدائش ۱۳۲۰ء بمقام دہلی ہوئی آپ خواجہ احمد نصیر الدین چراغ دہلوی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ خرقہ خلافت ملنے پر آپ گلبرگہ تشریف لے گئے۔ یہ فیروز شاہ بہمنی کا زمانہ تھا یہ ۸۱۵ھ کا واقعہ ہے آپ کی وفات احمد شاہ بہمنی کے عہد ۸۲۵ھ میں ہوئی۔

حضرت خواجہ بندہ نواز شاعر بھی تھے اور بلند پایہ مصنف بھی۔ تصوف کی تقریباً ۳۰ کتابیں آپ نے تصنیف کیں۔ اکثر عربی اور فارسی کی کتابوں پر حاشیہ لکھا۔ آپ اپنے ہندوستانی شاگردوں کو ان ہی کی زبان میں تعلیم دیا کرتے تھے۔ اور اکثر دینی رسالے آپ نے اسی زبان میں مرتب فرماتے۔ آپ کی تصانیف میں تفسیر کلام اللہ، حاشیہ الکشاف، کتاب الاسما، معراج العاشقین، ہدایت نامہ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ یہ کتابیں اگرچہ کوئی ادبی حیثیت نہیں رکھتیں مگر اس زمانہ کی زبان کا حال ان سے بخوبی معلوم ہوتا ہے

حضرت خواجہ بندہ نواز کی مشہور کتاب معراج العاشقین کا (جس کا سنہ تصنیف ۸۰۰ھ ۱۳۹۸ء ہے) نمونہ عبارت ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ نثر اردو کا عہد طفولیت پورا پورا نظروں کے سامنے آجائے نیز پہلا دور جس کو ہم نے خالص مذہبی قرار دیا ہے اس کی خصوصیات کا اندازہ لگانے میں آسانی ہو۔

"نبی علیہ السلام کہے۔ انسان کے بوجھنے کون پانچ تن۔ ہر ایک تن کوں پانچ دروازے ہیں۔

ہور پانچ دربان ہیں۔ پہلا تن واجب الوجود مقام اس کا شیطانی نفس اس کا امارہ یعنی واجب کسی آنکھ سوں غیر نہ دیکھنا سو۔ حرص کے کان سوں غیر نہ سنا سو۔ حسد ناک سوں بدبوئی نہ کینا سو بغض کی زبان سوں بدگوئی نہ لینا سو۔ کینہ کی شہوت ؔزن غیر جاگا خرچنا سو۔ پیر طبیب کامل ہونا نبض پہچان کو دوا دینا۔"

دکن کے مصنفین کی ابتدائی نثر کی کوششوں میں حضرت خواجہ بندہ نواز کے ایک مرید نے کتاب ہفت اسرار اپنے پیر کی کتابوں کی تفسیر میں لکھی۔ اسی دور میں سید محمد عبداللہ حسینی نے نشاط العشق کا (جو حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ کی تصنیف ہے) ترجمہ کیا۔ شاہ میران جی نے بھی کئی کتابیں نظم و نثر دونوں میں لکھیں۔ نثر میں شرح مرغوب القلوب، جل ترنگ اور گل باس قابل ذکر ہیں۔ میران جی کے صاحبزادے شاہ برہان نے اسی دور میں نظم و نثر کی بہت سی کتابیں لکھیں نظم میں حجۃ البقا، اور نثر میں کلمات الحقائق قابل ذکر ہیں۔

شرح مرغوب القلوب مصنفہ شاہ میران جی کی (جس کا سنہ تصنیف ۹۰۱ھ ۱۴۹۵ء ہے) عبارت کا نمونہ درج ذیل ہے

"پیغمبر کے جے کچ کام کرے گا کوئی خدا ناؤں نالے کر تو او کام پاؑمال ہوگا۔ سرانا، نوازنا خدا کو بہوت کہ او پالن ہارا ہے عالم کا"

کلمۃ الحقائق مصنفہ شاہ برہان الدین خلف میران جی (سنہ تصنیف قبل ۹۹۰ھ ۱۵۸۲ء) کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

"اللہ کرے سو ہووے کہ قادر توانا سوئے کہ قدیم القدیم اس قدیم کا بھی کرن ہار سچ سچ سو تیرا اٹھارو سچ ہوا ابھی تو ج بھی باؤ جد ہان کچھ نہیں بھی تھا۔ تیں دوجا شریک کوئی نہیں۔ ایسا حال سمجھنا خدا تھے خدا کون جس پر کرم خدا کا ہووے۔"

شاہ برہان الدین جانم خلف شاہ میران جی پر پہلا دور جس کو ہم نے خالص مذہبی دور کہا ہے ۱۵۹۰ء میں ختم ہو جاتا ہے۔

پہلے دور کی نثر اردو پر تبصرہ اوپر کے صفحات میں پہلے دور کے مصنفین اور ان کی تصنیفات کا تذکرہ ہوا ان عبارتوں

کے نمونے بھی پیش کئے گئے۔ سب سے پہلی چیز جو صاف طور پر معلوم ہوتی ہے وہ تو یہی ہے کہ یہ کتابیں خالص مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ مختلف کتابوں میں مختلف اسلامی مسائل کو عام فہم اور آسان زبان میں سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ دیکھ کر اور تعجب ہوتا ہے کہ معمولی مسائل نماز، روزہ، نجاست، طہارت سے لے کر بڑے پیچیدہ اور اہم مسائل مثلاً مسئلہ وحدت الوجود وغیرہ کو بھی اسی زبان میں سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لئے اس دور کی نثر اردو خالص مذہبی قسم کی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ مذہبی مباحث کی مناسبت سے اس قدیم دور کی تصانیف کی عبارت میں مذہبی مصطلحات بکثرت استعمال کی گئی ہیں۔ بہت سے خالص عربی اور فارسی الفاظ بجنسہ اردو میں استعمال ہونے لگے اور یہ ایسے الفاظ اور مصطلحات تھیں جن سے ہر مسلمان کم و بیش آشنا تھا۔ ہماری موجودہ مذہبی مصطلحات زیادہ تر اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان تصانیف کی زبان اس عہد کی زبان کا جو دکن میں بولی جاتی تھی اچھا نمونہ ہے اور اس سے قدیم یا دکنی اردو کا اندازہ ہو سکے گا۔ اگرچہ ان عبارتوں میں اجنبی اور نامانوس الفاظ کثرت سے آئے ہیں لیکن اردو نثر کی ان ابتدائی کوششوں میں بھی زبان حتی الوسع سادہ اور صاف استعمال کی گئی ہے اسالیب بیان اگر بہت زیادہ سلیس اور آسان نہیں ہیں تو بہت زیادہ مشکل اور پیچیدہ بھی نہیں ہیں تعقید اور تصنع سے حتی الامکان گریز کیا گیا ہے لیکن اولین کوشش ہونے کی وجہ سے اکثر مقامات پر عبارت الجھی ہوئی اور گنجلک معلوم ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس دور سے اس قدر بعد زمانی ہونے کے سبب سے ہم ان کتابوں کی عبارتیں سمجھنے سے قاصر رہتے ہوں

بعض لوگ مذکورہ بالا تصانیف کو اردو زبان کا نمونہ تسلیم کرتے ہیں اور اسے دکنی سمجھتے ہیں۔ ثبوت یہ پیش کرتے ہیں کہ دکنی الفاظ جو اردو دانوں کو نامانوس معلوم ہوتے ہیں ان تصانیف میں بکثرت استعمال ہوئے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ الفاظ کس زمانہ کے لوگوں کو نامانوس معلوم ہوتے ہیں؟ اس عہد کے لوگوں کو یا اس زمانہ کے لوگوں کو۔ اگر اس زمانہ کے لوگوں کو نامانوس معلوم ہوتے ہیں تو بعد زمانی کی وجہ سے ایسا معلوم ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں کیوں کہ اس وقت سے لے کر اب تک اردو نے ترقی کی اتنی منزلیں طے کرلی ہیں کہ اردو کی پرانی عبارتوں پر کسی دوسری زبان کے ہونے کا شک ہوتا ہے۔ اسلئے وہ جو ہم نے اوپر درج کی ہیں دکنی نہیں ہوسکتیں بلکہ وہ اردو کی ابتدائی شکلیں ہیں جن پر مقامی رنگ زیادہ غالب

ہے۔ یہ مقامی رنگ ہر زمانہ اور ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ آج بھی اردو بولنے والے ملک کے مختلف حصوں میں سینکڑوں مقامی الفاظ، اصطلاحات، کہاوتیں، ضرب الامثال وغیرہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف استعمال کی جاتی ہیں اور وہ سب کی سب اردو ہی کی مختلف صورتیں قرار پاتی ہیں۔ رہا فصیح اور غیر فصیح کا سوال تو یہ بالکل جدا چیز ہے۔

دوسرا دور

مذہبی ادبی

۱۵۹۰ء سے ۱۷۰۰ء

ہم نے اردو نثر کا دوسرا دور مذہبی ادبی کے نام سے قائم کیا ہے۔ اس دور میں اردو نثر کی جہاں مذہبی کتابیں ملتی ہیں وہاں کچھ قصے کہانیوں کی کتابیں بھی دستیاب ہو جاتی ہیں لیکن اس دور میں مذہب ہی کا رنگ ادب پر غالب رہا۔

اردو کے ابتدائی دوروں میں یہ وہ زرین دور ہے جو دکنی بادشاہوں کی سرپرستی میں گذرا۔ اور اس کا مرکز گولکنڈہ اور بیجاپور رہا۔ ان میں سلاطین قطب شاہیہ، سلاطین گولکنڈہ اور بیجاپور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ قلی قطب شاہ جو ۹۸۸ھ سے ۱۰۲۰ھ تک برسرِ حکومت رہا ایک قادر الکلام شاعر اور علم دوست فرمانروا تھا۔ دوسرے گولکنڈہ کے سلاطین ابوالحسن تاناشاہ، سلطان محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ ان میں سلطان محمد قطب شاہ کا کلام بہت بہتر ہے۔ بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ بھی بڑا علم دوست اور قادر الکلام فرمانروا ہوا ہے۔ اس کے دور میں نصرتی، ہاشمی اور میرزا ان مرثیہ گو اور ملا ظہوری تھے۔ نصرتی کا معراج نامہ ہے۔ ہاشمی نے ریختی ایجاد کی اور ملا ظہوری نثر لکھتے تھے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی فرمانروائے بیجاپور کا نورس نامہ ہے۔ یہ دور شاعری کے لحاظ سے دکن میں مثنوی کا دور تھا۔ چنانچہ قطب شاہی دور میں وجہی کی مثنوی "قطب مشتری"، غواصی کی سیف الملوک اور بدیع الجمال، احمد کی مصیبت اہل بیت،

ابن نشاطی کی پھول بن طبعی کا قصہ بہرام وگل اندام سب کی سب مثنوی کی طرز میں نظم ہوئیں یہی حال دوسرے سلاطین کے دربار کا تھا عیش وعشرت اور بزم طرب کا ہر جگہ چرچا تھا لہذا بزمیہ مثنویاں جن میں حسن وعشق ہجر ووصال اور فرضی قصے اور کہانیوں کا بیان ہوتا بہت پسند کی جاتیں۔ ایسی چیزیں فارسی ادب سے بکثرت مستعار لی جاسکتی تھیں چنانچہ مذکور الصدر مثنویاں زیادہ تر فارسی کا ترجمہ ہیں۔

اس کا اثر نثر پر یہ ہوا کہ اکثر کتابیں فارسی سے ترجمہ کی جانے لگیں، چنانچہ ملا وجہی کی سب رس ایک فارسی قصے حسن ودل سے ماخوذ ہے مصنف نے اس کو اپنی دماغی اپچ کا نتیجہ بتایا ہے لیکن اصل فارسی کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد یقین ہو جاتا ہے کہ مصنف نے فارسی قصہ سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ صاحب قادری کی معرفت السلوک اور میران یعقوب کی شمائل الاتقیا، فارسی سے ترجمہ ہیں۔

دور ثانی کی تصانیف | اس دور میں اگرچہ ادبی رنگ آنا شروع ہو گیا ہے لیکن مذہب کا رنگ اب بھی غالب ہے۔ اس دور کی مشہور کتابوں میں حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری کی گنج مخفی، حضرت شاہ میران جی حسن خدانما کی شرح تمہید ہمدانی، مولانا عبداللہ کی احکام الصلوٰۃ، میران یعقوب کی شمائل الاتقیا، شاہ ولی اللہ قادری کی معرفت السلوک، سید شاہ میر کا رسالہ اسرار التوحید، اور مولانا باقر آگاہ کی تصانیف مذہب سے متعلق ہیں اور سب مذہبیت کے رنگ کو ظاہر کرتی ہیں۔

گنج مخفی کی تصنیف تقریباً سنہ ۱۱۰۰ھ میں ہوئی۔ اس کے مصنف شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری متوفی سنہ ۱۶۷۵ء ہیں اور اس میں مصنف نے شاہد ومشہود سے بحث کی ہے

"اللہ تعالیٰ گنج مخفی کو عیاں کرنے چاہا تو اس میں سوں ایک نظر نکلی۔ سو اس سوں امین دیکھ ہوا امین شاہد کو کہتے ہیں۔ یہ دونوں ذات کے دو ظہور ہیں۔ ذات نے اپس کون دیکھا۔ اسے نظر کہتے ہیں۔ دیکھ کر گواہی دیا تو اسے شاہد کہتے ہیں یو تیون مرتبے ذات کے ہیں۔"

شرح تمہید ہمدانی جو ایک ضخیم کتاب ہے تقریباً سنہ ۱۰۱۲ھ / ۱۶۰۳ء کی تصنیف ہے، اس کے مصنف شاہ میران جی حسن خدانما متوفی سنہ ۱۶۵۹ء ہیں اس کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے۔ یہ اور گنج مخفی بالکل قریب قریب زمانہ کی ہیں

"جواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم قاضی عین القضات کو کہے کہ تمیں کئے سو کتاب مجنے دکھلاؤ، تو کتاب دیکھکر بہوت خوش ہوئے ہور کہے کیا خوب بیان میرے نور کا ہور خدا کے نور کا کئے ہور ارسے کنا بھی میرا جیہہ ہے"

احکام الصلوٰۃ کی تصنیف ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء کی ہے۔ اس کے مصنف مولانا عبداللہ معاصر قطب شاہ ہیں اور اس میں مصنف نے نماز کے مسائل کو بیان کیا ہے۔

"بات کرنے سوں نماز جانا۔ نماز میں آدمیاں کی مثال دعا مانگنے نماز جانا یہی وہ کینے نماز جانا۔ ڈر سوں یا مصیبت سوں نماز جانا۔ نماز میں کسی موت کی خبر سن کرنا للہ وانا الیہ راجعون بولتے سوں نماز جاتا۔ مصحف دیک کر پڑنے سوں نماز جاتا۔ قہقہہ ہنسے سوں نماز جاتا"

ہم برابر دیکھ رہے ہیں کہ ان عبارتوں میں پچھلی عبارت پہلی عبارت سے برابر کچھ نہ کچھ صاف اور آسان ہوتی جارہی ہے

اس عہد کی دوسری کتاب مفتاح الخیرات ہے:۔

"ایمان کی حکماں کا معرفت ہور نماز احکام ہور ارکان پچھاننا تمام مسلمان پر فرض ہے کہ سب کون اس کی پچھانے چھٹکارا ہے، ہور آخرت میں خدا کے عذابوں گرفتار ہونا ہوئیگا۔ اگر تجھے پوچھیں گے ایمان کیا ہے بول تو ایمان اقرار کرنا ہے زبان کے تئیں ہور استوار کرنا ہے دل میں خدائے تعالےٰ ایک ہے۔ بغیر اس ایک خدا خارج دوسرا نہیں"

معرفت السلوک مصنفہ شاہ ولی اللہ قادری کا نمونہ:۔

"بولتا ہے کمترین مرید ہور دالپ ترین شاگرد، جاروب کش درگاہ عالی ابالی عاجز فقیر الحقیر محمد ولی اللہ حکم کئے مجکوں حضرت شہباز ولایت معدن ہدایت، آفتاب عالمتاب (بزرگ اولیا کے بڑے اتقیا کے) (ہور صدر نشین محمد مصطفےٰ کے) (صاحب شریعت ہور طریقت کے دربار ہو معرفت کے) (وارث محمدؐ رسول اللہ) حضرت شاہ حبیب اللہ، قادری باقی رکھے اللہ اون کوں سلامت

مولانا باقر آگاہ اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں:۔

"بعض علما متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں تا کہ وہ لوگ جو عربی نہیں

سمجھ سکتے ہیں ان سے فائدہ پائیں لیکن اکثر عورتاں اور تمام آدمیاں فارسی سے بھی آشنا نہیں اس لئے یہ عاصی بہ طلب ان کے بہت اختصار کے ساتھ دکنی رسالوں میں بولا ہے۔"

اس دور کی مذہبی کتابوں کے سات مختلف نمونے پیش کیے گئے جن سے اس دوسرے دور کے مذہبی ہونے کا کافی ثبوت ملتا ہے اور اس کا بھی آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ زبان نے رفتہ رفتہ اسوقت تک کس حد تک ترقی کی نیز زبان کی ترقی کے ساتھ عبارت بھی کتنی سلیس اور صاف ہوتی گئی۔ وہ الجھن اور گنجلک پن جو پہلے دور کی کتابوں میں پایا جاتا تھا وہ اس دور میں کم ہو گیا۔ چونکہ زبان بہت کچھ ترقی کر چکی تھی۔ لہذا مذہبی کتابوں کے علاوہ دوسرے مباحث پر بھی کتابوں کی ابتدا ہوئی۔ الفاظ کا سرمایہ اگرچہ ابھی تک اتنا وسیع نہ ہوا تھا کہ خالص علمی مضامین کی کوشش کامیاب ہوتی لیکن وہ زمانہ ضرور آ پہونچا جہاں زبان تخیل کا ساتھ دے سکتی تھی۔ لہذا اس دور کی تصانیف میں مذہب کے علاوہ قصے اور کہانیاں لکھنے کی کوشش کی گئی اور یہیں سے ادبی دور کی ابتدا ہوتی ہے۔

مولانا باقر آگاہ کی مندرجہ بالا عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں فارسی ترجموں کی مانگ زیادہ تھی چنانچہ نظم اور نثر دونوں میں فارسی کتابوں کے ترجمے ہونے لگے۔ اس سے ایک تو فارسی الفاظ، محاورے استعارات اور تشبیہات اردو میں آنے لگے دوسرے فارسی خیالات اور اسالیب بیان نے بھی اردو میں راہ پائی۔ ظہوری کی نثر کا تتبع اردو میں ہونے لگا۔ اگرچہ اس طرز کے بہترین نمونے اس دور کے بعد ہی ملتے ہیں لیکن ان کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔

اس دور کی ادبی تصنیف ملا وجہی کی "سب رس" ہے۔ جس کا زمانہ تصنیف تقریباً ۱۰۴۰ھ / ۱۶۳۰ء ہے ملا وجہی سلطان عبداللہ قطب شاہ کا معاصر اور مداح ہے۔ مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں کہیں نہیں بتلایا ہے کہ یہ قصہ اس نے کہاں سے لیا ہے۔ دیباچہ پڑھنے سے ہر جگہ یہی شبہ ہوتا ہے کہ قصہ وجہی کی دماغ کی ایجاد ہے اور اس پر اس نے جا بجا فخر بھی کیا ہے لیکن اب جیسا کہ تحقیقات سے ظاہر ہو گیا ہے کہ وجہی نے یہ قصہ "دستور عشاق" یعنی قصہ حسن و دل مصنفہ محمد یحیٰ فتاحی نیشاپوری سے لیا ہے۔ "سب رس" میں اگرچہ اس طرف کہیں اشارہ نہیں کیا گیا ہے کہ یہ کتاب دستور عشاق دیکھ کر لکھی گئی ہے لیکن دونوں کے پڑھنے سے معلوم

ہوتا ہے کہ وجہی نے قصہ کی واردات حرف بحرف فتاحی سے لی ہے۔ "دستورِ عشاق" ایک مثنوی ہے جسے نثر کی صورت میں خود فتاحی نے "قصہ حسن و دل" کے نام سے لکھا تھا۔ وجہی کی نظر سے صرف نثر کی "قصہ حسن دل" گذری اور اسی پر اس نے اپنے قصہ کی بنیاد رکھی۔ وجہی نے اپنی طرف سے صرف یہ اضافہ کیا ہے کہ جا بجا پند و نصیحت کا دفتر کھول دیا ہے جس کا اصل کتاب میں ذکر نہیں ہے۔ طرزِ تحریر میں بھی وجہی نے نثر ظہوری کے تتبع کی کوشش کی ہے اور مقفیٰ اور مسجع عبارت لکھی ہے۔ مثلاً

"دنیا میں خوب گنوائی۔ چار دگاں میں عزت پائی۔ جان رہے کمر ٹرے واں قبول پڑے نہ آفت دیکھی نہ زلزلہ، اپسے بھلے تو عالم بھلا۔ کسی کو برا بولنا یو دسواس ہے۔ بھلائی برائی سب اپنے پاس ہے۔"

دوسری عبارت، اپنے ممدوح سلطان عبداللہ قطب شاہ کی مدح اور سببِ تالیف بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"سلطان عبداللہ، ظل اللہ، عالم پناہ، صاحب سپاہ، حقیقت آگاہ، دشمن پر ور، ثانی سکندر، عاشق صاحب نظر، خطرے تے باخبر، صورت میں یوسف تے اگلے، آدم بوس، ہنر بھلے، حکمت میں افلاطون شاگرد، سخاوت میں حاتم ہوے برد۔ شجاعت میں رستم گرد، عالی ہمت، غازی مرد، دلدار در، فریدون فر، کلیم بیان، مسیحا دم، مریخ صولت، زہرہ عشرت، خورشید علم صبح کے وقت بیٹھے تخت، یکایک غیب سے کچھ رمز پاکر، دل میں اپنے کچھ لاکر، وجہی نادر فن کوں دریادل گوہر سخن کوں حضور بلائے۔"

اس عبارت کو دیکھ کر صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبارت اس دور کی مذہبی کتابوں کی عبارت سے مختلف ہے۔ اگرچہ یہ بھی سلیس اور صاف ہے لیکن یہ عبارت پُر تکلف ہے جو آورد اور تصنع سے بھری ہوئی ہے یہ اردو پر فارسی کے اثر کا نتیجہ تھا جو ترجموں کے ساتھ نقل ہوا تھا۔ اس وقت سے اردو پر فارسی کے اثر ہونے کی ابتدا ہوتی ہے اور فارسی الفاظ و محاورات اور اسالیب بیان اردو میں راہ پانے لگتے ہیں اگرچہ اس طرز کے بہترین نمونے بعد کے دوروں میں ملتے لیکن ان کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔

"سب رس" اسی طرزِ عبارت کا نمونہ ہے۔

"سب رس" پہلی کتاب ہے جو اردو نثر میں ادب کے نقطہ نظر سے اہمیت رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے اردو کے دوسرے دکنی دور کو تھوڑی بہت ادبی اہمیت بھی حاصل ہو گئی ہے اور یوں یہ دوسرا دور صرف "مذہبی" ہونے کی جگہ "مذہبی ادبی" کہلانے کا مستحق قرار پایا ہے۔ کتاب میں مصنف نے جو قافیہ کا التزام کیا ہے اس سے اکثر مقامات پر تکلف اور تصنع ہو گئے ہیں اور اکثر جگہ عبارت محض تک بندی ہو کر رہ گئی ہے اور اسلوب بیان بھونڈا بن کر رہ گیا ہے لیکن ان مقامات سے قطع نظر کر کے بعض مقامات میں روانی اور سلاست بھی پائی جاتی ہے۔ حال میں فسانہ عجائب وغیرہ بھی اسی انداز پر لکھی گئی ہیں لیکن بیان کی سادگی میں "سب رس" یقیناً ان سے بہتر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کی زبان قدیم ہے اور پرانے الفاظ و محاورات آج کل سمجھ میں نہیں آتے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مصنف نے اپنے زمانہ کی نہایت با محاورہ اور فصیح زبان لکھی ہے اور اس میں نہ مصنف کا کوئی قصور ہے اور نہ اس سے کتاب کی خوبی پر کوئی حرف آتا ہے چنانچہ وہ خود بھی لکھتا ہے۔

"آج لگن کوئی اس جہان میں ہندوستان میں ہندی زبان سوں اس لطافت اس چھنداں سوں نظم و نثر ملا کر گلا کر نہیں بولیا"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب رس اپنے زمانہ کی نہایت با محاورہ اور فصیح زبان میں لکھی گئی ہے جس پر مصنف کو بجا طور پر فخر و ناز ہے اس کا انداز بیان جیسا کہ عبارت کے نمونوں سے ظاہر ہے اپنے متقدم نمونوں سے ضرور جدا نظر آتا ہے اور اس کی مقفیٰ اور مسجع عبارت پڑھ کر کہا جا سکتا ہے کہ شمالی ہند میں جب نثر نویسی کی ابتدا ہوئی اور قصے کہانیاں لکھنے کی کوشش کی گئی تو غالباً اسی قسم کا تقلیدی نمونہ سامنے رکھا گیا۔ بایں ہمہ اس کی زبان بہت قدیم ہے۔ سینکڑوں الفاظ اور بہت سے محاورے ایسے پائے جاتے ہیں جو اس وقت سمجھ میں نہیں آتے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض محاورات اس وقت بھی بعینہٖ اسی طرح استعمال ہوتے تھے جیسے آج کل استعمال ہوتے ہیں مثلاً "شرم حضوری" "دیکھا دیکھی" "شان نہ گمان" وغیرہ

دوسرے دور کی اردو نثر پر عام تبصرہ | ہر چیز آغاز کے وقت نہایت سادہ اور بے تکلف ہوتی ہے۔ یہ خصوصیت ہر زبان اور ہر ادب میں پائی جاتی ہے۔ دکنی الفاظ اور محاورات سے قطع نظر اس دور کی نثر عام طور پر سادہ اور بے تکلف تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابتدائی مؤلفین کے پیش نظر فارسی کی ترقی یافتہ اور پر تکلف نثر کی بجائے

قدمائے ایران کی سادہ اور سلیس نثری نمونے تھے۔ اس لئے صفائی اور سادگی اس دور کی اردو نثر میں خود بخود موجود رہی اس وقت الفاظ کے ذریعہ زینت مقصود نہیں تھی جو کچھ بیان کرنا ہے حتی الوسع صاف صاف عبارت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ تاہم مرور زمانہ اور زبان کی تدریجی ترقی اور تبدیلیوں کی وجہ سے آج کل اس دور کی تحریروں میں کھلک پن نظر آتا ہے۔

تیسرا دور

ادبی مذہبی دور شمالی ہند میں

سنہ ۱۷۰۰ء سے سنہ ۱۸۰۰ء

پہلے اور دوسرے دور کی نثر اردو میں مذہبیت کا غلبہ تھا وہ اس تیسرے دور میں آکر بہت کم ہو گیا گذشتہ دوروں میں جو کچھ لٹریچر پیدا ہوا وہ مذہب کی بدولت تھا اور اس ابتدائی زمانہ میں اس کا دامن صرف مذہب تک محدود رہا لیکن دوسرے دور کے آخر آخر میں جب زبان کو ذرا ترقی ہوئی تو قصص اور حکایات کا کچھ تھوڑا سا ذخیرہ فراہم ہونا شروع ہوا اور اردو زبان صنف ادب سے آشنا ہوئی جس کا تذکرہ دوسرے دور میں ہو چکا ہے۔

اس دور سے ادبیت کو غلبہ ملنا شروع ہوتا ہے۔ اور قصص اور حکایات کافی تعداد میں لکھی جانے لگیں مذہبی کتابیں بھی لکھی گئیں لیکن تھوڑی تعداد میں اس سے مذہبیت کا رنگ رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا اور اسی وجہ سے یہ دور بجائے "مذہبی ادبی" کے "ادبی مذہبی" قرار پایا۔

اردو نثر کے گذشتہ دو دور دکن میں گذرے اور سترھویں صدی تک دکن ہی اس کا مرکز بنا رہا اٹھارہویں صدی میں مرکز منتقل ہوا اور دکن کی جگہ شمالی ہند نے لی۔ اس وقت تک شمالی ہند بڑی حد تک دکن کی ادبی سرگرمیوں سے بے خبر تھا۔ اہل ادب کے ادبی کارنامے شمالی ہند تک نہ پہونچ سکے تھے نظم سے جو عام دلچسپی رہی ہے اس کی وجہ سے شعرائے دکن کا کچھ نہ کچھ کلام وقتاً فوقتاً شمالی ہند تک پہونچتا رہا مگر اہل دکن کی نثر سے شمالی ہند کو واقف ہونے کا موقع ہی نہ ملا چنانچہ شمالی ہند کے پہلے اردو نویس مولانا فضلی نے

اپنی نثر نویسی کو ایک ایجاد اور اختراع سے تعبیر کیا ہے۔ اسی خیال کے ماتحت ایک جگہ لکھا ہے:۔

"پھر دل میں گذرا ایسے کام کو عقل چاہئے کامل، اور مدد کسو طرف کی ہوئے شامل کیونکہ بے تائید صمدی و بے مدد جناب احمدی یہ مشکل صورت پذیر نہ ہووے اور گوہر مراد رشتہ امید میں نہ آوے لہذا کوئی اس صنعت کا نہ ہوا مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی بعبارت ہندی نہیں ہوا مستمع"

بہر حال اٹھارہویں صدی میں شمالی ہند میں بھی لوگوں نے اردو نثر نویسی پر قلم اٹھایا اور اردو نثر کا وہ انداز جو دکن میں آخر آخر میں فارسی کے اثر سے پیدا ہو چلا تھا شمالی ہند میں آکر اور بھی نکھر گیا۔ عبارت میں رنگینی اور تکلف نے دخل پا لیا۔ اور رفتہ رفتہ ایسی زبان بگڑی کہ قافیہ، ردیف اور وزن کی بھول بھلیوں میں پھنس کر اسکی لطافت، سادگی اور خوبصورتی ختم ہو گئی۔

اس دور کی تصانیف | صرف و نحو ہندوستانی مصنفہ جان جوشوا کیٹلر سفیر ولندیز مصنفہ ۱۷۲۸ء / ۱۷۱۵ء اس دور کی سب سے پہلی تصنیف ہے اس سے پہلے عبارتوں کے نمونے درج کئے گئے ہیں وہ سب جنوبی ہند کی قلم کاریاں ہیں۔ شمالی ہند کی کوئی کتاب اٹھارھویں صدی سے قبل کی نہیں ملتی۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو۔

"ترجمہ دعا حضرت عیسیٰ۔ ہمارے باپ کہ وہ آسمان میں ہے۔ پاک ہے تیرے نام آوے ہم کون ملک تیرا ہوئے راج تیرا جوں آسمان تو جمین (زمین) میں روٹی ہمارے نت کی ہم کو آس دے اور معاف کر تقصیر اپنی ہم کوں، جوں معاف کرتے اپرے قرض واروں کوں، نہ ڈال ہم کوں اس وسوسے میں بلکہ ہم کو چھوڑا کر اس برائی سے۔ تیری ہی پادشاہی ہے سواری ؟ عالمگیری حمایت میں۔ آمین"

جان جوشوا کی اردو عبارت شمالی ہند کے انداز بیان سے جدا ہے۔ البتہ دکنی اردو سے کچھ نہ کچھ ملتی جلتی ہے قیاس یہ چاہتا ہے کہ جب غیر ملکیوں کی یہ کوشش رفتار زمانہ کے مطابق عام طور سے دیکھی گئی ہوگی اس وقت شمالی ہند کے اہل قلم کو بھی احساس ہوا ہوگا یہ امر بھی خلاف قیاس نہیں کہ اہل یورپ کے عہد تصانیف سے پہلے یا قریب قریب اسی زمانہ میں شمالی ہند کے مصنفین نے تھوڑی بہت کتابیں اردو میں لکھی ہوں لیکن آج تک اس قیاس کے مطابق کوئی اثر نہیں ملتا۔ اس دور کی دوسری تصنیف مثل طی نامہ مصنفہ سید محمد قادری ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۷۳۲ء / ۱۱۴۵ھ ہے۔ اس میں مصنف نے حضرت گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے قصص و

حکایات کا اردو میں ترجمہ کیا ہے عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"پچھے سین طرح طرح صفت وثنا پیدا کرنے والے زمین وآسمان کی کیفیت وحقیقت یو دیہ ہے کہ داستان قصہ او حکایات حضرت بخشی رحمتہ اللہ علیہ کون زیج طوطی نامے کے ساتھ عبارت سخت و دقیق کے لکھے ہیں اس کے متن مفصل وبیان دار واسطے معلوم ہونے تمام لوگاں کوں محمد قادری نیک کرے اللہ مرتبہ انوں کا یچ عبارت سلیس اور آسان کے کہلی ہوئی اوپر عبارت خطان گئے ہوئے روزمرہ جواب وسوال کہ دولت منداں کے تئیں لائق ہوئے لکھے ہیں"

اس دور کی کتابوں میں "دہ مجلس" بہت مشہور ہے، فضلی دہلی کے رہنے والے تھے۔ اوران کی زبان اس عہد کی عام نثر کا اچھا نمونہ ہے "دہ مجلس" کی تصنیف ۱۱۴۵ھ ۱۷۳۲ء میں ہوئی ہے۔ یہ کتاب فارسی روضتہ الشہدا کا ترجمہ ہے جو ملا حسین کاشفی کی تصنیف ہے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے اسے اردو کی اولین کتاب لکھا ہے لیکن اوپر کے بیان سے اس کی تردید ہو چکی ہے جس سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ اردو تو درکنار یہ شمالی ہند کی اردو کی اولین تصنیف بھی قرار نہیں دی جاسکتی۔ "دہ مجلس" کی عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ سبب تالیف کتاب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"پس اس اندیشہ عمیق میں غوطہ کھایا اور میان تامل وتدبیر میں سرگشتہ ہوا لیکن راہ مقصود کی نہ پائی۔ ناگاہ نسیم عنایت الٰہی گلشن افکار پر باہتزاز میں آ، یہ بات آئینہ خاطر میں منہ دکھائی کہ یہ فکر علیم بغیر امداد ارواح مقدس حسنین علیہما السلام حسب خواہش مجبون کے سرانجام نہ پاوے۔ چوں ذکر حسنین علیہما السلام کا ذہن نشین ہوا، دیں دل کو تقویت ہوئی پھر خاطر میں گذرا کہ قادر حقیقی اور خالق تحقیق نے ذات انسانی کو ایسی قدرت کرامت کی ہے کہ جیسے کام پر طبیعت اور توجہ کو مصروف رکھے البتہ معطل اور موقوف نہ رہے اور انصرام کو پہنچے"

اندازہ ہوا ہوگا کہ پچھلے دوروں کے مقابلہ میں عبارت میں رنگینی اور تکلف نے کتنا دخل پالیا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

"دیکھا اس جمال جہاں آرا کو کہ مانند لعر منور اور ماہ انور کے برج روضہ مقدس کو روشن کئے ہوئے بیٹھے روتے ہیں اور گوہر غلطاں صدف رخسار آبدار پر بہہ رہے ہیں۔ میں دیکھتے ہی اس جمال باکمال کو تصدق ہو قدموں پر گرکر یہ التماس کیا کہ یا حضرت حق تعالیٰ نے میری یہ مراد دی جو یہاں ان قدموں پر ملی۔"

جو انداز دکن میں آغاز ہی میں پیدا ہو چلا تھا۔ اس نے اس دور میں ترقی کر کے کس طرح رفتہ رفتہ پرانے دوروں کی نثانت

سادگی اور خوبصورتی کو کم کر دیا اور زبان کس طرح آہستہ آہستہ تکلف تصنع نیز قافیہ ردیف اور وزن کی بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ گئی لیکن اسے زبان کا عیب نہیں کہا جا سکتا۔ اپنی ترقی کے اعتبار سے زبان مختلف حالتوں سے گذرتی ہے۔ ابتداً جب زبان بالکل بچپن میں ہوتی ہے تو صرف بول چال کے قابل سرمایہ موجود ہوتا ہے اور اسی مناسبت سے زبان میں بچپن کی سادگی باقی رہتی ہے۔ اسلوب بیان سیدھا سادہ عام فہم ہوتا ہے لیکن زبان کی ترقی کے لئے الفاظ، استعارات اور تشبیہات، نئی نئی اصطلاحیں اور رنگ برنگ کے اسلوب بیان درکار ہوتے ہیں۔ اور جب تک یہ چیزیں پیدا نہ ہوں زبان آگے نہیں بڑھ سکتی ہر زبان کی ترقی میں ایک زمانہ ایسا آتا ہے جب ان چیزوں کا سرمایہ بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے اور جب یہ سرمایہ فراہم ہو جاتا ہے تو اس کی مدد سے زبان اس قابل ہوتی ہے کہ روزمرہ کی گفتگو سے گذر کر زیادہ وقیع اور دلچسپ مباحث کو ادا کر سکے۔ جن متقدمین نے نئی نئی جدتوں سے ہماری زبان کے لئے الفاظ، استعارات، تشبیہات وکنایات اور ترکیبوں کا بیش بہا ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ ان کا نظم و نثر اردو پر بہت بڑا احسان ہے۔ یہ دراصل انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اردو میں وسعت پیدا ہوئی اور آئندہ ترقی کی راہ کھلی۔

اس دور کے دوسرے مصنفین میں محمد حسین کلیم، عطا تحسین، سودا، شاہ عبدالقادر، انشاء اللہ خاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عطا تحسین کی نوطرز مرصع (چار درویش) مرزا سودا کا دیباچہ، شاہ عبدالقادر کا ترجمہ کلام پاک اور انشاء اللہ خاں کی دریائے لطافت اور رانی کیتکی کی کہانی اردو نثر کی مشہور اور مستند کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ مرزا سودا بھی اپنی مخصوص طرز عبارت کے لئے مشہور ہیں۔ ان کی زبان کا نمونہ ان کا خود نوشتہ دیباچہ ہے جو ان کی کلیات کے ساتھ شامل ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۱۸۰ھ / ۱۷۶۶ء ہے۔

"ضمیر منیر پر آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو کر یہ چند مصرع کہ از قبیل ریختہ در ریختہ خامۂ زبان اپنی سے صفحہ کاغذ پر تحریر پائے۔ لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سنجان روزگار کر دوں تا زبانی ان اشخاص کی ہمیشہ مورد تحسین و آفریں رہوں۔"

دوسرا نمونہ:-

"مخفی نہ رہے کہ عرصہ چالیس برس کا بسر ہوا ہے کہ گوہر سخن عاجز کا زیب گوش اہل ہنر ہوا ہے۔ اس مدت میں مشکل گوئی و دقیقہ سنجی کا نام رہا ہے اور سیمرغ معنی عرش آشیاں گرفتار دام ہوا ہے۔ باوصف اس کے قول خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل کیا ہے بلکہ تمام عالم کے سخن انصاف پر تلمذانہ گوش دیا ہے۔"

عبارت میں رنگینی، تکلف اور تصنع کے علاوہ کس طرح فارسی اور عربی الفاظ جن میں سے بعض ثقیلہ ثقیل ہیں بکثرت استعمال کئے گئے ہیں جملے پیچیدہ، پر تصنع اور مقفیٰ ہیں۔ زمانہ حال کی پابندی صرف و نحو اس میں بالکل نہیں مضمون بھی تشبیہوں اور استعاروں سے مملو ہے۔ ایسی عبارت صرف موزوں نہ ہونے کی وجہ سے نثر کہی جا سکتی ہے ورنہ اس میں اور نظم میں کوئی فرق نہیں، اور طبیعت کی دقت اور مشکل پسندی نے کس طرح عبارت کو دقیق اور مشکل بنا کر رکھ دیا۔

انشاء اللہ خاں کی دریائے لطافت (اگرچہ فارسی میں ہے لیکن اردو نثر کے بکثرت مضمون اس میں ملتے ہیں) اردو زبان کی تاریخ میں ایک اہم تصنیف ہے اس میں اس عہد کے اردو بولنے والوں کے مختلف طبقوں کی بولیوں کا بہت اچھا نمونہ فراہم کیا گیا ہے جس سے اس عہد کی لسانی حالت کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے اس کے علاوہ مختلف رسم و رواج اور معمولی بول چال، ضرب الامثال اور اودھ لکھنو کی زبان کا نیز متروکات قدیم اور مختلف ملکوں کی زبانوں کا دہلی اور لکھنو میں شامل ہونے کا اثر دکھلایا ہے مثلاً انشاء اللہ خاں اور مرزا مظہر کی گفتگو کا جو نمونہ دیا گیا ہے وہ اس عہد کے پڑھے لکھے شرفا کی زبان ہے۔ انشاء اللہ خاں کہتے ہیں۔

"ابتدائے سن وسال سے تا اوائل ریعان اور اوائل ریعان سے تا الآن اشتیاق مالا یطاق بقبل اقتناء علیہ نہ بحدے تھا کہ تحریر و تقریر میں منتظم ہو سکے لہذا بے واسطہ وسیلہ حاضر ہوا ہوں"

اس کا جواب مرزا مظہر دیتے ہیں:۔

"اپنے تئیں کون بھی ۔ وطن سے تمہیں ایسے اشخاص کے ساتھ موانست اور مجالست رہا کی ہے لیکن بی نورن کی گفتگو بالکل مختلف ہے۔

"اجی آؤ میر صاحب تم تو عید کے چاند ہو گئے۔ دلی میں آتے تھے۔ دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے اور ریختہ پڑھتے تھے۔ لکھنو میں تمہیں کیا ہو گیا کہ کبھی صورت بھی نہیں دکھاتے۔ اب کے کربلا میں کتنا موتڑا کہیں تمہارا اثر معلوم نہیں ہوا"

اس دور کی دوسری مشہور کتاب نوطرز مرصع ہے۔ جس کو عطا حسین خاں تحسین نے امیر خسرو کے قصہ چہار درویش سے اردو میں ترجمہ کیا ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۱۹۰ھ ہے۔ یہ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں مکمل ہوئی جن کی تعریف میں ایک قصیدہ دیباچہ کے آخر میں دیا ہوا ہے۔ نوطرز مرصع کی عبارت نہایت

پرتکلف رنگین اور فارسی اور عربی الفاظ سے مملو ہے۔ یہی وجہ ہوگی کہ اس کی مشکل اور دقیق عبارت کو دیکھکر ڈاکٹر گلگرسٹ نے قصہ چار درویش کا ایک دوسرا ترجمہ باغ و بہار کے نام سے میر امن سے کرایا۔

تیسرے دور کی اردو نثر پر تبصرہ | اس دور کی تصانیف کی آخری کڑی عطا حسین خاں تحسین کی نو طرز مرصع ہے اور اس پر یہ فہرست ختم ہو جاتی ہے۔ ان کتابوں کا تعلق ادب یعنی قصص وحکایات یا مذہب سے ہے۔ اس وقت تک تاریخ، سوانح عمری، اخلاق و معاشرت وغیرہ سنجیدہ اور رفیع موضوعات پر ایک کتاب بھی نہیں لکھی گئی۔ اس دور میں فضلی کی دہ مجلس سے لے کر تحسین کی نو طرز مرصع تک سب کا قریب قریب ایک طرز تحریر ہے جس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ فارسی ہر جگہ اردو پر بھاری ہے۔ فارسی عربی الفاظ جن میں سے بعض تو بیحد ثقیل اور نامانوس ہیں بکثرت استعمال کئے گئے ہیں۔ فارسی کی تقلید میں نہ صرف عربی فارسی الفاظ کی کثرت ہے بلکہ اکثر صورتوں میں قافیہ اور ردیف کا التزام رکھا گیا ہے۔ غرضکہ ساری عبارت محض تصنع اور آورد پر مبنی ہے۔ عبارت میں سادگی اور بے ساختہ پن اس دور میں نظر نہیں آتا۔ اسی وجہ سے اکثر و بیشتر ایسا ہوا ہے کہ خیال شاندار اور پرتکلف الفاظ کے گورکھ دھندوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے کہ پڑھنے اور سننے والوں کو الجھن محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور یہ پرتکلف اور پر تصنع طرز تحریر اردو میں عرصہ تک مقبول رہا۔

اس دور میں پہلے دور سے اتنی ترقی ضرور نظر آتی ہے کہ فارسی کا اسلوب بیان اختیار کرنے کی وجہ سے اردو اسلوب بیان میں بھی وسعت پیدا ہو چلی۔ نئے الفاظ جو فارسی اور عربی سے مستعار لئے گئے انھوں نے اگر ایک طرف تکلف اور تصنع کو دعوت دی تو دوسری طرف ان سے اردو کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ بھی ہوا۔ اور اس طرح زبان کی ترقی کا ایک بڑا مرحلہ طے ہو گیا۔ اسی نے زبان کو اس قابل کیا کہ روزمرہ کی بول چال اور عام گفتگو یا سیدھے سادے مذہبی مسائل اور احکامات کی تصانیف سے گذر کر تخیلی اور زیادہ وسیع مباحث کے اظہار کا ذریعہ بن سکے۔

فارسیت کے اثر کا سبب یہ تھا کہ دربار کی زبان اب بھی فارسی تھی۔ بڑے بڑے مصنفین کی تالیفات و تصنیفات کا سلسلہ فارسی زبان ہی میں تھا جن لوگوں نے اردو کی طرف توجہ کی وہ بھی اپنی قابلیت اور علمیت کی دھاک فارسی دانی کا اظہار کر کے کرنا چاہتے تھے۔ اور اس دور تک جس کی عبارت جتنی مشکل، دقیق اور پیچیدہ ہوتی اتنا ہی اس کی علمیت کا اعتراف کیا جاتا۔ (باقی آئندہ)

محمد عرفان خاں صاحب جامعی

آج کی دُنیا

دنیا کو انقلاب کی یاد آ رہی ہے آج
تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے آج

وہ سر اُٹھائے موجِ فنا آ رہی ہے آج
موجِ حیات موت سے ٹکرا رہی ہے آج

کانوں میں زلزلوں کی دھمک آ رہی ہے آج
ہر چیز کائنات کی تھرا رہی ہے آج

جھپکا رہی ہے دیر سے آنکھیں ہوائے دہر
کون و مکاں کو نیند سی کچھ آ رہی ہے آج

ہر لفظ کے معانی و مطلب بدل چلے
ہر بات اور بات ہوئی جا رہی ہے آج

یکسر جہانِ حُسن بھی بدلا ہوا سا ہے
دنیائے عشق اور نظر آ رہی ہے آج

ہر ہر شکستِ ساز میں صد لحنِ سرمدی
یا زندگی کے گیت اجل گا رہی ہے آج

یا زندگی دہر تھی سوگند موت کی
یا موت زندگی کی قسم کھا رہی ہے آج

یہ دامنِ اجل ہے کہ تحریکِ غیب ہے
کیا شئے ہوائے دہر کو سنکا رہی ہے آج

ابنائے دہر لیتے ہیں یوں سانس گرم و تیز
جینے میں جیسے دیر ہوئی جا رہی ہے آج

افلاک کی جبیں بھی شکن در شکن سی ہے
تیوری زمین کی بھی چڑھی جا رہی ہے آج

پھر چھیڑتی ہے موت حیاتِ فسردہ کو
پھر آتشِ خموش کو اُکسا رہی ہے آج

برہم سا کچھ مزاجِ عناصر ہے ان دنوں
اور کچھ طبیعت اپنی بھی گھبرا رہی ہے آج

اک موجِ درد سینے میں لرزاں ہے اس طرح
ناگن سی جیسے شیشے میں لہرا رہی ہے آج

بیتے جگوں کی چھاؤں ہے امروز پر فراقؔ
ہر چیز اک فسانہ ہوئی جا رہی ہے آج

(فراقؔ گورکھپوری)

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

متاع اقبال :- از ابوظفر عبدالواحد صاحب ایم-اے مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن قیمت عہ سائز $\frac{20\times30}{16}$ صفحات ۱۰۰ کاغذ کتابت اور طباعت اچھی۔

زیر نظر کتاب مصنف کے تین مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف رسالوں میں ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۶ء میں چھپے تھے۔ مضامین کے عنوان یہ ہیں۔ "اقبال کی شاعری اور اس کا پس منظر" "اقبال کا ذہنی ارتقا" اور "اقبال کا شاعرانہ فلسفہ" چونکہ یہ مختلف موقعوں پر لکھے گئے تھے اس لئے تینوں مضامین میں بہت سی باتیں مشترک ملتی ہیں مثلاً اقبال کا یورپ جانا اور وہاں ان کا وطنیت کے تخیل سے برگشتہ ہو جانا اس بات کو تینوں مضامین میں دہرایا گیا ہے۔ غالباً جب مضامین لکھے گئے تو یہ خیال نہ تھا کہ یہ مضامین ایک ساتھ چھاپ دئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں دہرائی ہوئی ملتی ہیں۔ ویسے جہاں تک اقبال کے سمجھنے اور سمجھانے کا تعلق ہے مصنف نے بڑے مدلل اسلوب میں اقبال کے نظریات کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں امید ہے ابوظفر صاحب تینوں مضامین کو ایک کر دیں گے تاکہ وہ نقص جو تکرار سے پیدا ہو گیا ہے دور ہو سکے

پاکستان اور ہندوستان :- مرتبہ عبدالقدوس ہاشمی، دارالاشاعت سیاسیہ، شاہراہ عثمانی حیدرآباد دکن سائز $\frac{20\times30}{16}$ صفحات ۲۲۶۔ کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ قیمت مجلد عالمر

زیر نظر کتاب پاکستان کے مسئلے پر ایک مفصل تالیف ہے اس اسکیم کی موافقت میں جتنے مضامین اور صدارتی خطبے مختلف پرچوں اور رسالوں میں اس موضوع پر نکل چکے ہیں وہ بھی جمع کر دیے گئے ہیں بعض جگہ اعتراضات کے جواب میں طرز تحریر ذرا جذباتی ہو گیا ہے ورنہ ویسے اپنے موضوع کا بہت اچھا احاطہ ہے۔ اگر ایک دو نقشے بھی شامل کر دیئے جاتے تو بہتر ہوتا۔ امید ہے کہ دارالاشاعت اسی طرح سیاسی علم کو عام بنانے کے لئے دیگر مفید کتابیں پیش کرے گی۔

نازو۔ اردو کے نوجوان اور ہونہار افسانہ نگار اختر انصاری کے مختصر افسانوں کا تازہ مجموعہ ہے۔ کتاب میں کل ۱۴ افسانے ہیں اور سب کے سب اختر انصاری کے طرزِ نگارش کی خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان میں سے کوئی تو صرف کسی مخصوص سیرت کا مطالعہ ہے۔ اور کوئی زندگی کے کسی مختصر اور محدود پہلو کی مصوری۔ کسی میں محبت اور رومان ہے اور کسی میں صرف شاعری۔ یہ افسانے مختلف قسم کے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک جیتی جاگتی زندگی کی تصویر ہے۔ سیرت، نفسیات، مشاہدہ، محبت، رومان اور شاعری کوئی چیز زندگی سے الگ رہ کر بامعنی نہیں رہتی اور اختر انصاری اس چیز کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔

نازو کے تقریباً سب افسانے دلچسپ ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اختر انصاری اپنے افسانوں کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ ان میں شروع ہی سے Suspense کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور پڑھنے والا ہر قدم پر یہی سوچتا ہے کہ اب کیا ہوگا۔ اور اس کا تصور افسانے کے انجام کی جو تصویریں بناتا ہے وہ یقیناً اس تصویر سے مختلف ہوتی ہیں جو افسانہ نگار کے ذہن میں تھی۔ اختر انصاری کے افسانے جذبات انسانی کی کشمکشوں کی بڑی اچھی تصویریں ہیں وہ ایک شاعرانہ دل کی کیفیتوں کے آئینہ دار ہیں۔ ایسا دل جس کے خیالات میں تاثر اور بیان میں زور ہے۔

یہ افسانے مکتبہ جہاں نما دہلی نے شائع کئے ہیں۔ کتاب مجلد ہے ٹائٹل خوش نما اور دیدہ زیب لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے اور اس لحاظ سے ان افسانوں کی قیمت ایک روپیہ (عہ) درست ہے۔

سرگذشت ادارہ ادبیات اردو۔ مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد، سب رس کتاب گھر، رفعت منزل خیریت آباد، حیدرآباد دکن، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۴۳۰ قیمت ۱۲ر کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ

یہ سرگذشت ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کی دس سالہ رپورٹ ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۳۱ء میں قائم ہوا تھا مقاصد یہ تھے کہ اردو زبان اور ادب کی توسیع اور حفاظت کے ساتھ دکن کے نوجوانوں میں انشاپردازی، شاعری اور تصنیف و تالیف کا شوق پیدا کرائے ساتھ ہی عوام میں اردو کے مطالعہ کا شوق تاریخ دکن کی خدمت اور ایک کتب خانہ کا قیام وغیرہ تھے۔ خوشی کا مقام ہے کہ یہ دس سال سے بڑی مستعدی سے اپنے کاموں کو انجام دیتا رہا ہے۔ تقریباً ہر موضوع پر بیشتر مفید اور کمتر غیر مفید کتابیں چھاپ چکا ہے۔ ادارہ کی وسعت کار کا اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ نہ صرف مختلف مضامین پر تالیفات و تصانیف پیش کرتا ہے بلکہ اردو زبان و ادب کی تعلیم و امتحانات بھی لیتا ہے۔ ایک کتب خانہ بھی قائم ہے۔ ایک رسالہ سب رس کے نام سے نکلتا ہے جس میں مختلف مذاقوں کے لئے مختلف قسم کا سامان دلچسپی پیش کیا جاتا ہے علمی نمائشیں بھی کرتا ہے اور دکن کے مختلف حصوں میں اس کی شاخیں بھی قائم ہیں۔

فرضکہ ادارہ بڑے مفید کام کر رہا ہے۔ نوجوانانِ دکن اس مفید کارکردگی پر یقیناً لائقِ صد آفریں ہیں۔ آخر میں اتنا ضرور عرض ہے کہ ادارہ بحیثیت مجموعی ادب اور شاعری پر زور زیادہ دیتا ہے۔ اگر یہی اہمیت سائنس اور دیگر مفید علوم کو دی جائے تو پبلک کا زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ نیز ادبیات میں ایسی اچھے تراجم کی کمی ہے۔ امید ہے کہ ادارہ آئندہ اس کمی کو بھی دور کر دے گا۔

نقشِ ناتمام:۔ از سحر رامپوری ملنے کا پتہ مرزا عباس علی بیگ۔ باغیچہ غازی مظفر خاں ریاست رامپور سائز ۲۶×۲۰/۱۶ صفحات ۹۶، قیمت ۲ر کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ

یہ سحر رامپوری کی نظموں اور غزلوں کا مختصر مجموعہ ہے۔ سحر صاحب رامپور کے نوجوان شاعروں میں سے ہیں اور چوٹ کھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کی اکثر نظموں اور اکثر غزلوں میں کسک ہے "اے دل"، "غریب نوجوان، حسن یقین"، استقبال بہار، آجا اچھی نظمیں ہیں۔ لیکن ابھی سحر صاحب کے نقوشِ ناتمام ہیں پھر بھی درد رکھنے والوں کو ان کے کلام میں ایک درد بھری روح ملے گی۔

السیر الحثیث فی تاریخ تدوین الحدیث:۔ کئی سال سے دائرۃ المعارف، حیدرآباد دکن ملک کے نامور علماء کو دعوت دیتی ہے کہ اپنی علمی تحقیقات کو مقالات کی صورت میں ادارہ کے جلسہ میں پیش کریں جولائی ۱۹۴۶ء میں جو اجتماع ہوا اس میں مولانا سید محمد سلیمان ندوی اور مولانا عبدالعزیز میمن (صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی) نے جہاں اپنے مقالے عربی زبان میں لکھ کر پیش کئے ڈاکٹر محمد زبیر صاحب (صدر اسلامیات جامعہ کلکتہ) نے اپنا مقالہ اردو میں پیش کیا۔ موصوف کا یہ مقالہ اُن کی ایک انگریزی کتاب کا ایک حصہ اور اس کا اردو ترجمہ تھا۔ اب موصوف نے اُس اردو ترجمہ کو عربی لباس پہنایا ہے اور دائرۃ المعارف کی طرف سے چھاپا گیا ہے۔ زیر نظر مقالہ میں حدیث نبوی کی تدوین پر نظر ڈالی گئی ہے۔

ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ موصوف کی روشن فکر کی توجہ سے اس مبحث کے بعض اہم پہلو روشنی میں آ گئے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہیں کہیں موصوف کی یہ علمی کاوش ڈاکٹر اسپرنگر اور ڈاکٹر گولڈزیہر کی ریسرچ کی ترجمہ ہو کر رہ گئی ہے۔ ہمیں موصوف سے مستشرقین کی تحقیقات پر مفصل نقد کی آرزو تھی جس کے وہ ہر طرح اہل تھے۔

(ر)

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

جامعہ

زیر ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم اے

جلد ۴۳ — نمبر ۵	بابتہ ماہ مئی سنہ ۱۹۴۱ء	چندہ سالانہ ۵ر فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) المحبوب المطابع دہلی

مطبوعات جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہوگئی ہے۔ اس فہرست میں
آپ کو اپنے پسند کی بہت سی کتابیں نظر آئیں گی۔
مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسرے اداروں کی
کتابیں بھی مختلف عنوانات کے ماتحت درج کی گئی ہیں
ارباب ذوق یہ نئی فہرست منگا کر ملاحظہ فرمائیں۔

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

طلبا کی تعلیم میں کمزوری کے اسباب

ہندوستانی مدرسوں میں اگر طالب علم ناکامیاب ہو جائے یا مختلف مضامین میں کمزور رہتا ہو تو سرپرست اور والدین کی فوراً یہ رائے ہوتی ہے کہ مدرسہ کی پڑھائی اچھی نہیں ہے۔ اساتذہ توجہ سے نہیں پڑھاتے اِدھر اساتذہ یہ جواب دیتے ہیں کہ طالب علم کا دماغ اچھا نہیں ہے، کند ذہن ہے، محنت نہیں کرتا اس لئے فیل ہو گیا۔ لیکن صورت یہ ہے کہ دونوں طالب علم کی کمزوری کے اسباب پر غور نہیں کرتے اور اگر غور کرتے ہیں تو اس کو اتنا اہم خیال نہیں کرتے اور ایک دوسرے کو مورد الزام قرار دیتے ہیں اپنی اپنی کہتے ہیں اور طالب علم کا خیال نہیں کرتے استاد یہ کہتا ہے کہ ہاں کمزوری کے اسباب یہ یہ ہیں۔ لیکن چالیس پینتالیس لڑکوں کی جماعت میں اس مسئلہ کے حل کی کیا صورت نکالی جاسکتی ہے جبکہ ہم صرف چالیس پینتالیس منٹ کے لئے جماعت میں جاتے ہیں سرپرست کہتے ہیں کہ مجھے خود فرصت نہیں اب تو آپ ہی کے حوالہ کر دیا ہے آپ جو چاہیں کریں۔ لہٰذا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں کے تعاون بغیر طالب گرتا پڑتا تعلیم تو پالیتا ہے لیکن اُس کی چھپی ہوئی قوتوں کے اُبھرنے اور تربیت پانے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ طلبا کی تعلیم کا معیار ہر اعتبار سے پست رہتا ہے۔

کمزوری کی سب سے بڑی وجہ مدرسہ سے غیر حاضری ہے۔ جو طلبا مدرسہ آنے میں پابندی نہیں کرتے وہ اپنی ذہانت اور ذکاوت کے باوجود بھی اُس معیار سے نیچے رہتے ہیں جو ان کا پابندی سے حاضر رہنے کی صورت میں ہوتا۔ اور کم ذہین اور کم محنت کرنے والے طلبا، تو بہت پیچھے رہ جاتے ہیں وہ اپنا ناقابل تلافی نقصان کرتے ہیں۔

مدرسہ سے غیر حاضری کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ بعض طلبا کو مدرسین سے شکایت پیدا ہو جاتی ہے یا شکایت نہ ہو لیکن ان کے دل میں یہ خیال کسی طرح پیدا ہو جاتا ہے کہ فلاں استاد سخت ہے اور یوں وہ مدرسہ جانے سے گھبراتے ہیں اور بجائے مدرسہ جانے کے اِدھر اُدھر چلے جاتے ہیں یا معمولی سا بہانہ کر کے گھر پر ہی پڑ رہتے ہیں۔ اس کو عرف عام میں مدرسہ سے بھاگنا بھی کہتے ہیں۔ یہ عمل سخت سزا کے خوف سے بھی ہونے لگتا ہے۔ اس صورت حال کی ذمہ داری مدرسین پر ہوتی ہے وہ طلبا سے محبت سے پیش نہیں آتے، اور ان کی سختی

طلبا کو بھاگنے پر مجبور کرتی ہے یا جو کام وہ طلبا کو دیتے ہیں اس کا مطالبہ وہ اس سختی سے کرتے ہیں کہ طلبا مدرسہ نہ آنا ہی پسند کرتے ہیں بعض طلبا اس لئے بھی مدرسہ نہیں آتے کہ ان کو مدرسہ آنے میں کچھ دیر ہو جاتی ہے۔ اور مدرسہ میں دیر سے آنے پر بازپرس ہوتی ہے یا سزا ملتی ہے لہذا بازپرس اور سزا کے خوف سے مدرسے سے غیر حاضر ہو جاتے ہیں۔ اور بجائے ایک گھنٹہ کے نقصان کے تمام دن کی پڑھائی کا نقصان کرتے ہیں۔ مدرسوں میں ایسے طلبا بھی ہوتے ہیں کہ بازپرس نہ کرنے والے اور بہت کم سزا دینے والے استادوں کے گھنٹوں میں حاضر رہتے ہیں اور سخت استادوں کے گھنٹوں سے بھاگ جاتے ہیں یا چھٹی لے کر چلے جاتے ہیں اس طرح اس پڑھائی سے محروم رہتے ہیں جو اُن گھنٹوں میں ہوتی ہے۔ یہ وہ تمام صورتیں ہیں جن میں مدرسین اور مدرسہ کے ڈسپلن کی وجہ سے طلبا مدرسہ نہیں آتے۔ مدرسہ کے ڈسپلن میں ہمیشہ لوچ ہونا چاہئے۔ یہ ڈسپلن فوجی ڈسپلن کی طرح بالکل حتمی نہ ہونا چاہئے۔ طلبا کو اس کا تو بالکل یقین ہی نہ ہونا چاہئے کہ اگر میں کام کرکے نہ لے جاؤں گا یا دیر سے مدرسہ پہونچوں گا تو بس سزا ہی سے دوچار ہونا پڑے گا یا سخت بازپرس ہوگی ہاں آپ یہ خیال ضرور پیدا کردیں کہ اگر کام نہیں کیا، سامان درست نہ رکھا یا دیر سے مدرسہ پہونچا تو سزا بھی مل سکتی ہے۔ مدرسہ کے ڈسپلن میں تدریج کا خیال ہونا چاہئے۔ کیوں نہ آپ طالب علم کو سمجھائیں، دوسروں کی مثالیں دیں، فائدہ جتلائیں، سرپرستوں کو لکھیں سرپرستوں سے ملیں خفا ہو جائیں اور اس قسم کی سینکڑوں تدریجی صورتیں اختیار کریں اور جہاں تک ممکن ہو سزا دینے سے پرہیز کریں۔ طالب علم پر یہ ظاہر ہی نہ ہونے دیں کہ آپ سخت مزاج ہیں۔

ایک صورت یہ بھی ہے کہ طالب علم کو سرپرستوں نے شادی بیاہ کوئی نجی کام یا سفر وغیرہ پر لے جانے کی غرض سے مدرسہ جانے سے روک دیا ہو۔ آخری وجہ خود طالب علم کی علالت ہے۔ گھر پر کسی کام سے روکنے میں سرپرست اور والدین بہت کم ذمہ داری محسوس کرتے ہیں وہ پوری طرح غیر حاضری کے نقصانات کی اہمیت نہیں سمجھتے اور ایک ایک دو دو دن کی رخصت کی درخواستوں سے لے کر دو دو تین تین مہینوں تک کی رخصت کی درخواستیں دیتے ہیں۔ جو بچے پہلی اور دوسری جماعتوں میں پڑھتے ہیں وہ اپنی والدہ کے ساتھ اپنی ننہیال چلے جاتے ہیں اور جب تک بچے کی والدہ میکے سے واپس نہیں آتی ہیں بچہ مدرسہ سے غیر حاضر ہوتا رہتا ہے اور اس طرح اس کی ابتدائی تعلیم میں رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ یہ وہ نقصان ہے جس کا بچہ کو سخت خمیازہ اٹھا

پڑتا ہے یعنی وہ فیل ہو جاتا ہے اور اپنے ساتھیوں سے بچھڑ جاتا ہے۔ اس میں اپنی کمتری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ آگے کی منزل کھوٹی ہو جاتی ہے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر بھی سرپرست بچوں کو چار پانچ دن کے لئے روک لیتے ہیں اور اگر شادی بیاہ وطن سے دور کسی دوسری جگہ ہوتے ہیں تو دو دو ہفتے بچے نہیں آتے۔ اس قسم کی طویل غیر حاضریوں کے بعد جب طلبا، مدرسہ آتے ہیں تو ایک دو ہفتے تو وہ جماعت میں بالکل اجنبی رہتے ہیں اس کے بعد پھر کہیں جا کر جماعت کی تعلیم کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اگر گھر پر کسی کی مدد حاصل ہو گئی یا ذہین ہوئے تو ایک حد تک یہ کمزوری دور ہو گئی ورنہ یہ کمزوری برابر ساتھ دیتی رہتی ہے

ہندوستان کی موجودہ تعلیمی فضا میں جبکہ تعلیم میں نیا انداز پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس اہم کام کی ذمہ داری بھی استاد ہی کو لینی چاہئے۔ ایک طرف تو اسے اپنا طریقۂ تعلیم دلچسپ بنانا چاہئے کہ طلبا، خود بخود مدرسہ آنے کے لئے بے چین ہو جائیں اور گھر پر رکے نہ رکیں۔ دوسری طرف استاد ہر غیر حاضر ہونے والے طالب علم کے سرپرست اور والدین سے ملے اور انھیں بتلائے کہ بچہ کی غیر حاضری سے کتنا نقصان ہوتا ہے۔ مدرسہ میں حاضری کا جھنڈا، مدرسہ میں مختلف دلچسپ کام اور کھیل اور استاد کا بہتر سلوک مدرسہ کی حاضری کو بہت زیادہ بڑھا سکتے ہیں۔ مدرسین اپنے کام کو اس طرح ترتیب دیں کہ طلبا گھر سے زیادہ مدرسہ میں دلچسپی لینے لگیں۔ وہ مدرسہ کے بعد اور تعطیلات میں بھی خوشی سے مدرسہ آئیں اور مدرسہ میں کام کریں۔ آپ مدرسہ اور طلبا میں ایک گہرا لگاؤ پیدا کر دیں۔

مختلف بیماریاں بھی بچوں کی تعلیمی کمزوری کا سبب ہوتی ہیں۔ اس میں والدین، سرپرستوں اور استادوں کی نگرانی کی کمی ہوتی ہے۔ اکثر بچے صرف اس لئے بیمار ہوتے ہیں کہ وہ گھر کا پکا ہوا تازہ اور اچھا کھانا نہیں کھاتے بلکہ بازار سے مختلف قسم کی مٹھائیاں اور چٹپٹی چیزیں خرید کر کھاتے رہتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سستی سر کے درد اور پیٹ کے درد کے دائمی مریض بن جاتے ہیں سستی اور درد کی وجہ سے پڑھائی کے دوران میں ان کی توجہ ادھر ادھر ہوتی رہتی ہے اور جو کچھ استاد سمجھاتا ہے وہ پورے طور پر ان کی سمجھ میں نہیں آتا اور اس طرح گو وہ جماعت میں موجود رہتے ہیں لیکن ان کا ذہن جماعت سے باہر ہوتا ہے۔ بچے بے احتیاطی کی وجہ سے کبھی کبھی سردی اور گرمی کا بھی شکار ہو جاتے ہیں چھوت چھات کی وجہ سے جن کا وہ مطلق خیال نہیں رکھتے کئی

بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں لیکن زیادہ تر بچے بار بار کھانے اور ناوقت کھانے سے بیمار ہوتے ہیں۔ مدرسہ پر اس سلسلہ میں یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مدرسوں میں بچوں کی دوکان کا انتظام کرے۔ جہاں سے بچے صاف ستھری کھانے پینے کی چیزیں خریدیں۔ دوسری چیز بچوں کا شفاخانہ ہونا چاہئے۔ جس میں اس قسم کے مرض کی دوائیں موجود رہیں۔ بچوں کی دوکان اور شفاخانہ میں بچے ہی کام کریں اور اس طرح ایک طرف لین دین سیکھیں اور دوسری طرف شفاخانہ سے وابستہ رہ کر صحت اور صفائی کے متعلق عملی طور پر سیکھیں۔ مدرسہ میں کھیل اور ورزش کے انتظام سے بھی بچوں کی صحت پر نمایاں اثر پڑتا ہے لیکن کھیل اس طرح کھلائے جائیں کہ تمام بچے حصہ لے سکیں اور ورزش اس طرح کرائی جائے کہ بچے جبر نہ محسوس کریں۔

غیر حاضری اور بیماری کے علاوہ بچوں کے پاس لکھنے پڑھنے کا پورا سامان موجود نہ ہونا بھی بہت بڑی کمزوری کا سبب ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک طالب علم سال کے دوران میں صرف دو ایک دفعہ بیمار ہوا ہو اور دوسری وجوہات کی بنا پر بھی وہ غیر حاضر نہ ہوا ہو لیکن وہ اپنا سامان مکمل نہ رکھتا ہو اس لئے کمزور ہو۔ بعض بچوں میں سامان کھو دینے کی عادت ہوتی ہے یا وہ گھر سے سامان لانا بھول جاتے ہیں یا وہ مدرسہ میں سامان رکھتے ہیں اور ڈسک کی چابی لانا بھول جاتے ہیں یا ان کا سامان مدرسہ میں کوئی چرا لیتا ہے اور وہ اپنے والدین اور سرپرستوں سے دوبارہ سامان طلب کرنے کی جرات نہیں رکھتے اس لئے کہ شاید سزا سے دوچار ہونا پڑے۔ لہذا ان تمام صورتوں میں سامان کی غیر موجودگی کی وجہ سے طالب علم کا تعلیمی نقصان ہوتا رہتا ہے۔ بعض سرپرست بچوں کو سامان دلانے میں بہت لاپروائی برتتے ہیں اور اس طرح بھی بچوں کا نقصان ہوتا رہتا ہے۔ بعض بچوں کو سامان تھوڑا تھوڑا ملتا ہے یعنی پورا سامان اُن کے والدین یا سرپرست بہ یک وقت خرید کر نہیں دیتے کچھ بچے اُن پیسوں کی جن سے انہیں سامان خریدنا ہے کھانے پینے کی چیزیں خرید لیتے ہیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان نہیں خریدتے جس سے پڑھائی کا برابر نقصان ہوتا رہتا ہے۔ اکثر سرپرست طلبا کی بات کا یقین نہیں کرتے کہ واقعی طالب علم کو مدرسہ میں فلاں چیز کی ضرورت ہے اور اس لئے چیزوں کی خریداری کے لئے قیمت نہیں دیتے کچھ لوگ ملازمین کے ذریعہ طلبا کو چیزیں خریدواتے ہیں جو وقت پہ بچوں کو چیزیں خرید کر نہیں دیتے۔ اس معاملہ میں مدرسے کو رہنمائی اور مدد کرنی چاہئے۔ مدرسہ ہر جماعت میں تعداد طلبا کے مطابق

دوات قلم اور پنسل اور بادامی کاغذ کا انتظام کر دے۔ اس لئے کہ بعض مرتبہ اس معمولی سامان کے نہ ہونے سے طلبا کا بہت نقصان ہوتا ہے۔ جو ضروری باتیں استاد طلبا کو لکھانا چاہتا ہے وہ ان چیزوں کی غیر موجودگی کی وجہ سے رہ جاتی ہیں۔ اُدھر طالب علم اپنی سستی کی وجہ سے اسے کسی دوسرے طالب علم کی کاپی سے نقل کرنا بھول جاتا ہے۔ جہاں قلم کے واسطے سے لکھائی کا کام ہوتا ہے وہاں طلبا کے قلم روز ٹوٹے ہوئے اور بغیر بنے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے ان کے تعلیمی نقصانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر جماعت میں بنے ہوئے قلم موجود ہونے چاہئیں اور جب لکھائی کا کام شروع ہو تو جن طلبا کے پاس قلم نہ ہوں یا بغیر بنے ہوئے اور ٹوٹے ہوئے ہوں ان سے ان کے قلم لے لئے جائیں اور اُن کو بنا ہوا قلم دے دیا جائے۔ بجائے اس کے کہ آپ طلبا کا قلم بنانے میں وقت ضائع کریں۔ آہنی قلم میں بھی اس قسم کی دقتیں ہوتی ہیں۔ اکثر طلبا اپنا قلم اپنی شیروانی یا کوٹ کے اوپر کی جیب میں رکھتے ہیں۔ اب جہاں کہیں وہ جھکے تو ان کا یہ قلم بھی گرا اور گرنے سے اس کی نب خراب ہوگئی۔ لہذا ان تمام دقتوں کو دور کرنے کا واحد علاج یہ ہے کہ مدرسہ قلموں کا انتظام کرے۔ مدرسوں میں ایسا انتظام بھی ہوسکتا ہے کہ ہر بچہ کا حساب بچوں کی دوکان میں کھولدیا جائے اور تھوڑی رقم ان کے کھاتہ میں جمع کرالی جائے تاکہ جب ان کے پاس کوئی سامان نہ ہو تو وہ اپنے حساب میں سے اسی دن خرید سکیں جس دن ان کو ضرورت ہو۔

بچوں کی تعلیمی حالت پر ان کے ماحول کا بھی اثر پڑتا ہے۔ ہندوستان ایسے ملک میں اچھے تعلیمی ماحول کی بہت کمی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے یہ ماحول بیشتر حالات میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ طلبا کے آس پاس اکثر ایسے بچے ہوتے ہیں جن کا بیشتر وقت کھیل کود اور بیہودہ مذاق میں گذرتا ہے اور جن کی تعلیم کا کہیں انتظام نہیں ہوتا۔ مدرسہ میں پڑھنے والے بچوں کا بھی تمام وقت انھیں بچوں کے ساتھ گذر جاتا ہے اور اس طرح تعلیم میں انھیں یکسوئی اور دلچسپی حاصل نہیں ہوتی جو ایک تعلیمی ماحول میں حاصل ہوسکتی تھی جب طلبا بیٹھ کر مدرسہ کا کام کرنا چاہتے ہیں یا اپنا نجی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو آس پاس کے بچوں کا کھیل کود اور شور و شغب انھیں اس تعلیمی کام سے کھیل کود کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اور متواتر ایسا ہونے سے وہ تعلیم سے اکھڑا ہوجاتے ہیں۔

اکثر گھروں میں کوئی پڑھا لکھا نہیں ہوتا۔ نہ والدین نہ سرپرست۔ اگر طالب علم کو اپنی پڑھائی اور اپنے کام میں کوئی دقت محسوس ہوتی ہے تو وہ اس کے متعلق کسی سے دریافت نہیں کرسکتا۔ اپنی وقت کو دور نہیں

کر سکتا اور جب ان کی وقت رفع نہیں ہوتی تو قدرتاً ان کو مایوسی ہوتی ہے۔ ایسے مایوس کن حالات میں چند ہی بچے آگے بڑھتے ہیں اور باقی دو چار منزل پر ہی ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ اکثر گھروں میں بچوں کو اپنے گھر کا بھی کام کرنا پڑتا ہے اور بازار سے سودا سلف لانے کے علاوہ اپنے چھوٹے بھائی بہن کو بھی کھلاتے ہیں اور یوں آزادی سے اپنا مطالعہ جاری نہیں رکھ سکتے۔ پھر بعض گھروں میں اس قدر شور و غل ہوتا ہے کہ طلبا کو اسکول سے پڑھنے کا موقع نہیں ملتا یہ چند گھروں کے نمونے نہیں ہیں بلکہ ہندوستان کے بیشتر حصوں میں کم و بیش اسی قسم کے حالات نظر آتے ہیں اور ان میں سے بعض ایسی مجبوریاں ہیں جن کا علاج ان حالات میں بالکل ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔

ڈسٹرک بورڈ اور میونسپلٹی کے چند اسکولوں کی اونچی جماعتوں میں طلبا کو صبح بلاتے ہیں اور دن بھر مدرسہ میں رکھ کر شام کو گھر واپس بھیجتے ہیں۔ گھر کے لئے جتنا کام تجویز کیا جاتا ہے وہ مدرسہ ہی میں کرا لیا جاتا ہے۔ اس صورت حال سے جو مفید نتیجہ حاصل ہوتا ہے یعنی طلبا بری صحبت سے بچے رہتے ہیں اور امتحانوں میں پاس ہو جاتے ہیں۔ وہ اس مضرات سے کہیں کم ہے جو اس جبری حاضری سے پیدا ہوتا ہے اس لئے بچے بالکل ڈرپوک ہو جاتے ہیں۔ آزادی فکر کی جگہ استاد کے خیالات کے ہر وقت محتاج ہو جاتے ہیں ہر کام بلا چون و چرا اور بلا سمجھے بوجھے کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اپنی ذکاوت اپنی ذہانت اپنی فکر اپنی سمجھ بوجھ غرضکہ ہر چیز قربان کر دیتے ہیں۔ دراصل یہ ان کے لئے ایسا نظام بن جاتا ہے کہ بس استاد کے بتلائے ہوئے راستہ پر چلنا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔ کھیلنے تک کے لئے وقت نہیں ملتا۔

جہاں تک مدرسہ کے اوقات سے پہلے اور بعد میں طلبا کے آنے اور رکنے کا تعلق ہے یہ چیز اپنی جگہ بہت اچھی ہے لیکن جن مقاصد کے ماتحت بچوں کو بلایا جاتا ہے وہ طریقہ مناسب نہیں ہے بچے مدرسہ کے اوقات سے پیشتر اور بعد میں اگر اپنے شوق سے کوئی تعمیری کام کرنے کے لئے رکیں تو بہت مفید نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان حالات میں بچے اپنے مقصد اور کام سے مدرسہ آئیں گے اور رک کر کام کریں گے۔ صرف اور بامقصد کاموں کے ذریعہ جو مدرسے اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرتے ہیں وہ اپنے بچوں میں اپنے اوقات کو مفید کاموں میں استعمال کرنے کا شوق اور عادت پیدا کر دیتے ہیں وہ بچوں کو بغیر کسی جبر کے مدرسہ میں اور گھر

پر اپنے اوقات کے صحیح استعمال کرنے کی تربیت دیتے ہیں۔

بچہ کی جسمانی خرابی بھی تعلیم میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے بچہ تندرست ہو، بہت کم بیمار پڑتا ہو لیکن کم سنتا ہو زیادہ فاصلے سے بورڈ پر لکھی ہوئی باتیں نظر نہ آتی ہوں۔ پڑھنے اور بولنے میں ہکلاتا ہو تو بھی اس میں برابر کمزوری رہے گی۔ جماعت کے چند لڑکوں میں یہ صورتیں ضرور ہوتی ہیں جو استاد ان باتوں کو معلوم نہیں کرتے یا معلوم کرکے توجہ نہیں کرتے اور جماعت کے طلبا کو تعلیم دیتے رہتے ہیں وہ ان بچوں کا بہت نقصان کرتے ہیں۔ استاد یہ خیال کرتا ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ تمام لڑکے سن رہے ہیں یا جو کچھ میں بورڈ پر لکھ رہا ہوں وہ تمام لڑکے دیکھ رہے ہیں حالانکہ چند بچے ایسے ہوتے ہیں جو کم سننے کی وجہ سے اور کم بینائی کی وجہ سے استاد کی تمام باتیں اچھی طرح نہیں سمجھتے اور اس طرح ان کا برابر نقصان ہوتا رہتا ہے اور وہ کمزور رہ جاتے ہیں۔ اس میں سرپرستوں کا بھی قصور ہے کہ وہ مدرسہ میں بچے کے داخلہ کے وقت مدرسین کو یہ نہیں بتلاتے کہ بچہ میں فلاں فلاں جسمانی خرابی ہے۔ جن بچوں کو سخت ملیریا یا ٹائیفائڈ ہو جاتا ہے۔ ان کے دماغ پر بھی ان بیماریوں کی وجہ سے خاص اثر ہوتا ہے ان کی ذہانت اور ذکاوت میں نسبتاً کمی ہو جاتی ہے تعلیم میں ان کی رفتار مدھم پڑ جاتی ہے۔ داخلہ کے وقت مدرسہ کو یہ تمام باتیں سرپرستوں سے دریافت کرنی چاہئے تاکہ پڑھانے والے معلمین بچوں کی ان خرابیوں سے آگاہ ہو سکیں جو بچے کم سنتے ہیں یا بورڈ کی عبارت اچھی طرح نہیں پڑھ سکتے ان کو بورڈ اور استاد کے قریب بٹھانا چاہئے چشمہ کا انتظام بھی اس دقت کو رفع کر سکتا ہے لیکن ہندوستان ایسے غریب ملک میں بہت کم سرپرست یہ انتظام کر سکتے ہیں، اور گاؤں میں تو بالکل ہی نہیں۔ جو لڑکے بولنے اور پڑھنے میں ہکلاتے ہیں یا توتلے ہیں ان سے ہمدردی کرنی چاہئے۔ اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ دوسرے لڑکے اس لڑکے کی نقل کرکے اُس کا مذاق نہ اُڑائیں۔ اس لئے کہ اس سے ایک طرف دوسرے بچوں میں ہکلا پن پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اور دوسری طرف ہکلانے والے بچوں میں اپنی کمتری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ بولنے سے پرہیز کرنے لگتے ہیں۔

اس قسم کی خرابیاں استادوں میں بھی ہوتی ہیں، اس کا بھی بچوں کی کمزوری پر اثر پڑتا ہے اگر استاد بہت تیز بولنے کا عادی ہے تو پوری جماعت پر اس کا اثر پڑیگا اور لڑکے استاد کی باتوں کو اچھی طرح نہ سمجھ سکیں گے وہ استاد کو

فصیح و بلیغ تو خیال کرنے لگیں گے لیکن جو باتیں ایسا استاد ان کو سمجھانا چاہے گا اس کو وہ اچھی طرح نہ سمجھ سکیں گے گو استاد اپنی جگہ پر یہی خیال کرے گا کہ اس نے ہر بات کو اچھی طرح بچوں کو سمجھایا ہے۔ بعض استاد بہت آہستہ بولتے ہیں۔ اس کا بھی تیز بولنے کی طرح اثر پڑتا ہے گو آگے بیٹھنے والے بچے استاد کی باتیں سمجھ لیتے ہیں لیکن پیچھے بیٹھنے والے لڑکوں کی سمجھ میں استاد کی بات اچھی طرح نہیں آتی۔ استاد بھی ہکلے ہوتے ہیں اس سے بچے استاد کی باتیں اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ جو استاد ہکلا کر بولتا ہے اُس سے اولاً بچے اس کی نقل کرتے ہیں دوم انھیں اس کی باتیں سمجھنے میں الجھن ہوتی ہے۔ جو استاد کم سنتے ہیں وہ اپنی تو کہہ لیتے ہیں لیکن شاگردوں کی کم سنتے ہیں۔ استادوں میں ان خرابیوں کا ہونا طلبا کے لیے مستقل مصیبت ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کے تمام مدرسوں میں بچوں کی کثیر تعداد ایسی ملتی ہے جو کسی نہ کسی قسم کی کمتری کے احساس میں مبتلا ہوتی ہے یہ وہ احساس ہے جو اکثر بچوں کو آگے بڑھنے سے روک دیتا ہے۔ ہندوستانی گھرانوں کی تربیت اور اٹھان ہی اس انداز پر ہوتی ہے کہ بچوں میں شروع سے احساس کمتری پیدا ہونے لگتا ہے۔ جب ان کی کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی تو وہ اپنی بے مائگی پر غور کرنے لگتے ہیں اور غور کرتے کرتے بالکل دلگیر ہو جاتے ہیں تعلیم میں دوسروں کو آگے بڑھتا ہوا دیکھ کر کوفت اور غم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ استاد کی ذرا سی جھڑکی انھیں اپنی اپنی کمتری کا بار بار خیال دلاتی ہے۔ گھروں میں ذرا ذرا سی باتوں پر والدین، سرپرست اور گھر کے دوسرے ممبران کی ہر وقت کی روک ٹوک اور گرفت بچوں کی فطری آزادی اور خوشحالی کو رفتہ رفتہ کم کر دیتی ہے۔ اس سے بچے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ گھر کے لوگ ان سے ہمدردی نہیں کرتے اور اس طرح ان میں دلگیری اور احساس کمتری رفتہ رفتہ پیدا ہونے لگتا ہے اور جب بچہ اپنے چھوٹے بھائی بہن کے ساتھ والدین اور دوسروں کو اچھا سلوک کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس میں یہ احساس اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ جن بچوں میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے انہیں نہ کھانا اچھا لگتا ہے نہ پہننا۔ وہ گھر میں اپنے والدین اور مدرسہ میں استاد کو اپنا ہمدرد خیال نہیں کرتے ہیں مدرسہ جانے اور تعلیم پانے میں وہ نسبتاً کم دلچسپی لیتے ہیں بس والدین کا حکم بجا لاتے ہیں۔ وہ استاد کے لئے ایک مسئلہ بن جاتے ہیں۔ اگر مدرسہ میں بھی ایسی فضا ہوئی یعنی مدرسین نے طالب علم کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کیا تو پھر مدرسہ سے بھاگنا ایک فطری فعل ہو جاتا ہے اور اگر مدرسہ آتے رہے تو تعلیم میں برائے نام دلچسپی

رہ جاتی ہے جن بچوں کی والدہ یا والد یا دونوں حیات نہیں ہوتے ان میں بہت ناخوشگوار قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کے خیال میں دنیا ناہمدردی کا گھر ہو جاتی ہے۔ ایسے بچوں کے خیالات منتشر ہوتے ہیں ان میں توجہ اور انہماک کی کمی ہوتی ہے وہ زیادہ تر کھوئے ہوئے رہتے ہیں۔ اس لئے جماعت میں جو کچھ تعلیم ہوتی ہے اس کا بہت زیادہ حصہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔

احساس کمتری کی تمام پیچیدگیوں اور ان کے نتائج کو اس مختصر مضمون میں قلمبند کرنا بہت مشکل ہے لیکن تعلیم میں یہ تمام پیچیدگیاں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اساتذہ کے نا ملائم کلمات ایسے بچوں کی زندگی ہی خراب کر دیں۔ اس لئے ایسے بچوں کی تعلیم کی رہنمائی بڑی ہوشیاری سے کرنا چاہئے۔ انہیں کبھی دلگیر نہ ہونے دینا چاہئے۔ ان سے اس طرح پیش آنا چاہئے کہ وہ خوش رہیں۔ ایسا موقع ہی نہ آنے دینا چاہئے کہ وہ فکرمند اور آزردہ خاطر ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے بچوں میں بعض ایسی عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن پر گرفت کرنا بہت ضروری ہوتا ہے لیکن یہ گرفت ملائم طریقہ سے بھی ہو سکتی ہے اس لئے کہ سخت بازپرس ان میں اور زیادہ پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے۔ ایسے بچوں کے مسئلہ کو ہمیں اپنے خیال کے مطابق نہیں بلکہ اس بچے کے خیال کے مطابق دیکھنا چاہئے۔ اگر اس کا خیال مضر ہے تو اس کو رفتہ رفتہ تبدیلی کا خواہشمند بنانا چاہئے۔ بری عادتیں رفتہ رفتہ بنتی ہیں اور اگر مناسب طور پر تربیت کی جائے تو رفتہ رفتہ چھوٹ بھی جاتی ہیں اور بعض مرتبہ خود بخود۔

بچوں کی تعلیم میں کمزوری کے اسباب میں غیر دلچسپ طریقہ تعلیم اور داخلہ کے وقت بچوں کی صحیح جانچ کا نہ ہونا بھی ہیں۔ غیر دلچسپ طریقہ تعلیم میں اتنا عرض کروں گا کہ جو کچھ بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر نہیں کیا جاتا وہ سب کا سب غیر دلچسپ طریقہ تعلیم ہے اور بے نتیجہ (استفادہ کے اعتبار سے) ہونے کے علاوہ مضر بھی ہے اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ دماغ سدھرتے ہیں نہ ذہن نہ عادات سدھرتی ہیں نہ ہنر۔ رہا بچوں کی صحیح طریقہ پر جانچ کا نہ ہونا سو یہ بھی اپنی جگہ پر بہت اہم ہے اور بچوں کو ان کی استطاعت کے مطابق جماعتوں میں نہ رکھنا ان میں بے اعتمادی اور احساس کمتری پیدا کرتا ہے اور عارضی خوشی سے تمام پڑھائی کے سالوں کی کوفت مول لینا ہے بچوں کو اسی جماعت میں داخل کرنا چاہئے جس میں وہ آسانی سے چل سکیں اور اس جماعت کی تعلیم پڑھائی میں دشواری نہ محسوس کریں اگر ابتدا میں اطمینان ابھی ہے تو آئندہ بھی خوشگوار طریقہ پر تعلیم جاری

رہے گی۔ ورنہ بچہ جماعت میں دب کر رہ جائے گا اور اس کی تمام صلاحیتوں میں انحطاط ہی انحطاط نظر آئیگا۔ مدرسوں میں عام طور سے بچوں کے تبادلے سارٹیفکٹ کے ذریعہ ہوتے ہیں اور جس جماعت سے ایک طالب علم ایک مدرسہ چھوڑ کر جاتا ہے دوسرے مدرسہ میں اسی جماعت میں داخل ہوتا ہے۔ اس طرح ایک مدرسہ کی خامیاں دوسرے مدرسہ میں بھی جاری رہتی ہیں۔ اور اگر طالب علم ایک دو ماہ بیمار ہو گیا تو اس میں اور زیادہ تعلیمی کمزوریاں پیدا ہو گئیں۔ لہٰذا دوسری جگہ بچوں کو اچھی طرح امتحان لے کر داخل کرنا چاہئے۔ اور اسے کمزور پودے کی بجائے تندرست پودے کی طرح بڑھنے کا موقع دینا چاہئے۔

منشی پریم چند

گذشتہ سے پیوستہ

بحیثیت ناول نویس :- زمانہ کے ساتھ ساتھ اُردو زبان میں طرح طرح کی تبدیلیاں ہوئیں۔ زبان رفتہ رفتہ صاف اور آسان ہوتی گئی قصے کہانیوں نے بھی پلٹا کھایا اور داستان امیر حمزہ اور بوستان خیال کی بے شمار پوتھیوں اور دوسرے بھوت پریت اور جادو سے بھرے ہوئے قصوں کا بھی رنگ بدلا۔ دوسرے یہ کہ نظریۂ زندگی ہی بدل گیا یعنی سیرت انسانی پر غور کیا جانے لگا۔ رچرڈسن۔ فیلڈنگ جیسے ماہر نفسیات پیدا ہوئے جنھوں نے اٹھارہویں صدی میں حقیقت نگاری کا بیڑا اٹھایا اور واقعات عالم کو دلچسپ پیرائے میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ اور ہندوستان میں بھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہماری معاشرت پر بھی مغربی تعلیم کا رنگ چڑھنے لگا۔ ہندی میں للو لال جی نے اور اردو میں سب سے پہلے میر امن نے اس کی بنیاد ڈالی اور اس کو کمال تک منشی پریم چند نے پہونچایا۔ دراصل اردو میں ایسے ناولوں کی کمی تھی جن کو صحیح معنوں میں ناول کہہ سکیں۔

سرشار کے ناولوں میں ظرافت ہے مکالمہ چست ہے لیکن پھر بھی ان میں پرانی کہانیوں کی طرح ترتیب اور ربط نہیں ہے۔ سیرت نگاری میں بھی زیادتی سے کام لیا گیا ہے اور ان کی ظرافت بھی بلند معیار کی نہیں ہے نذیر احمد کے بیان زور ہے بے تکلفی ہے روانی ہے۔ قوت مشاہدہ بھی اچھی خاصی ہے۔ سیرت نگاری میں بھی ایک حد تک کامیاب ہیں لیکن اسٹائل کے لحاظ سے ناہموار ہیں اور جس پردے پر وہ تصویر بناتے ہیں بہت ہی چھوٹا ہے۔ اصل میں ان کی کہانیاں ناول اور رومانس کے بیچ کی کڑی ہیں۔

شرر کی کہانیوں میں ترتیب تو ہے لیکن یہ ناول زیادہ تر خیالی اور تاریخی ہیں۔ آغا عبدالحمید کے بیان کے مطابق ان کے ہیرو ہیروئن بہت ہی گھٹیا درجے کے خیالوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کے ناول پر مذہبی رنگ چڑھا ہوا ہے اور تاریخی ناول حقیقت سے بہت دور ہیں۔ مولانا نے معاشرتی ناول بھی لکھے ہیں

لیکن یہ آج کل کی معاشرت کا صحیح خاکہ نہیں پیش کرتے۔

پریم چند نے اپنی قابلیت اور صلاحیت کا ثبوت تقریباً ایک درجن ناول لکھ کر دیا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان میں خامیاں بالکل نہیں ہیں کیونکہ منشی صاحب کا اصل میدان افسانہ ہے۔ اس میں انہوں نے کمال حاصل کیا۔ ناول میں وہ اتنے کامیاب نہیں ہوئے۔ طویل ناولوں میں یہ تسلسل قائم نہیں رکھ سکے ہیں اور کیرکٹر نگاری میں بھی کسی قدر کمزوری آگئی ہے۔ انسان کا کیرکٹر بدلتا رہتا ہے لیکن اس کے وجوہ بھی ہوتے ہیں جن کا دکھانا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اگر نکتہ چینی کرنے اور خامیاں نکالنے بیٹھیں تو ہر بڑے ناول نویس میں نکال سکتے ہیں۔ منشی صاحب کو اس کا دعویٰ تو تھا نہیں۔ انہوں نے جس چیز کو اپنا موضوع بنایا اس میں بہت کامیاب ہوئے۔

ان کے انداز بیان میں سادگی اور بے تکلفی ہے۔ ناول نویس کا اہم فرض ہے کہ وہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تنقید کرے اور اس کے روشن پہلوؤں کو ابھارے۔ مجلسی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی، قومی، انفرادی، اجتماعی، علمی و تعلیمی مسائل و نکات کو سلجھا کر ان کا حل پیش کرے۔ یہ سب باتیں منشی صاحب کے ناولوں میں موجود ہیں۔ ان کے ناول نہ صرف ہمارے ناقص سماجی نظام کی مذمت کرتے ہیں بلکہ قومیت اور وطنیت کے جذبے کے علمبردار بھی ہیں۔

پلاٹ:۔ منشی صاحب ایک بڑے ناول نویس ہیں۔ انکا پلاٹ نہایت دلکش اور دلچسپ ہوتا ہے۔ ان کے ناول مجلسی، معاشرتی، قومی اور ملکی واقعات کی تصویریں ہیں اور حقیقت میں ان کے سب ناول زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کے واقعات پڑھ رہے ہیں لیکن بعض ناولوں میں طوالت کی وجہ سے پلاٹ میں وہ دلکشی نہیں دکھائی دیتی۔

طرز بیان:۔ پریم چند کا طرز بیان بھی اچھا ہے۔ ان کی عبارت میں بلا کی انشاپردازی ہے۔ ان کی تحریر سادہ، صاف اور دلکش ہے۔ عبارت آرائی سے پاک ہے۔ ان کے مکالمے بہت دلچسپ ہیں۔ انہوں نے جس طبقے کے اشخاص کو لیا ہے۔ انہیں کی زبان میں مکالمہ ادا کرایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیفات میں ایک خاص خوبی پیدا ہو گئی ہے۔ ان کو اہل طبقہ کی زبان پر پورا عبور حاصل ہے لیکن جو زبان وہ دیہاتیوں کی زبانی ادا کراتے ہیں وہ ان کا شاہکار ہے۔ انہوں نے دیہاتی محاورے اور الفاظ کثرت سے شامل

کر دئے ہیں جس سے زبان عام فہم اور سلیس ہو گئی ہے۔

پریم چند کو کردار نگاری میں بھی کافی مہارت حاصل ہے۔ ان کے کردار بے جان مٹی کے پتلے نہیں ہیں بلکہ جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ان میں برائیاں بھی ہیں اور بھلائیاں بھی ان کے جذبات اور احساسات میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں لیکن ان تبدیلیوں کے وجوہ کم دکھلائے ہیں۔ دوسرے برائیوں کے مقابلہ میں خوبیوں کو زیادہ اُجالا ہے جس سے برائیاں دب گئی ہیں یہ غالباً اصلاحی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے مثلاً "بازار حسن" میں پدم سنگھ، وِٹھل داس، سدن اور سمن قابل ذکر کردار ہیں۔ پدم سنگھ اور وٹھل داس شاہدان بازاری کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ بھولی سمن کو بدی کی طرف مائل کرنا چاہتی ہے یہ باتیں سمن کے لئے زہر ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن بھولی کو بھی اس گناہ کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے وہ سوسائٹی کی نظر سے گر جاتی ہے۔

اسی طرح "پردہ مجاز" میں چکردھر کو ایک نڈر بے دھڑک اور دلیر آدمی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے وہ غریب مزدوروں اور کسانوں کی دل سے بھلائی چاہتا ہے۔ اور ہندو مسلم فساد کو سلجھانے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ منورما حقیقی دیوی ہے وہ بہت سوں کے لئے ہدایت کا کام دیتی ہے۔ اس کو چکردھر سے محبت ہے لیکن اس محبت میں لجاتی ہے۔ بدی سے بالکل پاک ہے۔ اس کی شادی ایک راجہ سے ہوتی ہے اور رانی ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی وہ ہمیشہ غریبوں کسانوں اور دکھیوں کا ساتھ دیتی ہے۔

منشی صاحب ایک عملی فلاسفر اور حقیقت نگار تھے۔ اپنے ناولوں میں انھوں نے فلسفۂ زندگی کو پیش کیا ہے اور اس کے باریک سے باریک پہلوؤں کو بھی اجالے میں دکھایا ہے۔ پریم چند کو اپنے وطن سے محبت تھی۔ وہ سچے وطن پرست تھے ...... کسانوں کی نوے فیصدی آبادی ہندوستان کی جان ہے اس لئے انھوں نے اپنا خاص موضوع کسانوں مزدوروں ادنیٰ درجے کے ملازمین کی آہ و پکار کو بنایا۔ اور یہ موضوع ٹھیک بھی ہے جو باتیں انھوں نے بیان کی ہیں وہ روزانہ پیش آتی رہتی ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک سچے قوم پرست تھے انھوں نے ادب کے ذریعہ قوم و ملک کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے منشی صاحب ڈکنز، ٹیگور، ٹالسٹائی اور گورکی کے ہم پلہ ہیں۔

ادب کا سب سے بڑا مقصد سماج کا سدھار اور مسائل زندگی کا حل پیش کرنا ہے منشی صاحب

نے زندگی کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔ انھوں نے ہر مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے ہندو مسلم فساد، کاشتکاروں پر کئے ہوئے ظلم اور مسئلہ تناسخ کا حل بہت کامیابی سے پیش کیا ہے۔ غرضکہ انھوں نے اپنا پیام کتابوں کے ذریعہ پہونچایا ہے۔ ان کے ناول پڑھنے والے کے دل میں ایک جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے وہ بلندی ہی کی طرف اٹھتا ہے نیچے نہیں گرتا۔ مجھے تو ان کی تصانیف میں درد ملتا ہے، سوز ملتا ہے۔ دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے الفاظ اتنا اثر ڈالتے ہیں کہ رونا آتا ہے۔

اردو میں منشی صاحب کا سب سے پہلا ناول "ہم خرما و ہم ثواب" کے نام سے شائع ہوا جس کا ترجمہ ہندی میں "پریما" کے نام سے ہوا تھا۔ مصنف کی یہ پہلی کوشش تھی اس لئے اس میں اکثر خامیاں موجود ہیں۔ اس کے بعد منشی صاحب کے متعدد ناول جلوۂ ایثار، غبن، گوشہ عافیت، بازار حسن، نرملا، بیوہ، چوگان ہستی، میدان عمل، گئودان وغیرہ شائع ہوتے ہیں۔ ان میں ہر ایک پر تبصرہ کرنے سے تو مضمون طویل ہو جائیگا۔ صرف دو تین ناول ہی دیکھیں گے۔

جلوۂ ایثار۔ یہ ناول غالباً منشی صاحب کی دوسری کوشش ہے اس لئے اس میں اس زمانے کی افسانہ نگاری کا رنگ جھلکتا ہے۔ پورے ناول کا خلاصہ پہلے ہی باب میں موجود ہے۔ منشی صاحب کسی کو زیادہ دیر تک منتظر نہیں رکھنا چاہتے۔

پریم چند دیس کے پجاری تھے اس لئے ان کے بھی سورما دیس بھگت ہیں۔ آدمی کسی طبقے یا فرقہ سے تعلق رکھتا ہو وہ ہر ایک کے لئے دیس سیوا ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے ہیرو، ہیروئن کا خاص جوہر یہی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ہیرو آئیڈیل رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کا ہر ہیرو سچائی کا پتلا، انصاف پسند، تیاگ اور ترک کا نمونہ اور قربانی کا دیوتا معلوم ہوتا ہے۔

اس ناول میں نئی روشنی اور پرانی روشنی خاص انداز میں پیش کی گئی ہے لیکن ایک نقص جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ منشی صاحب کبھی کبھی جزئیات اور تفصیلات میں پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے قصہ کا اصل حسن ماند پڑ جاتا ہے۔ وہ آمد نہیں رہتی کیونکہ آمد اختصار ہی میں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طبیعت کبھی کبھی اکتا جاتی ہے۔ ان کے مکالموں سے بھی کبھی کبھی دلچسپی نہیں رہتی۔ وہ جب اپنے گرد و نواح کی زبان

میں گفتگو لکھتے ہیں تو لطف آجاتا ہے لیکن مکالموں میں جنسی تفریق نہیں رکھی یعنی عورتوں کی گفتگو میں زیادہ خیال نہیں رکھا گیا یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول واقعات کے لحاظ سے کئی جگہ غیر فطری سے ہو گئے ہیں مگر وہ اس موثر انداز میں بیان کرتے ہیں۔ کہ پڑھنے والے محسوس نہیں کرتے۔

بالاجی اس ناول کے ہیرو ہیں۔ ان کا کیرکٹر اتنا زوردار اور مکمل نہیں ہے کہ ہر شخص کے دل میں بالاجی بننے کی آرزو پیدا ہوتی ہو۔ وہ صرف ایک معمولی قومی لیڈر معلوم ہوتے ہیں۔ اس ناول کی دوسری سیرتوں میں بھی کسی کو کوئی خاص وقعت نہیں

دوسری چیز جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا پلاٹ کا تسلسل باقی نہیں رہتا۔ ہر پلاٹ الگ ایک افسانہ بنا ہوا ہے۔ یہ ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے نہیں معلوم ہوتے۔

مختصر یہ کہ اس ناول میں سرشار کا چٹخارہ اور رسوا کے رنگ کا عجیب میل جول ہے۔ اس کی زبان بھی ناہموار اور ثقیل ہے کہیں کہیں فارسی ہندی کے الفاظ کے ساتھ ساتھ سنسکرت کے بے جوڑ الفاظ بھی موجود ہیں۔

دوسرا ناول "گوشۂ عافیت" ہے جس قدر خامیاں جلوۂ ایثار میں نظر آتی تھیں اتنی ہی خوبیاں اس ناول میں سما گئی ہیں۔ اس ناول کی زبان اتنی سادہ اور پیاری ہے کہ صحیح معنوں میں ہندوستانی معلوم ہوتی ہے۔ صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے زبان میں وہی لطف وہی زور باقی رہے گا۔

اس ناول میں مکالمہ بھی غضب کا ہے۔ خاص طور سے دیہاتی لہجہ میں تو اتنی حقیقت اور سچائی ہے۔ کہ معلوم ہوتا ہے لکھنے والے کو اس فن میں خاص ملکہ ہے

سیرتیں بھی مکمل معلوم ہوتی ہیں اور واقعات کا تسلسل بھی قائم رکھا گیا ہے اور اس میں بے جوڑ اور غیر فطری واقعات بھی نہیں ہیں۔ اس میں وہی باتیں ہیں جو رات دن گذرتی رہتی ہیں۔

منشی صاحب نے رشوت ستانی اور جبریہ رسوم پر بڑی آزادی سے تنقید کی ہے لیکن وہ کسی کی حمایت نہیں کرتے دونوں پارٹیوں کی کمزوریوں اور اچھائیوں کو یعنی تصویر کے دونوں رُخ دکھائے ہیں کہ انصاف کا خون کہیں نہیں ہونے پایا۔

یہ ناول حقیقت میں انسانی نفسیات کا مرقع ہے۔ اس کے توازن میں جو شان ہے منشی صاحب کے دوسرے ناولوں میں نہیں۔

یہ تو پہلے حصہ کا تذکرہ تھا لیکن اس کا دوسرا حصہ اتنا ہی پست ہے جتنا پہلا حصہ بلند ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ ایک نشست میں نہیں لکھا کیونکہ وہ ایک ہی بیٹھک میں جو کچھ لکھتے ہیں وہ بہت خوب ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ مختصر افسانوں میں زیادہ کامیاب ہوئے ہیں لیکن ان کے طویل ناولوں میں ہم آہنگی اور روانی نہیں ملتی۔

منشی صاحب اپنے ناولوں میں خود پہلا نمبر بازارِ حسن کو دیتے ہیں لیکن ہمارا..... خیال ہے کہ پریم چند اپنی زندگی میں بجز چوگانِ ہستی کے کچھ نہ لکھتے تو دنیا اور آخرت میں کافی ہوتا۔ برنرڈ کی جارت اسکی آزادی۔ ڈکنس کی غربت نگاری۔ گلزوردی کا طنزیہ تبسم۔ ڈوا کی نقشہ کشی۔ راشد کی ٹیسیں۔ نظامی کی سادگی۔ شرر کا جوش۔ رسوا کی معنویت۔ ٹیگور کی لطافتیں۔ اس ناول میں جمع ہو گئی ہیں۔ کتاب کہیں سے کھول لیجئے۔ یکساں دلچسپ۔ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر چین نہیں آتا۔ سادگی۔ بے ساختگی۔ اور ہر قصہ میں دلکشی و دل آویزی موجود ہے۔

بنارس میں جان سیوک ایک دیسی صاحب عیسائی مذہب ہیں۔ پرلے سرے کے دنیادار اور ان کی بیٹی کا رجحان ہندو مذہب کی طرف ہے۔ ایک موقعہ پر ماں بیٹی کی گفتگو ہو رہی ہے وہاں لڑکی کے بڑھے دادا ایشور سیوک بھی آجاتے ہیں۔

صوفیہ۔ میں مذہبی معاملہ میں اپنے ضمیر کے سوا کسی کے احکام نہیں مانتی۔

مسز سیوک۔ میں تجھ کو اپنی اولاد نہیں سمجھتی اور تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔

یہ کہکر وہ صوفیہ کے کمرے میں گھس گئی اور اس کی میز پر سے مذہب اور ویدانت فلاسفی کی کتابیں اٹھا کر باہر پھینک دیں۔ اسی جوش میں انھیں پیروں سے کچلا اور پھر جا کر ایشور سیوک سے بولیں پاپا آپ صوفی کو ناحق بلوا رہے ہیں وہ حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے۔ مسٹر ایشور سیوک ایسے چونکے گویا بدن میں آگ کی چنگاری گر پڑی ہو۔ اور اپنی بے نور آنکھوں کو پھاڑ کر بولے۔

کیا کما رفیہ حضرت مسیح کی ہو کر رہی ہے! صوفی؟

مسز سیوک۔ ہاں ہاں صوفی کہتی ہے۔ مجھے ان کے معجزوں ان کے مواعظ اور احکامات پر اعتقاد نہیں ہے

ایشور سیوک۔ (ٹھنڈی سانس کھینچ کر) یسوع! مجھے اپنے دامن میں چھپا! اپنی گمراہ بھیڑوں کو راہ راست پر لا۔ کہاں ہے صوفی مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میرے ہاتھ پکڑ کر اٹھا۔ خدا میری بیٹی کے دل کو ایمان کے نور سے منور کر دے۔ میں اس کے پیروں پر گروں گا اس کی منتیں کروں گا اس کو عاجزی سے سمجھاؤں گا مجھے اس کے پاس لے چلو۔

مسز سیوک۔ میں سب کچھ کر کے ہار گئی۔ اس پر خدا کا قہر ہے۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔

ایشور سیوک۔ بیٹی ایسی باتیں نہ کرو۔ وہ میرے گوشت کا گوشت، میرے خون کا خون، میری جان کی جان ہے۔ میں اسے کلیجے سے لگاؤں گا۔ یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپا۔

جب مسز سیوک نے اب بھی سہارا نہیں دیا تو ایشور سیوک لکڑی کے سہارے اٹھے اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے صوفیہ کے کمرے کے دروازے پر آ کر بولے "بیٹی صوفی کہاں ہے؟ ادھر آ بیٹی تجھے گلے لگاؤں۔ ہا! یسوع خدا کا لاڈلا بیٹا تھا۔ غریبوں کا مددگار، کمزوروں کا محافظ، مفلسوں کا دوست، ڈوبتوں کا سہارا، گنہگاروں کا ساتھی، دکھیوں کا بیڑا پار کرنے والا! بیٹی ایسا کون سا نبی ہے۔ جس کا دامن اتنا وسیع ہو۔ جس کی گود میں اتنے سارے گناہوں ساری برائیوں کے لئے جگہ ہو۔ وہی ایک ایسا نبی ہے جس نے بدکاروں کو کافروں کو گناہگاروں کو نجات کا مژدہ سنایا نہیں تو ہم جیسے ناپاک لوگوں کے لئے نجات کہاں تھی؟ ہم کو بچانے والا کون تھا؟

چوگانِ ہستی جلد اول ۴۹ سے ۴۷ صفحہ

اس ساری گفتگو میں کتنی سچائی ہے اور مطابق واقعہ ہے کہ پڑھنے والے کے دل پر ایک خاص اثر ہوتا ہے۔

اس ناول کا ہیرو ایک اندھا بھکاری ہے۔ ایسا کامیاب ہیرو ہے کہ جتنا ناولوں کے ہیرو اس کے آگے پانی بھرتے ہیں۔ ظاہری شان و شوکت کو ٹھکرا کر اور خدمت کو گلے لگا لی۔

اس ناول میں نفسیاتی خوبیاں اور زبان کا لطف بھی ہے۔ ہر چیز میں ایک اثر ہے ایک جادو ہے

طوالت بہت ہے پھر بھی دلچسپی باقی رہتی ہے۔ جی نہیں گھبراتا۔

دوسرے کامیاب ناول بازارِ حسن اور میدانِ عمل ہیں۔ بازارِ حسن کا ہندی میں بڑا پیارا نام ہے سیوا سدن اس کے کیرکٹر زیادہ تر مرصع ہیں۔ زبان بھی زیادہ ناہموار نہیں۔ اثر بہت زیادہ ہے دلچسپی اور دلکشی بلا کی ہے مکالمہ بھی چست ہے۔

میدانِ عمل، ترکِ موالات اور ستیا گرہ کی پوری تاریخ ہے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۳ء تک کی ہندوستان کی تمام تحریکوں پر دلچسپ تبصرہ ہے بحیثیت مجموعی یہ کتاب بہت اچھی ہے زبان بہت اچھی ہے۔ اس میں سیرت نگاری آغاز و انجام اتحاد و ربط پلاٹ کی عمدگی اور ظرافت غرضکہ یہ تمام چیزیں نفاست سے پیش کی گئی ہیں۔

منشی صاحب غریب اور اوسط طبقے کی زندگی دکھانے میں بہت کامیاب ہوئے ہیں لیکن جہاں اعلیٰ طبقہ اور سوسائٹی کا بیان آیا ہے وہاں کچھ لغزشیں نظر آتی ہیں اور ہونا بھی چاہئے چونکہ منشی صاحب ایک اوسط خاندان کے آدمی تھے۔ ان کی زندگی تمام تر دیہات ہی میں گذری اعلیٰ سوسائٹی میں آنے جانے کا کم اتفاق ہوا۔ اس لئے یہ کمزوری نظر آتی ہے لیکن عیب سبھی میں ہوتے ہیں۔ کون ہے جس میں عیب نہیں ان تمام باتوں کے باوجود ان کے تمام ناول جو سادہ اور صاف زبان عوام اور خواص کے نفسیاتی مطالعہ کا گلدستہ بنے ہوئے ہیں ہماری زبان کے لئے قابلِ فخر ہیں اردو زبان میں ان سے پہلے ایسی مثالیں نہیں ملتیں۔ منشی صاحب اسی طرح چند سال اور جیتے تو ناول نویسی میں بھی وہی کمال حاصل کر لیتے جو افسانہ نگاری میں کیا تھا۔ لیکن انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ چھوت اور گؤ کشی کی طرح معاشرتی خرابیوں کو دور کرنے کی جو خدمت انجام دی ہے اسے ہندوستان کبھی نہیں بھول سکتا۔

بحیثیت ڈرامہ نگار: منشی پریم چند نے ڈرامہ نگاری کے میدان میں بھی قدم رکھا لیکن حالات نے انھیں آگے نہیں بڑھنے دیا۔ ورنہ اس میں بھی کمال حاصل کر لیتے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی صلاحیت کا ثبوت سب سے پہلے کربلا لکھ کر دیا۔ "کربلا" ادبی حیثیت سے بہت کامیاب ہے اس کے بعد منشی صاحب کو ۱۹۳۴ء میں اجنتا سینی ٹون نے بمبئی بلایا اور آپ سے ڈرامے لکھنے کی درخواست کی چنانچہ آپ وہاں ملازم ہو گئے اور دو ڈرامے "مزدور" اور "شیر دل عورت" کے نام سے لکھے سب سے پہلے مزدور لکھا۔

لیکن اس میں کمپنی والوں نے کچھ نئی باتیں جوڑ لیں تمام شعبے الگ کر دیے اور قصے کو نئی شکل دیدی لیکن پھر بھی اصل مطلب باقی رہا۔ اس میں مل کے مالکوں اور مزدوروں کی کش مکش دکھائی گئی تھی۔ اور مالکوں کے ظالمانہ برتاؤ، مزدوروں کی خراب حالت، ان کی بہو بیٹیوں کی غیر محفوظ حالت بڑی صفائی کیساتھ دکھائی گئی تھی۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ کہ اس فلم میں خود منشی صاحب نے پارٹ کیا تھا۔ پنچایت کے چودھری منشی صاحب ہی ہیں۔ لیکن افسوس کہ سینسر نے اس فلم کو برباد کر دیا۔ اس میں بہت کاٹ چھانٹ کی۔ موثر نظارے تمام نکال دئے اس طرح اس فلم کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔

دوسرا ڈرامہ "شیر دل عورت" ابھی تک زندہ ہے۔ لیکن منشی صاحب اپنی تصانیف کا یہ حشر دیکھکر مایوس ہو گئے اور ڈرامے لکھنا بند کر دیا۔ اس طرح ان کی ڈرامہ نگاری کا مختصر دور ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا (ان ڈراموں کے علاوہ ہندی میں بھی منشی صاحب نے دو ڈرامے "سنگرام" اور "پریم کی دیوی" لکھے تھے)

بحیثیت اخبار نویس:۔ ایک اچھے اور سایماندار اخبار نویس کے فرائض نہایت اہم ہوتے ہیں اور پھر ہندوستان جیسے غلام ملک میں تو اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اخبار نویس کی مختصر سی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ وہ سچا مصلح قوم، ایک سرفروش سپاہی، ایک مہربان استاد اور ایک بے خوف اور ہمدرد رہنما ہے۔

منشی صاحب نے اخبار نویس کے فرائض انجام دئے ہیں۔ ان کی اخبار نویسی غالباً رسالہ "زمانہ" سے شروع ہوتی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں وہ ہندی رسالہ "مریادا" کے ایڈیٹر سمپورنا نندجی تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں جیل چلے گئے تو اس کی ایڈیٹری کے فرائض منشی صاحب کے سپرد کئے گئے۔ انھوں نے ڈیڑھ سال تک اس خدمت کو بخوبی انجام دیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں مشہور ہندی رسالہ "مادھوری" کی ایڈیٹری ان کے سپرد کی گئی۔ اور انھوں نے اس خدمت کو بھی تین سال تک بخوبی انجام دیا۔ اس کے بعد خود ہی ۱۹۳۰ء میں بنارس سے ایک ماہوار رسالہ ہندی میں "ہنس" نامی جاری کیا۔ جو اب تک نکل رہا ہے ۱۹۳۲ء میں ایک "جاگرن" نامی ہندی ہفتہ وار اخبار کی ایڈیٹری بھی اپنے ذمے لی۔ دو ہی سال بعد یہ بوجہ نقصان بند کرنا پڑا لیکن دو سال تک یہ خوب چمکا۔

ہندوستان میں اردو ہندی کا جھگڑا ایک عرصہ سے چل رہا ہے۔ ہندی والے اس کوشش میں ہیں کہ ہندی ہی ہندوستان کی زبان ہے اور اُردو والے کہتے ہیں کہ اردو تو بنی ہی سب زبانوں کے میل سے ہے۔ اصل ہندوستانی تو یہی ہے چنانچہ بہت سے لوگ اس جھگڑے کو ختم کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ عام بول چال کی زبان جس میں نہ عربی فارسی کے مشکل الفاظ ہوں اور نہ سنسکرت کے کٹھن شبد ہوں۔ ایک صاف ستھری اور سادہ زبان ہونی چاہئے۔ جو واقعی ہندوستانی کہی جا سکے منشی صاحب اس خیال کے حامی تھے اور انھوں نے ہنس پرچہ اسی مقصد کے لئے جاری کیا جو ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب کو ہندوستانی زبان میں پیش کرے لیکن ان کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اردو والوں کو ہمیشہ یہی شکایت رہی ہے کہ ہنس کی زبان ابھی سنسکرت کے الفاظ سے پاک نہیں ہوئی ہے۔ پھر بھی منشی صاحب کی یہ کوشش قابلِ داد ہے۔

اخبار نویس کی حیثیت سے منشی صاحب نے ہماری قومی مجلسی زندگی کے ہر شعبہ میں بہت بیباکی سے حصہ لیا۔ اور انھوں نے سیاسی، مالی، معاشرتی غرضکہ ہر تحریک آزادی میں بے دھڑک حصہ لیا۔ اور برابر تمام مسائل پر آزادی سے لکھتے رہے۔ اس کی پروا نہ کی کہ انجام کیا ہوگا۔

منشی صاحب کی ادبی خدمات میں افسانوں، ناولوں، ڈراموں کے علاوہ چند متفرق کتابیں بھی ہیں اور ترجمے بھی کئے ہیں۔ زمانہ میں تنقیدی مضامین اور تبصرے بھی لکھے ہیں۔

"رام چرچا" بچوں کے لئے نہایت سلیس زبان میں لکھا ہے۔ اور دوسری درسی کتابوں میں باکمالوں کے درشن، جو کئی مضامین کا مجموعہ ہے شائع ہوا۔ اور کئی سال تک صوبوں کے مدرسوں میں رائج رہا۔ اور ابتدائی درجوں کے لئے ریڈریں تیار کیں غرضکہ منشی صاحب آخر دم تک ہندوستانی ادب کی خدمت کرتے رہے

خاتمہ: منشی صاحب ۱۹۲۱ء میں تحریک آزادی سے بہت متاثر ہوئے اور اپنے آپ کو وطن کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ اور اپنی تصانیف کے ذریعہ قوم کے مردہ دلوں میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔ افسانہ نگاری اور ناول نویسی میں ایک الگ کمال حاصل کر لیا لیکن یہ تمام افسانے اور ناول محض رونقِ محفل کے لئے نہیں لکھے گئے بلکہ ایک خاص مشن پیشِ نظر تھا ان کا مقصد یہ تھا۔

۱۔ حسن اعمال اور حسن اخلاق کو مجاز سے حقیقت کی طرف سے جانا اور اس طرح کے کرم اعمال کو دھرم یا ایمان سے ہم رشتہ کرنا۔

۲۔ معیار انسانیت کو کمال تک پہونچانے والے ارتقائی مدارج پر روشنی ڈالنا

۳۔ محبت وطن اور آزادی کے پیام سے مذہبی معاشرتی تعلیم بہم پہونچانا۔

منشی صاحب نے اس مقصد کو بڑے اچھے انداز سے پیش کیا ہے کہیں ویدانیت کی تعلیم کہیں بھگتی کی کہیں اخلاقیات کی کہیں علم النفس کی۔ کہیں رنگ نظرت کا غلبہ ہے کہیں حقیقت مجاز کا امتیازی پہلو کہیں یگانگت اور اتحاد کے گیت ہیں کہیں فرقہ وارانہ نوک جھونک ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے اردو ہندی کی چاشنی سے عجیب لطف پیدا ہو گیا ہے۔

پریم چند کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے دیہاتیوں، غریب گھرانوں اور اوسط طبقے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اپنی کتابوں میں جا بجا ان کی حالت کا نقشہ اس پر اثر انداز میں کھینچا ہے کہ پڑھتے وقت رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ بار بار ہندوستانیوں کو غیرت دلاتے ہیں کہ ہندوستان کی ۹۰ فیصدی آبادی کا کیا حال ہے۔ اس وقت جبکہ دنیا ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھ رہی ہے۔ ہندوستانی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس بے بسی اور بے کسی کے عالم میں پڑے سسکیاں لے رہے ہیں۔ کیا ساری دنیا کی مصیبت ہندوستانیوں کے حصہ میں آئی ہے۔ منشی جی کی کتابیں پڑھنے سے ہر شخص کو غیرت آتی ہے۔ اور اپنی زندگی سنوارنے اور آزادی حاصل کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔

متوسط طبقے کی طرز معاشرت کو مد نظر رکھتے ہوئے منشی صاحب قدامت پسند تھے لیکن لبرل خیال سے انھیں بیر نہ تھا۔ البتہ سیاسی اعتبار سے یہ انتہا پسند کانگریسی تھے۔ ان میں مذہبی رواداری بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کی تصانیف تعصب کے عیب سے پاک ہیں۔ ان کو متعصب کہنا سراسر غلطی ہے۔ ان میں شگفتگی بھی تھی اور کہیں کہیں ظرافت بھی ملتی ہے۔ ان کی تصانیف میں درد ہے سوز ہے دلکشی ہے انکا حساس دل جو کچھ محسوس کرتا تھا سیدھے سادے الفاظ میں ادا کر دیتے تھے

پریم چند ہمارے ادب کے رہنماؤں میں سے تھے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا اپنی زبان کے لئے

اپنے وطن کے لئے غریبوں اور کمزوروں کے لئے۔ انھوں نے نوجوانوں کو ایک راستہ دکھایا جس پر چل کر سینکڑوں نوجوان اپنا اور اپنی قوم کا بھلا کر سکتے ہیں۔ منشی صاحب کی مختصر الفاظ میں اس سے بہتر تعریف نہیں کی جا سکتی جو مولوی عبدالحق صاحب نے کی ہے ان کے خیال میں

"منشی صاحب نے ادب کو زندگی کا ترجمان بنایا۔ زندگی کو شہر کے تنگ گلی کوچوں میں نہیں بلکہ دیہات کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں جا کر دیکھا انھوں نے بے زبانوں کو زبان دی اور ان کی دلی میں بولنے کی کوشش کی"

پریم چند کے نزدیک اردو ایک کھونٹی تھی ادب کو لٹکانے کے لئے۔ وہ سماج کو بہتر اور برتر بنانا چاہتے تھے۔

پریم چند ہمارے ادب کے سرتاجوں میں تھے۔ وقتی مسائل کی اہمیت کو انھوں نے اس شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ فن کے معیار کو اس پر قربان کر دیا۔ افسانہ نگاری میں ان کا وہی مرتبہ ہے جو شاعری میں حالی کا۔ دونوں پیش رو تھے۔ دونوں پیغامبر تھے۔ دونوں بیداری کے نقیب تھے شخصی حیثیت سے بھی دونوں ایک دوسرے کے قریب تھے۔ سادگی کے رسیا۔ اخلاص کے پجاری۔ انھوں نے زندگی کا مرانی کا پیغام سنایا۔ اسی میں عمر گزاری سختیاں جھیلیں اور شہادت کے درجہ کو پہونچے۔

محمد اسمٰعیل خاں بی۔ اے (جامعہ)

لکھنویت کیا ہے؟

لکھنویت سے مراد شعر و ادب میں وہ خاص رنگ ہے جو لکھنؤ کے شعرائے متقدمین نے اختیار کیا اور جو اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر قدیم شاعری سے جدا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ متاخرین شعرائے لکھنؤ نے قدیم رنگ میں کچھ اصلاح کر کے ایک نیا اندازِ سخن گوئی کا پیدا کر لیا تھا لیکن وہ ردِ عمل کے طور پر واقع ہوا تھا۔ لکھنویوں کے اصلی رنگ کو دیکھنا ہو تو اس زمانہ پر نظر ڈالئے جب لکھنؤ کا شباب تھا۔ دولت کے دریا بہہ رہے تھے۔ آسمان سے ہُن برس رہا تھا دور دور سے با کمال اور اہلِ فن کھچے چلے آ رہے تھے اور لکھنؤ تھا کہ ہر ایک کے لئے اس کی آنکھیں فرشِ راہ تھیں۔ رفتہ رفتہ اودھ کی سرزمین فخرالبلاد ہو گئی۔ اس کا اندازہ ایک معاصر کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے۔

"صوبہ اودھ در اضلاع شمالی ہند واقع شدہ، اکثر طولش صد و سی کروہ و اکثر عرضش صد و بست حضارۂ آں مشحون شرفائے کرام و بداوۂ آں معمور بایلات و احتشام مقتدران ثغور اودھ را منزل اقوام یافتہ و بہائے سلطانیہ سلطان پور رنجہ پور رسا مر برتافتہ، قنادان پرتاب گڈھ و صفدر گنج در صناعت خویش ید طولیٰ و نسا جان ٹانڈہ و شاہ آباد تار و پود ے رسا وار مہ، گویندگان جیوارڈ و مغنیان ککباچ و سندرا کلیت بگو شمال و طوطیان ہند را تحریص بہ حکایت اعمال نمودہ، مرحومیعا میر علی صاحب تا آنکہ عارج ایں علم و تسلیم ایں معارج بودند استفادہ خویش ازیں جماعہ نقل می کردند علمائے فرنگی محل و سندیلہ کوس لمن الملک نواختہ و منطقیان سالی و کمنڈی نعرہ ہل من مبارز بلند ساختہ، مشائیہ خیرآباد در مسلک تحقیق قدم زدہ و اشراقیہ گوپامئو با صبح صادق دم زدہ، سر زمین بلگرام در مردم خیزی بہشت آدم می نماید و سر زمین مرزا پور و کنارہ خیزی پہلو بفلک سابع می ساید۔۔۔۔۔۔"[1]

ان ہی باکمالوں میں ایسے باکمال شاعر بھی تھے جن کے وجود پر ہندوستان کو ناز تھا اور جو اب تک گردشِ روزگار سے آوارہ وطن ہو کر بھٹکتے پھر رہے تھے ان میں سے جو یہاں آ گیا پھر مر کر اٹھا۔

---

[1] تاریخ عماد السعادت، سید غلام علی خان (۱۲۲۳ھ/۱۸۰۷ء) قلمی نسخہ موجودہ کتب خانہ علی [illegible] لائبریری [illegible] اسلام کلکشن نمبر [illegible]

لکھنؤ میں شاعری کی بزم قائم ہوئی تو اس سے بہت پہلے دو مجلسیں قائم ہو کر درہم برہم ہو چکی تھیں۔ پہلی بزم دکن کی تھی اور دوسری شمالی ہند کی۔

دلی میں شاعری کی باقاعدہ مجلس ولی کی آمد سے شروع ہوتی ہے اور اس وقت قائم رہی جب تک دلی دلی رہی، اس دبستان یا دور کے شعرا نے سب سے پہلے زبان کی صحت و صفائی کی طرف توجہ کی اور بڑی کوشش سے ایسے الفاظ اور روابط جو ثقیل اور نامانوس تھے اور جو متقدمین شعرائے دکن بلکہ ولی اور ان کے معاصرین تک کے کلام میں موجود تھے ان کو متروک قرار دیا لیکن ان متروکات کے پس پردہ کوئی عصبیت کام نہیں کر رہی تھی یہی وجہ ہے کہ ہندی کے بہت سے شیریں اور سبک الفاظ باقی رہ گئے اور بعض فارسی کے محاورات کا ترجمہ ہو گیا۔

جذبات کے ادا میں متقدمین شعرائے دلی نے خلوص اور صداقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کے شعر کی خوبی کا دارومدار لفظی گورکھ دھندوں پر نہیں بلکہ جذبات کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ ان کی شاعری داخلی اور قلبی ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کے ہاں روحانی مضامین اور وجدانی کیفیات کی کثرت ہے۔ حسن کے بیان میں حسن کے اثر کو بیان کیا ہے۔ خارجی متعلقات حسن کی بحث ان کے ہاں یکسر مفقود ہے۔ اور جن شعرا کے ہاں ہے بھی وہ نہ ہونے کے برابر ہے یعنی پوری کلیات میں اس مضمون کے دو چار شعر ہی نکلتے ہیں۔

مضمون کے علاوہ بیان میں بھی اس دبستان کی شاعری نے بڑا کمال پیدا کیا عشق و عاشقی، ہجر و وصال شکوہ و شکایات، حرف و حکایات کے جو مضمون ہمیشہ سے شاعر کہتے چلے آتے تھے انھیں اپنی زبان میں اس خوبی سے ادا کیا کہ ایک نیا لطف پیدا ہو گیا۔ ان کی بندشیں اگلی بندشوں سے زیادہ چست اور لطیف اور ان کے محاورے اگلے محاوروں سے زیادہ دلآویز ہیں۔

یہ البتہ ہوا کہ ان متقدمین شعرائے دلی نے دکن والوں کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ تشبیہ و استعارہ سے کام لیا ہے لیکن اعتدال کے دامن کو پھر بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے اور صنعت در صنعت تشبیہ در تشبیہ یا استعارہ در استعارہ کر کے اشعار کو پیچیدہ اور مغلق نہیں بنایا ہے۔

اپنی جدت طبع سے انھوں نے جذبات اور خیالات اور مضامین میں باریکیاں نکالیں، اور نزاکت و لطافت

کے پہلو کو زیادہ واضح اور روشن کیا لیکن تخیل کی پرواز میں انھوں نے کبھی حقیقت اور فطرت کو فراموش نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ سینکڑوں برس گزرنے پر بھی ان کا کلام ویسا ہی تر و تازہ ہے۔

شعر کے فن کے سلسلہ میں ان کی ایک بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ آزاد نے کسی موقع پر لکھا ہے کہ "دوہوں کے انداز نے جو ہندوستان کا سبزۂ خودرو تھا اردو کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دیا"۔ یہاں آزاد کا اشارہ ایہام اور ذومعنین کی طرف ہے۔ ہندی دوہوں میں بعض عجیب عجیب صنعتیں ہیں۔ اگر ایک طرف سے پڑھیے تو سیتا کی تعریف ہے اور دوسری جانب سے پڑھنا شروع کیجئے تو رام کی تعریف نکلتی ہے۔ اردو کے ابتدائی دکنی دور میں شاید زبان اس قابل نہ تھی کہ کسی صنعت کا بوجھ سنبھال سکتی یہی وجہ ہے کہ ولی کے عہد تک ان صنعتوں کا زیادہ زور نہیں رہا لیکن زبان میں قوت آتے ہی شاعروں نے اسی طرف توجہ کی اور شاہ مبارک آبرو اور ان کے معاصرین نے اسے بھی مستقل فن کی حیثیت بخشی۔

ان لوگوں نے اردو شاعری میں ایک نیا مضمون داخل کیا جو شعرائے دکن کے یہاں موجود نہیں یہ تصوف ہے۔ فارسی شاعری میں تصوف نے ایک خاص گداز اور کیفیت پیدا کر دی تھی۔ دکن میں چونکہ شاعری نے سلاطین کے زیر سایہ پرورش پائی اور دکنی سلاطین زیادہ تر اثنا عشری تھے اس لئے دکنی شعرا نے کبھی بھول کر بھی ان مضامین کی طرف رُخ نہیں کیا جس طرح سلاطین صفوی کے اثر سے ایران میں کچھ عرصہ کے لئے متصوفانہ شعر و ادب کی ترقی رک گئی تھی اسی طرح سلاطین عادل شاہی و قطب شاہی کے عہد میں شعر و ادب کا سرمایہ ان خیالات سے خالی رہا سب سے پہلے سراج نے اور پھر درد نے اس طرف توجہ کی۔ تصوف کی جگہ دکن میں شاعری میں مرثیہ گوئی شروع ہوئی تھی لیکن اسے بھی بحیثیت فن دکن میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ سب سے پہلے سودا نے مرثیہ کو مسدس میں لکھ کر وسعت پیدا کی۔

متاخرین شعرائے دلی کا رنگ متقدمین سے مختلف تھا۔ اپنے مذاق کے مطابق انھوں نے بھی زبان میں تراش خراش کی اور محاورہ کو ایسا درست کیا کہ اب تک اس میں بہت کم فرق آیا ہے لیکن ان کے خیالات بھٹکنے لگے اور جذبات عشق میں عشق حقیقی اور پاک و بے لوث الفت کے خیالات ترک کر کے ہوس پرستی کے جذبات نظم کرنے لگے۔ جرأت، انشا اور رنگین نے اس گندہ ذہنی کی ابتدا کی اور چونکہ یہی شعرا اگلے دور میں نمونہ بنے اس لئے جو زہر ان لوگوں نے اگلا تھا وہ تھوڑے ہی عرصہ میں شعر و ادب کے سارے جسم میں سرایت کر گیا۔ ان ہی لوگوں نے ایجاد سے ریختہ کے ساتھ ریختی کو بھی ترقی بخشی۔ ریختی دو قدیم دکنی شاعروں نے بھی لکھی ہے لیکن یہ ہندی شاعری کا نمونہ ہیں۔ ان میں وہ بے حیائی اور بد مذاقی نہیں جو رنگین اور انشا سے شروع ہوئی اور لکھنؤ پہونچ کر فن بن گئی۔

دلّی کی سلطنت کی بنیادوں کو عرصہ ہوا گھن لگ چکا تھا لیکن اب تک پوری عمارت بظاہر اسی شان و شوکت سے کھڑی تھی کہ یکا یک ملک میں چاروں طرف سے طوفان اٹھا، ایک طرف مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر دور دراز صوبوں میں آئے دن شورش ہونے لگی۔ پنجاب میں جاٹوں نے، دکن میں مرہٹوں ادھر روہیلوں نے اپنی یورشوں سے اس عمارت کو ہلا دیا۔ لوگوں پر خواب و خور حرام ہوا۔ دربار برہم ہونے لگے تو درباری کہاں رہتے۔ یہ لوگ بھی کسی اور کا دامن تلاش کرنے لگے۔ کچھ لوگ مرشد آباد اور عظیم آباد کا قصد کرکے اٹھے اور جا پہونچے، کچھ حیدر آباد گئے لیکن یہ ان کا کام تھا جن کی ہمت جوان تھی اور اعضا اتنے دور دراز کے سفر کے مصائب برداشت کر سکتے تھے اس لئے یہی ہوا کہ شاعروں کی زیادہ تعداد فرخ آباد یا پھر فیض آباد میں جا بسی۔ فرخ آباد کی اسلامی ریاست بھی تھوڑے ہی دن ان لوگوں کا ساتھ دے سکی اور پھر صرف ایک مرکز فیض آباد یا اس کے بعد لکھنؤ رہ گیا جہاں ان لوگوں کو پناہ مل سکتی تھی۔ ان ہی مہاجرین کے اثر سے اُردو شاعری کی تیسری محفل اودھ کی سرزمین پر قائم ہوئی جس کے تقدس پر آج تک ہندو دیومالا کی داستانیں اپنی مہریں ثبت کر رہی ہیں۔ یہی دبستان شاعری لکھنؤ کا دبستان شعر ہے۔ جو اپنی گوناگوں خصوصیات کے اعتبار سے مذکورۃ الصدر دونوں دبستانوں سے ممتاز اور علیحدہ ہے۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے

نواب سعادت خاں برہان الملک امین الدین نیشاپوری کو ان کی خدمات کے صلہ میں اودھ کی صوبہ داری عطا ہوئی تھی لیکن برہان الملک نے دلی کے دربار کا نقشہ دیکھ کر پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ اگر اپنے صوبہ کی خیر منظور ہے تو اپنا ہی بھروسہ کرنا پڑے گا، اور اسی لئے رفتہ رفتہ وہ اور ان کے جانشین دلی کے بادشاہ سے آزاد ہوتے گئے۔ اگرچہ عرصہ تک فرمانروایان اودھ نے نواب وزیر کے لقب پر قناعت کی اور دلی کے شطرنجی بادشاہ ہر نئے وزیر کے لئے خلعت اور خطاب بھیجا کرتا تھا۔ لیکن انگریزوں نے بعض سیاسی مصالح کی بنا پر یہی بہتر سمجھا کہ نواب غازی الدین حیدر تاج شاہی زیب سر فرمائیں۔ اس دن سے گویا لکھنؤ کا دربار شاہی دربار ہوگیا اور دلی کا مقابلہ کرنے لگا۔ ایک مصنف جس نے یہ زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے

> اپنے گھر سے جب نکلا تو چلتے چلتے نخاس پر پہونچا۔ یہ مقام شہر کے مغربی دروازے سے چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں دیکھا تو ایک بازار لگا ہوا تھا اور خرید و فروخت کی گرم بازاری

تھی۔ انواع و اقسام کے کھانے، مٹھائیاں، کباب، پراٹھے، نان خطائیاں، شربت اور فالودے والے ہر طرف نظر آتے تھے اور سارا گیر خریداری میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے اور کثرت ہجوم میں ایک دوسرے پر گرتے پڑتے یہ ہنگامہ اور رونق دیکھ کر خیال گذرا کہ میں شہر میں داخل ہو گیا ہوں اور خاص چوک میں ہوں لیکن کسی نے مجھے بتایا کہ ابھی تو میں شہر پناہ کے دروازے میں بھی داخل نہیں ہوا تھا۔ آخر کار میں شہر میں پہونچا۔ ہر جگہ ناچنے اور گانے والوں کے طائفے دیکھے جنھیں دیکھ کر اور سن کر میری عقل دنگ رہ گئی۔ صبح سے شام تک اور غروب آفتاب سے طلوع آفتاب تک نوبتوں کے ڈھولوں اور باجوں کی مسلسل صدائیں آتی رہتی تھیں گاڑیوں کی صداؤں سے کان بہرے ہوئے جاتے تھے، گھوڑے، ہاتھی، اونٹ، خچر شکاری کتے، بیل اور بیل گاڑیاں اور توپیں لے جانے والی باربرداری کی گاڑیوں کی قطاریں کی قطاریں سڑکوں پر چلتی رہتی تھیں۔ لباس فاخرہ پہنے شرفائے دہلی کے اعزا اور رشتہ دار، یونانی اطبا، ہر طرح کے گانے بجانے والے۔ قوال، بھانڈ اور طوائفیں ہر طرف دکھائی دیتی تھیں اور سب اپنی اپنی زندگی عیش و آرام میں بسر کر رہے تھے۔ چھوٹے اور بڑے سب کی جیبیں زر و جواہر سے بھری ہوئی تھیں۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی مفلسی اور فلاکت کا خیال نہیں گزرتا تھا۔ نواب وزیر شہر کی آبادی اور رونق میں کوشاں تھے معلوم ہوتا تھا کہ فیض آباد دلی کی ہمسری کا دعویٰ کرے گا۔[1]

اسی مصنف کا کہنا ہے کہ اگر کچھ برس اور فیض آباد کی آبادی کو گزرتے تو ایک دوسرا شاہجہاں آباد وجود میں آجاتا لیکن نواب شجاع الدولہ نے فیض آباد کو اجاڑ کر لکھنؤ کو بسایا۔ اہل فضل و کمال کا جو سیلاب اب تک فیض آباد کی طرف آ رہا تھا لکھنؤ کی طرف امنڈ پڑا۔ فیض آباد میں بھی شعرائے دلی میں سے آرزو اور ضاحک آ چکے تھے۔ لکھنؤ دارالسلطنت ہوا تو ضاحک کے بیٹے میر حسن اور ان کے پوتے میر مستحسن خلیق بھی آ گئے۔ میر سوز بہ

---

[1] تاریخ فرح بخش از فیض بخش کاکوروی، قلمی نسخہ موجودہ لٹن لائبریری علی گڑھ۔ و انگریزی ترجمہ تاریخ فیض آباد مصنفہ ولیم ہوئی ایم۔ اے۔ ڈی لٹ مطبوعہ گورنمنٹ پریس صوبہ شمالی و مغربی ۱۸۸۸ء صفحہ ۱۴

مرزا فیح سودا، میر تقی میر، غلام ہمدانی مصحفی، میر انشاء اللہ خاں انشا، شیخ قلندر بخش جرأت بھی آ گئے۔ پرانے شاعر تو مر کھپ گئے البتہ نوجوانوں نے میدان خالی پاکر اپنا رنگ کھل کر کھیلا دلی کی شاعری اپنے دور آخر میں جس رنگ میں انشا، رنگین اور جرأت کی بدولت رنگ رہی تھی وہاں سے لکھنؤ کی شاعری کی ابتدا ہوئی اور چونکہ بنیاد کج تھی اس لئے عمارت آخر تک کج ہی چلی گئی۔

لکھنؤ کی شاعری پر سب سے پہلا اثر لکھنؤ کی معاشرت کا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جسے سحر نے اپنے ان الفاظ میں بیان کیا ہے[1]

خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو ہر اک گھر خانۂ شادی ہے ہر اک کوچہ ہے عشرت کا۔

اسی دولت کی فضا نے تعیش اور آزادی کی راہ دکھائی، تماش بینی پر لوگ فخر کرنے لگے۔ شجاع الدولہ کے متعلق فیض بخش نے آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے کہ انھیں فطرتاً عورتوں کی صحبت پسند تھی۔ لہذا بازاری عورتیں اور ان کے گانے والے طائفے اس قدر کثرت سے تھے کہ کوئی محلہ یا کوچہ ایسا نہ تھا جہاں وہ موجود نہ ہوں اور مالی اعتبار سے ان کی حالت ایسی اچھی تھی کہ ان میں اکثر رنڈیاں ڈیرہ دار تھیں اور ان کے ساتھ دو دو تین تین خیمے رہا کرتے تھے۔ نواب وزیر جب اضلاع کا دورہ کرتے تھے تو ان کے ڈیرے بھی نواب وزیر کے ڈیروں کے ساتھ چلا کرتے تھے۔ اور دس بارہ تلنگے ان کی حفاظت کے لئے ساتھ ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے فوجی حکام اور امرا بھی علانیہ بلا خوف رسوائی اپنے آقا کی نقل کرتے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جذبات میں جو شرافت، تہذیب، متانت اور شائستگی دلی کی عام سوسائٹی کا عام قاعدہ تھا۔ ان کی جگہ لکھنؤ میں رکاکت و ابتذال، ہوسناکی اور فحاشی نے لے لی اور اس میں دو ایک مستثنیات کے علاوہ سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ گویا یہ ایک حمام تھا جس میں سب ننگے ہی ننگے جمع تھے۔ چنانچہ یہاں کا ابتدائی شعر و ادب کا سرمایہ بھی اسی میلان کا آئینہ دار ہے۔ جذبات کی وہ پاکیزگی جو دہلوی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے یہاں مفقود ہے۔ اس کی جگہ ایک نیا فن ہے جسے معاملہ بندی کا نام دیا گیا ہے یہ صحیح ہے کہ اس فن میں جرأت بہت زیادہ نام آور ہوئے اور وہ دلی سے آئے تھے لیکن ان کے

---

[1] گل رعنا صفحہ ۲۲۳ ۔

مذاق کی تسکین میں لکھنؤ کی فضا کو بڑا دخل ہے جس کے ماحول نے انھیں اس بات کا موقع بخشا کہ وہ اپنے فطری جذبات اور میلانات کو نظم کریں اور ملک سے خراج تحسین حاصل کریں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں

کل واقف راز اپنے سے وہ کہتا تھا یہ بات   جرأت کے یہاں رات جو مہمان گئے ہم
کیا جانئے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر   جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

چنانچہ ان شاعروں کی گل افشانی دیکھئے جن پر لکھنؤ کو ناز ہے۔

رات کو چوری چھپے پہونچا جو میں   غل مچایا اس نے دوڑو چور ہے   (ناسخ)
کھولئے شوق سے بند انگیا کے   لیٹ کے ساتھ نہ شرمائیے آپ   (رند)
ہاتھ میں انگیا کی چڑیا آگئی   آج ہم عنقا کو لائے دام میں   (مسیح)
تیرے پستاں پہ نظر آتا ہے عالم نور کا   اے پری روشن ہے گویا قمقمہ بلور کا   "
کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت   ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی رات کے وقت   (انشا)
مستی میں میں لگا ہی چکا تھا اسے گلے   بھاگا جو پاؤں ہاتھ کہے سے نکل گیا   (امانت)

اس معاملہ بندی کے ساتھ قدرتی طور پر شاعری کی ہر صنف میں رکاکت اور ابتذال سرایت کر گئے۔ اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو اگر ایک طرف انیس اور دوسری طرف دبیر و محسن نہ روکتے تو نہ معلوم یہ لکھنؤ شعر و ادب کو خس خاشاک کی طرح بہا کر کہاں لے جاتا۔ لیکن ان دونوں کا رنگ لکھنؤ میں منفرد اور لکھنؤ کے عام طرز سے جدا ہے۔ لکھنؤ کا عام رنگ وہی تھا جس کی بحث اوپر آ چکی۔

اسی سلسلہ میں نسائیت کا عنصر بھی شعر و ادب کی تعمیر میں شامل ہو گیا۔ ہندی شاعری میں جذبات کی آگ کو دہکانے کے لئے عشق کا اظہار عورت کی طرف سے کرایا گیا ہے اور قدرتی طور پر زبان اور خیالات عورتوں کے نظم ہوئے ہیں۔ اسی کی تقلید میں متقدمین شعرائے اردو نے اپنی داستان عشق صنف نازک کی آڑ لے کر ان کی زبان میں بیان کی ہے۔ افضل جھنجھانوی (المتوفی ۱۰۳۵ھ) کا مشہور بارہ ماسہ اس قبیل کی بہترین مثال ہے۔ شجاع الدولہ کے عہد سے حسین اور مہ جبین عورتوں کو سوسائٹی میں بڑا دخل ہوا اور عیش و عشرت

---

[1] ملاحظہ ہوں گل رعنا صفحہ ۲۰۰۔ امانت کی غزل گوئی پر ایک مقالہ از راقم السطور مطبوعہ جامعہ جنوری ۱۹۳۱ء۔

اور فراغت نے عورتانہ جذبات اور خیالات کو کمزور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں کے جذبات، خیالات اور زبان پر نسائیت غالب آ گئی۔ بعض مسخروں نے ریختہ کے جواب میں ریختی کو ترقی دے کر رواج دیا اور اس میں اپنی بیہودگی کی داستانیں بے شرمی سے نظم کیں۔ ریختی کے ان نمونوں میں لکھنؤ کی جن عورتوں کے جذبات ان کی زبان میں ان گندہ ذہن شاعروں نے نظم کئے ہیں وہ لکھنؤ کی سوسائٹی پر ہمیشہ بدنما داغ بن کر رہیں گے۔

نسائیت کا اثر صرف ریختی کی صورت میں ہی ظاہر نہیں ہوا۔ عام خیالات، جذبات زبان اور محاورہ میں نسائیت آ گئی۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ فرہنگ آصفیہ میں جو اردو کی ایک مستند لغت ہے۔ جہاں کسی خاص محاورہ کو بیان کیا ہے تو جان صاحب یا کسی ایسے شاعر کا کلام سند میں پیش کیا ہے جو عورتوں کے جذبات ان کی زبان میں ادا کرتے ہیں۔

اسی لکھنوی فضا کا ایک اہم رُخ آزادی تھا۔ نواب وزیر نے دلی کے دربار سے آزادی کیا حاصل کی کہ لکھنؤ والوں نے ہر شے میں خود کو آزاد کر لیا۔ تہذیب و تمدن اور معاشرت کے نئے اصول مدون ہوئے لباس وضع قطع میں نئی نئی تراشیں اور خراشیں ہوئیں۔

آداب مجلس اور گفتگو میں فرق قائم ہوا چنانچہ ادیب اور شاعر بھی شاعری کے مروجہ اور مستعملہ اصولوں اور اسالیب سے انحراف کر لے گئے۔ وہاں شاعری جذباتی اور داخلی تھی تو یہاں لفظی اور خارجی ہو گئی۔ وہاں عین عالم فطرت تھا تو یہاں کمال صنعت معیار ٹھہرا۔ وہاں سادگی اور برجستگی تھی تو یہاں تکلف اور تصنع کو دخل ہوا۔ زبان میں ایسی تراش خراش کی اور اس کے اصول منضبط کئے جو اس سے پہلے موجود نہ تھے۔

اس آزادی کا تاریک پہلو تو یہ تھا کہ اثر جو متقدمین شعرائے دکن و دلی کے کلام کو ممتاز کرتا ہے رفتہ رفتہ کم ہونے لگا لیکن ایک پہلو روشن بھی تھا اور یہ صفائی زبان کا ہے اس سلسلہ میں جو کوششیں شعرائے دلی نے کی تھیں حضرات لکھنؤ نے انھیں جاری رکھا بلکہ انھیں ایک خاص صورت بخشی۔ مثلاً تذکیر و تانیث کے اصول باقاعدہ طور پر منضبط نہیں ہوئے تھے ناسخ نے بڑی کاوش سے انھیں مرتب کیا اور بہ خود سختی سے ان کی پابندی کی زبان کی صفائی کے سلسلہ میں لکھنؤ کا کارنامہ اردو کی تاریخ میں یقیناً زرین حروف سے لکھا جائے گا۔ اس کا اعتراف خود دلی والوں نے کیا ہے چنانچہ شاہ نصیر کو دلی والے اپنا ناسخ کہتے تھے اور غالب نے بھی اس مصرعہ کو سن کر۔

ع نہاتا ہے وہ سہ دریا میں کپڑے ہو رد ہوتی ہے

کہا تھا کہ مضمون دلی کا اور زبان لکھنؤ کی خوب ہے۔ اصلاح زبان کے سلسلہ میں اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

آزادی کے علاوہ لکھنؤ کی فضا کا ایک اہم ترین عنصر تکلف تھا۔ ان کے تمدن کی بنیاد ہی تصنع، تکلف اور بناوٹ پر رکھی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک لکھنوی حضرات اپنے تکلف کے لئے ضرب المثل ہیں۔ شعر و ادب میں بھی تکلف، ان کے ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کی ایک مثال رجب علی بیگ سرور کے فسانہ عجائب سے ملتی ہے۔ سرور نے اگرچہ اس کی معذرت کی ہے کہ ان کی کتاب کو میر امن کی باغ و بہار کا جواب نہ سمجھا جائے لیکن اس کو کیا کیجئے کہ خود ان کے بیان سے یہی مترشح ہوتا ہے۔ میر امن نے اپنا قصہ سادگی و سلاست سے بیان کیا ہے جسے سرور، محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑنا کہتے ہیں، سرور کی عبارت نہایت پر تکلف اور بے شمار صنائع لفظی و معنوی سے گرانبار ہے۔ یہی حال شعر کا ہے لکھنوی شعرائے شعر کے ظاہری پیکر پر زیادہ توجہ کی ہے اور اس اعتبار سے ان کے اشعار نہایت مرصع اور آبدار ہیں۔ اگر کسی کو صرف زبان کا لطف اٹھانا ہے تو وہ ایسے لکھنوی شاعروں کا کلام پڑھیں جنہوں نے مروجہ مشکل پسندی سے اپنے دامن کو بچا کر عام خیالات کو اپنی زبان میں ادا کیا ہے۔

اس حیثیت سے ان کی تمام شاعری ایک جمالیاتی نظریہ کے تحت میں ہے یہ جمالیاتی نظریہ صنعتگری کا ہے اور ہر فن کی تاریخ میں اس کا ایک دور ضرور آتا ہے۔ اس عہد کو آپ چاہیں تو انتہائی کمال سمجھ سکتے ہیں، اور یہی ابتدائے زوال ہے۔ ہر فن کی ابتدا فطری ہوتی ہے۔ موسیقی میں پہلے پہل گانے والوں نے قدرتی آوازوں کے زیر و بم کی نقل کی اور اس کے دقیق اصول اور قانون وضع ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ آج موسیقی میں کمال پیدا کرنے کے لئے اس کی باقاعدہ تحصیل ضروری ہے۔ یہی کیفیت رقص کی ہے۔ قوموں کے ساتھ ساتھ ان کے رقص بھی صنعت کا نمونہ بنتے چلے جاتے ہیں ورنہ ان قوموں کا رقص دیکھئے جو اب تک جدید تہذیب و معاشرت کی روشنی سے آگاہ نہیں ہوئے ہیں ان میں ایک فطری سادگی موجود ہے۔

یہی حال شاعری کا ہے۔ ہماری شاعری کا اصلی سرچشمہ عربی شاعری ہے۔ ایران والوں نے اپنے مرصع تمدن سے عربوں کی سادہ شاعری پر ایک انقلابی اثر ڈالا جو عربوں کے فتح ایران کے بعد شروع ہوتا ہے۔

اور بقول ایک ناقد کے سادگی اصلیت اور جوش ہی شعر کے عناصر ثلاثہ ہیں۔ عربوں کی شاعری لفظی صنائع اور بدائع سے بہت کم گراں بار ہے۔ ان کے ہاں تشبیہ اور استعارات کا رواج ہے لیکن ان کی تشبیہات اور استعارات سریع الفہم اور سادہ ہیں۔ ان کے اشعار کو پڑھ کر دل پر اثر ہوتا ہے۔ دماغ شعر کے معمہ کو حل کرنے میں نہیں الجھتا۔

لیکن ایرانیوں نے عربوں سے مل کر ان کے شعر و ادب پر ردعمل کیا اور یہی وجہ ہے ایرانی اسلامی شاعری میں صنعتگری کی ابتدا ہوئی اور جس زمانہ میں اردو شاعری کا ظہور ہوا۔ اس وقت فارسی شعرگوئی کا فن صنعتگری کے دور سے گزر رہا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے فارسی گو شعرا نے جن میں امیر خسرو اور بیدل جیسے عظیم المرتبت شاعر بھی شامل ہیں شاعری میں باوجود اپنی جدت طبع کے اس نظریہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اردو شاعری اس وقت بچپن کی حالت میں تھی اور اس صنعتگری کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ اردو ایک بچہ تھی جس کی زبان ابھی صاف نہیں ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ متقدمین شعرائے دکن کی شاعری جذباتی اور فطری ہے۔ متقدمین شعرائے دہلی نے جن کے ہاں ولی کی آمد کے وقت بیدل کی فارسی شاعری کا انداز مقبول تھا۔ شعرگوئی شروع کی تو ایہام گوئی اور تجنیس سے شروع کی۔ دلی والوں نے پہلے پہل خود اس کے خلاف جدوجہد کی خصوصاً مرزا مظہر جانجاناں جو اس اصلاح کے امام کہے جا سکتے ہیں۔

اس کے بعد شاعری لکھنؤ پہونچی۔ یہاں تہذیب و تمدن پر تکلف اور تصنع کا رنگ چڑھ ہی رہا تھا ادھر زبان میں وسعت پیدا ہوچکی تھی۔ اس لئے شاعری جدید رنگ میں پیش کرنے کی اس سے بہتر اور کوئی صورت ممکن نہیں تھی کہ اسے صنعتگری بنا دیا جائے۔

(باقی آئندہ)

ابواللیث صاحب صدیقی ایم۔ اے (علیگ)

نثر اُردو کی تدریجی ترقی

گذشتہ سے پیوستہ

چوتھا دور

کلکتہ کا ادبی دور

یعنی

فورٹ ولیم کالج کی نثر

سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۸۲۰ء

اب تک نثر اردو کے تین دوروں سے بحث کی گئی اور ہم نے دیکھا کہ کس طرح رفتہ رفتہ اُردو نثر تدریجی ترقی کرتی ہوئی منازل ارتقا طے کر رہی ہے۔ پہلے اور دوسرے دوروں کے اوائل میں اگر وہ صرف روزمرہ کی بول چال اور عام گفتگو یا سیدھے سادے مذہبی مسائل واحکامات بیان کرنے کی اہلیت رکھتی تھی تو دوسرے دور کے آخر آخر اور تیسرے دور میں وہ اس منزل سے گذر کر تخیلی اور زیادہ وسیع مباحث کے اظہار کا ذریعہ بن گئی اور عربی فارسی الفاظ کے کثرت استعمال سے اس کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ ہوگیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلوب بیان، طرز ادا، تکلف تصنع اور آورد پر مبنی ہوتا گیا اور وہ پرانی ابتدائی سادگی، خوبصورتی اور بے ساختہ پن ایک ایک کرکے رخصت ہوتے گئے۔ جیسا کہ ہم تفصیلی طور پر مندرجہ بالا بحث میں دیکھ چکے۔

نثر اردو کی تاریخ میں وہ دن مبارک تھا جب فورٹ ولیم کالج کی بنیاد پڑی اور اس کے ذریعہ زبان کو ترقی دینے کی منظم کوششیں شروع ہوئیں یہ دن اس لئے اور بھی مبارک تھا کہ اس دن سے اردو میں جو تصنع آمیز اور دقیق رنگ مقبول تھا اس کی جگہ سیدھا سادہ اور آسان اسلوب بیان اور طرز تحریر پیدا کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔

اس کالج نے نثر اردو کی عمارت کی نیو کس طرح ڈالی؟ اور نثر نویسی کی کیسی اساسی تحریک کی؟ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد اردو زبان میں تصنیف و تالیف کے لئے وسیع میدان کھل گیا اور اردو زبان کی شاندار عمارت اٹھنے لگی۔ فورٹ ولیم کالج کے قائم کرنے والے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے انگریز تھے جو ہندوستانی زبان و ادب سے ناآشنا تھے۔ انگریز جو پہلے سے ہندوستان کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر مغلیہ سلطنت کو مال مفت سمجھ چکے تھے اب حکومت کے خواب دیکھ رہے تھے لیکن ملک کی زبان ان کی ذہنیت اور ان کے رجحانات سے واقفیت حاصل کرنا بھی ضروری تھا اور یہ کام ڈاکٹر گلکرسٹ نے انجام دیا۔

انگریزوں کو اردو سے واقف کرانا اس ادارہ کا اولین مقصد تھا اس کام کے لئے ضروری تھا کہ ایسے اصحاب منتخب کئے جائیں جو زبان اُردو کے مستند صاحب طرز ہوں اور ملک کے مختلف حصوں کی بولیوں سے واقفیت تامہ رکھتے ہوں۔ دوسرے یہ کہ جس زبان میں تصنیف کریں وہ آسان اور سریع الفہم ہو۔ ایسی اردو جو خود ہندوستان والوں کی سمجھ میں نہ آئے انگریزوں کے لئے اس کا سیکھنا ناممکن بھی تھا اور بیکار بھی چنانچہ اسی مقصد کو سامنے رکھکر فورٹ ولیم کالج کی تمام تصانیف سہل اور سادہ زبان میں لکھی گئی ہیں۔

جو خدمات زبان اردو کی اس ادارہ نے انجام دیں وہ حقیقتاً اردو کے حق میں اکسیر ثابت ہوئیں۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے سب سے پہلے اُردو کا اس قسم کا دارالتصنیف قائم کیا جس کی ضرورت اس کے بعد خود اہل زبان کو محسوس ہوئی جس قسم کا ادبی حلقہ سرسید نے اپنی کوششوں سے بعد میں سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے قائم کیا وہ اس ادبی حلقہ کا نقش ثانی تھا جو سب سے پہلے کلکتہ میں ڈاکٹر گلکرسٹ کی سرپرستی میں قائم ہوا تھا اور جس کی منظم کوششوں سے اردو زبان میں تصنیف و تالیف کے لئے وسیع ترین میدان کھل گیا۔

<u>چوتھے دور کی تصانیف</u> اس دور کے مشہور مصنفین میں میر امن، شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، بہادر علی حسینی، حفیظ الدین احمد، نہال چند لاہوری، اکرام علی، امانت اللہ، مرزا لطف علی اور للو لال جی ہیں۔ یہ سب اردو زبان کے مشہور صاحب طرز استاد گذرے ہیں۔ ان کی تصانیف میں باغ و بہار، گنج خوبی، مذہب عشق، آرائش محفل، نثر بے نظیر، اخلاق ہندی، خرد افروز اور باغ اردو بہت مشہور ہیں لیکن فورٹ ولیم کالج کے نثر نویسوں میں سے میر امن

خاص طور پر مقبول ہوئے ہیں (۱) میر امن (۲) میر شیر علی افسوس (۳) حیدر بخش حیدری۔ ان میں سے بھی سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت صرف میر امن کے حصہ میں آئی ہے۔ ان کی " باغ و بہار" خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ ان کی دوسری تالیف "گنج خوبی" ہے لیکن اس کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی

"باغ و بہار" کی ابتدا میں میر امن فورٹ ولیم کالج کی سرپرستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"صاحبان ذیشان کو شوق ہوا کہ اردو زبان سے واقف ہو کر ہندوستانیوں سے گفتگو اور گفت و شنید کریں اور ملک کے کام کو بخوبی انجام دیں۔ اس واسطے کتنی کتابیں اس سال بموجب فرمائش کے تصنیف ہوئیں۔"

میر امن کی عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو، باغ و بہار، کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جو صاحب دانا اور ہندوستان کی زبان بولنے والے ہیں ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ یہ قصہ چہار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا جو ان کے پیر تھے اور درگاہ ان کی دلی میں قلعہ سے تین کوس لال دروازہ کے باہر مٹیا دروازہ کے آگے لال بنگلے کے پاس ہے۔ آپ کی طبیعت ماندی ہوئی تب مرشد کا دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو رحمہ اللہ یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور تیمارداری میں حاضر رہتے۔

میر امن کا طرز انشا جہاں تک طرز انشا کا تعلق ہے پہلے دور اور اس دور کے طرز انشا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پرانی روش کے مطابق وہ عبارت جو مقفیٰ اور مسجع نہ ہو پھیکی اور غیر معیاری بھی جاتی تھی یہ دور اس تکلف اور تصنع سے بری ہے اور خصوصاً میر امن اپنی اس صفت میں اپنے تمام ہمعصروں سے بہت ممتاز ہیں۔ ان کی عبارت کو تو تصنع اور تکلف کہیں سے چھو بھی نہیں گیا جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ۔

"میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے"

بالکل واقعہ ہے کہ باغ و بہار کے صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے لیکن تکلف اور آورد کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ملے گا یہ معلوم ہوتا ہے کہ بغیر کسی کوشش کے مصنف کے قلم سے فقرے خود بخود ٹپک پڑے لکھنے والے نے اپنی طبیعت پر زور ڈال کر کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔ ان ہی وجوہ سے باغ و بہار کو اعتبار زبان اس وقت

کی نہایت سلیس سادہ شیریں اور فصیح کتاب سمجھنا چاہئے۔ میرامن اسے معیاری اُردو کہتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"اب نئے سرے سے زبان کو رونق ہوئی نہیں تو اپنی دستار و رفتار کو کوئی بُرا نہیں جانتا۔ ایک گنوار سے پوچھئے تو شہر والے کو نام رکھتا ہے اور اپنے تئیں سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ خیر عاقلاں خود می دانند، بہت ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کو دلّی میں گئے اور رہے وہ بھی کہاں تک بول سکیں گے کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں گے۔ جو شخص سب آفتیں سہکر دلّی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گذریں اور اس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے، عرس چھڑیاں سیر تماشا اور کوچہ گردی اس شہر کی مدت تلک کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا یہاں تک پہونچا ہے"

میر آمن خاص دلّی کے رہنے والے تھے۔ ان کی زبان وہاں کی ٹھیٹھ روزمرہ اور ٹکسالی زبان ہے۔ اسی لئے وہ سند ہے یہ زبان سوا سو برس پہلے کی زبان کا نمونہ ہے۔ گو آج کی زبان سے کچھ فرق بھی پایا جاتا ہے مگر بہت کچھ ہماری اس وقت کی زبان سے ملتی جلتی ہے یہی وجہ اس کتاب کی مقبولیت کی ہے۔ اس کا اسلوب بیان سادہ اور عبارت سلجھی ہوئی ہے۔ فارسی کے جو الفاظ اور ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں وہ اس خوبی سے اُردو میں کھپا دی گئی ہیں کہ بدزیب ہونے کے بجائے ان سے زبان کا حسن اور بھی بڑھ گیا ہے لیکن عربی اور فارسی کے موٹے اور ثقیل الفاظ اور ترکیبیں ان کی عبارت میں ناپید ہیں۔ جگہ جگہ ہندی الفاظ بڑی خوبصورتی سے استعمال کئے گئے ہیں اس کے علاوہ سادگی اور بے ساختہ پن عبارت کی جان ہے جس میں وہ رنگینی اور شیرینی بیان ہے جو بہتر سے بہتر مقفیٰ مرصع، مسجع عبارتوں میں نہیں ملتی اور یہی میر آمن کی طرز انشا کی ہمارے خیال میں سب سے بڑی خوبی ہے۔

جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے میر آمن نے فصاحت کے ہر پہلو کو مد نظر رکھا ہے۔ ہر عبارت موقع و محل کی مناسبت سے ہے۔ وہ محاورں اور روزمرہ کے آگے قواعد زبان کی پابندی کی پروا نہیں کرتے وہ بول چال کی زبان کو ہر دوسری چیز پر ترجیح دیتے ہیں۔ انھیں کسی واقعہ کا نقشہ کھینچنے اور اس کو اس طرح پیش کرنے

میں خاص کمال ہے کہ اصل سماں آنکھوں کے سامنے پھر جائے منظر کشی بھی خوب کرتے ہیں۔ اور اس کی ابتدا امیر امّن سنے کی ہے جس کو عصر حاضر کے اردو ناول نگاروں نے ترقی دی مثلاً ایک جگہ منظر کشی اس طرح کرتے ہیں۔

"ایک روز بہار کے موسم میں مکان بھی دلچسپ تھا۔ بدلی گھمنڈ رہی تھی۔ بوندیاں پڑ رہی تھیں بجلی بھی کوندرہی تھی اور ہوا نرم نرم آتی تھی۔ غرض عجیب کیفیت اس دم تھی۔ جوں ہی رنگ برنگ کے حباب اور گلاب کی گلابیاں طاقوں پر چنی ہوئی نظر آئیں دل للچایا کہ ایک گھونٹ پی لوں جب دو تین پیالوں کی نوبت پہونچی وہیں مجھ کو خیال ہوا کہ اس باغ نوخرید کو دیکھوں کمال شوق سے باغ کی سیر کرنی چاہی .... یہ روشنی کا ٹھاٹھ تھا کہ جا بجا قمقمے، سرو چراغاں، کنول فانوس خیالی، شمع مجلس حیران اور فانوسیں روشن تھیں کہ شب برات باوجود چاندنی اور چراغاں کے اس کے آگے اندھیری لگتی تھی۔ ایک طرف آتش بازی چھٹتی تھی۔ اس عرصہ میں بادل پھٹ گیا اور چاند نکل آیا بعینہ جیسے نافرمانی جوڑا پہنے کوئی معشوق نظر آتا ہے۔"

قصے کے سلسلہ میں جب آداب و رسوم کا ذکر آگیا ہے وہ ہندوستان کی اُس عہد کی معاشرت کی اچھی تصویریں ہیں مثلاً ایک موقع پر ایک تقریب کی تیاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"دیکھا تو تمام حویلی میں فرش مکلف لائق ہر مکان کے جا بجا بچھا ہے اور مسندیں لگی ہیں۔ گلاب پاش عطردان، پکدان چنگیریاں قرینے سے دھری ہیں۔ طاقوں میں رنگترے، کوے، نارنگیاں اور گلابیاں رنگ برنگ کی چنی ہیں۔ ایک طرف رنگ آمیز ابرک کی ٹٹیوں میں چراغاں کی بہار ہے ایک طرف جھاڑ اور سرو کنول کے روشن ہیں اور تمام دالان اور شہ نشینوں میں طلائی شمعدانوں پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں اور جڑاؤ فانوس اوپر دھری ہیں .... غرض سب اسباب بادشاہانہ موجود ہے کنچنیاں، بھانڈ بھگتے، کلاونت، قوال اچھی اچھی پوشاکیں پہنے تینے اپنے سازوں سے سر ملائے حاضر ہیں۔"

اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مغل بادشاہ یا شاہزادے کی محفل طرب میں پہنچ گئے۔ انداز میں بیانیہ

کھینچا ہے کہ اصل سماں آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

میر امن کی ایک خاص خصوصیت جو ان کو اردو کے بہت سے مشہور نثر نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کرنے کی عادت ہے۔ ان کی عبارتوں میں بڑے بڑے جملے بہت کم نظر آتے ہیں، جو کچھ کہنا چاہتے ہیں چھوٹے چھوٹے جملوں میں بغیر حرف ربط کے استعمال کئے ہوئے کہہ جاتے ہیں مثلاً

"اسی طرح تین دن رات صاف گذر گئے ملکہ کے منہ میں ایک کھیل اڑ کر نہیں گئی وہ پھول سا بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ کندن سا دمکتا رنگ ہلدی سا ہو گیا۔ منہ میں پپیڑی بندھ گئی۔ آنکھیں پتھرا گئیں مگر ایک دم اٹک رہا تھا کہ وہ آتا جاتا تھا۔"

ہم نے میر امن کی تالیف "باغ و بہار" اور ان کے طرز انشا پر کافی سے زیادہ زور دیا یہ اس لئے کہ ان تمام باتوں کے پیش نظر جو ہم اوپر ایک ایک کرکے گنا آئے ہیں۔ باغ و بہار ہی اس عہد کی بہترین تصنیف قرار پاتی ہے اور دوسرے اس لئے کہ یہ اردو کے نشاۃ ثانیہ کی آئینہ دار بھی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی توبۃ النصوح اس کا نقش ثانی معلوم ہوتی ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ یہی زبان تھوڑے فرق سے نذیر احمد اور راشد الخیری کی زبان بن گئی ہے۔ ویسے ہی محاورے، ویسی ہی ضرب الامثال اور وہی فقروں اور جملوں کی ترکیبیں جو میر امن نے استعمال کئے ہیں نذیر احمد اور راشد الخیری کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج کے نثر نویسوں میں تین شخص خاص طور پر مقبول ہوئے ہیں پہلے نمبر پر میر امن ہیں جن کا تذکرہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہم نے کیا۔ ان کے بعد حیدر بخش حیدری آتے ہیں۔ جن کی طوطا کہانی اور آرائش محفل بھی بہت مقبول ہوئی ہیں لیکن یہ میر امن کی عبارت کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ حیدر بخش کا اسلوب بیان سنجیدہ اور پچھلے دور کے مصنفین سے نسبتاً سلجھا ہوا ہے لیکن ان کے جملے بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ عربی فارسی کے الفاظ اور ترکیبوں کا استعمال بھی انھوں نے بکثرت کیا ہے۔ علاوہ بریں محاوروں کے استعمال میں انھوں نے خاص کوشش نہیں کی لیکن بہر حال ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ اس دور کے مصنفین کی اردو نے دور گذشتہ کی نثر کے مقابلہ میں کتنی ترقی کی۔ یہ ممکن ہی نہیں بلکہ واقعہ ہے فورٹ ولیم کالج کے مصنفین ایک دوسرے پر اپنی مختلف خصوصیات کے لحاظ سے فوقیت رکھتے تھے اور میر امن اس دور میں

اپنے ہمعصروں کے مقابلہ میں ہر حیثیت سے ممتاز نظر آتے ہیں لیکن نثر اردو کے مصنفین کی متفقہ اور منظم کوششوں سے ہی برگ و بار آئے اور ہر ایک نے اپنی اہلیت اور قابلیت کے مطابق اس کی ترقی میں حصہ لے کر پچھلے دور سے اس کو لسانی اعتبار سے بہت ترقی یافتہ بنا دیا۔

نمونہ عبارت طوطا کہانی :-

"جب سورج چھپا اور چاند نکلا خجستہ، سینہ پر سوز چشم گریاں آہیں بھرتی ہوئی طوطے کے پاس گئی اور کہنے لگی۔ اے سبز پوش طوطے میں عشق کے غم سے مُنی جاتی ہوں اور تو ہر ایک شب میری نصیحت اور گفتگو میں کھو دیتا ہے۔ فرد۔ نصیحت کی باتیں نہ مجھ کو سنا میں عاشق ہوں مجھ کو نصیحت سے کیا۔ طوطا کہنے لگا اے خجستہ یہ کیا کہتی ہے۔ دوستوں کی بات ماننا چاہئے کیونکہ جو کہنا دوستوں کا نہیں مانتا خراب ہوتا ہے اور پشیمانی کھینچتا ہے :

نمونہ عبارت آرائش محفل :-

"یہ قصہ عبارت سلیس سے زبان فارسی میں کسی شخص نے آگے لکھا تھا۔ اب اس حیدر بخش متخلص بہ حیدری دلی کے رہنے والے نے امیر والا تدبیر پشت و پناہ ہر پیر و جوان، دستگیر درماندگان و بے کسان، نوشیرواں وقت، ہمایوں بخت زبدۂ نوئینان عظیم الشان ہشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان، مارکوس ولزلی گورنر دام اقبالہٗ کی حکومت میں اور خداوند والا شان عالی خاندان جان گلکرسٹ بہادر دام اقبالہٗ کے حکم سے۔

غرض جملہ کسی طرح ختم ہونے کو نہیں آتا۔ اور قافیہ بندی کی کوشش بھی کی گئی ہے یہ عبارت تمہید کی تھی پورے قصہ میں یہ رنگ نہیں ہے مثلاً

"حسن بانو نے کہا کہ دوسرا سوال یہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے دروازہ پر لکھ کر لگا دیا ہے کہ نیکی کر دریا میں ڈال اور اس نے کیا نیکی کیا ہے اس کی خبر لا۔ اس سخن کے سنتے ہی حاتم اٹھ کھڑا ہوا اور حسن بانو سے پوچھنے لگا کہ وہ کون شخص ہے اور کس طرف کو رہتا ہے حسن بانو نے کہا میں نے اپنی دادی سے سنا ہے کہ اس کی جگہ اتر کی طرف ہے پس اتنی بات دریافت کر کے وہاں

سے توکل بخدا چل نکلا............ اتنے میں ایک آواز سوزناک دردآلودہ ساتھ آہ وزاری کے کسی طرف سے اس کے کان میں ایسی پڑی کہ جس کے سنتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔

طوطا کہانی کے نمونے سے ظاہر ہے کہ فارسی الفاظ و ترکیبیں زیادہ ہیں لیکن بعد میں یہ چیز کم ہو جاتی ہے اور آرائش محفل میں جہاں انھوں نے آزادی سے ترجمہ کیا ہے تو وہ بھی سیدھی سادی اور سلیس عبارت لکھتے گئے ہیں جیسا کہ آخر کے نمونے سے ظاہر ہے۔

میر شیر علی افسوس بھی فورٹ ولیم کالج کے اُن تین مشہور نثر نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جو خاص طور پر معروف و ممتاز ہیں۔ نثر میں افسوس کا شاہکار اور ان کا نہایت مقبول و معروف کارنامہ سعدی علیہ الرحمۃ کی گلستاں کا اردو ترجمہ ہے جو باغ و بہار کے نام سے مشہور ہے۔ گلستاں کے ترجمہ کرنے کی تقریب خود ان کے کی عبارت میں سنئے تاکہ ان کی طرز تحریر کے متعلق اندازہ ہو سکے۔

"ایک دن صاحب موصوف ڈاکٹر گلکرسٹ نے مہربانی سے فرمایا کہ گلستان سعدی شیرازی کا زبان اردو میں ترجمہ کر۔ میں نے دھیان کیا کہ عبارت اس کی بہ ظاہر صاف اور بہ باطن پیچدار ہے۔ علاوہ اس کے عبارت کا اختلاف بے شمار ہے اور رتبہ اپنی قوت تالیف کا اور شیخ مرحوم کی تصنیف کا جو خیال کیا تو کسی طرح کی نسبت نہ پائی۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ ارادہ کیا کہ اس سے پہلو تہی کروں اور سر عجز آگے دھروں۔ پھر سوچ آیا کہ مبادا حاشیہ خیال میں ان کے گذرے اس نے ہمارا کہنا نہ مانا اور اس بات کو مہمل جانا۔ تب قصد کیا کہ ایک حکایت طولانی کہ نظم و نثر اس میں کثرت سے ہو اسے ترجمہ کروں اگر بخوبی انجام ہوئی اور اہل معنی کو پسند پڑی تو بہا والا صاحب ممدوح سے اس امر کی معافی چاہوں گا"

افسوس کے طرز بیان میں میر امن سے زیادہ گنجلک ہے۔ اس میں میر امن کے اسلوب بیان کا سا لوچ اور بے ساختہ پن نہیں۔ میر امن کی زبان جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں بالکل محاورہ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے وہ جو بات کہتے ہیں روزمرہ اور محاورہ سے خالی نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف افسوس کی زبان میں سلاست اور صفائی کے ساتھ سنجیدگی اور وقار پایا جاتا ہے۔ وہ عربی فارسی کے فقرے بکثرت استعمال کرتے ہیں اور اس خصوص

میں حیدری سے بڑھے ہوئے ہیں. باغ وبہار کی عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

*حکایت:۔ ایک فقیر کو میں نے سنا کہ فاقہ کی آگ میں جلتا پیوند پر پیوند گانٹھتا اور تسلی اپنے خاطر کی ان دو بیتوں سے کرتا ؎

لباس فقرو نان خشک پر میں — یہ لازم ہے کہ کر بیٹھوں قناعت
ہر اک کی منتوں کا بوجھ اٹھانا — ہے بہتر یا کہ اپنا بار محنت

کسی نے کہا اس سے کیا بیٹھا ہے تو فلانا شخص اس شہر میں ایسا صاحب ہمت ہے کہ دست کرم اپنا اس نے کھول دیا ہے اور اپنی کمر کو آزادوں کی خدمت کے لئے باندھ لیا ہے۔ اگر صورت حال سے تیری اطلاع پاوے تو اپنے پر منت رکھے اور تیری خدمت کرنی غنیمت جانے. کہا اس نے چپ رہ کہ فقیری میں مرنا اچھا ہے کہ حاجت کسی کے آگے لے جانا۔

قطعہ۔ پیوند گانٹھ، صبر کا کونا کر اختیار — پر اغنیا سے کر نہیں جامہ کی التجا
مثل عذاب نار ہے ہمسایہ کے سبب — جانا جو تیرا گلشن فردوس میں ہوا ؎

اُردو زبان میں گلستان کے ایک دو ترجمے اور بھی ہوئے ہیں۔ لیکن افسوس کے ترجمہ کے مطالعہ سے حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے انھوں نے گلستاں کا نہایت عمدہ اور بے نظیر ترجمہ کیا ہے انھوں نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ زبان سلیس اور صاف ہو اور کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوتے ہیں۔ ان کا ترجمہ اس دور کی اردو کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ اور اس دور کی عبارتوں کا پچھلے دور کی عبارتوں سے مقابلہ کرنے پر بالکل صاف صاف واضح ہو جاتا ہے کہ نثر اردو نے اس دور میں منازل ترقی کتنی جلدی جلدی طے کی ہیں۔ اور کس طرح اس نے بناوٹی اور پر تصنع حسن کے مقابلہ میں فطری حسن کی سادگی شیرینی، اور لطافت حاصل کر لی۔

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں سے ہم تین مشہور اور مقبول ہستیوں کا ذکر کر چکے۔ اس ادارہ کے رفقا کی تعداد انتیس تھی اور اس چھوٹے سے مضمون میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ ہر ایک کی کتابوں اور طرز تحریر پر جدا جدا تبصرہ کیا جائے اس دور کی نثر کا ایک عام اندازہ لگانے کے لئے اوپر کے بیانات سے کسی حد تک مدد مل جاتی ہے۔ اور ہمارے مقصد کے لئے اتنا کافی ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی نثر پر ایک عام تبصرہ | اس دور کا ذخیرہ ادب یعنی قصے کہانیوں کے ترجمے، تاریخ، چند اخلاقی کتابوں اور کچھ صرف و نحو اور مذہب کی کتابوں پر مشتمل ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی تحریک اردو زبان کی نشاۃ ثانیہ کی ابتدا ہے۔ اس کالج کی کتابیں اردو کے قدیم اسلوب بیان میں عظیم الشان انقلاب کا باعث ہوئیں۔ انھوں نے صفائی اور سادگی کی مشترکہ خصوصیت کے ساتھ مختلف اسالیب بیان کے دروازے کھول دیے۔ اس سے قبل کی دکنی اردو نثر کا طرز بیان نہایت مغلق اور پیچیدہ تھا اور ایسے ہی شمالی ہند کی ابتدائی نثر نویسی کے نمونے بالکل فارسی کے مرصع اور مقفیٰ طرز پر مبنی تھے اور ان میں بعض عبارتیں تو ایسی ہیں کہ انھیں بمشکل اردو عبارت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ درحقیقت فورٹ ولیم کالج کی منظم کوششوں سے قبل اردو کا کوئی مستقل اسلوب ہی نہ تھا۔ جو کچھ لکھا گیا وہ فارسی کی اندھا دھند تقلید تھی۔ اس کالج کے قیام کی اصل غایت چونکہ نووارد انگریزوں کو اردو سکھانی تھی۔ اس لئے فورٹ ولیم کالج کے مصنفین نے سادگی اور صفائی کو خاص طور پر ملحوظ رکھا۔ اس کالج کے تقریباً تمام مصنفین ایک دو کو چھوڑ کر صاف اور سادہ عبارت لکھنے والے ہیں اور ایسے گوناگوں اور دل آویز اسالیب پیش کرتے ہیں جن پر اس وقت تک نثر اردو کی بنیاد قائم ہے۔ میرامن اور افسوس اپنی تحریروں میں محاورہ اور روزمرہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے لیکن حیدر بخش اور مولوی اکرام اللہ وغیرہ کی زبان صاف اور سادہ ہونے کے باوجود سنجیدہ اور علمی ہے۔

لیکن اس سے اگر کوئی یہ نتیجہ نکالے کہ فورٹ ولیم کالج کے زمانہ میں یا اس کی کوششوں کے فوراً بعد ہی عام مذاق بھی سادگی اور صفائی کی طرف مائل ہو گیا تھا تو یہ صحیح نہیں ہے۔ اردو میں اہل ملک نے اپنے مذاق کے مطابق جس قسم کا تصنع اور تکلف پیدا کر لیا تھا فورٹ ولیم کالج نے اس بگڑے ہوئے مذاق کو سدھارنے کی ابتدائی کوششیں ضرور کیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس تحریک کے باعث دہلی کے مصنفین میں ان اسالیب کی تقلید کا ذوق زیادہ اور ان سے کم اہل لکھنؤ میں پایا جاتا ہے لیکن ملک کی ذہنیت اور انشا پردازوں کا انداز پورے طور پر سرسید کی ادبی تحریکات کے بعد ہی بدلا۔ اگر اس وقت میرامن والا طرز مقبول ہو جاتا تو اردو میں جو چیز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد پیدا ہوئی اس سے پہلے ہی پیدا ہو جاتی۔ اسی وجہ سے ہم کہیں ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید کی ادبی تحریکات کے باعث عام مذاق میں تبدیلی دیکھتے ہیں۔

پانچواں دور

لکھنؤ کا ادبی دور

قدیم دور اور نشاۃ ثانیہ کے درمیان عبوری دور

سنہ ۱۸۲۰ء سے سنہ ۱۸۵۷ء

اس دور کو زبان اردو کے قدیم دور اور نثر اردو کی نشاۃ ثانیہ کے درمیان ایک طرح کا عبوری دور کہنا چاہیے یعنی اگرچہ زبان میں ایک خاص قسم کی تبدیلی کے آثار فورٹ ولیم کالج کی منظم کوششوں سے نظر آنے لگے تھے لیکن اس کا اثر پوری طرح سے زبان پر ابھی نہیں ہوا تھا۔ اور عام مذاق اب بھی پرانے طرز کو پسند کرتا تھا یعنی سادگی اور سلاست نے عام مقبولیت ابھی نہیں حاصل کی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی کوششوں نے اتنا تو ضرور کیا کہ دو چار کتابیں روزمرہ اور با محاورہ زبان میں تصنیف کرا دی تھیں لیکن اس عام اور پرانی ذہنیت میں اتنی جلدی تبدیلی کیونکر ہو سکتی تھی اگر اس ادبی تحریک کا شیرازہ اتنی جلدی یعنی بیس سال کے بعد ہی نہ بکھر گیا ہوتا اور لکھنے کی ادبی کوششیں برابر جاری رہتیں اور زمانہ کی ضرورت کے مطابق ان میں اصلاح اور ترقی جاری رہتی تو اس سے کسی دیرپا اور مستقل اثر کی امید ہو سکتی تھی۔

اسی لئے ہم لکھنؤ میں وہی پرانا مذاق دیکھتے ہیں۔ لکھنؤ والے خصوصیت کیساتھ قدیم مذاق کو پسند کرتے تھے۔ اس میں ان کا قصور نہیں۔ دلی اجڑ رہی تھی۔ اہل ہنر پریشان ہو ہو کر عافیت کی تلاش میں دلی چھوڑ چھوڑ کر کسی اور کا سایہ تلاش کر رہے تھے۔ شاہان اودھ دربار سجائے بیٹھے تھے اس لئے جو بھی مغلوں کے دربار سے نکلا اس نے فیض آباد اور لکھنؤ میں شاہان اودھ کے سایہ میں آکر پناہ لی۔ یہاں علم و فن کی اب بھی قدر تھی اور اس طرح مشرقی تہذیب کا آخری نمونہ اودھ کے اجڑے دربار نے دیکھا۔ یہاں وہ سب تھے جنہوں نے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں اور وضعدار اتنے تھے کہ پرانی لکیر کے فقیر بننے ہی کو سرمایہ افتخار جانتے تھے۔ چنانچہ زبان میں بھی یہاں جدید رنگ ذرا دیر سے پیدا ہوا۔

کلکتہ کے دور کے بعد تصانیف کا خاص رنگ لکھنؤ میں نظر آتا ہے اور رجب علی بیگ سرور اس کے

خاص نمائندہ ہیں مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانہ عجائب میں وہی پرانی مقفیٰ مسجع اور رنگین عبارت لکھی ہے اور نئے طرز کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھا ہے۔

"دلی کے روڑے ہیں کہ محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑتے ہیں پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر کہ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے"

فسانہ عجائب کا نمونہ عبارت جس کا سنہ تصنیف ۱۸۲۴ء ہے ملاحظہ ہو۔

"ناگاہ ایک روز موکب حشمت و جلال با فر و شوکت و کمال ایک صحرائے باغ و بہار دشت لالہ زار میں ہوا۔ فضائے صحرا قابل تحریر کیفیت دشت گلشن آسا لائق تقریر، بو باس ہر برگ و گل کی رشک مشک اذفر صفحہ بیاباں معنبر و معطر چشموں کا پانی صفا میں آب گہر سے آبدار تر۔ ذائقہ میں بہ از شیر و شکر چلے کے جاڑے کڑاکے کی سردی تھی گویا زمین سے آسمان تک یخ بھر دی تھی، پرند و چرند اپنے آشیانوں اور کاشانوں میں جمے بیٹھے تھے بھوک پیاس کے صدمے اٹھاتے تھے۔ دھوپ کھانے باہر نہ آتے تھے۔ قصد سے تھرتھراتے تھے۔ سردی سے سب کا جی جلتا تھا۔ دم تقریر ہر شخص کے منہ سے دھواں دھار دھواں نکلتا تھا آواز کسی کی کسی کے کان تک رک جاتی تھی منہ سے بات باہر آئی اور جم جاتی تھی۔ مار سیاہ اوس چاٹنے باہر نہ آتا تھا۔"

اس عبارت سے پتہ چلتا ہے سرور کا طرز اور اسلوب تحریر وہی پرانا ہے۔ عبارت میں سادگی کی جگہ رنگینیت پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی عبارت سادہ اور سلیس ہونے کی جگہ مقفیٰ اور مسجع ہے۔

دوسری کتاب سرور سلطانی ترجمہ شمشیر خانی جس کا سنہ تصنیف ۱۸۳۶ء ہے اس کی زبان فسانہ عجائب کے مقابلہ میں قدرے سادہ اور سلیس ہے اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا کہی جا سکتی ہے کہ امتداد زمانہ کی وجہ سے یہ تھوڑا فرق لازمی تھا کیونکہ دونوں تصانیف میں بارہ سال کا زمانہ حائل ہے اس کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"راویان اخبار و حاکیان آثار متفق ہیں کہ پہلے جس نے گلزار بے ثبات میں روش سلطنت نکالی تخت و تاج کی بنا ڈالی، عدل و داد کو رواج دیا، محصول و خراج لیا، وہ کیومرث تھا

اس کا بیٹا سیامک نام تھا اس کو عبادت کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ دیو نے اس کو مارا۔ کیومرث کو بہت قلق ہوا، ہوشنگ سیامک کا بیٹا تھا اس نے باپ کے خون کا بدلہ لیا۔ دیو کو قتل کیا تین سو برس کیومرث نے سلطنت کی پھر دار فنا سے رحلت کی یہ قول فردوسی ہے:

لکھنؤ سے قطع نظر خود دلی والے پرانی وضعداری نباہ رہے تھے۔ فقیر محمد خاں گویا جنھوں نے انوار سہیلی کا ترجمہ بوستان حکمت کے نام سے کیا ہے اور امام بخش صہبائی وغیرہ سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ پھر بھی دلی نے لکھنؤ سے پہلے کروٹ لی اور اس دور کے بالکل آخر آخر جب "انشائے بہار بے خزاں" لکھی گئی تو ہم اس میں طرز ادا کو ایک حد تک سادہ اور سلیس دیکھتے ہیں۔ اسی زمانہ میں مولوی سید احمد بریلوی کی مذہبی تحریک شروع ہوئی اور مذہب کی اشاعت اور اپنے عقائد کی تبلیغ کے سلسلہ میں مولوی صاحب موصوف نے جو زبان استعمال کی وہ اسی نئے طرز کی تھی۔

اس مختصر دور کی ابتدائی اور آخری تصانیف کی زبان میں نمایاں فرق معلوم ہوتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ تو زبان کی اپنی فطری صلاحیت اور کچھ ضروریات زمانہ کے رجحان کی وجہ سے سادگی اور سلاست کی طرف خود بخود مائل ہوتی جاتی ہے اور اس کا پورا پورا عمل ہیں اس دور کے ختم ہونے اور چھٹے دور کے شروع ہونے کے بعد دکھائی دیتا ہے۔

نثر اردو کا چھٹا دور

نشاۃ ثانیہ۔ جدید نثر اردو کی ابتدا

یعنے

سرسید اور اُن کے رفقا کا زمانہ

۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء

۱۸۵۷ء میں مظلوم ہندوستانیوں نے جنگ آزادی کے لئے کمر ہمت باندھی لیکن ان کی کوششیں ناکام ہوئیں۔ اس کے اسباب اور نتائج موضوع زیر بحث سے قطعاً خارج ہیں، ہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے

کہ اس کا فوری نتیجہ کچھ اچھا نہیں نکلا اور اس کے بعد ہمارا شیرازہ بالکل منتشر ہوگیا۔ سلطنت مغلیہ جو عرصے موت کی گھڑیاں گن رہی تھی ایک ہچکی لے کر رخصت ہوئی اور اس کا رہا سہا نشان مٹتے ہی ہندوستانی تمدن کی بنیادیں ہل گئیں

اس کا اثر ادب اور زبان پر بھی ہوا۔ شاعری میں مایوسی کا رنگ بہت نمایاں ہوگیا اور شعر گویا شاعر کے دکھے دل کی پکار بن گیا۔ نثر نگاروں نے جب ایسی مایوسی ہر طرف چھائی دیکھی تو وہ خیالی جنت کے تصور میں مست رہنے لگے۔ غرض ہر شخص کی دنیا نرالی تھی۔ جہاں کہیں شگفتگی اور رنگینی پیدا تھی وہاں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مصیبت زدہ کھسیانی ہنسی ہنس رہا ہے۔

اس نازک موقع پر سرسید نے بڑی ہمت کی۔ سرسید جیسا کہ سب کو معلوم ہے ان لوگوں میں تھے جو قیمتی ہڑبونگ کی بجائے ٹھوس کام کو زیادہ مفید سمجھتے تھے ان کے دل میں قوم و ملت کا درد تھا۔ ہندوستانیوں کی بداقبالی پر وہ گھنٹوں آنسو بہاتے تھے لیکن جذبات سے زیادہ ان میں عملی قوت تھی وہ قوم کے سامنے ایسا لائحہ عمل پیش کرنا چاہتے تھے جو ان کے حق میں مسیحائی کا کام کر سکے ان کے اس لائحہ عمل میں جہاں اور بڑے بڑے اور مفید پروگرام تھے وہاں زبان و ادب کی ترقی بھی شامل تھی کیونکہ زبان ہی سماج اور معاشرت کی بنیاد ہے۔

جدید نثر اردو کا دور غالب کے اردو خطوط اور سرسید کی ادبی کوششوں سے شروع ہوتا ہے اور دلی کالج کی تصانیف اور تراجم نے بھی اس دور کے شروع ہونے میں بہت کافی امداد کی۔ اس وقت سے اُردو کو جس کا سرمایہ اس وقت تک چند تراجم، کچھ تصنیفات، انتخابات اور قصص و حکایات نیز تاریخ و تذکرہ، لغات صرف و نحو اور مذہب کے مضامین پر مشتمل تھا منظم کوششوں کے ذریعہ علمی اور ادبی زبان بنانے کا عزم کیا گیا۔ اور یہی اردو زبان کی نشاۃ ثانیہ تھی۔

اردو کو سیدھے سادے طرز انشا سے آشنا کرنا فورٹ ولیم کالج والوں کا کام تھا۔ لیکن ملک میں اُس طرز کو مقبول کرانا غالب ہی کا کام تھا۔ غالب نے اپنے خطوط کے ذریعہ عوام کی ذہنیت پر زبان کی سادگی، روانی اور سلاست کا دیرپا اور مستقل اثر ڈالا۔ سادگی اور سلاست جو اب تک کم علمی کی نشانی سمجھی جاتی تھی وہ ان کے ہاں علمیت اور حسن کا جامہ پہن کر نمودار ہوئی۔ غالب کے زمانہ ہی میں ان کے ہمعصر اُن کے اس سادہ طرز پر فریفتہ تھے۔ ان کے بعد ان خطوط نے غالب کی جگہ نثر اردو کی تاریخ میں بہت زیادہ بلند کر دی۔

اس وقت خطوط میں جو آداب القاب لوازمہ خط بن گئے تھے محض رسمی طور پر لمبے چوڑے لکھے جاتے تھے اور اصل مطلب سے کہیں زیادہ غیر ضروری باتیں خط میں ہوتی تھیں۔ غالب نے جو ہر چیز میں جدت کے طالب تھے اور جن کی غیور طبیعت کسی چیز میں اتباع اور پیروی کو پسند نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اپنے لئے ایک نیا راستہ تلاش کیا۔ انھوں نے خطوط کو مکالمہ بنایا اور اس میں ایسے کامیاب ہوئے کہ خطوں میں ملاقات کا سا مزہ پیدا کر دیا اور خطوط کا وہ تمام پرانا ٹھٹھ پن ختم کر کے رکھدیا کہیں صرف بھائی میاں کہہ کر خط شروع کیا اور رسمی القاب و آداب چھوڑ کر فوراً ادائے مطلب پر آگئے اور کہیں اس کی بھی ضرورت نہ سمجھی سیدھی سادی اپنی مطلب کی بات لکھکر خط ختم کر دیا۔ لکھتے ہیں ا۔

"بھائی یہ بات تو کچھ نہیں کہ تم خط کا جواب نہیں لکھتے۔ خیر دیر سے لکھو اگر شتاب نہیں لکھتے"

ان کے طرز کی ایک اور خصوصیت اُن کی شوخی اور ظرافت ہے۔ جگہ جگہ ایسی چٹکیاں ہیں کہ پڑھنے والے کو لطف آجاتا ہے۔ لکھتے ہیں ا۔

"تیری جان کی قسم مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر ہے کہ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چلدئے واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہونچا۔ نا صاحب دہائی خدا کی میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا"

ان کے طرز کی بے ساختگی ذیل کے خط سے ظاہر ہے۔

"پیر و مرشد ۱۲ بجے تھے میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خط دیا میں نے کھولا پڑھا بھلے کو انگرکھا کرتے گلے میں نہ تھا اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا حضرت کا کیا جاتا میرا نقصان ہوتا"

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔

"اے جناب میرن صاحب: السلام علیکم۔ حضرت آداب۔ کہو صاحب آج اجازت ہے

میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی حضور میں کیا منع کرتا ہوں۔ میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہوگئے ہیں بخار جاتا رہا ہے صرف پیچش باقی ہے وہ بھی رفع ہوجائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں نہیں میرن صاحب کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوتا ہوگا جواب لکھنا ضرور ہے۔"

خط نہ لکھنے کی معذرت کو کس اچھوتے اور نرالے انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بالکل آمنے سامنے باتیں ہو رہی ہیں۔ جملے چھوٹے چھوٹے۔ ترکیبیں اور الفاظ سہل اور آسان اور ان کے ساتھ ساتھ لطافت اور ظرافت کی چاشنی۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کیلئے اردو نثر غالب کی ہمیشہ احسان مند رہے گی اور ان کے خطوط کا مجموعہ اردوئے معلےٰ اردو ادب میں اپنی مثال آپ ہی رہے گا۔

اس دور میں اردو زبان کو علمی بنانے کی پہلی منظم کوشش دلی کالج میں ہوئی۔ دلی کالج کا ذکر اردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ تعریف سے کیا جائے گا۔ یہ پہلی درسگاہ تھی جہاں مشرق و مغرب کا سنگم ہوا اور جہاں ایک ہی جماعت میں مشرق و مغرب کا علم و ادب ساتھ ساتھ پڑھایا جاتا تھا جہاں اردو کے ذریعہ تمام علوم و فنون کی تعلیم دیجاتی تھی اور جس کے ماتحت ایک ادبی سوسائٹی قائم تھی جو کالج کے طلبا کے لئے انگریزی سے اردو میں درسی کتابوں کے ترجمے کا کام انجام دیتی تھی۔ اس مجلس کے ترجموں اور تالیفات کی تعداد قریب قریب سوا سو کے ہے جو مختلف مضامین پر مشتمل ہیں۔ اس طرح دلی کالج نے اردو کو خالص علمی زبان بنانے میں عظیم الشان خدمت انجام دی اور اس زمانہ کے لحاظ سے اس کا یہ کام قابل قدر ہے۔ ذکاء اللہ، نذیر احمد، آزاد جنہوں نے بعد میں سرسید کے ادبی اور علمی اسکول کو رونق دی یہ سب اسی دلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔

اس کے باوجود جتنا بڑا احسان سرسید نے زبان اردو پر کیا ہے اتنا بڑا کسی دوسرے کا نثر اردو پر احسان نہیں ہے۔ انہوں نے نہ صرف اپنی ذات کو نثر اردو کے لئے وقف کر دیا بلکہ اپنی جادو اثر اور کشش آفریں شخصیت سے کام لے کر اپنے اردگرد سورج چاند اور ستارے جمع کئے جنہوں نے اپنی متفقہ کوششوں سے نثر اردو میں چار چاند لگا دئے اور جو انتہائی عروج اور ترقی نثر اردو کو حاصل نہیں ہو سکتی تھی وہ اسے اس دور میں حاصل ہوئی۔ نازک سے نازک، دقیق سے دقیق اور مشکل سے مشکل مفہوموں کو ادا کرنے کی صلاحیت

اس میں پیدا ہوئی اور در اصل اردو اس دور میں آکر کامل طور پر علمی اور ادبی زبان کہلانے کی مستحق قرار پائی۔

ابتدا میں سرسید نے چند چھوٹے چھوٹے رسالے مذہب اور ریاضی پر لکھے۔ یہ دونوں چیزیں سرسید کی خاندانی تھیں۔ اسی زمانہ میں شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اردو زبان کی خوش قسمتی تھی کہ سرسید کا دل بہت جلد شعر و شاعری سے ہٹ گیا اور وہ نثر کی طرف متوجہ ہوئے نثر کا اس وقت جو حال تھا اس کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے۔ رنگین اور پر تکلف عبارت جس میں قافیوں اور ردیفوں کا التزام اور جو نئی نئی ترکیبوں دور از کار تشبیہات و استعارات سے مملو ہو عام طور پر مقبول تھی سرسید پر جن لوگوں کا اثر ہو سکتا تھا وہ سب خود پرانے طرز کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ سرسید کی اٹھان اسی انداز سے ہوئی ۱۸۴۷ء میں انھوں نے آثار الصنادید مرتب کی اس میں دہلی کی مختصر تاریخ اور وہاں کی عمارتوں کا تفصیلی حال درج ہے۔ اس کے ساتھ ہی بعض مفید تصویریں نقشے اور کتبے بھی شامل ہیں۔

آثار الصنادید لکھتے وقت سرسید کے سامنے میر امن کی باغ و بہار کا نمونہ موجود تھا اور ظاہر ہے کہ یہ نیا طرز انشا تاریخی مباحث کے لیے پر تکلف اور رنگین عبارت کے مقابلہ میں زیادہ موزوں تھا لیکن سرسید صہبائی کا تتبع کرتے تھے اور صہبائی اردو نثر میں بیدل اور ظہوری کا رنگ دیکھنا چاہتے تھے لہذا آثار الصنادید میں بھی وہی پر تکلف اور رنگین انداز اختیار کیا گیا۔ مثلاً:

"ان حضرات کی طبع رسا شکل رابعہ سے پہلے اس سے نتیجہ پیدا کرتی ہے کہ بدیہی الانتاج ہے ارباب فہم و ذکا سے اور ناخن فکر عقدۂ لاینحل کو پہلے اس سے وا کرتا ہے کہ حباب کو انگشت موج دریائے سخن فہمی اس درجہ کی راست و درست سمجھ لیا کہ زبان سوسن نے کیا کہا اور رمز شناسی اس مرتبہ کو واقعی معلوم ہو گیا کہ نرگس نے کیا اشارہ کیا۔ اگر ان کی رائے روشن معجز نما ہو تو نقطۂ موہوم کو انگشت سے تقسیم کرے اور جزو لایتجزا کو دو نیم۔"

اس نمونہ میں رنگینی، تکلف اور مشکل پسندی کی انتہا ہے اور اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرسید کی طرز تحریر کا ابتدائی رجحان کس طرف تھا اور اگر چند وجوہ سے ان کی اصلاح پسند طبیعت اصلاح زبان کی طرف مائل نہ ہو جاتی تو شاید اردو کا حشر نہ معلوم کیا ہوتا۔ زبان تو بہر حال پھر بھی استاد زمانہ کے ساتھ ساتھ اصول ارتقا کے

تحت ساقط ہوتی تھی ترقی اور ترقی کرتی لیکن اتنا ضرور ہے کہ اتنی جلدی اس کل کی ہچکی کو یہ بلند رتبہ اور امتیاز کبھی نہ حاصل ہوتا۔

۱۸۳۲ء میں نثر اردو میں ایک بڑا انقلاب رونما ہوا۔ اسی سال اردو زبان عدالتی اور دفتری زبان قرار پائی اور ظاہر ہے کہ جب کسی زبان کو حکومت کی سرپرستی مل جاتی ہے تو اس کی ترقی کے امکانات بے حد وسیع ہو جاتے ہیں۔ سرکاری زبان ہوتے ہی اردو کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہوا اور وہ مصطلحات قانونی جو آج تک انگریزی اور فارسی قانون کی کتابوں میں موجود تھے اردو میں ترجمہ ہونے لگے اور اس طرح اردو زبان میں قانونی الفاظ کی بہت بڑی تعداد بڑھ گئی۔ اسی زمانہ میں سرکاری مدارس کے لئے اکثر کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئیں۔ دلی کالج میں کی ادبی کوششوں کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے اس نے کتابوں کے ترجمے کے سلسلہ میں بہت قابل قدر کام کیا۔ یہ ترجمے چونکہ خاص علمی کتابوں کے تھے اور ترجمہ کے ساتھ اسلوب بیان کا آنا بھی ضروری ہے جیسا کہ پہلے دوروں میں فارسی کتابوں کے ترجموں کے ساتھ فارسی اسلوب بیان رواں ہو گیا تھا اس لئے اب انگریزی کتابوں کے ترجمے کے ساتھ انگریزی اسلوب بیان بھی اردو میں آنے لگا اور زبان میں بے ساختگی اور سادگی پیدا ہونا شروع ہو گئی۔

اردو کی نشاۃ ثانیہ میں پریس کے قیام کو بھی کافی دخل ہے اردو میں سب سے پہلے رہے کا پریس فورٹ ولیم کالج کی طرف سے روشناس کرایا گیا اور ڈاکٹر گلکرسٹ کی قواعد اردو میر امن کی باغ و بہار اور فورٹ ولیم کالج کے دوسرے مصنفین کی کتابیں اسی پریس سے شائع ہوئیں اور پریس کے رواج نے کتابوں کی طباعت اور اشاعت کے ذریعہ سے اردو زبان کی ترقی میں بہت مدد کی۔

۱۸۳۵ء میں پریس ایکٹ کا نفاذ ہوا جس سے اخباروں کو تھوڑی بہت آزادی مل گئی۔ اس ایکٹ کے نافذ ہونے کے فوراً بعد ہی ۱۸۳۶ء میں جس کو آج ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے اردو کا پہلا اخبار آزاد کے والد مولانا محمد باقر صاحب نے اردو اخبار کے نام سے نکالا۔ پھر سید الاخبار بھی شائع ہونے لگا۔ سید الاخبار اجراء میں سر سید اور ان کے بڑے بھائی کی کوششیں شامل تھیں لیکن سر سید ہی نے زیادہ تر مضامین لکھے۔ ۱۸۵۰ء میں غالب نے اردو میں خط و کتابت شروع کی اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ انھوں نے

اپنی جدت پسند طبیعت سے خط وکتابت کو مکالمہ بنا دیا جیسے کہ دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں اس کے ساتھ ہی بہت سے خطوط میں انسانی جذبات رنج و غم حسرت و بیکسی، مسرت و خوشی کو اس خوبی اور بے ساختگی سے ادا کیا کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی اور اس سے بھی بہت بڑی منکشف [illegible] ایک جدید طرز کے امکانات پیدا ہو گئے۔

سرسید عصر جدید کے مجتہد کی حیثیت سے فورٹ ولیم کالج کی نثری کوششیں، اردو کا عدالتی زبان قرار پانا، سرکاری مدارس کے لئے انگریزی سے اردو میں کتابوں کا ترجمہ ہونا، اردو پریس کا قیام، اخباروں کی آزادی اور غالب کے خطوط کی نئی طرز انشاء یہ سب مل کر ایک بڑے اور ہمہ گیر انقلاب کا مواد تیار کر رہے تھے۔ سرسید نے اپنی پیش بینی کی وجہ سے حالات اور واقعات کا جائزہ لے کر رفتار زمانہ کو بہت جلد صحیح صحیح سمجھ لیا اور اردو کے عصر جدید کے مجتہد ثابت ہوئے۔

آثار الصنادید کا جب دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو سرسید نے کتاب کی رنگین عبارت کو بالکل بدل دیا اور اس کی جگہ سلیس اور عام فہم اردو کو دیدی۔ اردو میں یہ انقلاب ہونا تو ضرور تھا اور اگر سرسید اس کی ابتداء نہ کرتے تو یہ سعادت کسی اور کے حصہ میں آتی لیکن سرسید کی خوش قسمتی تھی کہ اپنی بے نظیر قابلیتوں کی وجہ سے ہوا کا رُخ پہچان گئے اور اس طرح اردو کی نشاۃ ثانیہ کے بانی ثابت ہوئے۔ اردو پر سرسید کا سب سے بڑا احسان تہذیب الاخلاق کا اجرا تھا جو جدید طرز کا سب سے زیادہ کامیاب علمبردار ثابت ہوا اور اس نے قدیم اور جدید دور کے درمیان ایسا خط جدائی کھینچا جس سے دونوں دور بالکل علیحدہ علیحدہ ہو کر ایک دوسرے سے بالکل ممتاز ہو گئے۔

۱۸۷۰ء میں سرسید نے قوم کی حالت کی اصلاح کے لئے "تہذیب الاخلاق" کا پرچہ نکالا۔ اس پرچہ نے اردو زبان کی جو خدمت انجام دی اس کا ذکر خود سرسید کی زبان سے سننا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے جو اس کے چار سال بعد تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں۔

"جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینی عبارت

ئے تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانہ کی مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی اور اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری کوشش کہاں تک کارگر ہوئی اور ہمارے ہموطنوں نے اسے کس قدر پسند کیا مگر اتنی بات ضرور دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی آگئی ہے اور اس کی طرف لوگ متوجہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اخباروں کی عبارتیں نہایت عمدہ اور صاف ہوتی جاتی ہیں۔ وہ پہلا ناپسند طریقہ ادائے مضمون کا چھوٹتا جاتا ہے۔ بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے لفظوں سے اردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا۔ صفائی اور سادگی روز بروز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے۔ خیالات بھی بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ بہت کم اخبار ایسے ہوں گے جن میں ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی آرٹیکل عمدہ اور سلیس عبارت میں کسی نہ کسی مضمون پر نہ لکھا جاتا ہو۔ صرف اس بات کی کمی ہے کہ وہ سامان ہمارے پاس نہیں ہے جس سے ہماری معلومات زیادہ ہوں اور ہمارے خیالات وسیع ہوں۔ جو مضمون ہم لکھنا چاہیں اُن کے ماخذ اور ان کے حالات اور جو بحثیں اوپر ہو چکی ہیں اور جو امور ان کی نسبت محقق ہو چکے ہیں اُن سے آگاہی ہو اور یہی سبب ہے کہ بعض دفعہ ہماری قوم کے آرٹیکلوں میں غلطی ہو جاتی ہے اور جن امور کا تصفیہ ہو چکا ہے انہیں کو پھر کہے جاتے ہیں۔ یہ نقص اس وقت رفع ہوگا جبکہ انواع عالم کے علوم و فنون کی کتابیں ہماری زبان میں موجود ہو جائیں گی اور ہماری قوم کو عموماً ان پر دسترس ہوگی سائنٹفک سوسائٹی علی گڈھ نے اس کام کے پورا کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر افسوس ہے کہ قوم کو اس طرف توجہ نہیں ہے اور اسی وجہ سے اس کا کام ادھورا پڑا ہے۔"

سرسید نے جتنی اہم اور ضروری اصلاحات اردو زبان میں کیں اُن ہی کی زبانی آپ سن چکے اور اس کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کیا کچھ بھی مبالغہ ہے کہ اس دور میں آکر نثر اردو میں بالکل کایا پلٹ ہوگئی۔ سرسید کے اجتہاد میں انگریزی انشا پردازی کو بہت دخل ہے۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں بکثرت مضامین انگریزی کتابوں سے ترجمہ یا اخذ کرکے

لکھے۔ تہذیب الاخلاق کا سادہ اور سلجھا ہوا انداز بیان اور بے ساختگی اڈیسن اور اسٹیل کے مضامین کے مطالعہ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ سرسید نے اس کا اقبال خود کیا ہے۔

"ہم نے نامی یورپ کے عالموں اڈیسن اور اسٹیل کے مضامین کو بھی اپنے طرز اور اپنی زبان میں لکھا ہے۔ جہاں کہ ہم نے اپنے نام کے ساتھ .A.O اور .T.S کا اشارہ کیا ہے اور اپنی قوم کو دکھایا ہے کہ مضمون لکھنے کا کیا طرز ہے اور ہماری زبان اردو میں ان خیالات کے ادا کرنے کی کیا کچھ طاقت ہے۔ اگر ہماری قوم اس پر متوجہ ہو تو کس قدر اور زیادہ خوبی اور صفائی و سادگی اس میں پیدا ہو سکتی ہے۔"

اسی وجہ سے سرسید کے اس دعویٰ میں کچھ بھی مبالغہ نہیں کہ اردو انشا کا جو خاص طرز انھوں نے نکالا اور پیش کیا بالکل نرالا تھا اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ عبارت کے سادہ اور صاف ہونے کے ساتھ اس میں ہر قسم کے مطالب کو آسانی سے ادا کیا جا سکتا تھا۔ اردو کے قدیم دوروں میں صرف مذہب پر قلم اٹھایا گیا اس کے بعد کے دوروں میں عموماً قصے کہانیوں اور خیالی باتوں کو پیش کیا گیا۔ سنجیدہ اور وقیع مباحث میں پرانا اسلوب بیان اور طرز تحریر ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ سنجیدہ اور سلجھے ہوئے مضامین کے لئے طرز انشا ویسا ہی درکار تھا اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ تہذیب الاخلاق میں عبارت کے نئے اور بالکل اچھوتے طرز کی بنا پر مفید اہم اور وقیع مباحث پر مضمون لکھے گئے اور عبارت کی سادگی نے اردو کے دامن کو بہت وسیع کر دیا یہاں تک کہ وہ اس دور میں ہر قسم کے علمی، ملکی، معاشرتی، تعلیمی مباحث کے ادا کرنے پر قادر ہو گئی۔ سرسید نے اپنے ایک اردو داں انگریز دوست کا خط نقل کیا ہے جو لکھتا ہے کہ

"تہذیب الاخلاق نے ثابت کر دیا ہے کہ اردو زبان میں بھی ہر قسم کے مضامین اور خیالات عمدگی اور سادگی سے ادا ہو سکتے ہیں۔"

سرسید کی اصلی انشا پردازی کا کمال ان کے علمی مضامین سے ظاہر ہوتا ہے۔ اردو زبان چونکہ اس سے پیشتر کبھی علمی زبان کی حیثیت سے کام میں نہیں لائی گئی لہذا اس میں علمی اصطلاحات، علمی لغات بہت کم ہیں۔ اسی لئے اگر کسی علمی مسئلہ کو اردو لکھنا چاہو تو الفاظ مساعدت نہیں کرتے لیکن سرسید نے مشکل مشکل مسائل کو اس وضاحت، صفائی اور دلآویزی سے ادا کیا ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کوئی دلچسپ قصہ پڑھ رہا ہے اس کے ساتھ ہی سرسید کی تحریر میں جگہ جگہ شوخی اور ظرافت کی چاشنی بھی مزہ دیتی ہے لیکن تہذیب اور لطافت کبھی ہاتھ سے نہیں جاتی۔

سرسید کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنی ذاتی کوششوں سے زبان اردو میں

ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا بلکہ ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ارد گرد آسمان صحافت کے ایسے آفتاب اور ماہتاب جمع کئے جنھوں نے اپنی متفقہ کوششوں سے ملک کی پرانی ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا اور جن کے تنوع اور مختلف ادبی اور علمی کارناموں کے سامنے تمام پرانا ذخیرہ بالکل ماند پڑ گیا۔

سر سید کے ادبی رفقاء میں حالی شبلی۔ نذیر احمد۔ ذکاء اللہ تھے، یہ سب اردو ادب کے بڑے محسن ثابت ہوئے اور ان میں سے ہر ایک کی حیثیت ادب اردو میں ستونوں کی سی ہے زبان اردو کو علمی اور ادبی حیثیت سے انتہائی ترقی کے درجہ تک پہونچانے میں ان سب کی مختلف النوع متفقہ کوششیں کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں ان میں سے ہر ایک کا طرز تحریر اور اسلوب بیان اگرچہ جدا جدا تھا لیکن اردو کو صاف سلیس اور آسان بنانے اور حسن سادگی کے ساتھ ساتھ اس کو ٹھوس علمی اور ادبی زبان بنانے کی بنیادی اصول میں سب کی کوششیں متفق تھیں۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی کوششوں سے باغ اردو میں اگرچہ مختلف پھول کھلے لیکن وہ سب حسین بھی تھے سادہ لطیف بھی تھے اور خوش رنگ بھی۔ ان میں سے ہر ایک اپنی علمی ادبی خدمات کی وجہ سے اس بات کا مستحق ہے کہ مستقل تصانیف میں ان سے بحث کی جائے اور اردو کے دور جدید پر بالتفصیل لکھنے والے کے لئے بہت بڑا میدان سامنے ہے

<u>خاتمہ کلام</u> | غرض انیسویں صدی کے اختتام یعنی سر سید اور ان کے رفقاء کے دور کے بعد اردو نثر کی تاریخ ختم ہو جاتی ہے اور زبان میں جو کچھ تغیرات اور اصلاحات ہونی تھیں وہ ہو چکی تھیں البتہ سر سید کے عہد میں تخصیص (Spe cialization) نہیں تھی۔ ایک ہی مصنف ادب سیرۃ، تاریخ فلسفہ، مذہب اور سیاست سب پر لکھتا تھا۔ اور اس کی تصانیف میں مختلف مضامین پر کتابیں ملتی تھیں اس دور کے اختتام پر اردو کی مختلف اصناف علیحدہ علیحدہ قائم ہو گئیں اور مصنفین نے ایک ایک صنف کو اپنے لئے منتخب کر لیا اور اسی میں تصنیفی کوششیں جاری رکھیں اور اب اردو دور پہلے کی طرح کسی مقام کے ساتھ مخصوص نہیں رہے بلکہ ہر جگہ اردو کے اچھے اچھے لکھنے والے پیدا ہونے لگے ہیں

محمد عرفان صاحب ندوی بی اے جامعہ

اُستانی

دونوں لڑکیاں اپنے کمرہ میں تنہا تھیں۔ روشنی گل ہو چکی تھی ہر طرف اندھیرا تھا البتہ دونوں بستروں سے ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھی۔ لڑکیاں آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھیں جس سے دھوکا ہوتا تھا کہ وہ سو رہی ہیں

"میں کہتی ہوں۔" ایک بستر سے دھیمی لیکن رکتی ہوئی آواز آئی۔ بارہ سالہ لڑکی بول رہی تھی۔

"کیا؟" اس کی بہن نے دریافت کیا۔ جو اس سے ایک سال بڑی تھی۔

"اچھا ہوا تم جگ رہی ہو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

لفظوں میں اس کا جواب نہیں دیا گیا البتہ دوسرے بستر سے اٹھنے کی آواز آئی۔ بڑی لڑکی اٹھی اور منتظر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں دھندلی روشنی میں چمک رہی تھیں

"دیکھو میں تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ .... لیکن پہلے یہ تو بتاؤ کیا تم نے "مس مین" میں اس طرف کوئی عجیب بات دیکھی۔"

"ہاں" دوسری لڑکی نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "کوئی بات ضرور ہے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح زیادہ سختی بھی نہیں کرتیں۔ دو دن سے میں نے اپنا کام نہیں کیا ہے لیکن وہ مجھ پر بالکل خفا نہیں ہوئیں معلوم نہیں کیا وجہ ہے مگر اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ ہماری فکر نہیں کرتیں وہ تنہا بیٹھی رہتی ہیں مگر ہمارے کھیل میں پہلے کی طرح شریک نہیں ہوتیں۔

میرا خیال ہے کہ وہ کچھ پریشان رہتی ہیں لیکن اس کا اظہار نہیں کرنا نہیں چاہتیں۔ اب تو انھوں نے پیانو بجانا بھی چھوڑ دیا۔"

تھوڑی دیر سکوت کے بعد بڑی لڑکی بولی "تم نے ابھی کہا تھا کہ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں لیکن وعدہ کرو کہ میری بات کو اپنے ہی تک محدود رکھو گی۔ اماں یا اپنی سہیلی ڈورتی سے کے سامنے اس کا ذکر نہ کروگی۔"

"ہرگز نہیں" دوسری نے ذرا برا مانتے ہوئے کہا۔ "کہو تو سہی"

"قصہ یہ ہے کہ جب ہم سونے کے لئے یہاں آئے تو مجھے فوراً یہ خیال آیا کہ میں نے مس ہَین کو آتے وقت سلام نہیں کیا میں ان کو چونکانا نہ دوں اس لئے میں بغیر جوتا پہنے پنجوں کے بل ان کے کمرہ تک گئی۔ آہستہ سے دروازہ کھولا اور تھوڑی دیر تک اسی گمان میں رہی کہ وہ وہاں موجود نہیں ہیں۔ روشنی ہو رہی تھی لیکن میں ان کو نہ دیکھ سکی۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ یکایک میں چونک پڑی میں نے کسی کے رونے کی آواز سنی اور میں نے دیکھا کہ وہ اپنے بستر پر لباس تبدیل کئے ہوئے لیٹی ہیں ان کا سر تکیہ میں دھنسا ہوا ہے وہ اسقدر خوفناک طریقے سے ہچکیاں لے رہی تھیں کہ مجھ کو جھرجھری سی آگئی لیکن وہ میری موجودگی سے بے خبر رہیں۔ میں باہر کھسک آئی اور انتہائی خاموشی کے ساتھ دروازہ بند کردیا۔ تھوڑی دیر تک باہر کھڑی رہی کیونکہ مجھ میں چلنے کی سکت تک نہ تھی۔ ہچکیوں کی آواز اب بھی دروازہ سے آرہی تھی اس کے بعد میں واپس چلی آئی"

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہیں پھر بڑی لڑکی ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی: "بے چاری مس ہَین" پھر خاموشی طاری ہوگئی۔

"مجھ کو حیرت ہوتی ہے وہ رو کیوں رہی تھیں" چھوٹی لڑکی نے سلسلہ شروع کیا "ان کا تو آج کل کسی سے بگاڑ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اماں نے تو ان کی عیب جوئی بھی ترک کردی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ ہم لوگ ان کے لئے باعث تکلیف نہیں ہوسکتے پھر آخر وہ کیوں رو رہی تھیں"

"میرا خیال ہے کہ اس بارے میں میں کچھ نظر دوڑا سکتی ہوں" بڑی نے کہا۔

"اچھا بتاؤ"

بڑی نے جواب دینے میں توقف کیا لیکن پھر بولی "مجھے یقین ہے کہ انہیں کسی سے محبت ہے"

"محبت ہے!" چھوٹی لڑکی چونک سی پڑی "کس سے محبت ہے؟"

"کیا تم نے محسوس نہیں کیا؟"

"اوفوہ سے تو نہیں!"

"ہاں ہاں انہیں کے متعلق۔ وہ بھی ان سے محبت کرتے ہیں۔ تین سال ہوگئے وہ یہاں رہیں لیکن

دو تین مہینے سے پہلے کبھی ہمارے ساتھ ٹہلنے نہیں گئے لیکن اب تو وہ ایک دن بھی ناغہ نہیں کرتے مس تین، کے آنے سے پہلے تو وہ ہم لوگوں کے پاس پھٹکتے تک نہ تھے اور اب یہ ہے کہ ہر وقت ہمارے قریب ہنگامہ مچایا کرتے ہیں ہم جب بھی باہر نکلتے ہیں وہ ہمارے ہمراہ ہوتے ہیں خواہ پارک کی طرف یا کسی باغ میں.........

.........جہاں بھی مس تین ہم کو لے جائیں۔ یقیناً تم نے اس پر غور کیا ہوگا؟"

"ہاں غور تو کیا ہے" چھوٹی نے جواب دیا، "لیکن ابھی ابھی یہ خیال پیدا ہوا کہ............" وہ جملہ پورا نہ کر پائی۔

"اب تک میں اس پر زیادہ زور دینا نہیں چاہتی تھی لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہم لوگوں سے وہ آڑ کا کام لیتے ہیں۔"

دیر تک خاموشی رہی وہ دونوں اس پر غور کر رہی تھیں اس کے بعد چھوٹی نے سلسلہ کلام شروع کرنے میں اقدام کیا

"لیکن اگر ایسا ہو بھی تو آخر وہ روکیوں رہی تھیں وہ تو ان کے بڑے دلدادہ ہیں.........

میں ہمیشہ اسی خیال میں رہی ہوں کہ محبت کرنا بھی کس قدر مسرت انگیز ہے۔"

"اور میں بھی" بڑی نے خواب آگین انداز میں کہا، "یہ راز سمجھ میں نہیں آتا" نیند بھری آواز میں ایک مرتبہ یہ آواز پھر سنائی دی "سب لے جا رہی مس تین۔"

اس رات کو پھر کوئی گفتگو نہ ہوئی۔

صبح انھوں نے اس معاملہ کی طرف اشارہ تک نہیں کیا دونوں ایک دوسرے کے متعلق جانتی تھیں ہر ایک اسی خیال میں غرق ہے۔ یہی نہیں کہ انھوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا بلکہ اشارہ نہ کرنے کے باوجود جب بھی ان کی آنکھیں اسنانی بچا کر ملتیں وہ ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کر لیتیں کھانے کے وقت دونوں نے اونو کو اپنے سے الگ سا محسوس کیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی وہمی ہے۔ انھوں نے اس سے بات تک نہ کی اور بہت ہی غور سے جانچتی رہیں کہ شاید اس طرح اس کے اور مس تین کے درمیان کی خفیہ تعلق کا پتہ لگ سکے۔

ان کی دلچسپیاں ختم ہو چکی تھیں وہ ہر دم اسی دھن میں لگی رہتیں کہ کسی طرح یہ معمہ حل ہو جائے۔ شام کو ایک نے دوسری سے مصنوعی لاپروائی کے ساتھ پوچھا۔

"کیا تم نے آج کسی نئی بات پر غور کیا؟"

"نہ" اس کی بہن نے مختصر سا جواب دیا۔

وہ دونوں اس موضوع پر گفتگو کرنے سے خائف تھیں یہ حالت کئی روز تک باقی رہی مگر دونوں لڑکیاں خاموشی کے ساتھ حالات کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ ان کا دماغ بے چین تھا لیکن پھر بھی محسوس کر رہی تھیں کہ بہت جلد اُن کو حیرت انگیز راز معلوم ہو جائے گا

بالآخر دوپہر کے کھانے پر چھوٹی لڑکی نے دیکھا کہ استانی نے غیر مشہود انداز میں اشارہ کیا اور اوٹو نے اس کو سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے ہیجان سے کانپتے ہوئے اپنی بہن کے میز کے نیچے آہستہ سے پیر مارا۔ بڑی نے دریافت طلب نگاہوں سے چھوٹی کو دیکھا اور معنی خیز نگاہوں سے چھوٹی نے جواب دیا کھانے کے اختتام تک دونوں عجیب کشمکش و پیچ میں رہیں کھانا ختم ہوتے ہی استانی نے لڑکیوں سے کہا "تم لوگ پڑھنے کے کمرے میں جا کر کچھ کام کرو میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ مجھے کم از کم گھنٹہ آدھ گھنٹہ لیٹ رہنا چاہیے۔

تنہائی پاتے ہی چھوٹی لڑکی بول اُٹھی "ابھی دیکھنا اوٹو اس کے کمرے میں جائیں گے۔

"ہاں" دوسری نے کہا "اسی لئے تو انھوں نے ہم کو یہاں بھیج دیا ہے۔ ہم کو باہر سے سننا چاہیے۔"

"لیکن فرض کرو کوئی آجائے ا..................."

"کون آجائے؟"

"اماں"

"یہ تو بہت برا ہوگا" چھوٹی لڑکی خوف زدہ ہو کر چلا اٹھی۔

"دیکھو میں سنتی ہوں اور تم ان راستہ کی پاسبانی کرو۔"

چھوٹی لڑکی نے منہ پھلا کر کہا "لیکن تم مجھ کو سب باتیں نہیں بتاؤ گی۔"

"اطمینان رکھو"

"پکی رہی"

"ہاں جیسے ہی کسی کو آتے دیکھنا کھانس دینا"

راستہ میں دونوں ٹھہریں۔ ان کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ کیا ہونے والا تھا؟ انھوں نے قدموں کی چاپ سنی اور کمرے میں گھس کر پڑھنے لگیں۔

"ہاں آتو تھا؛ وہ مس تہمین کے کمرہ میں گیا ہے۔ اندر سے دروازہ بھی بند کرلیا" بڑی لڑکی اپنی جگہ پر جا پہونچی اور دروازے سننے لگی۔ اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ سانس بھی آسانی سے لے سکے۔ چھوٹی لڑکی حاسدانہ نگاہیں ڈال رہی تھی۔ حیرت زدہ ہوکر وہ بھی دروازہ کی طرف چپکے سے لپکی لیکن بڑی بہن نے اسے ڈھکیل دیا اور جھنجلا کر بولی کہ راستہ کے دوسرے کنارے پر جاکر پاسبانی کرو۔ انھوں نے تھوڑی دیر انتظار کیا مگر چھوٹی بہن کو یہ چند لمحے پہاڑ معلوم ہورہے تھے۔ شدت بے قراری میں بے کل ہوکر ادھر سے اُدھر جاتی گویا آتش زیر پا ہے۔ دفور تجسس میں وہ اپنے آنسو مشکل سے ضبط کرسکی کیونکہ اس کی بہن سب کچھ سن رہی تھی۔ بالآخر ایک آواز نے اسے چوکنا کردیا۔ دونوں لڑکیاں اپنے پڑھنے کے کمرے کی طرف اس زور سے بھاگیں کہ تھوڑی دیر تک بول بھی نہ سکی تھیں۔ چھوٹی لڑکی نے بے قرار ہوکر پوچھا۔

"اب تو سب کچھ بتا دو"

بڑی لڑکی عجیب الجھن میں پڑگئی۔ اس طرح جواب دیا گویا وہ اپنے آپ سے باتیں کررہی ہے۔

"میں تو ان کی باتوں کو سمجھی ہی نہیں"

"کیا!"

"یہ معاملہ غیر معمولی طور پر اہم ہے"

دوسری نے جھنجلا کر کہا۔ "کیا کیا؟"

بڑی لڑکی نے کہنا شروع کیا۔ "ہم لوگوں کی خیال آرائیوں سے بالکل مختلف یہ عجیب اہم بات ہے جونہی وہ کمرہ میں داخل ہوا اسے اپنی گود میں بٹھاکر پیار کرنا چاہا کیونکہ میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے اشرومی

نہیں۔ مجھے چند اہم باتیں آپ سے کہنی ہیں۔" میں کچھ نہ دیکھ سکی کیونکہ کمبی بیچ میں لٹک رہی تھی۔ مگر سب کچھ صاف صاف سنائی دیتا تھا۔

"تو پھر بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟"

آڈو اس وقت ایسے انداز میں اور ایسے لہجے میں گفتگو کر رہا تھا کہ میں نے اس سے قبل اس کی زبان سے نہیں سنی تھی۔ تم تو جانتی ہی ہو وہ عموماً کس لب ولہجہ میں گفتگو کرتا ہے ——— بہت زور سے اور گستاخانہ انداز میں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت خوفزدہ تھا۔ استانی نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ وہ فضول بکواس کر رہا ہے کیونکہ استانی نے صرف ان مختصر الفاظ میں جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ تھوڑا نہیں بہت کچھ جانتے ہو۔ اگر ایسا ہے۔" اس نے انتہائی غمناک لہجے میں کہا "تو پھر مجھ سے اس قدر کھنچے کیوں ہو۔ تقریباً ایک ہفتہ ہوا کہ تم سے ملاقات ہوئی تھی اس وقت سے تم نہیں بولے ہو اور مجھے ہر موقع پر ٹالنے کی کوشش کی ہے۔ اب تم لڑکیوں سے ملنے میں بھی احتیاط برتتے ہو اور نہ پارک ہی میں ملنے آتے ہو۔ کیا یکبارگی تم مجھے بھول گئے آڈو میں کیا بتاؤں کہ تم کیوں روٹھے ہوئے ہو اسے تم ہی بہتر سمجھتے ہو۔"

خاموشی طاری ہو گئی۔ کچھ دیر بعد آڈو نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"یقیناً تم محسوس کرتی ہو گی کہ میرا امتحان کس قدر سر پر ہے۔ پڑھنے سے مجھے فرصت نہیں ملتی کیا اس معاملہ میں میں قطعاً معذور نہیں ہوں؟"

وہ رونے لگی اور سسکتے ہوئے دردمندی کے ساتھ کہا، "آڈو سچ بولو سچ میں نے تم سے کیا خطا کی کہ تم مجھ سے اس قدر بدسلوک ہو گئے ہیں نے تم پر کسی دعویٰ کا اظہار بھی نہیں کیا۔ لیکن مسائل پر صاف گوئی سے رائے زنی کرنی چاہئے۔ تمہارے نقروں سے واقفیت کی بو آتی ہے......"

وہ کانپنے لگی اور خوف کے مارے جملہ پورا نہ کر سکی سننے والی نے اور نزدیک آکر دریافت کیا۔

"........ آخر یہ سب کچھ کس لئے تھا؟"

"اس کے بچہ کے متعلق ہے"

"ان کا بچہ! چھوٹی لڑکی نے کہا۔ "ایک بچہ ناممکن ہے"

"سچ مچ یہی کہا تھا"

"تم اسے صحیح صحیح سن نہ سکی ہوگی۔ یہ ناممکن ہے"

"نہیں نہیں! میں نے سنا ہے اور مجھے کامل یقین ہے۔ بدکواوڑ نے یہ دہراتے ہوئے کہا تھا۔
"ہمارا بچہ! اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ کہنے لگی اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے تب ...."

"اچھا"

تب تم کھنکھارنے لگیں اور مجھے مجبوراً وہاں سے بھاگنا پڑا

چھوٹی بہن کی پریشانی خوف و وحشت کی حد کو پہونچ گئی۔

چھوٹی بہن نے کہا۔ "بچہ اس کو کہاں سے مل گیا؟

"میں خود تم سے زیادہ نہیں سمجھ سکتی"

شاید وہ اپنے گھر بھاگ گئی ہے۔ مگر ماں نے اسے یہاں آنے کی اجازت نہ دی ہوگی۔ اسی وجہ سے شاید وہ اس قدر افسردہ خاطر ہے،

"کیسی مہمل باتیں کرتی ہو اس وقت تو وہ اوڈ سے آشنا بھی نہ تھی،

دونوں متفکر سی ہوگئیں۔ مگر سعی بے حاصل۔ چھوٹی بہن نے کہا۔

بچہ تو قطعی ناممکن ہے۔ اس کے کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کی شادی نہیں ہوئی ہے صرف شادی کے بعد ہی بچہ پیدا ہو سکتا ہے شاید اس کی شادی ہو چکی ہو۔

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ اس کی نسبت اوڈ سے کبھی نہیں ہوئی ہے۔

"اچھا تب ...... پھر دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

"غریب مس مینا ایک نے المناک انداز میں کہا۔

ان کی گفتگو اور ان کے احساسات و جذبات کا حاصل یہی ایک حسرت بھرا جملہ تھا جو تاسف اور رنج کے ظاہر کرنے کے لیے ان کی زبان پر بار بار آتا لیکن تجسس انہیں بے چین کر دیتے۔

"تمہیں معلوم ہے کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی؟"

"تم ہی بتاؤ مجھے اس کا علم کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کتنا اچھا ہوگا اگر جاؤ لاکی سے میں سب کچھ اس سے اگلوا لوں۔"

"چپ رہو کیسی باتیں کرتی ہو۔"

"آخر میں کیوں نہ پوچھوں؟ وہ تو ہم لوگوں سے بے حد خوش اخلاق ہے!"

"فائدہ ہی کیا وہ اس قسم کی چیزیں ہم لوگوں سے کہنا پسند نہ کریں گی جب کبھی بھی اس قسم کی گفتگو کے درمیان ہم لوگ کمرہ میں داخل ہوتے ہیں وہ فوراً گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیتی ہیں۔ ایسی فضول باتیں شروع کر دی جاتی ہیں جیسے ہم لوگ ابھی تک بچے ہیں اگرچہ میری عمر تیرہ سال سے زیادہ ہے۔ پوچھنے سے کیا فائدہ صرف ایک ہنگامہ ہو جائے گا۔"

"لیکن میں جاننا چاہتی ہوں۔"

"بیشک میری بھی یہی خواہش ہے مگر دل بیٹھا دینے والی چیز یہ ہے کہ ادو نے اسے ہم لوگوں سے پوشیدہ رکھا۔ جس طرح اپنے والدین کا نام بتانے میں کسی کو شرم نہیں معلوم ہوتی اسی طرح کسی کے اگر بچہ پیدا ہو تو اس کے بتانے میں کیا شرم ہے وہ یونہی قسمیں کھا رہا تھا اصل میں وہ ہم لوگوں کو جانسا دے رہا تھا........"

- -

اسی وقت استانی کمرہ میں داخل ہوئی وہ دکھاوے کے لئے کام پر لگ گئیں لیکن نظر بچاتے ہوئے انھوں نے دیکھ ہی لیا کہ آنکھوں کے پپوٹے سرخ تھے۔ اس کی بھرائی ہوئی آواز سے اس کے شدید جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ لڑکیاں اس کی تعظیم کو ملحوظ رکھتے ہوئے بت کی طرح خاموش ہو گئیں۔ اس کے ایک دکھ ہے یہ خیال ان کے ذہن میں بھر رہا تھا۔ ہو نہ ہو وہ اسی لئے بے حد غمگین ہے لیکن ان پر بھی نادانستہ طور پر غم کا اثر ہونے لگا۔

دوسرے دن دوپہر کو ایک حیرت میں ڈالنے والی خبر معلوم ہوئی۔ ادو نے جلا وطنی کا قصد کر لیا اس نے اپنے چچا کو بتلایا کہ اسے سخت محنت کرنی ہے مگر پر ٹھیک پڑھائی نہیں ہو سکتی وہ دو مہینے کے لئے کسی دوسرے

مقام کو چلا جائے گا۔ لڑکیوں کے دل جوش سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کو کامل یقین تھا کہ اس کی جدائی اسی دن کی گفتگو سے تعلق رکھتی ہے اسلئے جب اوٹو آخری مرتبہ ان سے رخصت ہونے آیا تو وہ جان بوجھ کر رہ گئیں اور اس کی طرف پیٹھ کرلی اس کے باوجود جب وہ مس تمین سے ملنے گیا تو وہ توجہ سے اس کی طرف دیکھتی رہیں۔ اوٹو نے خاموشی سے ہاتھ ملایا مگر استانی کے لبوں پر ہلکی سی جنبش ہوئی تھی اتنے دنوں میں لڑکیاں بہت بدل گئیں تھیں۔ وہ مشکل سے ہنستیں اور کسی خوشی میں بھی شریک نہ ہوتی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے حسرت ٹپکتی وہ ادھر سے ادھر اس طرح پھرتیں گویا ان کا صبر و قرار لٹ چکا تھا۔ اپنے بڑوں پر ان کا اعتماد بھی اٹھ چکا تھا کیونکہ ان کو شبہ تھا کہ ان کی سادہ لوحی کی باتوں میں مکر و فریب پوشیدہ ہے ہمیشہ تاک میں لگی رہتیں۔ سایہ کے مانند وہ دبے پاؤں جاتیں اور دروازوں کی آڑ میں اس طرح سنتیں گویا وہ اس جال یا پردے کو جس نے اس بھید کو ان سے چھپا رکھا ہے چاک کرنے یا کم سے کم اس جال کے سوراخ سے دنیائے حقیقت پر ایک نظر ڈالنے کے لئے مضطرب ہیں۔ ایمان.......... عہد طفولیت کی بے نوری جس پر بچہ قانع رہتا ہے ـــــ ان کے دماغ سے محو ہونے لگا۔ اس کے علاوہ ہمیشہ کچھ نئے انکشافات کی منتظر رہتی تھیں۔ اور ہر موقع سے کچھ نہ کچھ اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہتیں ـــــ ماحول کے مکر و فریب نے انھیں بھی مکار بنا دیا تھا۔ اپنے والدین کے سامنے اپنے کو بچہ بنانے کی کوشش کرتیں۔ ان دونوں بڑے بوڑھوں کی مخالف تھیں۔ اسی لئے آپس میں ذہنی قربت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ جب کبھی ان کو اپنی ناواقفیت اور لاچاری کا خیال آتا تو ہمدردانہ انداز میں ایک دوسرے سے چمٹ جاتیں کبھی جذبات کی شدت میں ان کی آنکھوں سے زار زار آنسو نکل پڑتے بلا کسی ظاہری سبب کے ان کی زندگیاں نازک صورت اختیار کر رہی تھیں۔

ان کے گوناگوں مصائب میں یہ مرحلہ تلخ ترین تھا چپ چاپ انھوں نے فرداً فرداً مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ مس تمین کو کبھی بھی تکلیف نہ پہونچائیں گی کیونکہ وہ یونہی افسردہ خاطر تھی۔ وہ انتہائی محنتی واقع ہوئی تھیں۔ اپنے سبق کے یاد کرنے میں ایک دوسرے کو مدد دیا کرتیں۔ خاموش اور خوش اخلاق ہوتے ہوئے انھیں اپنی استانی کی مرضی سمجھ جانے میں ملکہ حاصل تھا لیکن استانی کو کبھی بھی اس کا احساس نہیں ہوا۔ اسی چیز سے تو ان کے دلوں کو ٹھیس لگتی تھی۔

استانی اب قطعاً بدل گئی تھی جب لڑکیاں اس سے گفتگو کرتیں تو وہ اس طرح چونک اٹھتی گویا یکدم خواب سے بیدار ہو رہی ہے۔ اس وقت اس کی نگاہ سے ایسا معلوم ہوتا کہ گویا وہ کسی عمیق تجسس میں پڑ گئی تھی۔ گھنٹوں بیٹھی ہوئی خیالات کی دنیا میں سیر کیا کرتی۔ لڑکیاں اپنے انگوٹھے کے بل اس کے پاس سے نکل جاتیں مبادا اس کے تصور میں کوئی خلل پڑے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ ہمیشہ بچہ کے متعلق سوچا کرتی ہے۔ چونکہ لڑکیوں میں بھی نسوانیت کے جذبات بیدار ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ اپنی مہربان اور شریف استانی سے ہمدردی اور محبت کرنے لگی تھیں زندہ دل مس ہین جس کی بڑھی ہوئی زندہ دلی کسی زمانہ میں بری معلوم ہونے لگی تھی اب متفکر بن گئی تھی گویا کہ کوئی بت ہے۔ اس کے تمام افعال سے حزن و ملال ٹپکتا۔ اسے روتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا تھا مگر اس کی آنکھوں کے چوٹے ہمیشہ سرخ رہتے تھے بالکل صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی تکالیف کو اپنے ہی تک چھپا کر رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن انھیں اس بات کا بے حد قلق تھا کہ وہ اس کے کسی کام نہ آسکیں۔

آخرکار استانی ایک دن آنکھ پوچھنے کے لئے کھڑکی کی طرف گئی چھوٹی بہن نے ہمت کر کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی۔

"مس ہین آپ کبیدہ خاطر کیوں ہیں۔ ہمارا کوئی قصور تو نہیں؟"

استانی نے محبت بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی لمبی زلفوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں عزیزم! یہ تمہاری غلطی نہیں ہے" یہ کہکر اس نے چھوٹی بچی کی پیشانی کا بوسہ لے لیا۔ اس کے بعد لڑکیاں ہمیشہ اسی فکر میں پڑی رہتیں۔ ایک دن ان میں سے ایک غیر متوقع طور پر اپنے والدین کے کمرہ میں گھس آئی۔ اس نے ایک دو الفاظ ایسے سن لئے جو اس کے لئے موزوں نہ تھے۔ اس کے والدین نے اس کو دیکھتے ہی ذرا موضوع گفتگو بدل دیا لیکن ان کیلئے اتنا ہی سن لینا کافی تھا وہ تفکرات میں پڑ گئیں۔

"ہاں میرے ذہن میں بھی یہی بات آتی تھی وہاں کہہ رہی تھی مجھے اس سے گفتگو کرنی پڑے گی"۔

پہلے چھوٹی لڑکی نے خود اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکامیاب رہ کر اپنی بڑی بہن سے رائے لینے کے لئے دوڑی ہوئی گئی۔

"آخر یہ گفتگو کس چیز کے متعلق ہو سکتی ہے؟"

لیکن کھانے کے وقت انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے والدین استانی سے کس قدر ناراض اور بدظن ہیں کھانے کے بعد ان کی ماں نے مس ٹین سے کہا۔

"کیا آپ میرے کمرہ میں تشریف لائیں گی میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتی ہوں"

لڑکیاں خوف سے کانپ رہی تھیں کوئی ہولناک واقعہ پیش آنے والا ہے۔ لیکن اب چھپکر سن گن لینا روزانہ کا معمول ہو گیا تھا جھجک اور شرم قطعاً معدوم ہو چکی تھی۔ ان کے ذہن پر صرف ایک خیال حاوی تھا کہ پوشیدہ راز کو کس طرح معلوم کیا جائے۔ جس دروازہ سے مس ٹین داخل ہوئی تھی اسی پردہ کھڑی ہوئی گفتگو کو سننا چاہتی تھیں ان کو صرف ہلکی سائیں سائیں کی آواز سنائی دی۔ کیا وہ راز کے معلوم کرنے میں ناکام رہیں گی؟ اتفاقاً ان کو ایک آواز سنائی دی۔ ان کی ماں کو غصہ آ رہا تھا۔

"کیا ہم لوگ اندھے تھے کہ ہمیں تمہاری حالت کی خبر نہ ہوتی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ استانی کے فرائض کے بارے میں تمہارے نظریات کیا ہیں۔ تم ایسی عورت کے ہاتھ میں لڑکیوں کی تعلیم سپرد کر کے میں پچھتاتی ہوں۔ جونہی یہ خیال آتا ہے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں تمہاری بے شرمی اور غفلت شعاری انتہا کو پہونچ گئی ہے" استانی غصہ سے تمتما اٹھی۔ مگر اس کی آواز اس قدر ملائم اور نحیف تھی کہ لڑکیاں اسے سن نہ سکیں۔

"بولے جاؤ، بہانہ تو تلاش ہی کر لیا۔ ہر ابالی اور بدکار ایسا ہی کرتا ہے تم نے نتائج کی پرواہ نہ کر کے ایک نوجوان مہمان سے ناجائز تعلقات پیدا کئے تم سے خدا سمجھے گا۔ تم ایسی عورت کا استانی ہونا کتنا شرمناک ہے تمہیں میرے متعلق اب زیادہ حسن ظن نہ رکھنا چاہئے۔ اب میں تمہیں ایک لمحہ کے لئے یہاں نہیں ٹھہرا سکتی"

لڑکیاں کانپ اٹھیں وہ سب کچھ نہ سمجھ سکیں مگر پھر بھی ان کی ماں کی آواز وحشتناک تھی۔ اس کے جواب میں مس ٹین سسکنے لگی ان کی بھی آنکھوں سے آنسو کے قطرے نکل پڑے مگر ان کا پارہ چڑھتا ہی گیا۔

"اب چیخنے چلانے کے علاوہ رہ ہی کیا گیا ہے لیکن تمہارے آنسو مجھے نہیں رلا سکتے۔ مجھے تم جیسی عورت سے کوئی ہمدردی نہیں ہے مجھے اس کی قطعاً پرواہ نہیں کہ تم یہ کیا بیتے گی تمہیں پناہ ملنی تو معلوم ہی ہو گا بہرحال تمہارے معاملہ میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے بس میرا حکم ہے کہ میرا مکان خالی کر دو"

اس وقت مس تین کی پُر حسرت سسکیاں خاموشی میں گویائی کا کام کر رہی تھیں۔ ان لڑکیوں نے کبھی کسی کو روتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ اس کی آہ و زاری نے شکوک و شبہات کو دور کر دیا۔ ان کی ماں تھوڑی دیر بیٹھی ہوئی انتظار کرتی رہی۔ آخر کار تڑپ کر ترشروئی سے بولی

"مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے کہہ دیا۔ ابھی سہ پہر کے بعد اپنا بوریا بستر سنبھال (اور صبح اپنی تنخواہ لے کر رخصت) ہو جاؤ ——— اب تم جا سکتی ہو۔"

لڑکیاں بھاگ کر کمرہ میں گھس گئیں۔ آخر کیا ہونے والا ہے؟ اس برس پڑنے کی وجہ کیا ہے۔ وہ راز حقیقت جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ اب ظاہر ہونے لگا کئی مرتبہ والدین سے بغاوت کرنے کا خیال ان کے دل میں پیدا ہوا۔

"ماں کا انداز گفتگو کس قدر کریہہ تھا۔" بڑی لڑکی نے کہا۔

چھوٹی بہن اس بیباک نکتہ چینی پر کانپ اٹھی اور ہکلاتے ہوئے بولی

"لیکن .... لیکن .... ہم تو یہ بھی نہیں جانتے ہیں کہ اس نے کیا کیا ہے؟"

"میں خوب جانتی ہوں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مس تین کبھی بھی کوئی غلطی نہیں کر سکتی۔ ماں تو اس سے اتنا بھی واقف نہیں جتنا کہ میں۔"

"وہ بری طرح چلائیں مجھے تو یہ برا معلوم ہوا۔"

"ہاں وہ برا تھا۔" ماں کی ڈانٹ ڈپٹ بھی دل کو کھٹا کر دینے والی تھی ...... غصے کے مارے اس کی زبان رک گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اسی وقت مس تین کمرے میں داخل ہوئیں۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

"مجھے آج سہ پہر کے وقت بہت کام کرنا ہے۔ اگر میں تمہیں چھوڑ کر چلی بھی جاؤں تو مجھے یقین ہے کہ تم میں سے ہر ایک شریف لڑکی بننے کی کوشش کرے گی۔ آج شام میں تمہارے ساتھ گذاروں گی۔" یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔ مگر اپنے ساتھ چہروں کی تر و تازگی اور دلوں کی خوشی بھی ... لیتی گئی۔

"کیا تم نے اس کی آنکھوں کو نہیں دیکھا؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ماں آخر بیچاری مس آمین سے کیوں ناراض ہیں؟"
"غریب مس آمین"

اس کے منہ سے دوبارہ اکھڑی ہوئی آواز نکلی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اس کے بعد اس کی ماں نے آکر پوچھا کیا وہ اس کے ساتھ سیر کرنے چلیں گی۔

"نہیں ماں! آج ہم لوگ نہیں جائیں گے۔"

درحقیقت وہ اپنی ماں سے ڈر رہی تھیں اور غصہ اس بات پر تھا کہ مس آمین کو نکالتے وقت ان کی ماں نے انھیں کیوں بتایا اس وقت تنہا رہنا ان کے مزاج کے مطابق تھا۔ طائرِ قفس کی طرح وہ کمرہ میں پھڑپھڑاتی رہیں مگر خاموشی اور فریب کے بارے دبی جا رہی تھیں۔ انھوں نے مس آمین کو سب کچھ پوچھنے اور اسے اپنی ماں کے خلاف روسکنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وہ صاف طور پر کہہ دینا چاہتی تھیں کہ ان کی ماں کا رویہ اس کی طرف بہت غیر منصفانہ ہے۔ مگر وہ یہ لکھ کر اسے زیادہ غمگین بنانا پسند نہ کرتی تھیں اور یہ سب کچھ کہتے ہوئے وہ جھجکتی بھی تھیں کہ کسی کو یہ خیال ہو جائے کہ انھوں نے اسے کیسے معلوم کیا۔ ان کے دلوں میں چور تھا کیونکہ سب کچھ سن گن کر معلوم کیا تھا۔ غرضکہ سہ پہر کا وقت اسی طرح افسردگی میں کٹا۔ اس درمیان میں جو کچھ انھوں نے دروازہ کی آڑ میں چھپ کر سنا تھا بار بار یاد آرہا تھا......... اف ماں کی سنگدلی اور بے رحمی...... مس آمین کی حسرت بھری سسکیاں۔

شام کو استانی آخری ملاقات کے لئے آئی۔ جونہی وہ کمرہ سے باہر نکلی لڑکیوں نے سکوت کو توڑنا چاہا لیکن ان کی زبان پر ایک لفظ نہ آسکا۔ دروازہ پر پہنچ کر جیسے وہ ان کی خاموش حسرتوں سے متاثر ہو گئی ہے اس نے واپس لوٹی۔ اس کی آنکھیں جذبات کی شدت سے چمک رہی تھیں۔ وہ دونوں سے بغلگیر ہوئی جو فوراً بے تحاشا رونے لگیں انھیں دوبارہ پیار کر کے استانی فوراً باہر نکل گئی۔ لڑکیاں سمجھ گئیں کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ ایک نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"اب ہم اسے کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔"

"کل جب ہم اسکول سے واپس آتے ہوں گے تو وہ چلی گئی ہو گی۔"

"لیکن اگر ہم کبھی ملے تو اس کا بچہ بھی اس کے ہمراہ ہو گا۔"

"ہاں وہ تو بڑی ہی پیاری ہے۔ غریب مس تمین۔"
معلوم یہ ہوتا تھا کہ اس حسرتناک جملہ میں ان کی قسمت کی پیشینگوئی مضمر ہے۔
"آخر اس کے جانے کے بعد ہم کیسے رہیں گے۔"
"میں تو اس استانی کے علاوہ شاید ہی کسی کے سامنے کھڑی بھی ہو سکوں۔"
"میں بھی نہیں۔"
مس تمین کی طرح کوئی دوسری نہ ملے گی۔ اس کے باوجود............ جب سے معلوم ہوا وہ حاملہ ہے۔"
اس میں جملہ پورا کرنے کی ہمت نہ تھی ایک نادانستہ جذبہ نسوانیت نے مس تمین کو ان کی نگاہوں میں وقیع اور معزز بنا دیا تھا۔
یہی خیال ہمیشہ ان کے ذہن میں چکر کاٹتا اور اسی کو سوچ کر ان کا دل پسیج جاتا۔
"مجھے ایک بات کہنی ہے۔" ایک نے کہا۔
"ہاں کیا ہے؟"
"میرے دماغ میں ایک تدبیر آئی ہے۔ کیا اس کی جدائی سے پہلے ہم اس کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے جس سے اس پر ظاہر ہو جائے کہ ہم اسے کتنا چاہتے ہیں اور ہم لوگوں کی طبیعت اپنی ماں سے کس قدر مختلف ہے۔ کیا تم میری تدبیر میں شریک ہو گی؟"
"بالکل۔"
تم جانتی ہو کہ اسے گلاب کے پھول کس قدر پسند ہیں۔ کل ہم لوگ علی الصبح باہر نکل چلیں اور اسکول جانے سے قبل کچھ پھول خرید کر اس کے کمرہ میں رکھدیں۔"
"لیکن کب۔"
"اسکول کے بعد۔"
تب تو اس سے کوئی فائدہ نہیں اس وقت تک وہ چلی گئی ہو گی۔ دیکھو میں ناشتہ سے قبل ہی نکل جاؤنگی اور پھول جمع کر لاؤں گی پھر ایک ساتھ اس کے کمرہ میں چلیں گے۔"

"بہت خوب پھر ہمیں صبح سویرے اٹھنا چاہئے۔"

انھوں نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا۔ وہ خوشی کے مارے پھولی نہ سماتی تھیں کیونکہ انھیں اپنی محبت کے ظاہر کرنے کا ایک موقع مل گیا۔ صبح سویرے ہاتھوں میں گلاب کے پھول لئے ہوئے انھوں نے مس تھین کے دروازہ کو کھٹکھٹایا کوئی جواب نہ ملا یہ سوچ کر کہ استانی سو گئی ہوگی۔ انھوں نے جھانکنا شروع کیا۔ کمرہ خالی پڑا تھا بستر پر شکن تک نہ تھی۔ گویا کوئی اس پر سویا بھی نہ تھا۔ میز پر دو خطوط پڑے تھے۔ لڑکیاں حیران ہوگئیں آخر کیا ہوگیا؟

بڑی لڑکی نے کہا۔ "میں سیدھی اں کے پاس جاؤں گی"

"اس نے بے خوف و خطر پوچھا۔ "اماں مس تھین کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں"

"کمرہ میں تو کوئی نہیں ہے، وہ آج سوئی بھی نہیں۔ ضرور وہ کل رات چلی گئی۔ اس کے متعلق آپ نے ہم لوگوں سے کیوں نہیں ذکر کیا؟"

ماں کو اس کی سخت آواز کا ذرا بھی خیال نہ ہوا۔ یہ سن کر وہ زرد پڑ گئی۔ اپنے شوہر کو لے کر وہ مس تھین کے کمرہ میں داخل ہوئی۔

وہ کچھ دیر وہاں ٹھہرے۔ اس دوران میں لڑکیاں اپنی ماں کو غضبناک نگاہوں سے دیکھتی رہیں۔ ماں ان کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ کچھ دیر میں ان کا باپ ایک کھلا ہوا خط لئے ہوئے واپس لوٹا۔ وہ خود بھی بہت پریشان تھا۔ والدین اپنے کمرے میں چلے گئے اور دبی آواز سے باتیں کرتے رہے۔ اس مرتبہ لڑکیوں میں ان کی گفتگو سننے کی ہمت نہ تھی۔ انھوں نے اپنے باپ کو اس حالت میں کبھی بھی نہ دیکھا تھا۔

جب ان کی ماں باہر نکلی اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ انھوں نے اس سے پوچھنا چاہا مگر اس نے ترشروئی سے ڈانٹا۔

"اسکول جاؤ ورنہ دیر ہو جائے گی"

انھیں جانا پڑا گھنٹوں درجہ میں کھوئی ہوئی بیٹھی رہیں۔ ایک لفظ بھی نہ سن سکیں چھٹی ہوتے ہی وہ گھر کی طرف دوڑیں سبھی کے چہرے خوفناک ہو گئے تھے حتیٰ کہ لڑکوں کا چہرہ اترا ہوا تھا جب ماں ان سے ملنے آئی

تو اس نے کہا۔

"بچو! اب تم مس تہمین کو کبھی نہ دیکھ سکو گی۔ وہ ...." جملہ پورا نہ ہو سکا۔ لڑکیوں کا چہرہ اسقدر خوفناک ہو گیا تھا کہ ماں کی کچھ ہمت نہ پڑی۔ وہ مڑی اور اپنے کمرہ میں جا کر پناہ لی۔

اسی دن سہ پہر کو آدولف وارد ہوا۔ ان خطوں میں سے ایک اس کے نام کا بھی تھا۔ جس میں اسے آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ وہ بھی اداس اور پریشان تھا۔ کسی نے اس سے بات تک نہ کی۔ ہر ایک نے اس سے پرہیز کیا۔ وہ دونوں لڑکیوں کو ایک گوشہ میں غیر مطمئن پا کر انہیں کے پاس گیا۔

"ہمارے نزدیک مت آؤ" دونوں چلا اٹھیں۔ جیسے ان پر کوئی ناگہانی آفت ہی آنے والی ہو۔

تھوڑی دیر تک وہ اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ پھر غائب ہو گیا۔ انھوں نے کسی سے اس کا تذکرہ تک نہ کیا اور نہ آپس میں کوئی بات ہوئی۔ بلا کسی مقصد کے علیحدہ علیحدہ وہ کمروں میں گھومتی رہیں اور جب ایک دوسرے کے پاس سے گزرتیں تو اشک آلود چہرے پر نظر اٹھا کر دیکھ لیتیں۔ اب انہیں سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ انھیں سراسر دھوکا دیا گیا۔ وہ اپنے والدین کے کمینہ پن اور رذالت پر چڑچڑا ئیں مگر کوئی چارہ نہ تھا۔ ماں باپ پر ان کا اعتبار اٹھ گیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ ہر شخص سے بدگمان ہو گئیں۔ ہر چیز سے انہیں مکر و فریب کی بو آتی۔ احساس زندگی کے بارے ان کے نوجوان نازک شانے دبے جا رہے تھے۔ طفولیت کا انبساط اور بچپن کی بے پروائی ختم ہو گئی۔ وہ نامعلوم خطرات کی منتظر رہنے لگیں اگرچہ اس واقعہ کی پوری اہمیت ان کی سمجھ اور عقل سے باہر تھی مگر پھر وہ اس کے دہشت ناک اور ہولناک امکانات کے معلوم کرنے کی جدوجہد کر رہی تھیں۔ وہ سب سے الگ تھلگ رہتیں مگر ان میں ایک خاموش ربط قائم تھا۔ وہ اس طلسم سکوت کو توڑ نہ سکتی تھیں۔ اپنے بڑے بوڑھوں سے علیحدہ رہتیں۔ ان تک کسی کی رسائی نہ تھی کیونکہ انھوں نے اپنے دلوں کے دروازے بند کر دئے تھے .... شاید آنے والے کئی سالوں کے لئے .... انہیں گرد و پیش کی ہر چیز سے نفرت تھی۔ کیونکہ کچھ دنوں کے مختصر عرصہ میں وہ سن رشد و تمیز کو پہنچ گئیں تھیں۔ بچپن کی لاپروائی جوانی کی ذمہ داریوں اور نسوانی جذبات کے ناگہاں ارتعاش سے مغلوب ہو چکی تھی۔

ایک روز شام کو بیٹھی ہوئی تھیں کہ اچانک بچپن کا آسیب ان میں پھر پیدا ہو گیا مردہ عورت کا خوف

اور خوفناک ممکنات ان کے چاروں طرف شیطان ڈراؤنی شکل میں منڈلانے لگے۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ایسی گھبراہٹ میں وہ کمرہ کو گرم کرنے کے لئے آگ بھی نہ جلا سکیں۔ دونوں لڑکیاں ایک ہی بستر میں گھس گئیں۔ اور کچھ تو گرمی پہونچانے اور کچھ ایک دوسرے کو تقویت دینے کے لئے کانا پھوسی کرنے لگیں۔

عنوان گفتگو بہت ہی معمولی تھا۔ وہ اپنے مصائب کا دکھڑا بیان کر رہی تھیں لیکن چھوٹی لڑکی جو کہ سریع الاحساس تھی، اسکے محبوس جذبات کو اشکوں کے راستہ تسکین ملی۔ بڑی لڑکی بھی رونے لگی۔ وہ ایک دوسرے کی آغوش میں روتی رہیں۔ وہ مس ٹیمن کی جدائی پر اتنا غمگین نہ تھیں جتنا یہ سوچ کر کہ معلوم نہیں کس وقت کیا مصیبت نازل ہو جائے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے ایک حقیقی دردناک واقعہ دیکھا تھا بھلا اسے کیسے بھلا سکتیں۔ ان میں احساس اور بیداری پیدا ہو گئی تھی۔ جس کا ردعمل یہ ہوا کہ وہ زندگی سے بیزار ہو گئیں۔

زندگی کا جنگل ایک گھنا جنگل ہے جس میں درندے بستے ہیں۔ انھیں یہ جنگل پار کرنا تھا۔ ابھی تک ــــ بے خوف و خطر چلی جا رہی تھیں۔ مگر اب انھوں نے درندوں کے پاؤں کے نشانات دیکھ لئے اور یہ بھی دیکھ لیا کہ وہ معصوم اور کمزور انسانوں کو کس طرح چیر پھاڑ ڈالتے ہیں۔ انھیں اپنی زندگی کے متعلق خطرہ پیدا ہو گیا ـــــ کہ نہیں معلوم یہ درندے ان پر کب حملہ کر دیں۔

لیکن اس کے ساتھ بچپن کا تجسس بھی کم ہوتا گیا۔ اب نہ وہ زوروں سے روتیں اور نہ دیر میں آتیں ـــــ ان کی تو زندگی کی ندی میں طوفان اٹھتے تھے مگر خاموش۔ تلاطم برپا تھے مگر بے آواز۔

مترجمہ ملک حامد حسین صاحب

جامِ صہبائی

(۱)

ہو مہر کہ ماہ دیکھتے ہیں تجھ کو
ہم شام و پگاہ دیکھتے ہیں تجھ کو
میداں ہو کہ کوہسار، صحرا ہو کہ باغ
اربابِ نگاہ دیکھتے ہیں تجھ کو

(۲)

کرنا ہے جو مجھ کو کام کر جاؤں گا
حق کوش ہوں حق کی راہ پہ جاؤں گا
اے لشکرِ اہرمن ڈراتا ہے کسے
تیری صفیں چیر کر گزر جاؤں گا

(۳)

اخلاص و وفا میں بھی ہے طاقت پنہاں
تسلیم و رضا میں بھی ہے طاقت پنہاں
بے تیغ و تفنگ ہیں بظاہر، مگر
مردانِ خدا میں بھی ہے طاقت پنہاں

(۴)

زردار بھی حکمراں بھی جھک جائیں گے
سرکش ہیں جہاں جہاں بھی جھک جائینگے
تو دامنِ حق اگر نہ چھوڑے گا اخترؔ
تیرے لئے آسماں بھی جھک جائینگے

(۵)

نمرود نے آگ پھر جلائی ہے یہاں
فرعون کو دعوائے خدائی ہے یہاں
یارب! ہیں کہاں تیرے خلیل اور کلیم
مردانِ خدا کی جگ ہنسائی ہے یہاں

(۶)

بڑھ بڑھ کے جگر پہ زخم کھاتا ہوں میں
ہر زخم پہ جھومتا ہوں گاتا ہوں میں
اوروں کی مصیبتوں پہ رو دیتا ہوں
اور اپنے غموں پہ مسکراتا ہوں میں

اختر صہبائی

بکھری ہوئی پتیاں

(سانیٹ)

اے دوست! پھر بھی میری پریشانیاں یہ کیوں؟
تاریخ باغ دہر کو ترتیب دے چکا
منظوم گلستاں کی بہاریں بھی لے چکا
لیکن پڑی ہیں، بکھری ہوئی پتیاں یہ کیوں!
مدت سے ایک فکر ہے، صدیوں سے کوششیں
لیکن ہوئیں نہ آج تک افسوس کامیاب
یعنی ابھی ہر ایک تغیر، ہر انقلاب
کھاتا رہا ہے چار قدم چل کے لغزشیں!
یہ نظم، یہ فسانہ، یہ تقریر، یہ پکار
اسٹیج سے زمانہ کے سو سرخیوں کے ساتھ
ان منتظر سی تکتی ہوئی ہستیوں کے ساتھ
کس درجہ دلفریب مگر کتنا انتشار!!
— کر شور اے حیات! کہ میں بھی نہیں ہوں میں
اے زندگی، پکار! کہ اندوہگیں ہوں میں!

سلام (مچھلی شہری)

آخری نصیحت

حیات ہو نفسِ مہر و ماہ تیرے لئے
جہاں تمام ہو اک درسگاہ تیرے لئے
اندھیری رات میں عصرِ رواں کی، نور نہیں
شرارِ عشق ہو قندیلِ راہ تیرے لئے
ترے ضمیر پہ روشن ہو باطنِ امروز
میں مانگتا ہوں خدا سے نگاہ تیرے لئے

حیاتِ دہر ہو اک بحرِ بیکرانہ تجھے
اسیرِ دام نہ کر دے تلاشِ دانہ تجھے

وفورِ غم سے تری روح بے قرار نہ ہو
شکستِ عمرِ جوانی سے اشکبار نہ ہو
تمام قلب و جگر ہو ترا، کنارِ طلب
مگر تو ساحلِ مقصد سے ہمکنار نہ ہو
تلاشِ رزق بھی ہے شرطِ زندگی لیکن
خودی کو بیچ کے فطرت سے شرمسار نہ ہو

رہے نظر میں ترے امتیازِ دین و وطن
ترے نصیب ہو، سوز و سرورِ عہدِ کہن

فضل حسین صاحب کیفؔ

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

بیسک انگلش:۔ از خیرات علی زیدی، مددگار مدرسہ فوقانیہ میدک حیدرآباد دکن۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۸۲، قیمت ۸/ غالباً مصنف صاحب سے مل سکتی ہے، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی قیمت کچھ زیادہ ہے

انگریزی زبان کو دنیا بھر کی زبان بنانے کے مقصد سے ایک طریقہ تعلیم زبان ایجاد کیا گیا ہے جس کو بیسک انگلش، کہتے ہیں اس کی رو سے انگریزی زبان کے ۲۵۰۰۰ الفاظ کو ۸۵۰ الفاظ کی مدد سے سمجھایا گیا ہے مقصد محض یہی ہے کہ جو لوگ انگریزی زبان نہیں جانتے وہ جلد از جلد سیکھ سکیں اور جو تھوڑی بہت جانتے ہیں وہ خاصی جاننے لگیں۔ حال میں اس بنیادی انگریزی نے اس قدر مقبولیت حاصل کی ہے کہ انگریزی ادب کی بہت سی مشہور کتابیں اسی سادہ زبان میں منتقل کی جانے لگی ہیں تاکہ شدبد انگریزی جاننے والے انگریزی ادب سے بھی مستفید ہو سکیں۔ خیرات علی صاحب نے بنیادی انگریزی کے اصول اور قاعدوں کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیا ہے۔ اس لئے بڑی وضاحت اور سلجھاؤ سے اس کے مسائل کو بیان کیا ہے انگریزی میں تو خیر اس موضوع پر بہت سی کتابیں ملتی ہیں لیکن اردو میں کوئی نہ تھی۔ وہ لوگ جو انگریزی زبان سے مرعوب ہیں یا سچ مچ شوق رکھتے ہیں ان کے لئے یہ بنیادی انگریزی کی کتاب بہت ہی مفید ثابت ہوگی۔

اس انگریزی کی اشاعت کے ساتھ ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ہمیں اردو کی اشاعت میں بھی ایسی ہی جد و جہد کرنا ہے۔ کچھ دن ہوئے رسالہ آردو میں بنیادی اردو پر کسی نے کچھ لکھا تھا لیکن ضرورت اس کی ہے کہ بنیادی اردو کا کام کوئی منظم جماعت مثلاً انجمن ترقی اردو یا حیدرآباد کی کوئی جماعت کرے یہ اپنی زبان کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

حسین اور انقلاب ۸/ از جوش ملیح آبادی۔ ملنے کا پتہ سرفراز بکڈپو سرفراز بلڈنگ نادان محل روڈ لکھنؤ

سائز ۲۰ × ۳۰/۱۶ صفحات ۴۰ قیمت ۵ر کتابت و طباعت خاصی۔

زیر نظر کتاب میں جناب جوش ملیح آبادی کا ایک مسدس ہے جو حضرت امام حسین کا ایک مرثیہ ہے دو چھوٹے چھوٹے سلام اور چار رباعیاں ہیں مسدس مرثیت لئے ہوئے ہے لیکن ظاہر یہ کیا گیا ہے کہ حسین کی مدافعت حکومت کے خلاف ایک انقلاب تھی۔ آج کل جبکہ انقلاب کا لفظ فیشن بن رہا ہے اس قسم کی تاویل روایات کہنہ کو قائم رکھنے کی ایک سعی معلوم ہوتی ہے۔ جوش سے کبھی کبھی مذہبی ائمہ کے متعلق نظمیں سرزد ہو جاتی ہیں غالباً کسی شہرت یا کسی طبقہ میں مقبولیت کے خیال سے نہیں بلکہ صرف عقیدت کے جوش میں۔ وہ خدا پر یقین نہ رکھتے ہوں لیکن خدا کے بعض بندوں پر فریفتہ ہیں سچ ہے "کیسے کوئی عزیز روایات چھوڑ دے"

جہاں تک نظم کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ بے پایاں جوش، بلند معانی اور مناسب خوشنما جڑے ہوئے الفاظ کا ایک گلدستہ ہے۔ خلوص، صداقت اور عقیدت ہر ہر مصرعہ سے طراوت کرتی ہے۔ دو بند نمونتاً پیش ہیں۔ امام حسینؑ کی تعریف میں لکھتے ہیں:-

جو صاحب مزاج نبوت تھا، وہ حسین جو وارث ضمیر رسالت تھا وہ حسین
جو خلوتی شاہد قدرت تھا، وہ حسین جس کا وجود فخر مشیت تھا، وہ حسین
سانچے میں ڈھالنے کے لئے کائنات کو
جو تولتا تھا نوک مژہ پر حیات کو

جو اک نشان تشنہ دہانی تھا، وہ حسین گیتی پہ عرش کی جو نشانی تھا، وہ حسین
جو خلد کا امیر جوانی تھا، وہ حسین جو اک سن جدید کا بانی تھا، وہ حسین
جس کا لہو تلاطم پنہاں لئے ہوئے
ہر بوند میں تھا نوح کا طوفاں لئے ہوئے"

اس میں شک نہیں کہ مسدس کے سانچے میں جوش کا یہ تجربہ بہت کامیاب رہا ہے پھر بھی ہمیں یقین ہے کہ میر انیس کی سی روانی، گھلاوٹ اور خوشنمائی ان میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ مصرعہ اس کی صاف ہے

مسدس میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ بند کی ابتدا اتار سے ہوتی ہے اور جب ٹیپ کے مصرعہ پر پہونچتے ہیں تو چڑھاؤ کی انتہا ہوتی ہے۔ جوش کی طبیعت میں جوش ہی جوش ہے ایسا جوش جو اتار چڑھاؤ نہیں جانتا بلکہ صرف چڑھاؤ ہی چڑھاؤ کا پابند ہے اس لئے وہ مدوجزر کی خوبصورتی نہیں پیدا ہو سکتی جو میر انیس کی نرم وگرم، متین اور پرجوش طبیعت کا نتیجہ تھی یہاں تک کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ میر انیس کی طبیعت کو مسدس سے جو فطری مناسبت تھی وہ اس سانچے سے بہتر کسی دوسرے میں ظہور پذیر ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ جہاں تک جوش کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ قدرت الفاظ، جوش بیان اور جوش تصور میں ان کا پلہ کسی سے کم نہیں لیکن اپنی طبیعت کی افتاد کے باعث میرے خیال میں یہ سب سے بہتر رومانی نظموں میں اپنی صلاحیتوں کا بہترین اظہار کر سکتے ہیں۔ رزمیہ یا انقلابی نظموں کا سانچہ مسدس نہیں ہے۔ اس کے علاوہ رزمیہ یا انقلابی نظموں سے زیادہ ان کا بہترین میدان رومانی نظمیں ہیں۔ جب یہ اس ڈگر سے ہٹ جاتے ہیں تو کہنے کو تو وہ ہر چیز کہہ لیتے ہیں اور اچھی کہہ لیتے ہیں لیکن رومانی نظموں کی سی خوشنمائی اور کمال کسی میں نہیں آتا۔ انقلابی نظموں کے لئے ان کی روح میں تڑپ تو کافی ہے لیکن اس کے برابر کی رومانی سوجھ بوجھ اور تنقیدی نظر نہیں۔

رسالہ چمنستان (شاعر نمبر) مدیر آغا سرخوش قزلباش نائب مدیر گوردھن داس ایم اے ملنے کا پتہ قصر شاعر دہلی قیمت ۱۲؍

مارچ کا رسالہ چمنستان کا شمارہ شاعر نمبر ہے۔ جو آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم کی یادگار میں نکالا گیا ہے آغا شاعر مرحوم دہلی دبستان شاعری کے پرانے نام لیواؤں میں سے تھے۔ داغ مرحوم کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔ افسوس کہ ۱۲ مارچ کو یہ شمع بھی گل ہو گئی۔ زیر نظر شمارہ میں مرحوم آغا شاعر کی حیات وکلام پر اچھے اچھے مضامین ہیں نیز مرحوم کے دوستوں کے بیانات بھی ہیں جن سے مرحوم کے کلام پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ مہاتما گاندھی کا بھی تعزیتی تار خصوصیت سے بلاک بنوا کر شامل کیا گیا ہے حالانکہ اس کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ جن حضرات کو دہلوی محاورہ بندی اور زبان سے شوق ہے۔ ان کے لئے یہ نمبر ایک تحفہ ثابت ہوگا کیونکہ آغا شاعر مرحوم کا کلام زبان و محاورہ کا ایک خوشنما البم ہے۔

رسید کتب:-

شامۃ العنبر من مولد خیر البشر۔ از قاری شاہ محمد رحیم۔ ملنے کا پتہ تراہا بیرم خاں پھاٹک مفتی والان دہلی قیمت ۸؍

قومیت اور بین الاقوامیت

مصنفہ محمد قاسم حسن

مصنف نے اس مقالے میں قومیت کے مفہوم کی تشریح کی ہے اور اس کے خاص طور سے بحث کی ہے۔ قومیت کا ارتقا کیونکر ہوا مشرق میں قومیت کا تصور کیا ہے اور یورپ والے کس قسم کی قومیت کے قائل ہیں۔ اس مسئلے کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کیا ہے۔ یہ وہ عنوانات ہیں جن پر فاضل مصنف نے اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ بین الاقوامیت کی تحلیل کی ابتدا کیونکر ہوئی اس کا موجودہ تصور کیا ہے اور مستقبل میں اس کی نوعیت کیا ہوگی۔ قیمت عمر

بحر الکاہل کی سیاست

مصنفہ امین خالدی

اس مقالے میں مصنف نے بحر الکاہل کی سیاسی اور معاشی اہمیت ظاہر کی ہے اس کا خیال ہے کہ اگرچہ اس وقت دنیا کی نظروں میں بحر الکاہل نے وہ جگہ نہیں لی ہے جو اس کا حق ہے پھر بھی مستقبل میں بحر الکاہل کی اہمیت دنیا کے تمام سمندروں سے بڑھ جائے گی جس طرح کسی زمانے میں بحر روم کے ارد گرد مصری، یونانی اور رومی تمدن کا عروج ہوا اور اب بحر اوقیانوس یورپ اور امریکہ کی جدوجہد کا میدان ہے اسی طرح آئندہ بحر الکاہل دنیا کی معاشی اور سیاسی ترقی کا مرکز ہوگا اس مقالے میں انھوں نے امریکہ، جاپان، روس، انگلستان اور چین کے مفاد کے باہمی اتحاد اور ان کی ایک دوسرے سے ٹکر کے امکانات پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ قیمت [illegible]

[illegible]

[illegible]

جامعہ

زیر ادارت۔ نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۴۳۔ نمبر ۶ | بابتہ ماہ جون سنہ ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ [illegible] فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

[illegible]

استاد اور اس کے مسائل

(یہ مقالہ ٹیچرز ٹریننگ اسکول رامپور کی ایجوکیشن سوسائٹی میں وہاں کے طلبہ کی فرمائش پر پڑھا گیا)

استاد اور اس کے مسائل؟ لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا استاد کے بھی کوئی مسائل ہوتے ہیں؟ استاد اور اس کے مسئلے، یہ پکار تو پہلے کبھی سنی نہ تھی۔ سنتے تھے کہ اقلیدس اور ہندسہ کے مسئلے ہوتے ہیں جنھیں استاد لوگ مدرسہ میں بیٹھے سلجھایا کرتے ہیں۔ اکثر منطق اور الٰہیات کے مسئلے بھی ہوتے ہیں جنھیں یہ لوگ الجھایا کرتے ہیں اور ان کے بعد استاد کیا اور اس کے مسئلے کیا! اور پھر مسئلے تو علمائے کرام کا حصہ ہیں اور استاد تو

نہ مفتیم، نہ فقیہم، نہ محتسب نہ امیر

میرے دوستو! سماج سمجھتی ہے کہ اس نے استاد کو مدرسے کی چہار دیواری میں ہمیشہ ہمیش کے لئے بند کر کے محفوظ کر دیا ہے۔ علم کی اس کال کوٹھری میں وہ اور اس کے مسائل آپس میں سر ٹکراتے رہیں لیکن اس ٹکراؤ کی گونج مدرسے کے ایوانوں سے باہر نہ آنا چاہئے۔ تو پھر استاد کیا اور اس کے مسائل کیسے!

سماج کہتی ہے کہ ہم نے استاد کے لئے کام کرنے کو مدرسہ دیا، پڑھنے کو بچے دئے، آگے کو میز اور پیچھے بیٹھنے کو کرسی۔ اتنا شکر ہے کہ یہ نہیں کہہ دیا کہ کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا بھی دیا! تو پھر اب کونسے مسائل رہ گئے۔

بھلا جب گھوڑے کے لئے صاف ستھرا اصطبل موجود ہو، اگاڑی اور پچھاڑی لگی ہو، کبھی کبھی دولتیں جھاڑنے کو دو چار نوٹ بھی ادھر ادھر بندھے ہوں، جب چلنے کے لئے تعلیمی کوڈ کی وہ جرنیلی سڑک ہو کہ دونوں آنکھوں پر کھنے چڑھائے ہوئے بے فکر چلے جائیے اور ہانکنے کو محکمۂ تعلیم کا ہنٹر لگانے کی بھی ضرورت نہیں۔ ایک ہش کر دیجئے کہ تعلیمی گاڑی آسمان کی خبر لانے لگے۔

سماج سمجھتی ہے کہ استاد کیا اور اس کے مسائل کیا اور ہماری برادری بھی وہ منہ ماؤ اور لجاؤ جانور ہے کہ جن کے چہرے مجسم سوال، ان کی صورت مجسم مسائل لیکن اس سوال کو معرض بیان میں لانے کے لئے نہ تو ہمت ہے نہ سکت۔

" میرے دوستو! اب وقت آچکا ہے کہ ہم بتائیں استاد ایک زندہ حقیقت ہے اور اس کے مسائل زندہ حقیقتیں! استاد کے مسائل، مدرسے کے مسائل۔ مدرسے کی چار دیواری کے مسائل نہیں ہیں۔ استاد کے مسائل زندگی کے مسائل ہیں۔ جیسے زندگی کا ابوالہول ایک معمہ طلب، ہمہ استفسار تبسم کا نشان استفہامیہ بنائے ہمارے سامنے کھڑا ہے کہ زندگی کیا ہے؟ اس کارخانہ حیات کا مقصد کیا ہے؟ استاد کے سامنے بھی تعلیم کی دیوی اپنے معنی خیز تبسم سے ایک چیلنج، ایک اعلان مبارزت پھینک رہی ہے بتاؤ تعلیم کیا ہے؟

اگر زندگی کی تفسیر اکبر الہ آبادی کے یہ الفاظ ہو سکتے ہیں کہ ؎

بی۔اے بنے نوکر ہوئے پنشن ملی اور مرگئے

تو تعلیمی زندگی کی تعبیر اس سے بھی مختصر الفاظ میں پیش کی جا سکتی ہے کہ

بی ٹی بنے، ٹیچر ہوئے ساری عمر یوں کوڈھ پر چلتے رہے جیسے چلے کولہو کا بیل
ہیڈ ماسٹر سے جنگ کی کچھ ساتھ والوں سے رہی اور آخرش پنشن ملی یعنی چھٹی آخر کھیل
اور اس رہائی پر ہوئی اتنی خوشی، اتنی خوشی! کہ بس خوشی سے مرگئے ملزم رہا قیدی جیل

لیکن اگر تعلیم زندگی کے مترادف ہے تو اس کے مسائل بھی اتنے ہی ہنگامہ خیز اتنے ہی ہمہ گیر ہونا چاہئیں

"تعلیم زندگی سے یوں ہم آغوش ہے جیسے دریا کی لہر ساحل سے بغلگیر ہوتی ہے۔ بھلا لہروں کے تلاطم کی دھمک ساحل کے سینہ میں نہیں اٹھتی۔ میرے دوستو! آج ہمیں تعلیم کو انھیں وسیع معنوں میں لیا ہے۔

ہمارے دیس میں علم اور زندگی کا رشتہ بہت گہرا رہا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جبکہ پورا سماجی ماحول ایک زندگی بخش تعلیمی اثر لئے ہوئے تھا اس میں تعلیم و تربیت کی وہ خوشگوار لیکن نامعلوم سوتیں جاری تھیں جو فرد کو اپنے دامن میں یوں لپٹائے ہوئے تھیں جیسے کسی محبت بھری گود میں بچہ ہلکورے لے رہا ہو زندگی اور تعلیم ایک مسلسل اور مربوط سلسلہ تھا ایک نامعلوم اور بے پناہ وسعتیں دوسری میں یوں سرایت کرتی جاتی تھیں جیسے جلتے جلتے دھندلکے میں پتہ نہیں چلتا کہ اندھیرا کہاں ختم ہوا اور اجالے کی حدود کہاں شروع ہوئیں تعلیم اور زندگی دو ایسے جزیرے نہ تھے جن کے مابین ایک دریائے ذخار اپنی طوفان خیز موجیں اٹھاتے ہوئے ہو اگر ایک دریا تھا تو دوسرا ساحل اگر ایک چولی تو دوسرا دامن۔

لیکن پچھلے سو سال سے ہمارے دیس میں ایک نئی تعلیم کا آغاز ہوا۔ وہ تعلیم کسی دوسری فضا میں اچھی تعلیم تھی۔ کامیاب تعلیم تھی لیکن میرے دوستو! کسی تعلیم کی کامیابی کا معیار زمان و مکان، ماحول اور فضا کی پابندیوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ بھلا ایک دیو قامت پیپل کا درخت جو منطقہ حارہ کی ہواؤں کی گود میں پل کر برگ و بار لایا ہے جس کے پتے اس کی زندگی بخش گرم ہواؤں میں پھیلے اور پھیل کر سبز روشنی کا بقعہ نور بن کر رہ گئے۔ کیا یہی پتے شمال کی سرد ہواؤں میں سمٹ کر ان سوئیوں جیسے تیز نشتر نہ بن جائیں گے جن سے ان دیسوں کے درخت برفانی طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہیں؟ کیا جب منطقہ معتدلہ کے خطوں کا عطر بیز گلاب جب شمالی آب و ہوا میں پہونچایا جاتا ہے تو اپنی بو باس نہیں کھو دیتا؟ میرے دوستو! جب نباتی اشیا پر ماحول اور فضا کا اثر مسلم ہے تو نظام تعلیم جو مادی رشتوں سے زیادہ دقیق، زیادہ نازک واسطوں کے ذریعہ اپنے سماجی اور کلچرل ماحول سے وابستہ ہے، کیسے اس مسئلہ سے بالا ہو سکتا ہے۔

میرے دوستو! ایک غیر معمولی طریقۂ تعلیم کو اس ملک میں رائج کرنے کے سلسلے میں لوگوں نے وہی غلطی کھائی جو ایک معمولی کسان یا باغبان بھی نہیں کرتا۔ اس کا جو نتیجہ ہوا وہ سب پر ظاہر ہے۔ تعلیم اور زندگی کا وہ نازک رشتہ سیاستداںوں کے غیر ہمدردانہ سلوک کی تاب نہ لا سکا۔ اس کے ریشے آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگے اور ان دونوں میں ایک غیر شعوری اور نامعلوم طور پر خلیج پیدا ہو گئی۔ ہمارے ملک میں تعلیم اور زندگی جھیل ڈل پر دو تیرتے ہوئے جزیروں کی طرح تھے جن میں کشش عنا بیب شعری ایک ذرہ کو دوسرے ذرہ سے وابستہ اور منسلک کرتی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ طاقت منتشر ہوتی چلی گئی اور ہمارے تعلیمی جغرافیہ میں ایک طرف زندگی، عوام کی زندگی، ایک صحرائے ناپیدا کنار، ایک ریگستانوں کا سلسلہ، ایک بنجر وادیوں کا ہجوم، بیچ میں ایک خلیج اور دور بازی تعلیم کا نخلستان۔ میرے دوستو! اس عظیم الشان خلیج کا پاٹنا آسان کام نہ تھا۔ میں جانتا ہوں کہ پچھلی صدی نے چند ایسے دیو قامت انسان پیدا کئے جنھوں نے اس وسعت کو پاٹنے کی کوشش کی۔ وہ عظیم الشان شخصیتیں جن کی پیامبرانہ نگاہ نے اس روزانہ بڑھنے والی خلیج کو پالیا تھا جن میں سے ایک خود اتحادی تھی کہ انھوں نے اس نخلستان سے دوستی اور محبت کا ہاتھ بڑھایا تو ایسی بھیانک کھاڑی کو پار کر گیا جو عوام اور خواص کے مابین حائل تھا۔ مگر پھر بھی انگریزی تعلیم والوں کو نئی دقتوں کا سامنا ہوا کوئی پودا ہم آہنگ آب و ہوا کے بغیر پروان نہیں چڑھا اور کوئی نظام تعلیم ایک شیش گھر میں پروان چڑھ کر پنپ نہیں سکتا۔ جب اس کے مصنوعی طریقوں سے کاشت کئے ہوئے پودوں کو صحرا کی سموم کا سامنا کرنا پڑا تو پہلے جھونکے میں ہی مرجھا کر

رہ گئے۔ ان میں زندگی کے لئے وہ ابدی اور مستقل اقدار کا احساس پیدا نہ ہوا جن سے حیات ابدی کی مہک اٹھی ہے اور جن کی صحیح پرکھ اور جانچ اصل مسرت کا راز ہے

کیتنا اس مشہور تعلیم داں نے مدرسہ کو انسانوں کی بھٹی کہا ہے۔ اگر مدرسہ بھٹی ہے اگر ہماری درسگاہیں وہ لپکتا ہوا شعلہ ہیں جس میں تعمیر حیات کا عمل جاری ہے تو اسے زندہ رکھنے والی دھونکنی ہماری سماج اور کلچرل زندگی ہے۔ جب تک اسے سانس ملتا رہے گا یہ زندہ ہے جس دن سانس بند ہو جائے گا یہ شعلہ بھی ٹھنڈا پڑ جائے گا تو دوستو ہمارے نظام تعلیم کی تشکیل کرنے والوں نے دھونکنی تو بند کر دی اور امید یہ رکھی کہ بھٹی کا شعلہ جوں کا توں لپکتا رہے گا۔

تعلیم کا سچا اور وسیع مقصد محض مدرسہ پورا نہیں کر سکتا۔ مدرسہ تو سماجی اور معاشی زندگی کا ایک حد تک محدود اور تنگ ادارہ ہے جو محض کتابی تعلیم کے لئے وقف ہے لیکن وسیع معنوں میں تو پوری زندگی ایک دبستان علم و عمل ہے۔ اس کے مختلف اداروں سے شخصیت کی اٹھان اور اس کی تکمیل نشوونما پاتی ہے۔ زندگی کے ابتدائی دوروں میں انسان قبائلی گروہ میں رہتا تھا اور اس کی نئی پود غیر کتابی طریق تعلیم کی گود میں پلتی اور پروان چڑھتی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ مدرسوں کی چار دیواری میں ان کے ضوابط اور بندھنوں کی پابند ہوتی گئی سب سے پہلے جس انقلاب آفریں معلم نے کتابی تعلیم کی بڑھتی ہوئی زنجیروں کو جھنجھوڑا یا وہ روسو تھا اس کی فطری تعلیم کی صدائے بازگشت اب تک وقت کے ایوانوں میں ٹکرا رہی ہے لیکن مدرسہ کو سماجی لحاظ سے زندہ حقیقت بنانے کا سہرا بیسویں صدی کے سر ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جب تک زندگی کی گرم اور ولولہ خیز لہریں مدرسے یوں ہم آغوش نہ ہو جائیں جیسے کہ ایک محبت بھری ماں کی گود بچے سے ہوتی ہے اس وقت تک مدرسہ میں زندگی کی حرارت گھر نہیں کر سکتی۔

میرے دوستو! آج ہمارے دیہی مدارس میں جو عام بے حسی اور زندگی سے سرد مہری پائی جاتی ہے اس کی بڑی وجہ یہی بڑھتا ہوا بعد ہے جو مدرسہ اور زندگی میں پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہمارے تعلیمی اعداد و شمار کا شماریاتی المہارت صریحاً بتا رہا ہے کہ ابتدائی مدرسہ کی چار دیواری سے نکل کر فارغ التحصیل طلبا کا معیار کس تیزی سے گرنے لگتا ہے۔ ہماری نئی نسل کی اکثریت مدرسے سے باہر آ کر یوں ٹھٹھک کر رہ جاتی ہے جیسے دیہات کا

چنڈول کسی جگہ میں آگیا ہو۔

لیکن ایک زمانہ ایسا تھا کہ ہمارے مکتبوں کا فارغ التحصیل طالب علم باہر نکل کر اس سیاح کی طرح محسوس نہ کرتا تھا جس کے نتھنے کوہ ہمالیہ کی بلندیوں پر پہونچنے سے پھولے جا رہے ہیں اور جس کا دم ہوا کی ہلکی ہونے کی وجہ سے گھٹا جا رہا ہے اس کے برعکس اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی ایسی زندگی بخش فضا میں پہونچ گیا ہے جس میں علم و ہنر کی وہ سوتیں جن کے سرچشمے مدرسہ نے کھول دئے تھے اب پوری قوت اور بہاؤ سے چل نکلیں گی۔ وہ زمانہ ایسا تھا جب ہمارا سماجی اور معاشی ماحول تعلیمی اثرات سے یوں تنا ہوا تھا جیسے کسی کان کی فضا رقیق مادوں کی آمیزش سے آتش در آغوش ہوتی ہے۔

ایک زمانہ میں آپ کے اپنے شہر میں ہی چند اسباب سے کچھ ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی جس نے پورے شہر کی فضا کو وسیع اور عالمگیر معنوں میں تعلیمی بنا دیا تھا۔ انہیں معنوں میں جس میں ایتھنز ایک زمانہ میں عروس البلاد کہلاتا تھا یا غرناطہ شہروں کا سردار۔

کائنات کا وہ ترنم جس کے ہمہ گیر اثر سے صبح و شام، چاند اور سورج بھی بچ کر نہ نکل سکے۔ اس شہر میں پوری فضا کو تھرتھرا رہا تھا۔ رامپور کے موسیقی اسکول نے اس فن لطیفہ کی روایات کو ہی حیات جاوید نہیں بخشی اس کے ترنم نے عوام کے دلوں میں وہ سکون اور کیف، توازن و تناسب کی وہ روح پھونک دی جو یونانی اخلاقیین کے نزدیک کامیاب زندگی کا اصل راز ہے۔ کتھک اسکول نے تربیت سمع کے ساتھ تہذیب نگاہ کا سامان بھی فراہم کیا یہ حسن صوت کی بجائے پورے اعضائے انسانی کی شاعری تھی۔ میرے دوستو! ایسی مترنم فضا میں جہاں قدرت کا گرانبار عطیہ جسم انسانی خود ایک مجسم شعر اور پوری فضا ایک نغمہ ہو کون متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔ یہ فضا وسیع معنوں میں تعلیمی فضا تھی۔

کچھ سال ہوئے ایک ولایت کے ماہر تعلیم نے ان ہی صوبجات میں مدرسوں کا دورہ کیا اور دورہ کے بعد انہیں یہ احساس ہوا کہ ہمارے مدرسوں میں مسرت اور خوشی کی فضا نہیں ہمارے درس بے کیف۔ ہمارا ماحول بے سکون ہے اگر اس قسم کا ماحول جس کا میں نے ذکر کیا ہے ایک حد تک معمر یا مذاہب ہم پھر ان کی دنیا میں پیدا کر سکتے تو شاید ہم پر سے یہ الزام دھل جاتا۔ بہرحال آپ دیکھئے کہ ہمارے پرانے تمدن میں ایک حد تک زندگی اور تعلیم کس طرح

ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے شانہ بشانہ گامزن تھیں۔ آج ہماری یونیورسٹیوں میں ہندوستانی موسیقی کے اسکول کھولے جاتے ہیں۔ ہمارے ماہرین تعلیم میں یہ احساس لطیف کافی دیر کے بعد بیدار ہوا ہے تاہم میں کہوں گا کہ علم موسیقی میں اعلیٰ اسناد پائے ہوئے حضرات (اور اب تو موسیقی میں ڈاکٹری کی سندیں ملنے لگی ہے) اس فن لطیف کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں اتنے کامیاب نہ ہوں گے جتنا رامپور کا ایک شہری۔

اور اس کے بعد آپ کا مشاعرہ ہے وہ موثر تعلیمی ذریعہ جس کی امداد سے عوام کا ادبی کلچرل معیار اونچا ہو جاتا تھا۔ پانی کے سیلاب کے برعکس ان ادبی کاریزوں کی سطح خواص کے معیار علم کے مطابق بلند ہوتی تھی اور اپنے ساتھ عوام کے خس و خاشاک جیسے مذاق کو بھی بلند کر دیتی تھی اس دلچسپ اور محبوب ذریعے سے عوام میں توازن صوت کے ساتھ ساتھ تناسب خیال کا بھی عام مذاق پیدا ہوتا تھا۔ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ پچھلے زمانہ کا وہ ان پڑھ شہری جس نے اس تاریخی شہر میں غالب اور امیر مینائی، جلال اور داغ کی آنکھیں دیکھیں ہوں گی حسن مذاق اور ذوق سلیم میں آج کل کے کتنے لکھے پڑھوں سے بڑھا ہوا ہوگا۔ ہمارا ادب کتنی ایک مثالیں ان شعرا کی پیش کر سکتا ہے جنھوں نے ایک عرب بدو کی طرح فطرت کی گود میں یا ایک کلچرل ماحول سے متاثر ہو کر شاعری کی اور ایک حد تک کامیاب شاعری کی۔

اور ان سب کے بعد لیکن ان سب سے اہم مدرسہ عالیہ رامپور ہمارے پرانے نظام تعلیم کا وہ روشن چراغ ہے جس نے ایک اندھیاری دنیا میں، ایک ڈھلتے ہوئے زمانہ میں علم و ہنر کی کرنیں دوڑا دی تھیں جس نے ہمارے ملک میں غرناطہ اور بغداد کی روایات زندہ کر دی تھیں جس نے یونیورسٹی کے تصور کو جو حقیقتاً تعلیمی دنیا کے لئے اسلام کا خاص عطیہ ہے ایک روشن حقیقت بنا کر دکھا دیا تھا وہ قندیل علم جس کی لو پر افغانستان، خوارزم بخارا اور ترکستان سے پروانے کھنچے چلے آتے تھے جو خواص اور عوام دونوں کے لئے سرچشمہ ہدایت تھا وہ ایسا خزینۃ العلوم تھا جس کی سوتیں ان آبشاروں کی طرح تھیں جو مسلمانوں کے عہد میں ان کی حسن تدبیر سے ہر صحن اور ہر پائیں باغ میں جاری و ساری تھیں، اس کے اساتذہ نہ صرف علمی دنیا میں بلکہ باہر کی دنیا میں بھی ایک مخصوص حیثیت رکھتے تھے، آج نگاہیں انھیں ڈھونڈتی ہیں تعلیمی دنیا میں ان کے منصب، ان کے رتبے کو تلاش کرتی ہیں لیکن نہیں پاتیں، مولوی عبدالعلی فرنگی محلی بحرالعلوم علم و فضل کا وہ دریا سے عذب جا بجا جن کی زندگی کے

ایک دور میں دکن پہونچا تو رئیس نے ان کی پالکی کو کندھا دے کر سعادت دارین حاصل کی۔ مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی خیرآباد اسکول کے فلسفیانہ روایات کو زندہ رکھنے والے بزرگ، وہ نازک مزاج اور آزادمنش عالم جن کی وضعداریوں کو بجز رامپور کی سرزمین ہی خوب نبھا سکی۔

جن کے لئے والئ ملک نے اپنے خزانے کا منہ کھول دیا تھا جن کی نفاست طبع اور حسن ذوق کے باوجود رئیس کی قدردانی اور فیاضی ہی اپنا سکی، وہ جب روٹھے تو والی ملک کے بنانے سے منے اور جب منے تو ایک زمانہ کے چہرے پر تبسم کھیلنے لگا۔

میرے دوستو! آپ کے شہر میں اس قسم کے زندہ ادارے تھے جن سے لہریں ابھر ابھر کر پورے ماحول کو مرتعش کر رہی تھیں آپ نے بزرگان دین کی تصاویر میں دیکھا ہوگا کہ ان کے چہرے کے گرد چاند کا ہالہ بنا ہوتا ہے اس قسم کا غیر محسوس اور غیر مرئی دائرہ فیضان ہر عالم اور ہر ادارے کا ہوتا ہے۔ عوام کے دلوں پر غیر شعوری اور شعوری طور سے ان کی ضیا منعکس ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے پرانے اداروں، ہمارے پرانے اساتذہ میں یہی خوبی تھی کہ وہ صحیح معنوں میں اخلاقی اور کلچرل لحاظ سے اس قسم کے مراکز نشر تھے جہاں سے علم و فضل کی لہریں اٹھتی تھیں اور پورے ملک کو شاداب و سرسبز کر دیتی تھیں۔

آپ کہیں گے کہ آخر ان اداروں کی کامیابی کا راز کیا تھا؟ یہ وہ ادارے تھے جو اپنے محدود دائرے میں ہماری سماجی اور مذہبی زندگی کے فطری اور طبعی نتائج تھے۔ یہ ادارے فطری جوش نمو سے ایک زرخیز مٹی سے اُگے اور اپنے برگ و بار سے مادر گیتی پر سایہ فگن ہوئے۔ ان کے اساتذہ کے درس بھی وہ سبق نہ تھے جو ایک شرمایا لجایا سا استاد، احساس خودی کی گھبراہٹ سے بے چین اور پریشان استاد، ایک مدرسہ کی چار دیواری کے اندر محفوظ کر دینا چاہتا ہے یا ایک جھلاتی ہوئی مشعل کی طرح جسے کوئی دونوں ہاتھوں سے ڈھانپے ہوئے ہو، ان اساتذہ کے درس فیضان قدرت کے کھلے خزانوں کی طرح جاری، چاند سورج کی طرح ضیا فگن، بادل کی طرح گوہر بار تھے ان کے اساتذہ برنارڈشا کے اساتذہ نہ تھے جس نے کہا ہے کہ جسے کچھ آتا ہے کرتا ہے اور جسے کچھ نہیں آتا پڑھاتا ہے۔ میرے دوستو! یہ اساتذہ صحیح معنوں میں اساتذہ تھے ملک و قوم کے اخلاقی اور علمی لیڈر تھے ہمارے پیشہ کو ان سے فخر تھا۔ انھیں ہمارے پیشہ سے افتخار حاصل نہ تھا۔

آپ داستان پدمنی کو سنتے سنتے اکتا گئے ہوں گے لیکن نقش اس کے پس منظر کے ذریعے ہی زیادہ روشن زیادہ معنی خیز ہو سکتا ہے اور ہر سماجی عمل اس کے تاریخی ماحول کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے۔ ایک اجلے براق کپڑے پر سیاہ دھبے کتنے نمایاں، کتنے بدنما معلوم ہوتے ہیں لیکن صبح کے وقت پورب سے ابھرتی ہوئی روشنی میں افق کے درختوں کے برگ و بار کتنے صاف، کتنے واضح ہوتے ہیں۔

میرے دوستو! میں اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ پچھلے زمانے میں استاد کے مددومعاون، کتنے وسائل، کس قدر ذرائع تھے۔ آپ نے دیکھا کہ تعلیم خود زندگی سے گہرے انداز میں مربوط تھی۔ نصاب اور ذریعہ تعلیم ہمارے تمدن کا مرہون منت تھا۔ بچہ اگر مکتب سے محض نوشت وخواند سیکھ کر آتا تھا تو سماجی ماحول میں وہ زندگی بخش اثرات موجود تھے جو اسے حسن ذوق اور طبع سلیم اور سماجی اور اخلاقی لحاظ سے ایک شگفتہ شخصیت عطا کر دیتے تھے پھر پرانے زمانے میں استاد یا گرو کا مرتبہ خود حقوق، وقار، اثر اور رتبہ کا ایک جہاں گھیرے ہوئے تھے۔

اس پس منظر کے آئینہ میں نئے استاد کو دیکھو اس جی بٹھا دینے والے ماحول کو دیکھو جس میں وہ کام کر رہا ہے۔ سماج میں اس کی جگہ کو دیکھو جو منصب سے کہیں پیچھے اور جوتیوں سے ذرا آگے ہے۔ اس کے مالی معاوضہ کو دیکھو جو چوکیدار سے کچھ زیادہ اور پٹواری کی آمدنی سے کہیں کم ہے اور اس کے بعد دل پہ ہاتھ رکھ کے بتاؤ کیا دوبارہ تم وہی الفاظ اسی شان استغنا سے دہرا سکتے ہو کہ استاد کیا؟ اور اس کے مسائل کیا؟ استاد کے سامنے تعلیمی پس منظر کم پھیکا سا ہوتا جا رہا ہے۔ قدیم روایات کے ستارے ایک ایک کر کے افق کے پیچھے ڈوبتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ کوئی نئی امیدیں ابھر نہیں رہی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری تربیت گاہیں استاد کو ان نئے حالات میں ایک نئے تعلیمی جہاد کے لئے کہاں تک تیار کر رہی ہیں؟

کسی نے کہا ہے بچہ کو بالغ بنانے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم بچے کو بچہ بننا سکھائیں اور استاد کو استاد بننے سے پہلے ضروری ہے کہ اسے انسان بنا بنائیں۔ ہر پیشہ انسان کی عملی زندگی کے کسی ایک آئیڈیل کی نمائندگی کرتا ہے اور جب ہم ان اعلیٰ تصوری مقاصد کو اداروں میں مقید کرنا شروع کر دیتے ہیں تو حبس کے سلسلے ان پر گہرے ہونے لگتے ہیں وہ داخلی روشنی جو ان میں جھلملا رہی تھی آہستہ آہستہ مدہم پڑتی جاتی ہے اور بتدریج ہمارے ادارے ہمارے آئیڈیل کے مقبرے ہوتے جاتے ہیں

مجھے ڈر ہے ہمارے ملک کے ٹریننگ کالجوں پر بھی ایک حد تک یہی الزام عاید ہو سکتا ہے۔ ان اداروں میں آزادیٔ اظہارِ شخصیت اور نشاطِ عمل کی خوش آیند صدائیں اٹھتی ہیں اور ان کی چار دیواری سے ٹکرا کر بجاتی ہیں۔ مجھے اپنا پرانا کالج یاد ہے، جہاں ہمارے کمرے "بارکیں"، ہمارے استاد، اسٹاف ممبر، ہماری ریاضت جسمانی ملٹری ڈرل کہلاتی تھی۔ اتنا شکر ہے کہ انھوں نے ہمارے ورزش ماسٹر کو ڈرل سارجنٹ اور ہمارے پرنسپل ٹیچنگ سپرنٹنڈنٹ کو کوارٹر ماسٹر جنرل کا خطاب نہیں دیا تھا۔ یہ بھی شاید انکساری تھی کیونکہ ظاہر میں تو یہ دونوں استاد ان فوجی افسروں سے کم نہ تھے۔ حیرانی ہے کہ ایک ہاتھ سے ہم آزادی کا گراں بہا عطیہ بچہ پر ہی نہیں ہر بالغ شہری پر نچھاور کر رہے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے وہی فطری حق استاد سے چھین رہے ہیں۔

جس استاد سے ایک ذمہ دار انسان کی طرح سلوک نہیں کیا گیا جسے اپنے آپ پر بھروسہ کرنا نہیں سکھایا گیا جسے ایک سخت ضبط کے فولادی شکنجہ میں رکھا گیا۔ جسے کبھی تخلیقی خود اظہاری اور سماجی خدمت کا موقع نہیں دیا گیا۔ وہ کیسے ایک نئی تعلیم کا علمبردار ہو سکتا ہے۔ ایک نئی تعلیم نہیں ایک نئی زندگی کا دردہ بچوں کو ایک نئی سماج، ایک نئے جمہوری نظام کیلئے کیسے تیار کر سکتا ہے۔

گر میں ان پرانے فرسودہ اداروں میں ان کی سنگین دیواروں میں بھی رخنے پڑتے دیکھ رہا ہوں کہیں کہیں دروزوں اور شگافوں میں سے نئے اصولوں کی روشنی پھوٹ نکلی ہے۔ آپ لوگ جو ایک نئی تربیت گاہ میں کام کر رہے ہیں خوش قسمت ہیں۔ آپ کے ادارے کی امتحان نئی تعلیم کے دور میں ہوئی ہے پرانے ادارے قدم آگے بڑھانا چاہتے ہیں لیکن ان کی نگاہیں ماضی کی طرف لگی ہیں اور پرانے ضبط اور روایات کی بھاری بھرکم زنجیریں ان کے پاؤں میں پڑی ہیں۔

اسی طرح مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس روشن خیال تربیت گاہ سے باہر جا کر تم بھی کبھی کسی ایسے مرقد گاہ میں نہ پہونچ جاؤ جہاں کے مجاور کوئی پرانا ہیڈ ماسٹر جہاں کا سجادہ نشین کوئی سال خوردہ سکرٹری ہو جس پر پرانے تجربوں کی اتنی تہیں پڑ چکی ہوں کہ وہ خود تعلیمی اصولوں کا ایک چلتا پھرتا تابوت ہو۔ وہ ہیڈ ماسٹر جو آپ کا اسکولی زندگی کے پہلے دن ہی ایک مربیانہ انداز میں تپک کے ایک گوشہ میں لے جائے اور تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس انداز سے کہ گویا تعلیمی زندگی کے معنوں کو ایک تو اس نے سمجھا ہے اور کچھ کچھ اس کی امداد سے تم سمجھنے کی کوشش

کر رہے ہو۔ وہ یہ کہے گا دیکھو بھیا! اپنے ٹریننگ اسکول کی باتوں کو ذرا تہہ کر کے رکھ دو۔ تمہارے سامنے یہ اصل زندگی ہے زندگی، یہاں ٹریننگ کالج کی ہوائی باتوں سے قلعہ سر نہیں ہوتا۔ بچوں کو پڑھانے کا بس ایک ہی طریق ہے۔ میاں باقی جتنے طریقے تم نے سیکھے ہیں وہ ان نئی تعلیم والوں کے چونچلے ہیں جیسے ہمارا خدا ایک ہے اور رسول ایک ہے پڑھانے کا طریق بھی ایک ہے اور وہ ہے ضبط اور اس کے گُر دو ہیں۔ ایک تو لونڈے کو جماعت میں کبھی شرارت نہ کرنے دو اور دوسرا ذرا کلاس کو دیکھنا یہ بہت اہم ہے اگر اسے نظر انداز کر دو گے تو دھوکا کھا جاؤ گے۔ دوسرا یہ کہ کسی بچے کو جماعت میں کبھی سونے نہ دو۔ اگر تم نے ان دونوں اصولوں کا دھیان رکھا تو دیکھ لینا کہ چند روز میں بچوں کا ناک میں دم آ جائے گا واللہ ناک میں دم اور وہ جماعت میں صرف وقت گزارنے کے مقصد سے اس بے جگری سے کام کریں گے گویا زر خرید غلام ہیں یہ ہے تیس سال کے تجربے کا نچوڑ۔ میرے دوستو! تم نے شاید پولیس کے تھرڈ ڈگری طریقے تو سنے ہوں گے یہ تعلیمی تھرڈ ڈگری ہے۔

اور اپنے نارمل اسکول کے جوش و ولولہ کے بعد یہ برفانی غسل۔ اس سرد آبی کے بعد جب اپنے ساتھیوں اپنے شرکائے کار کو دیکھو گے تو نظر آئے گا کہ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جن میں زندگی کا شرارہ بھڑکا کیا سکیاں بھی نہ لیتا ہوگا بلکہ سالوں پہلے جل بجھ کر ٹھنڈی راکھ بن چکا ہوگا یہ لوگ کم تنخواہ پر کام کر رہے ہوں گے اور اس کمی کا احساس ان کے چہروں پر نمایاں ہوگا نہ تو ان کے ماتھے پر عزم صحیح، نہ ان کی نگاہوں میں جوش اور ولولہ نہ وہ چمک اور ذہنی جھلک جو نئی پود کے قائدین اور ان کے راہنماؤں کا حصہ ہوتی ہیں۔ استادی کا پیشہ ان کے لئے کیا ہے ایک طوفان سے بچے ہوئے کی آخری پناہ گاہ کشمکش کا وہ طوفان جس کی تباہ کاری اپنے پیچھے نہ تو ذہن بیداری چھوڑتی ہے اور نہ علمی ذوق ہی!

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ یہی لوگ اپنے مدرسوں میں طلبا کی برادری کے شاندار ستارے تھے۔ ان کے دل بھی جوش اور ولولہ سے لبریز تھے انھوں نے بھی اعلیٰ امتیازات حاصل کئے تھے۔ ان کے سینوں میں بھی زندگی کا طوفان اپنی قوت سے تلاطم خیز تھا۔ ان میں بھی شوق عمل تھا ذوق جستجو تھا اور اب کیا ہیں۔ اب مدرسے نے انھیں ایسے چوس لیا جیسے کسی ندیدہ بچے نے سنگترے کی پھانک کو چوس لیا ہو۔ انھوں نے اسکولی زندگی کا تھکا دینے والا آٹ مرکب کر بھی لیا اور اس طول طویل سفر کو پورا کرنے کے بعد ان کے سامنے کیا تھا ایک کمایہ نیشن یا پراویڈنٹ فنڈ۔

سا نخلستان!!!

تمہارے سامنے پورا مدرسہ ہوگا اس کا پورا ماحول ہوگا تمہیں محسوس ہو رہا ہوگا کہ پورے منظر پر اداسی پڑی ہوئی ہے وہ اداس جو گرم سے گرم جوش کو بھی ٹھنڈا کر سکتی ہے لیکن شاید اس افسردگی میں کسی ایک نے اپنے دل کی حرارت کو محفوظ رکھا ہو۔ کوئی ایک ایسا شریک کار جو اس تاریک ماحول میں بھی زندگی کی مدہم لَو کو دونوں ہاتھوں سے اوٹ کئے ہوئے سینے سے لگائے کھڑا ہو شاید ایک دن وہ تمہارا دامن پکڑ کر کھڑا ہو جائے۔ اس کی وہ آنکھیں جن میں زندگی کی جھلک مدھم پڑتی جاتی ہو۔ ایک لمحے کے لئے چمک اٹھیں اور روشنی کے مینار کے اس پاسبان کی طرح جو تن تنہا ایک سنسان جزیرے سے بھٹکتے ہوئے ملاحوں کو راستہ دکھا رہا ہو۔ روح کی اس خوفناک تنہائی میں جہاں وہ اپنے آپ سے ہی بات کرتا ہوا گھبراتا ہو شاید ایک دن وہ تمہارا دامن تھام لے اور کہے کہ دوست آج میں تمہیں سچ سچ بتا دینا چاہتا ہوں۔ سب کچھ سچ سچ اپنی روح کی بھلائی کے لئے سب کچھ سچ سچ اگر سچ پوچھو تو اب تک ہم نے کبھی کسی روح کی بھلائی کی پرواہ تک نہیں کی تھی مگر خدا جانے آج رہ رہ کر مجھے تمہارا خیال کیوں آ رہا ہے اور اس لئے میں تم سے دو باتیں کر لینا چاہتا ہوں۔ میرے جوان دوست میں تم سے دو باتیں کہہ دینا چاہتا ہوں بس ایک اور وہ یہ کہ یہاں سے بھاگو خدا کے واسطے یہاں سے کہیں باہر نکل جاؤ۔ ایسی تیزی سے اتنی کوشش سے نکل جاؤ جیسے کہ تم اپنی جان بچا کر بھاگ رہے ہو۔ میرے عزیز یہ تمہارے جسم کا مسئلہ نہیں یہ تمہاری روح کا سوال ہے بھاگو جلد بھاگو اس سے پہلے کہ اس ادارے کی زندگی کا سایہ تمہاری روح پر پڑنا شروع ہو جائے۔ اگر نہ جاگو گے تو دیکھ لینا ایک سال تک نہ تم ہو گے نہ تمہاری روح۔ تم مجھے اور دوسروں کو زندہ سمجھ رہے ہو کیسی بھلی خوش فہمی ہے۔ میرے دوست ہم تو مردہ ہیں سولہ آنے مردہ ہیں ہم تو سالہا سال سے مردہ چلے آ رہے ہیں اور دیکھو میں تمہیں یہ بات ہرگز نہ بتاتا لیکن کیا کروں سالہا سال کی مردنی سے میرے دل میں ہوک اٹھتی ہے جیسے زندگی کی آخری منزلوں میں ڈگمگا رہا ہوں میں کیا اور کیا میری زندگی! مگر تم جو اس سفر میں ابھی نئے شوق سے قدم بڑھا رہے ہو خدا نہ کرے کہ تمہیں نظر لگ جائے میں یہ سب باتیں تم سے ہرگز نہ کہتا مگر میرے دوست برسوں کے المیہ اور دردناک تجربے نے ان پر حقیقت کا رنگ دے دیا ہے میری زندگی کے جذبہ بالا نخل میں وہ داغ دے دیئے ہیں کہ بچے کے بھی خود ہی تو سب جانتا ہوں میں خود نہیں سمجھ سکا کہ میں تمہیں خواہ مخواہ کیوں تنگ کر رہا ہوں مگر

اب جو میں نے شروع کیا ہے اس کو سن لو دیکھو بعد میں یہ نہ کہنا کہ تم سے کسی نے کہا نہ تھا"

میرے دوستو! پہلے مسائل ہمارے اصول تعلیم کے مسائل تھے یہ ہماری عملی تعلیم کے مسائل ہوں گے۔ ان مسائل سے گھبرانا جانا سنا ہے کہ دریا کا بدترین تلاطم نزدیکی ساحل کا پتہ دیتا ہے اور رات کا تاریک ترین حصہ صبح کے اجالے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

تعلیمی دنیا میں ایک نیا ستارا۔ ایک نیا آسمان اُبھرتا چلا آ رہا ہے۔ یہ ستارہ آزادی بچے کی آزادی کا ستارا ہے کسی نے کہا ہے کہ انیسویں صدی انسانیت کی جمہوریت کی صدی ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بیسویں صدی بچہ کی آزادی کی صدی ہے۔ اس ستارے کی کرنیں ابھی ابھی افق سے اوپر روشن ہو رہی ہیں۔ انھوں نے اب تک ان اداروں کو جگمگایا ہے جو ہماری تعلیمی دنیا کی چوٹیوں پر بنے ہوئے ہیں۔ ابھی اس کی گرم محبت بھرے بوسوں نے ان کے میناروں اور گنبدوں پر کندن جیسا رنگ ڈورا دیا ہے۔ مگر دوستو! فطرت کے کوہساروں میں بھی ایورسٹ یا کنچن جنگا تو ایک دو ہی ہوتی ہیں مانا کہ ان کی بلندیوں میں ایک رومان ہے ان پر آکاش کے دیوتا آنکھ مچولی کھیلتے ہیں مگر اصل زندگی کی شادابیاں۔ اس کے گرجدار نغمے اس کی سنگین دشواریاں، اس کی جاندار پرشکوہ آبشاروں کی گونج وادیوں میں ہی ہوتی ہے میرے دوستو! ہمارے ملک کی تعلیمی وادی بھی وادیٔ مرگ سے کم نہیں۔ اس نئی صبح کا دھندلکا ابھی تک اس کی بے پناہ گہرائیوں اس کی دھند اور اندھیارے کو پار نہیں کر سکا ہے ابھی تک تو صرف اتنی روشنی ہے کہ جس سے ہمارے اندھیرے کا اور بھی احساس اس ظلمات کا اور بھی بھاری بھرکم بوجھ پڑ گیا ہے۔ میرے دوستو! اسی احساس اسی بے چینی۔ اسی موجودہ تعلیمی حالات سے ردعمل میں ایک نئی تعلیم بلکہ ایک نئی زندگی کا پیغام چھپا ہوا ہے۔

ابھی تک صبح کے دم سے وادیوں کے رہنے والوں پر کہیں لمبے لمبے گہرے گہرے سایے پڑ رہے ہیں جو آہستہ آہستہ کم ہوتے جا رہے ہیں کہیں کہیں کسمساہٹ کہیں کچھ بے چینی سی پیدا ہو رہی ہے۔ اس وادی کے ایسے گوشے ہیں جہاں رات کی تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ رات نیند کے ماتوں کی رات نہیں ہے۔ یہ ایک پریشان کن اندھیرے کی رات ہے نیند کے ماتوں سے تو یہ بھی امید ہے کہ صبح اٹھتے ہی تازہ دم ہو کر منزل مقصود کی راہ لیں گے یہ تاریکی جو ہمارے ادھ کچے، خام اور گنگا جمنی تعلیمی نظریے اور عمل کی تعبیر ہے اس اندھیرے میں نیک اور مخلص لوگ ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ اس اندھیرے میں ہم طلبا کو ایک ہی ڈگر پر ہانکنا چاہتے ہیں۔ اس اندھیرے

میں ہیں اس آسانی کو کا پتہ نہیں چلتا جو ہر ننھی سی جان کے سینہ میں روشن ہے کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ یہ اندھیرا رٹائے ہوئے سبقوں۔ طوطے کی پڑھائی کا۔ بے سمجھ اور سخت گیر ضبط کا، اندھا دھند مشق یا زبانی کام کا اندھیرا ہے۔

ان حالات میں استاد کا کام کیا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ اس اندھیرے میں بھی اپنی نگاہ ان ستاروں پر لگائے رکھے جو دور سے اسے منزل مقصود کا پتہ دے رہے ہیں لیکن میرے دوستو جو ستاروں پر ہی نظر جمائے رکھے گا ممکن ہے کبھی ٹھوکر کھا کر گر جائے۔ یہ سچ ہے کہ ہماری نگاہ ستاروں پر ہی ہونی چاہئے مگر دوستو ہماری زمین بھی تو ایک ستارہ ہے۔ اچھا استاد، کامیاب استاد وہی ہے جو سماوی ستاروں اور ارضی ستارے کے بیچوں بیچ وہ راستہ ڈھونڈ نکالے جو کہکشاں کی طرح اسے منزل مقصود تک پہونچا دے۔

میرے دوستو تعلیمی شاہراہ پر سب سے روشن اور سب سے شاندار روشنی کا مینار تعمیر حیات کا مینار ہے دوسرے مانیں یا نہ مانیں مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ استاد کا پہلا اور سب سے اہم فرض تعمیر حیات ہے انسان کو انسان بنانا ہے۔ اس کا کام تعمیر حیات ہے اس کی مرمت نہیں ہے۔ اس کی بخیہ گری یا ٹکل لگانا نہیں ہے جسم انسانی کی رفوگری یا کفش دوزی طبیبوں کے حصہ میں آئی ہے مگر استاد کا کام صحیح معنوں میں تعمیر حیات ہے۔

تعلیم کا عمل دو دھاری تلوار ہے اور اس کے دو پہلو ہیں۔ جہاں ایک طرف استاد بچہ کی تعمیر حیات میں مشغول ہے۔ دوسری طرف بچہ ایک حد تک ایک چھوٹے پیمانے پر لیکن شاید زیادہ موثر انداز میں تعمیر حیات کے کام میں مصروف ہے۔ وہ تعمیر حیات کس کی ہے استاد کی! شاید اپنے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر لوگ اس بارے میں اختلاف کریں لیکن ایک ٹریننگ کالج کے استاد کی حیثیت سے ذاتی تجربہ کی بنا پر میں تو یہی کہونگا کہ بچوں نے اپنی ہمت سے ان نوسیکھوں (یعنی پیوپل ٹیچر) کو اکثر استاد کیا انسان تک بنا دیا ہے

ملا شدن چہ آساں انساں شدن چہ مشکل!

یہ تو آپس میں ادلے کا بدلہ ہے۔ آپ بچوں کو انسان بنانے کی کوشش کریں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ وہ بھی آپ کو ٹریننگ اسکول سے نکلتے نکلتے انسان بنا کر چھوڑیں گے اور دوستو یہ انسان بنانے کا عمل کانی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس انسانی عمل کے قطرات میں نے (پسینہ کی شکل میں) اکثر نوسیکھیوں کے منہ سے ٹپکتے دیکھے ہیں اور انھیں انھی چہاؤں سے صاف ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے جو اتفاقاً چاک کے سفید پوڈر سے بھرا ہوا استاد کے ہاتھ آگیا تھا

میرے دوستو! ایک استاد کی شخصیت کا اثر گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ یہ اثرات کسی کھاری جھیل کی تہہ میں ان شیریں چشموں کی طرح ہوتے ہیں جو اَن دیکھے اپنا خوشگوار عمل دن رات جاری رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی تنہائی اور یادوں کی اندھیاری میں ایک بجلی سی چمک جاتی ہے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے گزشتہ ایام کی کوئی تصویر ابھر کر ذہنی پردے کے سامنے جلوہ آرا ہو جاتی ہے۔ یہ تصویر ہے کسی پرانے استاد کی جس نے روزمرہ کے تدریسی چکر سے ذرا اوپر اٹھ کر زندگی کے ستار کو اس جوش اور گہرائی سے چھیڑا کہ اس کی لرزش اب تک روح کے تاروں کو مرتعش کر رہی ہے۔ اگر ہم ایسی یادوں پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ ان لمحوں میں ہمارے ذہن میں نصاب کا کوئی ایسا مضمون نہیں آتا جو اس استاد نے پڑھایا تھا۔ نصابی عنصر زیادہ دیرپا نہیں ہوتے بلکہ اکثر اوقات تو ہم ایک حد تک لکھا پڑھا بھلا دینا چاہتے ہیں اور نہیں بھلا سکتے تعلیمی یادوں کا دیرپا اور مستقل پہلو وہ گہرا اثر ہے جو ایک زوردار استاد کی شخصیت اپنے طالب علم پر چھوڑ جاتی ہے بقول ایک مصنف کے اس اثر کے تحت اس نوجوان میں ایک نئے انداز کی ہستی تخلیق ہو جاتی ہے لیکن کتنے استادوں کو پتہ ہے کہ وہ کتنے نوجوانوں کے دلوں میں کتنے انسانوں کی زندگیوں میں دوبارہ جنم لے رہے ہوتے ہیں اور ابدی زندگی پائے ہوتے ہیں۔ اگر ہم اپنی زندگی کے دوسرے واقعات پر غور کریں تو ہمیں محسوس ہو گا کہ اس قدر گہرے اثرات دوسرے واقعات کم چھوڑتے ہیں بہت کم۔ اکثر ادب یا آرٹ کا کوئی شاہکار، بچپن میں چھوٹی ہوئی والدہ کی یاد یا کوئی نفسیاتی زلزلہ جس نے زندگی کی بنیادیں تک ہلا ڈالی ہوں۔

کسی استاد کا ایک طالب علم جب قوم کا محبوب قائد بن گیا تو اس کی شہرت سن کر استاد نے کہا تھا کہ طورِ سینائے علم سے موسیٰ کی طرح ہم کلام تو میں ہوا تھا میرے شاگرد نے تو ہارون کا کام کیا ہے۔ اس نے وہ پیغام قوم کو پہونچا دیا اور بس۔ میرے دوستو اگرچہ اس جملہ میں ایک قابل معافی خود پسندی کی جھلک ہے لیکن کچھ نہ کچھ حقیقت بھی ضرور ہے۔

استاد کو یاد رکھنا چاہئے کہ اس کے الفاظ یاد رہیں گے۔ مدتوں نہیں شاید صدیوں۔ میرے دوستو کوئی نیکی کا کام کوئی نصیحت کا بیج بیکار نہیں جاتا۔ ایک دفعہ ایک نوجوان کسان نے کرسچن کولڈ ڈنمارک کے کسان استاد سے کہا کہ آپ کی باتیں سننے میں لطف تو بہت آتا ہے لیکن بعد میں آپ کے الفاظ یاد نہیں رہتے۔ بار بار کوشش کرتا ہوں مگر ملتے ہی نہیں۔ کولڈ بولا۔ کوئی بات نہیں یہ الفاظ کہیں گم نہیں ہوتے کہیں نہ کہیں تم میں ہی موجود ہیں

اپنے وقت پر وہ خود بخود دیپو لیں پھلیں گے اور تمہیں پتہ بھی نہ ہوگا کہ وہ کہاں ہیں جب تم گیہوں بوتے ہو تو تمہیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ بیج کہاں گرے مگر تاہم وہ اُگتے ضرور ہیں۔"

اور پھر میرے دوستو! الفاظ بھی تو آخر کار ایک ظاہری لباس ایک اوپری سجاؤ ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ ظاہری چیز اینٹ اور گارے کا گھر زندا بن جائے جو اس من مندر کی قندیل کی کرنیں اپنے میں ہی سمٹ لے یہ لباس بھی ان رنگین پردوں کا۔ ان روحانی لطیف نیتوں کا ہونا چاہئے جو حسن روح کی رنگینی کو دوآتشہ کر دکھائے لیکن پھر بھی لباس آخر لباس ہے۔ جب تک لباس والا نہ ہو تو لباس کیا کام آئے گا۔ میرے دوستو دیکھنا یہ ہے کہ ان الفاظ کی روح کیا ہو وہ روح جو اکثر اپنا لباس خود بنا لیتی ہے۔

روح اور الفاظ، جذبہ اور پرجوش طریق اظہار۔ یہ دو اصول ہیں جن کی امداد سے معلمین نے قوموں کو زندہ کیا ہے وہ بیانیہ طریقہ یا لکچر میتھڈ جو ہر ٹریننگ اسکول اور کالج کے لئے تختۂ ستم ہے ان کے ہاتھ میں کامیاب ذریعہ گرنٹ وگ ڈنمارک کا معلم جس نے اپنی قوم کو پچھلی صدی میں نئی زندگی بخشی انہیں دو اصولوں کے ذریعہ اپنی قوم کو بیدار کر رہا تھا ایک تو اس کے پیغام میں عوام کی روح پوشیدہ تھی اور دوسرے اس کے زندہ اور جاندار الفاظ۔ زندہ الفاظ سے اس کی مراد اس ذاتی تعلق اور جذبہ سے تھی جو استاد کے سینے سے بچہ کے دل میں گھر کرتا ہے اور اس کے من کے مندر میں، اس کی اس مقدس عبادت گاہ پر زندہ شعلہ بھڑکا دیتا ہے۔

گرنٹوگ کے نزدیک استاد ایک اونچی روحانی قوت کا ذریعہ اظہار اور آلہ کار تھا۔ اس کے ذریعہ سے روحانی دنیا کی تڑپا دینے والی قوت ہماری دنیا میں زندہ اور جاندار الفاظ کے دھارے میں بہہ کر آرہی تھی اس کا طریق تدریس یہ تھا کہ سب سے پہلے استاد دل کو بیدار کرنے والے ترنم اور نغمے سے تعلیم شروع کرے۔ اسے انتہائی روشن اور زندہ تقریروں کے ذریعہ پڑھانا چاہئے۔ اس کے لکچر میں زندہ واقعات جگمگا رہے ہوں۔ اس طریق پر پڑھانے سے وہ محض فکر اور سمجھ کو اپیل نہ کرے بلکہ اس کا ہر لفظ روح کے بند دریچوں پر ایک ٹھوکا ہو۔

اور جب استاد دیکھے کہ اس کی روح کی گہرائیوں میں زندہ الفاظ تڑپ رہے ہیں اور قوت اظہار کے لئے بیتاب ہو رہے ہیں تو وہ اطمینان رکھے کہ اس کے الفاظ وسرزمین پر نہیں پڑیں گے ایک دہکتے

ہوئے انگارے کی طرح کہیں تو اقدار کی خس و خاشاک میں آگ لگا دیں گے۔ اسی خاک سے زمین پھر ایک دفعہ زندگی خیز اثرات سے مترنم ہو جائے گی اور اس میں تازہ پھول لہلہانے لگیں گے اور کہیں یہ شعلہ بجلی کے ان پوشیدہ مجمروں کی طرح ہو جائے گا جو بن دیکھے اپنی زندگی بخش حرارت پہونچا رہے ہوں۔

میرے دوستو! گرنڈوگ ایک شاعر معلم تھا اس نے شاعری کے انداز میں معلمی کی۔ ایک معلم کے انداز میں شاعری نہیں کی۔ وہ لکچر میتھڈ کا شاعر تھا، شاعر یعنی اپنے وجدانی قوت سے روح کو اپنا لینے والا! میرے دوستو اسی معنی میں ہم سب ایک حد تک شاعر ہو سکتے ہیں! ایک حد تک تخلیقی کارکن ہو سکتے ہیں جس حد تک میکانکی طریق عمل، روزمرہ کے چکر سے اوپر اٹھتے جائیں گے ہم تدریس کی زمین پر ایک شاعر ہوں گے۔ دوستو تم نے ڈالٹن پلان بھی پڑھا ہوگا۔ تم نے مانٹسوری میتھڈ بھی یاد کیا ہوگا۔ یہ سب بڑے کام کی چیزیں ہیں مگر وہ استاد کیا جو اپنا طریق اپنا ڈھنگ خود تخلیق نہ کر سکے۔ فن تدریس ایک آرٹ ہے اور استاد ایک آرٹسٹ! تمہیں بھی طریق تعلیم کے محدود لیکن دلچسپ دائرہ میں اس تخلیقی عمل کو جاری رکھنا ہوگا۔

تمہارا آرٹ اس قبیل کا آرٹ نہ ہوگا۔ جیسے ادب، مصوری یا سنگتراشی ہیں! ان میں آرٹسٹ کا مقصد اپنے روحانی تاثرات کا اظہار رہے۔ یہاں وہ اپنے مخصوص انداز میں، اپنے مخصوص ذریعہ اظہار میں اپنی روح کے اسرار کھول کے رکھ دیتا ہے۔ وہ پتھر یا الفاظ کو اپنی قوت متخیلہ کی امداد سے مجسم یا رنگین بنا دیتا ہے۔ ایک سنگتراش پتھر کو اپنے تخیل کے مطابق جیسا دل چاہے تراش سکتا ہے۔ مگر استاد بچے کو اس کی فطرت کے خلاف کوئی رجحان نہیں دے سکتا۔ اس کے برعکس استاد تو ایک ایسی فوج کا جرنیل ہے جو بچے کی روح کے میدان میں اخلاقی اور معیاری زندگی کے لئے جنگ کرتا ہے۔ اس کے دست و بازو بچے کے وہ رجحانات ہیں جو اس کے تعلیمی منتہائے خیال کے حصول میں اس کے معاون ہیں اور اس کے دشمن وہ میلانات ہیں جو اس کے راستے میں حائل ہیں اس کا فرض ان دشمن عناصر کا مقابلہ کرنا ہے اس جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایک جرنیل کو صرف طریق جنگ کا ہی پتہ نہ ہونا چاہئے بلکہ اسے میدان جنگ کے نشیب و فراز سے بھی واقف ہونا ضروری ہے اسے اپنے دستوں کو تازہ دم اور بلند ہمت رکھنا چاہئے انھیں محفوظ جگہوں اور مناسب کمین گاہوں میں رکھنا چاہئے۔ دشمن کی طاقت کا اسے اندازہ ہو اور وہ حملے کے لئے ہمیشہ اچھے موقعوں کی تلاش میں ہو کہ شکست خاطر

کی رائے میں تعلیم کا آرٹ یہ ہے۔

لیکن میرے دوستو! تعلیم کا آرٹ محض جنگ کا آرٹ نہیں حقیقی معنوں میں یہ امن کا آرٹ ہے۔ اگر ہم اس کے عملی پہلو سے گزر کر اس کے نتائج اور اس کی کامیابیوں پر غور کریں تو ہمارے لئے ایک اور تشبیہ شاید زیادہ کارآمد ثابت ہوگی۔

میری رائے میں جس آرٹ سے معلمی کا پیشہ سب سے زیادہ ملتا جلتا ہے وہ باغبانی کا آرٹ ہے یہ تعلیمی کہانی کی وہ تاریخی تشبیہ ہے جس میں نئی تعلیم کی تحریک کے کئی ایک پہلوؤں نے جنم لیا ہے۔ میری رائے میں تو معلمی کا اصل آرٹ اس ڈنمارک کے آزاد مدرسوں کے اس استاد کا آرٹ تھا جو انسانوں کی تربیت ان پودوں کی طرح کرتا تھا جنھیں مدت سے نہ پانی ملا ہو نہ زندگی۔ اس کے اثر سے بچوں میں یوں معلوم ہوتا تھا گویا زندگی کے گہرے اور تاریک سایے ان پر اُٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی بہترین خصوصیات روشن ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو چلی ہے اور ان کے چہروں پر زندگی کی سرخی دوڑ چکی ہے۔"

دوستو یہ ہے زندگی کا تخلیقی آرٹ!

عبدالغفور صاحب ایم۔ اے
ٹریننگ کالج علی گڑھ

اقبال اور کارل مارکس

فلسفہ کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف فلاسفروں نے قدرت اور اس کی نیرنگی کو مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھا اور جیسے جیسے علم ترقی کرتا گیا اور انسانی فکر میں گہرائی آتی گئی یہ زاویۂ نگاہ بھی بدلتا گیا حقیقت یہ ہے کہ کسی شئے پر غور کرنے کے بعد صحیح نتیجہ نکالنے کے لئے یہ امر بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھا جارہا ہے ــــــ زاویۂ نگاہ کی اہمیت سمجھنے کیلئے چاند گرہن کی مثال لیجئے۔ چاند گرہن کے موقع پر سائنسداں مختلف ممالک کے رصد خانوں سے چاند کو دیکھتے ہیں لیکن چونکہ مختلف ممالک مختلف سمتوں میں واقع ہوتے ہیں اس لئے ہر سائنسداں چاند اور دوسرے ستاروں کو مختلف زاویہ سے دیکھتا ہے اور مختلف نتیجہ پر پہونچتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہندوستان کا دیکھنے والا ٹھیک زاویہ سے دیکھ رہا تھا اس لئے درست نتیجہ پر پہونچا اور جاپان والے کا زاویہ چونکہ درست نہ تھا وہ بہت سی ایسی الجھنوں میں پڑ گیا جو در اصل الجھنیں نہیں تھیں بلکہ غلط زاویۂ نگاہ تھا۔ اس مثال سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ کسی شئے کو درست زاویہ سے دیکھنا درست نتیجہ پر پہونچنے کے لئے بہت اہم ہے۔

آج سے تقریباً دوسو سال قبل اس زمانہ کی معلومات کی کمی کے سبب سے فلسفہ دانوں کا زاویہ نگاہ موجودہ دور کے زاویہ سے بالکل جدا تھا۔ وہ قدرت کو بے حس و حرکت سمجھتے تھے ان کے نزدیک دنیا بے حس و حرکت اور ساکت اشیاء کے مجموعہ کا نام تھا اور ہر شئے کی نوعیت دوامی تھی لیکن وقت گذرنے پر علم کی ترقی کے ساتھ یہ نظریہ بدلتا گیا اور آخر کار چند فلسفہ داں جن میں مارکس بھی تھا اس نتیجہ پر پہونچے کہ قدرت اور اس کے کارخانہ میں عمل اور ردعمل کا قانون کام کرتا ہے۔ ہر شئے ادلتی بدلتی بنتی بگڑتی، پیدا اور فنا ہوتی رہتی ہے قدرت میں سکوت نہیں روانی ہے، قیام نہیں سفر ہے اور ہر شئے بھی ارتقاء کر رہی ہے وہ ایک قانون کے مطابق کر رہی ہے۔

قدرت اور اس کے کارخانہ کو جدید زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مارکس کو اس دنیا میں ایک

نئی دنیا نظر آنے لگی اور اس نے اپنا ایک نظریہ پیش کیا جس میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ ہر وہ شے جو ارتقا کی منازل طے کر رہی ہے ایک خاص اصول کے مطابق ترقی کر رہی ہے۔ ارتقا کے اس اصول کو مارکس نے جدلیات کا نام دیا۔ اب[1] یہ دیکھنا ہے کہ جدلیات کا نظریہ کیا ہے اور علامہ اقبال کے کلام سے اس نظریہ کی تائید کہاں تک ہوتی ہے۔

جدلیات کا نظریہ | فی زمانہ کارل مارکس کے اس خیال سے تو سب کو اتفاق ہے کہ دنیا انفرادی اور بے تعلق اشیاء کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ بہت سے عملوں (Processes) کا مجموعہ ہے جس میں سے ہر ایک نہ صرف بذاتِ خود ارتقا کی منازل طے کر رہا ہے بلکہ ایک دوسرے پر عمل کرکے ایک دوسرے کو بدل رہا ہے یہاں یہ غور کرنا ہے کہ جو شے ترقی کرتی ہے اس میں ارتقائی حرکت کیسے پیدا ہوتی ہے۔ کارل مارکس کہتا ہے کہ ہر شے جس میں ارتقا ہوتا ہے دو تکراروں سے مرکب ہوتی ہے یہ تکراریں کسی شے میں آلاتی طریقہ پر ملی ہوئی نہیں پائی جاتیں کہ ان کو وقتِ ضرورت الگ الگ کر دیا جائے۔ بلکہ جس طرح جزو لاتیجزا (Atom) میں انکاری قوت (Negative Energy) اور اقراری قوت Positive Energy کے ستون (Poles) ایک دوسرے میں ضم ہوتے ہیں اور ان کو جدا کرنا ممکن نہیں اسی طرح یہ تکراریں بھی ایک دوسرے میں ضم ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں دوسری مثال جبر المقابلہ سے دی جا سکتی ہے کہ جس طرح (ا۲) میں ا اور اس کی تکرار (-ا) نہاں ہوتی ہے اسی طرح کسی شے میں اس کی تکرار پوشیدہ ہوتی ہے اگر و کو و سے ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب و۲ آتا ہے اور اگر اس کی تکرار (-و) کو (-و) سے ضرب دیں تب بھی (و۲) حاصل ضرب آتا ہے (و۲) ایک ایسی وحدت ہے جس میں +و بھی پوشیدہ ہے اور اس کی تکرار -و بھی۔ ایک روشن مثال زندگی اور موت کی ہے۔ زندگی میں اس کی تکرار موت پوشیدہ ہے۔ جدید تحقیقات کی بموجب انسانی جسم خلیات (Cells) کا مجموعہ ہے جس میں ہر لمحہ نئے خلیے پیدا ہو رہے ہیں اور پرانے مر رہے ہیں اور اگر انسانی جسم میں موت و زندگی کی یہ تکرار بند ہو جائے تو ارتقا ختم ہو جائے اور آدمی مر جائے۔

---

[1] جدلیات کا نظریہ دراصل ہیگل کا نظریہ ہے اور مارکس نے اسے ہیگل ہی سے حاصل کیا۔ البتہ سماجی اقدار پر اس نظریہ کا اطلاق مارکس ہی نے کیا۔ (مدیر)

کارل مارکس کہتا ہے کہ جس طرح انکاری قوت اور اقراری قوت آپس میں ایک دوسرے کی تکرار میں اور ان کی کش مکش روشنی پیدا کرتی ہے اسی طرح جو شئے قوت ارتقا کے راستہ پر گامزن ہے اور اس میں دو تکراریں پیدا ہوتی ہیں جن کی آپس کی کش مکش اس شئے کو ارتقائی حرکت دیتی ہے۔ مثلاً مارکس کہتا ہے کہ سرمایہ داری ایک وحدت ہے جس کی نوعیت تکراری ہے یعنی اس میں طریق پیداوار تو اجتماعی ہے لیکن ملکیت انفرادی ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ بہت سے مزدور مل کر ایک شئے پیدا کرتے ہیں جس کا واحد مالک سرمایہ دار ہوتا ہے۔ چونکہ مزدور اور سرمایہ دار ان دو تکراروں کے نمائندہ ہیں اس لئے ان میں کشمکش ہوتی رہتی ہے جو سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کو اشتراکی طریق پیداوار کی طرف لے جا رہی ہے۔ دوسری مثال لیجئے مزدور ایک وحدت ہے اس میں دو تکراریں پوشیدہ ہیں یعنی وہ جنس بھی پیدا کرتا ہے اور نہیں بھی کرتا کیونکہ جب وہ کوئی جنس بناتا ہے تو وہ جنس کارخانہ دار کو سپرد کرنے پر مجبور ہے۔ یہ تکرار مزدور کو اپنے ارتقا یعنی انقلاب پر مجبور کرتی ہے۔ فلسفہ دان مندرجہ بالا خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ وحدت کو ارتقائی حرکت دوئی دیتی ہے یعنی وحدت میں اس کی تکرار کثرت پوشیدہ ہوتی ہے اور یہ کثرت ہی ہے جو وحدت کو ارتقائی حرکت دیتی ہے۔ زندگی کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

مذاق دوئی سے بنی زوج زوج اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج

لیکن جو تکراریں وحدت کو ارتقائی حرکت دیتی ہیں خود اس وحدت سے جدا نہیں کی جا سکتیں وہ تکراریں اسی وقت تک زندہ ہیں جب تک ان میں وحدت ہے۔ مثال کے طور پر مزدور اور سرمایہ دار ایک دوسرے کی تکراریں ہیں لیکن اسی وقت تک یہ دونوں جماعتیں قائم ہیں جب تک کہ سرمایہ داری قائم ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کئی جماعتوں سے مرکب ہے اور سب جماعتیں سرمایہ داری کے واحد رشتہ میں منسلک ہیں۔ اس نکتہ کو فلسفیانہ زبان میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ وحدت میں کثرت ہے اور کثرت میں وحدت۔

ان مثالوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تکرار سے کیا مراد ہے۔ وحدت میں کثرت ہونے اور کثرت میں وحدت ہونے کے کیا معنی ہیں اور تکراروں کی آپس میں کش مکش سے کس طرح ارتقائی حرکت پیدا ہوتی ہے اب ہم مارکس کے جدلیات کے نظریہ کو چار ٹکڑوں میں تقسیم کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال

جدلیات کے نظریہ سے کہاں تک متفق تھے

کارل مارکس کہتا ہے:۔

۱۔ کائنات میں ارتقاء کا قانون کام کرتا ہے

۲۔ وحدت میں کثرت ہے

۳۔ کثرت میں وحدت ہے

۴۔ ارتقائی حرکت تکراروں کی کشمکش سے ہوتی ہے۔

اب دیکھئے کہ اقبال کا ان چاروں باتوں کی بابت کیا خیال تھا۔

۱۔ کائنات میں ارتقاء کا قانون کام کرتا ہے۔

اس مسئلہ کی بابت علامہ فرماتے ہیں۔

زیبِ نظر ہے سکون و ثبات ۔۔۔ تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود ۔۔۔ کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی ۔۔۔ فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

ان اشعار میں علامہ نے صاف طور پر کہدیا ہے کہ دنیا کی اشیا میں جمود کی طرح آلاتی حرکت نہیں ہے بلکہ ارتقائی ہے جو کاروان وجود کو ہر لحظہ تازہ شان دیتی ہے۔ انسانی زندگی میں اگر کوئی راز پوشیدہ ہے تو وہ یہ ہے کہ اس میں ذوق پرواز ہے یعنی وہ ارتقاء کی منازل طے کرنا چاہتی ہے۔ اس خیال کو شاعر مشرق نے بار بار دہرایا ہے اور اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ علامہ کائنات کے سکون و ثبات کو زیب نظر سمجھتے تھے لیکن کائنات میں انسانی اور سماجی زندگی بھی شامل ہے۔ سماجی زندگی میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے جو سماج کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے رسم و رواج بدلے لیکن چونکہ کسی قوم کے آئین و قوانین، رسم و رواج، تمدن و تخیل کا بہترین مظہر اس کا مذہب ہوتا ہے اس لئے سماجی ارتقا کے ساتھ ساتھ مذہب کو بھی بدلنا پڑتا ہے یا یہ کہئے کہ مذہب میں اجتہاد کرنا پڑتا ہے چنانچہ مذہبی معاملات میں علامہ اقبال اجتہاد کے بڑی شد و مد سے قائل ہیں۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اجتہاد کا قائل ہونا اس امر کا اعتراف کرنا ہے کہ مذہب کو کھینچ تان کر کئی دور کے وقتی تقاضوں کے

مطابق کیا جا رہا ہے۔ ہر دور میں مذہب کی جو نئی تفسیر کی جاتی ہے اس کی تہہ میں بھی یہی امر پوشیدہ ہوتا ہے کہ ہر دور کا زاویۂ نگاہ و فلسفہ بدلتا رہتا ہے اور اس امر کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی ہے کہ مذہبی کتاب کی تفسیر اس طرح کی جائے کہ وہ موجودہ دور کے زاویۂ نگاہ، فلسفہ و ذہنی ارتقاء اور وقتی تقاضوں اور رجحانات کے مطابق ثابت ہو جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ بنیادی شے کونسی ٹھہری۔ آیا کسی دور کا فلسفہ و زاویۂ نگاہ اور رجحان یا مذہب؟ ظاہر ہے کہ اول الذکر بنیادی اشیاء ہیں کیونکہ ان کی مطابقت میں مذہب کو لایا جاتا ہے۔ اگر یہ استدلال درست ہے تو مذہب کی حیثیت بھی ارتقائی ہو جاتی ہے جو خود دنیا کے ذہنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ بدل رہا ہے

اب دوسرے مسئلہ کو لیجئے

۲۔ وحدت میں کثرت ہے۔

اس مسئلہ کی بابت علامہ فرماتے ہیں:۔

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر   مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر
یہ عالم یہ بت خانۂ شش جہات   اسی نے تراشا ہے یہ سومنات

یہ تو ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ کے نزدیک وحدت بھی اپنی تکرار کثرت میں اسیر رکھتی ہے اور یہ اسیری خارجی نہیں ہے بلکہ داخلی ہے کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ وحدت کثرت میں اسیر لیکن واقعہ یہی ہوتا ہے کہ جس طرح حرکت کے وقت ایک شے اپنی جگہ بھی ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی اسی طرح وحدت میں کثرت ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی ہوتی جب ہم قدرت کو اس کی اصل نوعیت میں دیکھتے ہیں تو ہم کو اس میں اتنی تکرار معلوم ہوتی ہے کہ ہماری پرانی منطق جس کا پہلا اصول یہ ہے کہ الف۔ الف ہی ہو سکتا ہے۔ ب نہیں ہو سکتا غلط معلوم ہونے لگتا ہے اور ہمیں نئی منطق کی ضرورت ہوتی ہے جس کی رو سے یہ ثابت کرنا ممکن ہو کہ ایک شے ہے بھی اور نہیں بھی ہے قدرت کی نیرنگی نے انسانوں کو مجبور کر دیا کہ ایسی منطق ایجاد کرے جس میں تکرار کی گنجائش ہو۔ مارکس نے یہ منطق ایجاد کی جس کا نام جدلیات ہے۔ دوسرے شعر میں اقبال نے صاف کہہ دیا کہ وحدت نے جو کثرت میں اسیر ہے یہ بت خانۂ شش جہات پیدا کیا یعنی دنیا کے ارتقاء کا انحصار تکرار پر ہے۔ ہر وقت میں تکرار ہوتی ہیں۔ جو ارتقاء کرتے کرتے ایک ایسی منزل پر پہنچی ہیں کہ ان میں سے

ایک نئی وحدت پیدا ہوتی ہے۔ اس نئی وحدت کی نوعیت پرانی وحدت سے جدا ہوتی ہے اور اب نئی وحدت کی نئی تکراریں پیدا ہوتی ہیں اور اسی طرح یہ بت خانہ شش جہات ترقی کرتا رہتا ہے۔

اب تیسرے مسئلہ پر غور کیجیے۔

۳۔ کثرت میں وحدت ہے۔

اس مسئلہ کی بابت علامہ اقبال فرماتے ہیں :-

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

من و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عین محفل میں خلوت نشیں

علامہ فرماتے ہیں کہ وحدت کو تکرار کی خو نہیں وہ تو اس کے ارتقا کا اصول ہے من و تو یعنی تکرار سے تو وحدت کو صرف انجمن آفرینی یعنی ارتقا مقصود ہے لیکن اس تکرار میں بھی وحدت ہوتی ہے جس طرح عین محفل میں خلوت رہتی ہے اسی طرح من و تو یعنی کثرت میں بھی وحدت رہتی ہے۔ یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ من تو، اور محفل و خلوت ایک دوسرے کی تکرار ہیں۔ اس مسئلہ پر بھی علامہ اقبال کارل مارکس کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں۔

اب آخری بات کو لیجیے :۔

۴۔ ارتقائی حرکت تکراروں کی کشمکش سے پیدا ہوتی ہے۔

اس مسئلہ کی بابت علامہ فرماتے ہیں۔

دما دم رواں ہے یم زندگی
ہر اک شے سے پیدا رم زندگی

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دود

یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی

گراں گرچہ ہے صحبت آب و گل
خوش آئی اسے محنت آب و گل

علامہ فرماتے ہیں کہ ہر شے کا ارتقا تکراروں کی کش کش سے ہوتا ہے۔ بدن کی نمود اسی وقت ہوتی ہے جبکہ دو تکراریں آپس میں ارتقائی کش کش کریں اور یہ تکراریں ایک دوسرے میں اس طرح ضم ہوتی ہیں۔

جیسے شعلہ میں موج دود ارتقا اس اصول پر ہوتا ہے کہ ہر شے اپنی تکرار اپنے کنار میں لئے ہوئے ہوتی ہے ان دونوں کی آپس کی کش مکش سے ارتقائی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کو صحبت آب و گل گراں بھی گذرتی ہے اور خوش بھی آتی ہے۔ گرانی اور خوشی ایک دوسرے کی تکرار ہیں۔ اگلے شعر میں فرماتے ہیں کہ زندگی ثابت بھی ہے اور سیار بھی۔ سیار اور ثابت ایک دوسرے کی تکرار ہیں۔ کارل مارکس ایک جگہ اسی مسئلہ پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے کہ کسی شے کے اچھے پہلو کو برے پہلو سے جدا کر کے دیکھنا جدلیات کے نظریہ کے منافی ہے۔ اچھے اور برے پہلو ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ حق کے لئے باطل کا ہونا ضروری ہے۔ علامہ اقبال اس حقیقت کو مکالمہ جبریل و ابلیس میں ابلیس کی زبان سے یوں بیان کرواتے ہیں۔

میری جرأت سے ہے مشت خاک میں ذوق نمو — میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر — کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو؟
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے — قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟
میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح — تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

اس مکالمہ میں علامہ اقبال نے اس نظریہ کو کہ ارتقاء کے لئے تکرار ضروری ہے۔ صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ دنیا میں رزم خیر و شر جاری ہے۔ خیر و شر آپس میں ایک دوسرے کی تکرار ہیں اور اس تکرار سے مشت خاک میں ذوق نمو ہے یعنی انسان کے اخلاقی ارتقا کی محرک یہی تکرار ہے اور پھر علامہ اقبال کارل مارکس کے اس نظریہ کی بھی تائید کرتے ہیں کہ خیر و شر ایک دوسرے کے دل میں گھسے ہوئے ہیں۔ دل یزداں میں ابلیس کانٹا بنا ہوا ہے۔ خیر کے ارتقا کے لئے شر کا ہونا ضروری ہے۔ قصۂ آدم کو رنگین کرنے والا لہو رزم خیر و شر سے پیدا ہوتا ہے۔

نہ صرف ان چار مسئلوں میں اقبال اور مارکس ہم خیال معلوم ہوتے ہیں بلکہ ایک اور اہم نکتہ پر بھی اقبال مارکس کی تائید کرتے معلوم ہوتے ہیں کہ کارل مارکس کا خیال تھا کہ جس طرح ایک مرکب کے اجزا کی صرف مقدار میں فرق کر دینے سے اس مرکب کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ اسی طرح سے کسی شے کی تکراروں میں مقداری فرق ہو جانے سے ایک ایسی شے پیدا ہو جاتی ہے جو پہلی شے سے بالکل مختلف ہوتی ہے مثال کے

طور پر پانی لیجئے۔ اس کو آنچ دیجئے کچھ دیر تک جیسے جیسے پانی کو آنچ لگے گی وہ گرم ہوتا چلا جائے گا۔ فرض کیجئے کہ اس طرح پانی کی حرارت ۹۹ ڈگری ہو جاتی ہے۔ ایک ڈگری آنچ اور دی تب بھی وہ پانی ہی رہا لیکن جست لگانے کے قریب ہو گیا۔ اب ایک ڈگری آنچ اور دی اور پانی نے جست لگا کر اپنی نوعیت بدل دی۔ پانی بھاپ بن گیا۔ حالانکہ اس میں کوئی نیا جزو شامل نہیں کیا گیا۔ آنچ پہلے بھی دی جا رہی تھی اور اب بھی آنچ ہی دے رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایک جزو یعنی حرارت کی مقدار میں فرق کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانی کی نوعیت بدل گئی۔ وہ رقیق شے سے بخارات میں تبدیل ہو گیا۔ اگر پانی کو ٹھنڈا کریں تب بھی یہی ہوتا ہے۔ بہت دیر تک اس طرح ٹھنڈک بڑھتی رہتی ہے لیکن اس پر بھی پانی رقیق ہی رہتا ہے لیکن جب اس کی حرارت صفر درجہ سے گری وہ یک لخت جما۔ اب وہ رقیق پانی منجمد ہو گیا۔ علمی زبان میں اس کو کمیت و کیفیت کا نظریہ کہتے ہیں۔ یعنی کسی مرکب شے کے کسی جزو کی کمی یا بیشی اس شے کی کیفیت بدل دیتی ہے اور چونکہ ہر شے دو یا زیادہ تکراروں سے مرکب ہوتی ہے اس لئے ہر شے کی تکراریں ارتقا کرتے کرتے ایک ایسی منزل پر پہونچتی ہیں جہاں ان میں کسی ایک کا کم یا زیادہ ہونا اس شے کی نوعیت بدل دیتا ہے۔ مارکس اس نظریہ کو سماجی زندگی پر بھی منطبق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب سرمایہ داری کی تکراریں بڑھتے بڑھتے ایک خاص مقدار پر پہونچیں گی تو جیسے پانی بھاپ میں تبدیل ہو جاتا ہے اسی طرح سرمایہ داری سوشلزم میں تبدیل ہو جائے گی۔ صاف زبان میں یوں کہنا چاہئے کہ سرمایہ داری ایک وحدت ہے اور سرمایہ دار اور مزدور تکراریں ہیں۔ ان میں کش مکش جاری ہے اور مزدور طبقہ طاقت ور ہوتا جا رہا ہے اور وہ وقت دور نہیں کہ سوشلزم ظہور میں آ جائے۔ اس لمحہ کو جب کہ ایک نوعیت دوسری نوعیت اختیار کرتی ہے۔ کارل مارکس ارتقائی جست کے نام سے موسوم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ارتقا کا منشا اولین یہی جست ہوتی ہے کسی شے کا ارتقا اس جست کے لئے تیاری ہوتی ہے ارتقا کا حاصل یہ جست ہے۔ ہر شے ارتقا کرتے کرتے ایک ایسی منزل پر پہونچتی ہے جہاں اس شے کو ایک جست لگا کر دوسرا قالب اور روح اختیار کرنی پڑتی ہے لیکن وہ روح اور قالب کہیں باہر سے داخل نہیں ہوتے بلکہ ان تکراروں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جیسے زرد اور نیلا رنگ ملانے سے ہرا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح ان تکراروں سے تیسری نوعیت پیدا ہوتی ہے۔ اس ارتقائی جست کے نظریہ کو اس لئے بہت اہمیت حاصل ہے کہ انقلاب کا نظریہ اسی

پر قائم ہے۔ کارل مارکس کے نزدیک انقلاب اس ارتقائی جست کا نام ہے جو ایک سماج اپنی تکراروں کے ارتقاکی وجہ سے لگاتی ہے جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ پہلے سے بالکل جدا نوعیت کی سماج قائم ہو جاتی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس ارتقائی جست کی بابت جس کا دوسرا نام انقلاب ہے علامہ اقبال کا کیا خیال تھا علامہ فرماتے ہیں

میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں — کچھ کام نہیں چلتا بے جرأت رندانہ

کیا یہ جرأت رندانہ ارتقائی جست لگانے کی ترغیب نہیں ہے؟

یہاں ہم علامہ اقبال کے کلام سے کچھ انتخاب پیش کر دیں جس سے ناظرین خود فیصلہ کر لیں گے کہ علامہ کا انقلاب کی بابت (جس کو مارکس نے ارتقائی جست کا نام دیا ہے) کیا خیال تھا: علامہ فرماتے ہیں:۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی — روح امم کی حیات کش مکش انقلاب

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخ امراء کے درو دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے — کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دور سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا

اور زبور عجم میں تو علامہ نے خدا سے دعا ہی یہ مانگی ہے کہ یا اللہ

یا بکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب — یا دگرگوں کن نہاد ایں زمان و ایں زمیں

یا چناں کن یا چنیں

علامہ اقبال کے مندرجہ بالا اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ ارتقائی جست کے نظریہ جس کو سیاسی زبان میں انقلاب کہتے ہیں مانتے تھے وہ ارتقا کا مقصد جست کو سمجھتے تھے۔

م م جوہر صاحب میرٹھی

تعلیم اور تعلقات باہمی

ذیل کا مضمون ایک مقتدر۔۔ امریکی تعلیمی رسالہ سے اخذ و ترجمہ کے بعد پیش کیا جاتا ہے تعلیمی ذریعہ سے قومی اتحاد اور تعلقات باہمی کو سلجھانے کے سلسلے میں اس مقالہ میں جو کچھ امریکہ کے متعلق کہا گیا ہے اس کا ایک بڑا حصہ ہندوستان پر بھی صادق آتا ہے (مدراسی)

یوں تو ممالک متحدہ امریکہ کے باشندے امریکی کہلاتے ہیں لیکن یہ قوم مرکب ہے ان بہت سی جماعتوں سے جو مختلف تہذیب و تمدن کی حامل ہیں۔ یہ اختلاف تہذیب یا تو سماجی ہے یا نسلی یا مذہبی، ہر تہذیبی و مدنی جماعت چند خاص عقائد، رسم و رواج، عادات و اخلاق اور مخصوص نظریہ پر کاربند ہے لیکن ان تمام تہذیبی جماعتوں cultural groups کا رشتہ قوم کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک فرد کا رشتہ اس کے خاندان سے۔

چند خیالات ایسے ہیں جو ہر ترقی پذیر تہذیبی جماعت میں پائے جاتے ہیں اور جن کو ہم cultural Behaviour یا عادت تہذیبی سے تعبیر کر سکتے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔

۲ ا۔ ہر ترقی پسند تہذیبی جماعت یہ چاہتی ہے کہ اپنے نوجوانوں میں زندگی کی نئی روح پھونکے ان میں اسلاف کا سا جذبۂ ایثار پیدا کرے اور ان کی بدولت خود زندہ رہے۔

ب۔ ہر تہذیب زندہ رہنا چاہتی ہے خودکشی کرنا نہیں چاہتی۔ اس لئے جب وہ دیکھتی ہے کہ خطرات نے اسے گھیر لیا ہے تو وہ اپنی بقا کے لئے پوری جد و جہد کرتی ہے۔ بے جا و بجا، معقول اور نامعقول، جائز و ناجائز غرض ہر طریق کار کو عمل میں لاتی ہے۔

ج۔ آسودہ حال اور ترقی پذیر تہذیبی جماعت کا اقتضا یہ ہوتا ہے کہ دوسری تہذیبی جماعتیں نہ صرف اس کی خودداری کو تسلیم کر لیں بلکہ اس کے ہر مطالبہ کو بلا چون و چرا کئے مان لیں۔

د۔ ہر جماعت فطرتاً اپنے میں تبلیغی احساس پاتی ہے اور چاہتی ہے کہ دوسروں کو بھی اپنی تہذیب و کلچر سے متاثر کرے اس سلسلہ میں ان تمام مسائل کا حل چاہتی ہے جو اس کی ترقی کی راہ میں سد راہ بنتے ہوں۔

امریکہ کی پوری تاریخ اس بات کی ترجمانی کرتی ہے کہ مختلف تہذیبی و مدنی جماعتوں کے باہمی تصادم اور آپس کے مناقشات نے ملک کو سخت نقصان پہونچایا ہے۔ زمانۂ آبادیات سے جبکہ کواکرس پر ظلم شروع ہوا تھا کو کلس کلان والے واقعات تک مذہبی و نسلی اقلیتوں پر بے انتہا ظلم ڈھائے گئے۔ تشدد و تحقیر کا کوئی حربہ ایسا نہ تھا جو ان کے لئے روا نہ رکھا گیا ہو۔ مختصر یہ ہے کہ ظلم و جبر کے جوئے تلے مبتنی آج تک پسے جا رہے ہیں۔ آج تین کروڑ نفوس امریکہ میں ایسے ہیں جو ماضی قریب میں آئے ہوئے مہاجر والدین کی اولاد ہیں لیکن ان کو زمانہ قدیم سے آباد شدہ طبقہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ان کا ماحول غیر دلچسپ، ان کی اقتصادی حالت کمزور، ان کی سماجی حیثیت قابل رحم بنا دی گئی ہے۔ ان کو مختلف بُرے ناموں مثلاً، ووپس، کراکس وغیرہ سے پکارا جاتا ہے اور ان کو یہ محسوس کرایا جاتا ہے کہ وہ ہر حالت، ہر بات غرض ہر حیثیت سے اس ماضی بعید سے آباد شدہ طبقہ سے کمتر ہیں۔

اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ ان تین کروڑ نفوس کی زندگی کتنی اجیرن ہو گئی ہوگی۔ ان میں اچھے جذبات پیدا ہوں تو کیسے: وہ اپنے مہاجرین والدین جو ایک خاص تہذیب کے حامل تھے، کے نقش قدم پر چل کر اپنے اسلاف کے کارناموں کو زندہ کریں تو کس طرح؟ اس حالت میں تو نہ وہ کسی تہذیب میں ضم ہو سکتے ہیں نہ کسی اور کو اپنی تہذیب سے متاثر کر سکتے ہیں۔ ان کا امریکی ہے پس منظر تو جرائم آلیس اور شہر کی گندہ و گنجان آبادی ہے کان کنی اور محنت و مشقت کی زندگی ان کا معمول ہے مفلوک الحال ستم رسیدہ اپنے والدین کی مہاجرانہ حماقت کا ماتم کرتے ہوئے امریکی واقعات و حادثات کے دھارے میں بہے چلے جا رہے ہیں بالکل غیر شعوری طور پر۔

ان غریب ہستیوں کا مسئلہ تعمیری ممکنات کے نظریہ سے غور طلب ہے۔ ان کی نئی پود مزاج اور قابلیت میں دوسروں سے بہتر ہو سکتی ہے اگر ان کو اچھا پس منظر دیا جائے تو امریکہ کی قومی تہذیب میں چار چاند لگا سکتے ہیں۔ ان تین کروڑ نئے شہریوں کو ان کی گذشتہ تاریخ کو نظر انداز کرتے ہوئے تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ کرنا ہوگا۔ اور دوسرے امریکیوں کے برابر درجہ دینا ہوگا۔

امریکہ کو چاہئے کہ وہ ایک خطرۂ عظیم سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے یعنی وہ یورپی احساس کمتری کو اپنے یہاں داخل نہ ہونے دے۔ یورپ پر شاونسٹی قومیت[1] کا بھوت سوار ہے جو مختلف تہذیبی جماعتوں کو باہم دست و گریبان

---

[1] اس قسم کے والہانہ جذبہ قومیت کو کہتے ہیں جو اپنی قوم کی برتری کے لئے دوسروں پر ہر قسم کا ظلم و جبر روا رکھے۔

کئے ہوئے ہے۔ یورپ کی یہ متخاصم اقلیتیں اتحاد ملی کی ہر معقول و نامعقول آواز کے خلاف لڑنے کے لئے تیار رہتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنا دو بھر ہو گیا ہے۔[۱]

تدبر نام ہے اس فن کا جو حالات کو قابو سے باہر ہونے سے پہلے سنبھال لے۔ جمہوریت کو اگر زندہ رکھنا ہے تو لوگوں کی ذہنیتوں میں اور خیالات میں ایک انقلاب پیدا کرنا ہوگا اور یہ انقلاب پیدا ہو سکتا ہے صرف تعلیم سے جمہوری نظام کار میں تعلیم کا مقصد ایک قسم کی تہذیبی اجتماعیت پیدا کرنا ہے بعض حضرات تہذیبی اجتماعیت کے خیال ہی سے کانپ اٹھتے ہیں۔ انھیں خوف یہ ہے کہ تہذیبی جماعتوں کا دقیانوسی و قنوطی رد عمل بجائے اتحاد کے نفاق پیدا کرے گا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ امریکی تہذیب مجموعہ ہے بہت سے کلچروں کا۔ اگر اختلاف و تخصیص ہی کسی تہذیب کی خصوصیات ہیں تو ماہرین تعلیم کا یہ فرض ہے کہ وہ امریکی بچوں کو ایک ایسے سماج میں سکون و اطمینان کی زندگی گذارنے کے لئے تیار کریں جس کی بنیادیں تہذیبی اجتماعیت کے اصول پر کھڑی کی گئی ہوں۔

جے۔ اے رابنسن نے اپنے مقالہ سیویلزیشن میں بہ تشریح واضح کیا ہے کہ فنون لطیفہ صنعت حرفت اور سائنس وغیرہ میں ایک کلچر دوسرے کلچر سے کیا کچھ نہیں حاصل کرتا اور ایک تہذیبی جماعت کا دوسری تہذیبی جماعت کے احسان کو مان جانا ہی اتحاد ملی کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ جمہوریت کا فرض ایک ایسے سماج کو جنم دینا ہے جس میں ہر قوم اور ہر جماعت کا فرد سکون اور اطمینان سے زندگی گذار سکے، ایک دوسرے سے پورا فائدہ اٹھا سکے۔ اپنی خوبیاں دوسروں کو دے اور دوسروں کے محاسن کو خود اختیار کر سکے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی اسکول یا کالج ایک قوم کے مختلف الخصائل گروہوں میں ربط و اتحاد کیسے پیدا کر سکتا ہے؟ وہ ان کو یہ کیسے سمجھا سکتا ہے کہ ایک گروہ کی بعض ضروریات دوسرے گروہوں کی بعض ضروریات کے عین مطابق ہیں۔ اس لئے ایک دوسرے کا آپس میں لڑنا خلاف مصلحت ہے؟ ان تجربات کو کیسے وسعت دے سکتا ہے جن کے ذریعہ تمام گروہ مل کر عام فائدے کے لئے مصروف کار ہوں

ہم جواباً یہ عرض کر سکتے ہیں کہ ہر اسکول و کالج کسی ملک و قوم کے عناصر ترکیبی کے مطالعہ کے لئے ایک

---

[۱] علاوہ ہندوستان کی تمام سیاسی اور تہذیبی مباحث کے اعادہ کو نظر کے سامنے رکھیں۔

دارالعمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے ان میں ہم کچری گروہوں کے اتحاد عمل کے نقشے تیار کریں اور سماجی ترقی کے لئے نئی نئی راہیں ڈھونڈھ نکالیں۔ مثلاً امریکی اتحاد ملی کے لئے ان نعروں کا نشر کرنا کہ "ہم سب امریکی ہیں اور مہاجر" بہت مفید ہوگا۔ دوسرے یہ کہ ایک قوم مختلف جماعتوں اور گروہوں کا مجموعہ ہوتی ہے اس لئے آپس کے میل جول کی وجہ سے قوم کا ہر فرد اپنی جماعت کے علاوہ دوسری جماعتوں کے حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں تعلیم کا مقصد سماجی اصلاح کار کی حیثیت سے یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہر گروہ پر یہ بات ظاہر کردے کہ اس کا مستقبل پوری قوم کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ وہ "کل" نہیں ہے بلکہ "جزو کل" وہ قوم کے پہیہ کا ایک حصہ ہے۔ دوسرے گروہوں کے ساتھ اتفاق و رواداری سے کام لینے ہی میں اس کی ترقی کا راز مضمر ہے تعلیمی نظام کار کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ اس سے وحدت ملی کے خوشگوار نتائج پیدا ہوں ہر اسکول اور کالج میں یہ قابلیت پیدا کرنی چاہئے کہ وہ اتحاد بین الملل کے تعلقات کے متعلق تجربات کرے۔ گول میز کانفرنس، مجلس اتحاد یا اسی قسم کی کوئی مجلس کسی نام سے بنائی جائے جس میں مختلف مذہبی جماعتوں کے نمائندے ایک جگہ جمع ہو کر "تہذیبی جمہوریت کا مطالعہ کریں۔ انسانی رشتوں کو استوار کرنے کے لئے جو نئی نصاب تعلیم ترتیب کیا جائے۔ اس میں ذہنی و جذباتی ہر طریقوں سے کام لینا ہوگا۔ اس لئے کہ مذہبی و نسلی تہذیبی جماعتوں کا ماحول جذباتی ہوتا ہے وہ ایک شخص واحد کو اپنا نجات دہندہ قرار دے کر والہانہ اس کی پیروی کرتے ہیں اس لئے ہمارے ادارہ ہائے تعلیم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اتحاد بین الملل کے لئے سازگار فضا پیدا کریں اسکولوں اور کالجوں میں جلسے کئے جائیں اور خاص طور پر ترتیب دادہ جلسوں کے موقع پر طلبا دوسری تہذیبی جماعتوں کے مدعو شدہ با اقتدار اور قابل قدر ہستیوں سے شرف نیاز حاصل کریں اور خود بھی دوسری تہذیبی جماعتوں کے جلسوں میں شریک ہوں اپنی خوبیاں ان پر روشن کریں اور ان کی خوبیوں سے خود مستفید ہوں۔ آپس میں مل جل کر کام کرنا اور رواداری کا برتاؤ سیکھیں۔

ہمیں اس اتحاد ملی کے مسئلہ کو سلجھانے میں اقتصادی حالات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ اقتصادی کساد بازاری اور بڑھتی ہوئی بیکاری کے ساتھ ساتھ آپس کی کشیدگی بڑھ جاتی ہے اور جھگڑے فساد پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ وانٹیلن اپنی کتاب میں جو "ضد سامیت" پر لکھی گئی ہے ایک ایسے قبیلے کا ذکر کرتا ہے جو درخت پی پو کے پھلوں پر گذارہ کرتا تھا جب فصل اچھی ہوتی تھی تو یہ قبیلہ جشن مناتا اور دوسرے قبیلوں کو

بھی مرا کرتا۔ مگر جب فصل خراب ہوتی تو یہ اپنے پاس دوسروں کو پھٹکنے بھی نہ دیتا۔ اور جب قحط سالی ہوتی یہ دوسروں کو مار ڈالتا۔

ہمارے تعلیمی اداروں کا فرض ہے کہ وہ جذبۂ نفرت و حقارت، احساس کمتری و برتری کو جلد از جلد دور کرنے میں کوشاں ہوں اس لئے کہ کسی فرقہ، نسل، مذہب یا قوم کے خلاف جذبۂ تحقیر کا ہونا اقتصادی گتھیوں کو سلجھانے اور حالات کو بہتر بنانے میں سنگ راہ ثابت ہوتا ہے۔ یہ ادارے آئندہ شہریوں کو اس قابل بنا دیں کہ وہ اقتصادی مسائل کو سائنٹفک طریقوں سے سلجھائیں اور ان تمام اشخاص کے ساتھ رواداری برتیں جو صدق دل سے مختلف اقتصادی نظریات کے حامل ہوں۔ زندگی ایک مجموعۂ اضداد ہے اور اس کو خوشگوار بنانے کے لئے ہر فرد کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔ ایک ہی منزل کی مختلف راہیں اور ایک ہی سوال کے ہزاروں حل ہوتے ہیں لیکن اچھی تعلیم ہی ایک ایسی چیز ہے جو مختلف خیال و عمل رکھنے والے اشخاص کو ایک رشتہ میں منسلک کر سکتی ہے۔ ان کے دلوں سے احساس دوئی مٹا کر انھیں متحد کر سکتی ہے اور اقتصادیات کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھا کر دنیا کو قتل و خون، لوٹ کھسوٹ اور غارتگری سے نجات دلا سکتی ہے۔

محمد علی صاحب مدراسی

عرب کی معاشی حالت اور پیغمبر صلعم

واقعہ یہ ہے کہ کسب اور حصول معاش کی جد وجہد کے متعلق رسول اکرم کا جو طرز عمل تھا مسلمان اگر اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا پر چلنے کو اپنی سعادت قرار دیں تو شاید مشکل ہی سے کوئی مسلمان بیکار یا بے روزگار رہ سکتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے۔

انی لا کرہ ان اری الرجل فارغا — میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ کسی شخص کو دنیا یا آخرت

فی عمل الدنیا و الاخرہ — کے کام سے بیکار دیکھوں۔

اور یہی وجہ ہے کہ بھیک (گداگری) جہاں دنیا کے بعض مذاہب میں مذہب اور مذہبی فرائض کے لوازم سے ہے اور دان پن کا سب سے زیادہ استحقاق اسی کو ہے جو مذہب سے جتنا زیادہ تعلق رکھتا ہو (جیسا کہ ہمارے ملک میں برہمنوں کا حال ہے) نیز جن لوگوں نے مذہبی تعلیمات سے غلط طور پر متاثر ہو کر ترک دنیا کو اپنا مسلک بنایا۔ ان کے جانشینوں میں جو زیرک اور نفسیات انسانی کے عالم تھے انھوں نے تو باالباطل ذرائع سے عوام کی کمائی کا اپنے آپ حصہ دار بنالیا۔ کمائے کوئی کھائے کوئی۔ لیکن اسی گروہ میں جو بے چارے بیوقوف اور احمق تھے انھیں گداگری کو اپنا پیشہ بنانا پڑا اور رفتہ رفتہ یہ ان کا خاندانی پیشہ ہوگیا۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ دوسرے مذاہب میں یہ بات پائی جاتی تو اتنا تعجب نہ ہوتا لیکن اسلام جس میں آنحضرت نے بھیک کے لقمہ کو۔

رضفا یاکلہ فی جہنم (ترمذی)

قرار دیا تھا ہم گداگری کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھاتے۔ آپ فرماتے تھے جیسا کہ بخاری میں ہے۔

لا تزال المساء لہ باحدکم حتی — تم میں سے جو کوئی ہمیشہ بھیک مانگتا ہے تو جب

یلقی اللہ تعالے ولیس فی وجہہ — وہ خدا کے سامنے جائے تو اس کے چہرہ پر

مزعۃ لحم — گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ ہوگی۔

بکثرت آپ اعلان فرماتے تھے کہ

الصدقة غيبت القلب — صدقہ آدمی کے فطری احساسات کو مردہ کر دیتا ہے

اور تجربہ شاہد ہے کہ صدقہ کھانے والے خود داری، عزت نفس، رحم وغیرہ کے جذبات سے مفلس ہو جاتے ہیں حضور انور اکثر یہ فرماتے جیسا کہ بخاری میں ہے۔

لان يحطب احدکم حزمة علی — کسی کا اپنی پیٹھ پر بوجھ لادنا بہتر ہے بہ نسبت

ظهره خیر له ان یسال احدا — اس کے کہ کسی سے سوال کرے۔

مشہور واقعہ ہے کہ ایک انصاری نے حضور اکرمؐ کے پاس سوال پیش کیا۔ رسول اکرمؐ نے دریافت کیا کہ تمہارے پاس کسی قسم کی کوئی چیز ہے؟" بولے کہ "ہاں ایک ٹاٹ ہے جس کا کچھ حصہ پہنتا ہوں اور اس کے کچھ حصہ کو اوڑھتا ہوں اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتا ہوں" آپ نے فرمایا" اس کو لے آو۔ وہ لے آئے حضور اکرمؐ نے اپنے دست مبارک میں دونوں چیزوں کو لے کر ہراج کرنا شروع کیا ایک صحابی نے ایک درہم دام لگایا آپ نے فرمایا اس سے زیادہ بھی دینے والا کوئی ہے؟ کسی صحابی نے دو درہم دام لگائے حضور انور نے ان ہی کے حوالے کر دیا اور دو درہم لے کر سوال کرنے والے انصاری کے حوالے کر دیئے اور حوالے کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ایک درہم کا غلہ لے کر گھر والوں کو دے آؤ اور دوسرے درہم سے ایک کلہاڑی خرید کر لاؤ۔ کلہاڑی آئی دنیا نے دیکھا کہ آسمان وزمین کے سردار خاتم الانبیاء نے بذات خود

شد فیه عودا بیده — اس کلہاڑی میں ایک لکڑی ٹھونکی

اور انصاری کے حوالے کر کے فرمایا۔

اذهب فاحطب وبع ولاارینك — جاؤ اس سے جنگل جا کر لکڑی کاٹو اور بیچا کرو میں جاتا ہوں کہ پندرہ دن تک تمہیں نہ دیکھوں۔

خمسة عشر یوما

انصاری نے یہی کیا اور پندرہویں دن حاضر خدمت ہوئے۔ پوچھا گیا کیا ہے؟ بولے کہ اس عرصہ میں دس درہم آمدنی ہوئی جس میں سے چند درہم کے کپڑے خریدے اور چند درہم کے اناج۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ "یہ اس سے بہتر ہے کہ تم کسی سے بھیک مانگو اور قیامت میں ذلت اٹھاؤ"

غور کرنے کی بات ہے کہ بجائے اس غریب کے ٹاٹ اور پیالہ کے یہ بھی ممکن تھا کہ خود حضور اکرمؐ کسی

صحابی سے ان کو دو درہم دلوا سکتے تھے لیکن جو آپ کی غرض تھی یعنی حتی الوسع ہر شخص اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرے اور یہ مقصد بہترین طریقہ سے اس تدبیر سے حاصل ہو سکتا تھا کچھ اسی قسم کا ایک اور واقعہ حضرت عمرؓ کا بھی ہے۔ مسجد میں ایک شخص کہتے ہوئے داخل ہوا کہ جہاد کرنے میں کون میری مدد کرتا ہے؟ حضرت عمرؓ نے اس کو اپنے پاس بلایا اور ہاتھ پکڑ کر مجمع سے فرمانے لگے

من یستاجر هذا یعمل ارضه — اپنی زمین پر کام کرنے کے لئے مزدوری پر کون لیتا ہے

کسی انصاری نے کہا کہ میں لیتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا

بکم تاجره کل شهر — اس کو ماہوار کیا دو گے

انصاری نے تنخواہ بتائی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا

خذه — تم اس کو نوکر رکھ لو۔

بہرحال نوکر ہو کر وہ شخص چلا گیا۔ چند مہینوں کے بعد حضرت عمرؓ نے انصاری سے پوچھا

ما فعل اجیرنا — میرے رکھائے ہوئے نوکر نے کیا کیا؟

انصاری نے عرض کیا۔

صالحٌ یا امیر المؤمنین — اچھا ہے اے امیر المومنین

حضرت عمر نے حکم دیا کہ

ائتنی به وبما اجتمع له من الاجرة — اس کی جمع شدہ پونجی کے ساتھ میرے پاس لے آؤ

آدمی حاضر کیا گیا۔ راوی کا بیان ہے کہ وہ حاضر ہوا اس شکل میں کہ ایک تھیلی بھی درہموں سے بھری اس کے ساتھ تھی۔ حضرت عمرؓ نے تب اس کو مخاطب کر کے فرمایا۔

خذ هذه فان شئت فالان اغز — لو یہ تھیلی اپنے پاس رکھو اب جی چاہے تو جا کر

وان شئت فاجلس (کنز العمال) — جہاد کرو چاہے گھر بیٹھو۔

اس میں شک نہیں کہ مفلس اور غریب عربوں کے متعلق تاریخی کتابوں میں عجیب و غریب افسانے درج ہیں۔ ابن خلدون ہی کا بیان ہے کہ عرب کے دیہاتی بے چارے

کانو یقتاتون بلحم الضب او الیرا د	سوسار کا گوشت، ٹڈے، گوبریلے اور بچھو کھاتے
او العقارب او الخنافس واذا جاعوا اکلوا	تھے اور بھوک سے بیتاب ہوتے تو اونٹ
العلهز وهو دبر الا بل مهونة فی الحجارة	کی لید میں خون کوٹ کر کھاتے تھے اور قریش
فی الدم قبط نونه وکان حال القریش بهاخر فلاح	کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔

گورنر کسریٰ کے سوال کرنے پر مغیرہؓ نے۔

قال نحن اناس من العرب کنا فی شقاء	کہا کہ ہم عرب کے باشندے ہیں ہم پر سخت
شدید وبلاء عظیم نمص الجلد والنوی	تنگی گذر رہی تھی اور آفتوں میں گرفتار تھے۔ بھوک
من الجوع ونلبس الوبر والشعر	میں چمڑا اور کھجور کی گٹھلیاں کھاتے تھے اور
بخاری کتاب الجهاد	بالوں کے کپڑے پہنتے تھے۔

پھر اسی عرب کو اسلام کے بعد پایا گیا جس حال میں پایا گیا یقیناً اس معاشی انقلاب میں سیاسی فتوحات کو بھی دخل ہو لیکن محض یہی ایک سبب نہیں ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ جہاں زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کی رہنمائی رسول اکرمؐ کے ذریعہ سے قدرت نے کی تھی وہیں محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ان کو بلکہ سارے جہان کو ایک آخری۔ معاشی پیغمبر بھی دیا گیا تھا۔ آخر غور کرنے کی بات ہے کہ جہاں دنیا کے اور پیغمبروں نے اپنی اپنی امتوں کے لئے مغفرت و ہدایت کی دعائیں کی تھیں حضور ان دعاؤں کے ساتھ ہی غریب عرب کے لئے یہ بھی دعا فرمایا کرتے تھے۔

اللهم! انهم حفاة فاحملهم۔ اللهم انهم	پروردگار! یہ ننگے پیر ہیں انھیں سوار کر، پروردگار
عراة فالبسهم اللهم انهم جياع فاشبعهم	یہ ننگے ہیں انھیں کپڑے پہنا۔ پروردگار یہ بھوکے
(ابوداؤد)	ہیں انھیں پیٹ بھر کھلا۔

...معاشی دعا کا اس سے بہتر نمونہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ حضور انور کو اگر ایک طرف عربوں کی اعتقادی و اخلاقی بیماریوں سے تکلیف ہوتی تھی اور اتنی تکلیف ہوئی کہ قرآن مجید میں حق تعالیٰ کو۔

فلعلك باخع النفسك الا يكونوا مؤمنين	شاید کہ آپ ان کے ایمان نہ لانے پر اپنی جان دیدیں گے

جیسی متعدد آئتیں نازل کرنی پڑیں لیکن قریب قریب اسی قسم کی اذیت آپ کے رؤف و رحیم قلب مبارک کو عرب کے افلاس، فقر اور فاقے سے ہوتی تھی صحیح مسلم میں ایک لمبی روایت ہے جو جریرؓ بن عبداللہ البجلی سے مروی ہے اس حدیث کا ابتدائی حصہ یہ ہے حضرت جریرؓ فرماتے ہیں۔

کنا فی صدر النهار عند رسول الله	ہم نصف النہار کے وقت رسول اکرمؐ کے
صلی الله علیه وسلم فجاءه قوم عراة	پاس تھے کہ کچھ کمل پوش ننگے پاؤں تلوار لٹکائے
مجتابی النمار او العباء متقلدی السیوف	ہوئے ایک قوم آئی ان میں اکثر بلکہ سب کے
عامتهم من مضر بل کلهم من مضر	کل مضر قبیلہ کے تھے۔ رسول اللہؐ کے چہرہ
فتمعر وجه رسول الله صلی الله علیه وسلم	مبارک کا رنگ بدل گیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر "تمعر" کی یہ کیفیت کیوں طاری ہوئی حضرت جریر خود ہی اس کے بعد وضاحت فرماتے ہیں۔

لما رای بهم من الفاقة	جب آپ نے ان کے فاقہ کی حالت کو دیکھا۔

حضورؐ انور کے لئے ان کی یہ حالت اتنی ناقابل برداشت ہوئی کہ پہلے آپ اندر زنانہ میں تشریف لے گئے اور اسی پریشانی کی حالت میں باہر نکلے بظاہر گھر میں کوئی ایسا سامان نہ تھا جس سے ان کمل پوش ننگے پاؤں والوں کی امداد فرما سکتے ہوں۔ اسی وقت بلالؓ بلائے گئے۔ اذان دینے کا حکم ہوا۔ نماز ہوئی اور باوجودیکہ جمعہ کا دن نہ تھا آپ منبر پر تشریف لے گئے اور آیت قرآنی

یا ایها الناس! اتقوا ربکم الذی خلقکم	لوگو! اس ذات سے ڈرو جس نے تم کو پیدا کیا
من نفس واحدة	ایک ہی جان سے

تلاوت کرتے ہوئے "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند" کی طرف توجہ دلا کر آدمیت کے اس جسد کے ہر ہر عضو کو بے چین کر دیا پھر اور آئتیں تلاوت فرمائیں فرمایا کہ کل جینے کے لئے آج اگر کوئی دینا چاہے تو دے سکتا ہے عطیوں کی بارش شروع ہو گئی ڈھیر لگ گیا اور وہی چہرۂ انور جو فاقہ کو دیکھ کر متمعر ہوا تھا حضرت جریر کے الفاظ میں۔

لہ تمعر۔ رنگ کا بدل جانا۔ حالت کا متغیر ہونا۔

رایت وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتھلل کانہ مذھبۃ	میں نے رسول اللہ کے چہرہ مبارک کو دیکھا کہ وہ چمک اٹھا، ایسا معلوم ہوا کہ اس پر سونے کی قلعی چڑھا دی گئی ہے۔

ایک "معاشی روح" اور "معاشی دل" کے احساسات کیا اس سے زیادہ ہو سکتے ہیں "خوباں ہمہ دارند" کا جو تنہا مظہر اتم تھا اس کی ان باتوں پر تعجب نہ کرنا چاہئے وہی جس کے قدم مبارک نمازوں میں قیام کی وجہ سے لوگ متورم دیکھتے تھے یہی لوگ اس کا بھی تماشا کرتے تھے کہ آپ بازار میں جا رہے ہیں غلہ کا ایک ڈھیر سامنے نظر آتا ہے۔

فادخل یدہ فیھا فنالت اصابعہ بللاً	اپنے دست مبارک کو اس انبار میں ڈال دیتے ہیں آپ کی انگلیوں میں تری لگ جاتی ہے۔

انبار کے مالک سے فرمایا جاتا ہے۔

ماھذا! یاصاحب الطعام	غلہ والے! یہ کیا ہے؟
فقال! یارسول اللہ! اصابتھا السماء	اس نے کہا اے اللہ کے رسول اس پر بارش ہوگئی

معاشی تعلقات کی تصحیح کے پیغمبر کی زبان مبارک سے آواز آتی ہے۔

افلا جعلتہ فوق الطعام حتی یراہ الناس من غشنا فلیس منا	پھر تم نے اس تر غلہ کو اوپر کیوں نہ رکھا کہ لوگ دیکھتے جو فریب کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

محمد یوسف الدین صاحب بی۔اے (عثمانیہ)

والٹیر[1]

نومبر ۱۶۹۴ء کے خنک ایام میں پیرس میں ایک بیمار اور کمزور بچہ پیدا ہوا۔ اتنا کمزور کہ اس کے جینے میں بھی شبہ تھا۔ اس کی عمر ۸۴ سال کی ہوئی لیکن ساری عمر اس کی تندرستی کی یہی حالت رہی۔ یہ کہا جائے کہ اس نے مرتے مرتے اسی سال لئے تو غلط نہ ہوگا۔ جب وہ مرا تو وہ دنیا کا سب سے مشہور آدمی تھا۔

اس کے والدین نے اس کا نام اروئیت رکھا تھا لیکن بڑے ہو کر اس نے خود اپنا نام بدل کر والٹیر رکھا اور دنیا میں اسی نام سے شہرت حاصل کی۔ یہ اس کی خود رائی کا پہلا مظاہرہ تھا۔ وہ خود رائی جس نے آگے جا کر اس کی زندگی کا رخ پلٹ دیا اور اسے ایک معمولی مقبول شاعر سے مغربی آزادی کا پیامبر بنا دیا۔

اس کا باپ ایک درباری تھا۔ اس کا مذہبی باپ ( ) ایک لامذہب اور آزاد منش قسم کا انسان تھا۔ اروئیت ابھی تین سال ہی کا تھا کہ اس کے مذہبی باپ نے اسے ایک نظم یاد کرا دی جس میں دنیا کے تمام مذاہب پر لعنت بھیجی گئی تھی۔ ابے چے تیو بنوف کی تربیت نے اسے بچپن ہی سے تعصب اور تنگ نظری کا دشمن بنا دیا۔

دس سال کی عمر میں اسے یعقوبی کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ یعقوبی عیسائیوں میں سب سے زیادہ متعصب فرقہ ہے لیکن اس زمانہ میں ان کا نظام تعلیم نہایت مکمل اور اپنے قسم کا بہترین نظام تھا۔ خاص طور سے اس زمانے میں جبکہ یورپ میں تعلیمی تنظیم کی طرف سے عام بے توجہی اور لاپروائی تھی یعقوبیوں کے مدرسے اپنی آپ مثال تھے۔ اروئیت کو کھیلنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ پڑھنے کا بہت شوقین تھا۔ اس کے اندر بچپن سے ہر چیز کے متعلق تفتیش کرنے کا مادہ تھا۔ استادوں کا اس کے سوالوں سے ناک میں دم تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک میں اپنا دماغ دوڑاتا۔ یعقوبی استادوں نے اس کو بڑے شوق سے پڑھایا۔ بارہ برس کی عمر میں وہ بلا تکلف شعر کہنے لگا۔ طنز اور شوخی اس کو فطرت سے ملی تھیں چنانچہ اس کی جملہ بازی بچپن ہی سے مشہور ہو گئی۔

---

[1] والٹے آر

جب وہ کالج سے نکلا تو قدیم کلاسیکل ادب اپنے زمانے کے مذہبی تنازعات اور سائنس کی جدید تحقیقات پر حاوی ہو چکا تھا۔ اس کا باپ چاہتا تھا کہ وہ اب قانون کی تعلیم حاصل کر کے کسی اچھے سرکاری عہدہ پر فائز ہو لیکن والٹیر کو ادب سے دلچسپی تھی اس لئے اس نے ادبی زندگی کو ترجیح دی۔

اس کی نئی زندگی کے ابتدائی ایام بہت خوشی بلکہ عیش میں گذرے۔ ابے تیونیوف نے اسے پیرس کے بہترین حلقوں میں متعارف کرا دیا اور خود والٹیر نے اپنی شگفتگی طبع اور شوخی کی بدولت اپنے لئے ان حلقوں میں جگہ بنالی۔ اس کا بیشتر وقت پیرس کے شوقین رئیس زادوں میں گذرتا۔ وہاں کی فیشن ایبل خاتونوں کے اشعار کی اصلاح کرتا۔ سب لوگ اس کی تعریف کرتے جو نہ کرتے وہ اس کی طنز کا شکار ہوتے۔

کچھ عرصہ بعد ابے تیونیوف ہالینڈ میں سفیر مقرر ہو گیا چنانچہ والٹیر بھی اس کی معیت میں ہالینڈ گیا۔ وہاں اسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ اس کا نام اس نے پیار میں "پمپی" رکھا لیکن پمپی کی ماں کو یہ سلسلہ پسند نہ آیا اس نے ابے تیونیوف سے شکایت کی ابے تیونیوف نے والٹیر کی نگہداشت کرنا چاہی جس میں اسے ناکامی ہوئی تنگ آکر اس نے والٹیر کو پیرس واپس بھیجدیا۔ پیرس میں اس کے باپ نے بھی اس کا استقبال نظربندی سے کرنا چاہا والٹیر کو ایک اور جگہ پناہ لینی پڑی اور وہیں سے اس نے اپنی محبوبہ کے اغوا اور اپنے باپ کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کی پہلے میں ناکام رہا دوسرے میں کامیاب۔

اس عرصہ میں فرانس کے بڈھے بادشاہ لوئی چہار دہم کا انتقال ہو گیا اس کے مرتے ہی اس کی سخت گیری کے خلاف ردعمل ہوا۔ آزادی اور بے ضابطگی کی ایک عام ہوا چل پڑی جس کے جو منہ میں آیا بلا خوف خطر کہنا شروع کیا کسی نے مرے ہوئے بادشاہ کی ہڈیوں پر لعنت بھیجی کسی نے ریجنٹ[1] کے کردار پر حملہ کیا۔ والٹیر نے بھی طبع آزمائی کی نتیجہ یہ نکلا کہ چند ایسے اشعار کے سلسلے جو کسی اور کے لکھے ہوئے تھے بسٹیل جانا پڑا۔ بسٹیل فرانس کا وہ تاریخی جیل ہے جس پر انقلاب فرانس کی پہلی چوٹ پڑی۔

یہاں والٹیر تقریباً ڈیڑھ سال نظربند رہا۔ یہ زمانہ اس نے بیکار نہیں گذارا بلکہ کچھ نہ کچھ لکھتا رہا۔ جب وہاں سے نکلا تو باہر بے اعتدالی اور آزادی کی ہوا کو اور بھی زور پر پایا۔ ادھر ڈیڑھ سال کے دبے ہوئے جذبات

---

[1] ولی عہد کمسن تھا اس لئے حکومت کی باگ ڈور ریجنٹ (ولی بادشاہ) کے ہاتھ میں تھی۔

اظہار چاہتے تھے۔ اس نے ایک ڈراما تیار کیا جس کے پردہ میں ریجنٹ کے کردار پر خوب حملے کئے۔ یہ ڈراما پیرس میں بہت مقبول ہوا۔ ریجنٹ خود اسے دیکھنے آیا۔ والٹیر کو خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں پھر بسٹیل نہ جانا پڑے اس لئے پیرس چھوڑ کر ایک اور جگہ پناہ کی غرض سے چلا گیا۔ یہاں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کی زندگی اور کردار کو نئے راستے پر ڈالدیا۔

والٹیر شروع ہی سے بڑے لوگوں کی صحبت کا شوقین تھا چنانچہ یہاں بھی اس نے امیرزادوں کے حلقے میں اپنے لئے جگہ پیدا کرلی۔ اس کا زیادہ تر وقت ان لوگوں کے ساتھ خوش مذاقی اور دل لگی میں گذرتا۔ اس خوش وقتی میں والٹیر بالکل بھول گیا کہ اس میں اور ان امیرزادوں میں کچھ فرق بھی ہے۔ وہ سب سے بالکل مساویانہ برتاؤ کرتا اور لاپروائی سے مذاق کرتا۔ وہ یہ بھول گیا کہ پیرس میں آزادی، اخوت اور مساوات کا وہ دور ابھی نہیں آیا ہے جس کا وہ خود ایک ممتاز پیش رو ہونے والا تھا۔

اسی حلقے میں فرانس کے ایک نامی خاندان کا ایک نوجوان آیا کرتا تھا جسے والٹیر کی یہ ہمسری خاص طور پر ناگوار ہوتی۔ ایک روز اس نے حقارت آمیز انداز میں والٹیر کے متعلق دریافت کیا کہ "یہ کون شخص ہے جو میری باتوں کا اتنی زور سے جواب دیتا ہے؟" "جناب" والٹیر نے جواب دیا۔ "یہ وہ شخص ہے جس کے نام کے ساتھ کوئی لمبا چوڑا خاندانی نام نہیں لگا ہوا ہے لیکن وہ اپنے نام کی عزت کرانا چاہتا ہے۔"

چند روز بعد اس نوجوان امیرزادے کے آدمیوں کے ہاتھوں والٹیر کی سر بازار مرمت ہوگئی۔ والٹیر نے انتقام لینے کے لئے اپنے دوسرے امیر دوستوں سے مدد مانگی لیکن ان لوگوں نے ہنس کے ٹالدیا کیونکہ ان کے لئے یہ کوئی خلاف معمول واقعہ نہ تھا۔ والٹیر نے شمشیر بازی سیکھنا شروع کردی اور ساتھ ہی اعلان کردیا کہ وہ ضرور انتقام لے کر رہے گا۔ اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ والٹیر کو بسٹیل جانا پڑا لیکن صرف چند روز کے لئے بہت جلد اسے ملک چھوڑنے کی اجازت دیدی گئی۔

والٹیر کی ابتدائی زندگی کا بلاشبہ یہ اہم ترین واقعہ ہے۔ اس واقعہ نے اسے "نظام قدیم" کے غیر منصفانہ پہلوؤں کے آمنے سامنے لاکر کھڑا کردیا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ جس ملک میں آزادی اور مساوات نہیں ہوتی وہاں کی زندگی کس قسم کی ہوتی ہے۔ اس واقعہ نے اس کے خیالات کو ایک نئے راستہ پر ڈالدیا۔ پر شوق جوانی کی جگہ

فکر اور سنجیدگی نے لے لی۔ وہ موجودہ نظام کا دشمن ہو گیا۔ وہ امیر زادے سے انتقام نہ لے سکا مگر اس نے تہیہ کر لیا کہ پورے نظام سے انتقام لے گا۔

فرانس کے قید خانے سے نکل کر والٹیر انگلستان کی سرزمین میں پہونچا جسے آزادی اور رواداری کے اعتبار سے یورپ کے سب ممالک پر سبقت حاصل تھی۔ یہاں نہ لوگ مذہب کے نام پر ایک دوسرے کا گلا گھونٹتے تھے اور نہ حکومت ہی ایسی جابرانہ تھی کہ کتابات پر واں زبان کٹتی ہو" آزادی، رواداری، مفاہمت اور اعتدال پسندی یہ وہ چیزیں ہیں جو ہمیشہ انگلستان کا نشان امتیاز رہی ہیں۔ غرضیکہ اس زمانہ میں کوئی دو ملک اتنے مختلف نہ تھے جتنے فرانس اور انگلستان۔

والٹیر کے قیام انگلستان کے متعلق کوئی تفصیل اور قابل اعتبار مواد موجود نہیں۔ فرانس کے ملک بدر والٹیر پر انگلستان کا کیا اثر پڑا ہوگا اس کا اندازہ بہر حال لگایا جا سکتا ہے۔

والٹیر نے انگلستان میں وہ تمام چیزیں پائیں جن کی غیر موجودگی نے اس کے لئے فرانس میں رہنا دو بھر کر دیا تھا۔ اس نے وہاں شخصی آزادی اور مذہبی رواداری دیکھی۔ اس نے دیکھا کہ وہاں تجارت پیشہ لوگوں کی عزت کی جاتی ہے (فرانس میں ان لوگوں کو جو اپنی کوشش اور قابلیت سے روپیہ کماتے تھے اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور شریف صرف اسے سمجھا جاتا تھا جس نے شرافت اور دولت اپنے بزرگوں سے میراث میں پائی ہو۔ اس نے اسحاق نیوٹن کا شاندار جنازہ دیکھا جس میں شاہی وزرا اور تمام اعیان ملک شریک تھے شیخص فرانس میں مرتا تو کیا اس کی بھی قدر ہوتی؟ والٹیر نے ضرور سوچا ہوگا۔ دوران قیام میں اس نے انگلستان کے فلسفے ادب اور سائنس سے بھی خاصی واقفیت پیدا کر لی۔

کچھ عرصہ بعد اسے فرانس واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ فرانس پہونچا تو وہاں کی وہی بے ڈھنگی چال پائی۔ پادریوں نے محض اختلاف رائے کے الزام پر تقریباً بیس ہزار آدمیوں کو جیل بھجوا دیا تھا۔ ادبی حلقوں میں ایک نہایت ضمنی معاملے پر پھوٹ پڑی ہوئی تھی اور تمام زور سخن اور زور قلم اس پر خرچ ہو رہا تھا۔ والٹیر نے آتے ہی ان اختلافات کی بے وقعتی پر ایک رسالہ لکھا۔ اس کے بعد اس کے دو ڈرامے اسٹیج کئے گئے اور انہیں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ ساتھ ہی اس نے اپنی تصنیف تاریخ چارلس دوازدہم شائع کی جو بہت مقبول ہوئی۔

والٹیر ابھی اپنی کامیابیوں پر خوش ہی ہو رہا تھا کہ پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جو اس کی بے پناہ قوت مخالفت کو عمل میں لے آیا۔ اس زمانے کے فرانس میں اور اس سے کچھ عرصے پہلے انگلستان میں اداکاروں (ایکٹروں اور ایکٹرسیوں) کو ایسی ہی نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا جیسے آج کل ہمارے ہندوستان میں۔ فرانس کی ایک مشہور اداکارہ جس کی فن کاری کا والٹیر دلدادہ تھا، انتقال کر گئی۔ کلیسا نے اسے اپنے قبرستان میں جگہ دینے سے انکار کر دیا اور اسے ایک ویرانے میں دفنانا پڑا۔ والٹیر کے احساسات بھڑک اٹھے اور اس نے ایک زوردار احتجاجی نظم لکھی۔ اس کی اس حرکت کو بہت نازیبا تصور کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے پیرس چھوڑ کر ایک گاؤں میں پناہ لینی پڑی یہیں سے وہ کتاب شائع ہوئی جسے فرانس کے "نظام قدیم" پر پہلی کاری ضرب سمجھنا چاہیے۔

فلسفیانہ خطوط[1]۔ قیام انگلستان کے تاثرات تھے یہ پہلی کتاب تھی جس نے فرانس کو انگلستان کی مذہبی رواداری سیاسی خود مختاری، شخصی آزادی، سائنس کی ترقی اور ادب کی رفعت سے آگاہ کیا۔ یہ کتاب کوئی معیاری کتاب نہ تھی اور نہ آج اس کی کوئی خاص وقعت ہے لیکن اس زمانے میں جبکہ فرانسیسیوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس چھوٹی سی رودبار کے پار کس قسم کی دنیا آباد ہے اور وہاں شیکسپیئر کے نام کا بھی کوئی شاعر گذرا ہے۔ اس زمانے میں اس کتاب کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ والٹیر کے انداز تحریر نے اس کے اثر کو اور بھی دوبالا کر دیا۔ والٹیر کا مخصوص طنز اور پیرایہ کی شگفتگی دونوں اس میں بدرجۂ اتم موجود ہے

اس کتاب کے اثر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شائع ہوتے ہی خلاف قانون قرار دے دی گئی۔ ناشر کو بسٹیل بھیج دیا گیا اور پارلیمنٹ کے حکم کے بموجب جلاد نے کتاب کو پبلک میں جلا[2] دیا۔ والٹیر کو پناہ لینے کے لئے بھاگنا پڑا۔

---

[1] اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے فرانس میں ڈے کارٹ کے نظریوں کو روایاتی احترام حاصل تھا اس طلسم کو والٹیر کے ان مضامین نے توڑا جو اس نے نیوٹن کی تحقیقات پر گہرے مطالعہ کے بعد لکھے تھے۔ اس کے بعد فرانس میں بہت سی نئی تحقیقاتیں سر ہوئیں لیکن نیا راستہ دکھانے کا سہرا بلاشبہ والٹیر کے سر ہے

[2] کسی تحریر کے خلاف سخت ترین قانونی اقدام یہ ہوتا تھا کہ اسے کسی کھلی جگہ میں پبلک کی موجودگی میں نذر آتش کر دیا جائے۔ یہ کارروائی سرکاری جلاد کے ہاتھوں عمل میں آتی۔ یہ گویا کتاب کے لئے سزائے موت ہوتی تھی لیکن بیشتر کتابیں جنہیں سزائے موت ملی آج بھی زندہ ہیں۔

والٹیر کی زندگی کی نمایاں خصوصیتوں میں ایک اس کی خوش قسمتی بھی ہے۔ اس کی زندگی کے بیشتر خوشگوار یا ناخوشگوار واقعات کسی نہ کسی طرح اس کی اس شخصیت کی تعمیر میں ممد ہوئے جو اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ کر پورے یورپ پر چھا گئی۔ اس کی جسمانی کمزوری جس نے اس کے دماغی حس کو تیز کر دیا، اس کی زود کوب جس نے اسے سنجیدہ بنا دیا، اس کی جلاوطنی جس نے اسے ایک نئی دنیا دیکھنے کا موقع دیا، ان سب اور آگے آنے والے واقعات سے اس کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

ان ہی واقعات میں سے خاتون چے تولت سے ملاقات ہے۔

خاتون چے تولت ایک عجیب عورت تھی۔ وہ خوبصورت نہیں تھی لیکن پھر بھی ایک مخصوص دلکشی کی مالک تھی وہ ایک نہایت تیز فہم تیز مزاج اور اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت تھی۔ ادب، طبعیات اور ریاضی سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ اس کی شادی ہو چکی تھی لیکن اپنے خاوند مارکوئس چے تولت کے بعض اوصاف (یا عدم اوصاف) کی بنا پر شادی کا ہونا نہ ہونا سب برابر تھا۔ والٹیر سے جب اس کی ملاقات ہوئی تو اس کی عمر ۲۷ سال کی تھی۔

والٹیر حکومت کی مسلسل ایذا رسانی سے تنگ آ چکا تھا۔ اسے ایک مقام امن کی ضرورت تھی۔ یہ مقام امن اب اسے خاتون کے مکان میں مل گیا۔ خاتون کا مکان فرانس کی سرحد پر واقع تھا۔ اس لئے اگر حکومت والٹیر کے خلاف کوئی اقدام کرنا چاہتی تو وہ بڑی آسانی سے سرحد پار کر کے دوسرے ملک میں پناہ لے سکتا تھا۔ اس خاتون کے ساتھ والٹیر نے اپنی زندگی کے اگلے چودہ سال گذارے۔

اس عرصے میں والٹیر کو پڑھنے لکھنے کا بہت اچھا موقع ملا۔ خاتون نے اپنے یہاں ایک تجربہ خانہ کھول رکھا تھا جس میں دونوں مل کر سائنس کے تجربے کیا کرتے تھے۔ شام کو دونوں بیٹھ کر مہمانوں کے ساتھ (جو اکثر آتے رہتے تھے) ادب اور فلسفہ پر گفتگو کرتے۔ دونوں تیز مزاج واقع ہوئے تھے اس لئے اکثر ان بن ہو جاتی لیکن پھر ایک دوسرے کو منا لیتے۔

اس چودہ سال کے مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں والٹیر کی علمیت کی دھاک بیٹھ گئی اس کی باتوں کو اب ایک خاص وقعت حاصل ہو گئی گویا اس کو کھڑے ہونے کے لئے ایک مضبوط بنیاد مل گئی۔ اس کے اعتراضات اب غیر اہم سمجھ کر نہیں ٹالے جا سکتے تھے۔ یورپ اب اس کی بات سننے اور اس پر غور کرنے کے لئے مجبور تھا۔ اب تک

اسے صرف ایک شاعر اور ایک کامیاب تمثیل نگار سمجھا جاتا تھا۔ اب اسے عالم اور فلسفی اور اس کے قول کو سند مانا جانے لگا۔

ایک بار پھر والٹیر کی خوش قسمتی نے زور مارا اور خاتون کا نہایت صحیح وقت پر انتقال ہوگیا۔ موت کا سبب ایک بچی کی پیدائش تھا جو نہ مارکوئس چے تولت کی تھی اور نہ والٹیر کی۔ اس خاتون کی دوستی سے والٹیر کو جو فائدہ پہونچا وہ ابھی بتایا جا چکا ہے لیکن اگر یہ تعلق جاری رہتا تو پھر والٹیر کی شخصیت کے لئے مضر ثابت ہوتا۔ خاتون والٹیر کے اوپر بہت حاوی تھی اور وہ اسے اپنے پاس سے کہیں نہ جانے دیتی تھی۔ والٹیر خود اس سے اتنا وابستہ ہو چکا تھا کہ وہ خود اسے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ غرض والٹیر کی زندگی بندھ کر رہ گئی تھی۔ اگر خاتون بروقت نہ مرجاتی تو والٹیر کی شخصیت کا ارتقا رک جاتا۔

خاتون کے انتقال کا والٹیر کو بہت صدمہ ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ تھیٹر کی دلچسپیوں اور فریڈرک شاہ پروشیا کی نوازشوں نے سب کچھ بھلا دیا۔

فریڈرک اپنے زمانہ ولی عہدی سے ہی والٹیر کا معتقد تھا۔ اٹھارویں صدی کے درمیانی دور میں فرانس کی شاعری اور زبان، وہاں کی تہذیب اور طرز رہائش کو یورپ میں معیاری درجہ حاصل تھا۔ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ فرانسیسی زبان تھی۔ درباروں میں فرانسیسی عالموں کو بڑا رتبہ دیا جاتا تھا۔ فریڈرک کی تعلیم بھی حسب معمول فرانسیسی زبان میں ہوئی تھی۔ اسے فرانسیسی زبان سے عشق تھا۔ فرانسیسی زبان کا مصنف اور شاعر بننے کا شوق اسے دیوانگی کی حد تک تھا۔ اس منزل تک پہونچنے کے لئے والٹیر سے بڑھ کر اور کون راہبر ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ولی عہدی کے زمانے سے ہی اُس نے والٹیر سے خط و کتابت شروع کر دی تھی۔ اس نے ایک خط میں لکھا تھا، "میرا عقیدہ ہے کہ دنیا میں صرف ایک خدا اور صرف ایک والٹیر ہے"

فریڈرک ولی عہدی کے زمانے میں بہت آزادانہ اور ترقی پسندانہ خیالات رکھتا تھا۔ اس نے سولہویں صدی کے مشہور لا اخلاقی مصنف میکاولی کے خلاف ایک کتاب لکھی تھی۔ والٹیر اور یورپ کے تمام علمی حلقوں کو اس سے بہت خوش آئند امیدیں تھیں۔ ایک فلسفی اور لبرل بادشاہ یورپ کے لئے ایک نئی بات تھی۔ آزادی اور ترقی کو عزیز رکھنے والے تمام اشخاص اس دن کے منتظر تھے جب فریڈرک تخت نشین ہوگا۔

۱۷۴۰ء میں فریڈرک بادشاہ ہوگیا شاہی لباس پہنتے ہی فریڈرک بالکل بدل گیا۔ وہ بالکل نرالا بادشاہ ہوگیا اس تبدیلی کا اثر والٹیر اور فریڈرک کے تعلقات پر بھی پڑا۔ رفتہ رفتہ دونوں کو ایک دوسرے کے اصل کردار کا اندازہ ہوتا گیا۔ والٹیر کے خواب "فلسفی بادشاہ" کی تعبیر جھوٹی نکلی۔ فریڈرک ایک فاتح جفاکش اور بے رحم بادشاہ نکلا جس نے اپنے باپ کی تیار کردہ فوجی طاقت کے ذریعہ پروشیا کو یورپ کی اہم ترین دول کے زمرہ میں شامل کر دیا۔ اسی کارنامہ کی بنا پر وہ فریڈرک اعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اِدھر فریڈرک کی تیز نگاہوں نے بھانپ لیا کہ والٹیر جتنا فرانسیسی شاعری کا استاد ہے اتنا ہی چالاکی میں استاد ہے۔ باہمی اعتبار اور خلوص رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا لیکن دونوں میں سے کوئی بھی تعلقات ختم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ فریڈرک کا فرانسیسی شاعری سے عشق ویسا ہی زور پر تھا۔ ادھر والٹیر کی حریص نگاہیں دربار پروشیا کے اعزاز و انعام پر لگی ہوئی تھیں۔ روپیہ کی محبت والٹیر کو ابتدائی زندگی سے تھی۔ علاوہ ازیں باوجودیکہ والٹیر کا اپنے ملک میں کافی اعزاز و احترام ہوتا تھا لیکن فرانس کے بادشاہ نے کبھی اسے اس وقعت کی نظر سے نہیں دیکھا جس کا وہ مستحق تھا۔ والٹیر کو یہ بات بہت شاق گذرتی تھی۔ شاید محض اسی غصہ کی بنا پر وہ پروشیا کے دربار میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ بہرکیف باہمی بے اعتمادی کے باوجود والٹیر اور فریڈرک ایک دوسرے کے مشتاق تھے۔

تین چار مختصر ملاقاتوں کے بعد ایک مرتبہ والٹیر کو فریڈرک کے دربار میں جانے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں فرانس کے انگلستان اور آسٹریا سے تعلقات اچھے نہ تھے۔ فرانس کی حکومت اس بارے میں فریڈرک کا عندیہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اگر فرانس کی ان دول سے لڑائی ہوئی تو وہ اس کا ساتھ دے گا یا نہیں۔ فرانسیسی حکومت کی نظر میں اس کام کے لئے سب سے موزوں آدمی والٹیر تھا۔ والٹیر نے بھی سوچا کہ شاید اس طرح وہ یورپ کی سیاست کار گہ میں اپنے لئے کوئی اہم جگہ پیدا کر سکے اور اسی لئے برلن جانے پر راضی ہوگیا۔ لیکن فریڈرک کی نظروں نے مضمون بھانپ لیا اور والٹیر کوئی کام کی بات معلوم نہ کر سکا۔ ادھر فریڈرک خفیہ طور سے ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ والٹیر کا فرانس واپس جانا محال ہو جائے۔ والٹیر کو جب اس کا پتہ چلا تو وہ اور بھی بددل ہوگیا اور اپنی ناکامیوں کی تلخی دور کرنے کے لئے خاتون سے نے تولت کے پاس چلا آیا۔ ابھی اس واقعہ کو ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ خاتون کا انتقال ہوگیا جس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے۔

فریڈرک نے پھر والٹیر کو بلانے کے لئے خط لکھا اس مرتبہ خاتون چے تولت کی محبت اس کے راستہ میں حائل نہ تھی۔ اس لئے وہ فوراً تیار ہوگیا۔ فریڈرک نے خوب آؤ بھگت کی۔ ایک ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ شاہی چیمبرلین کا عہدہ ملا۔ ایک کامیاب فرانسیسی شاعر بننے کے لئے فریڈرک سب کچھ کرنے کے لئے تیار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ والٹیر پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا لیکن اسے خود اپنے اوپر بہت اعتبار تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ چال، نرمی اور سختی سے والٹیر کو اپنے قابو میں رکھ سکے گا لیکن ابھی تک وہ صرف والٹیر کے کردار کی کمزوریوں سے واقف تھا اس کی قوت سے آگاہ نہ تھا۔

قیام برلن کے ابتدائی ایام بہت اچھی طرح گذرے لیکن دو خود پرست شخصیتیں کب تک بغیر ٹکرائے رہتیں اور اہل دربار کے حسد نے غلط فہمیاں پیدا ہونے میں مدد دی۔ والٹیر کو کسی نے آکر بتلایا کہ بادشاہ نے اس کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ "سنترہ چوسنے کے بعد اس کا چھلکا پھینک دیا جاتا ہے" یعنی جب والٹیر سے کام نکل جائے گا تو اسے نکال دیا جائے گا۔ اسی طرح کسی نے فریڈرک سے کہا کہ اس نے والٹیر کو اصلاح کلام شاہی کے بارے میں یہ کہتے ہوئے سنا "کیا میں ہمیشہ اس (فریڈرک) کے گندے کپڑے دھوتا رہوں گا" ویسے بھی اب فریڈرک اور والٹیر کا تعلق آقا اور ملازم کا تھا اور والٹیر اس سے کچھ زیادہ عرصے تک مطمئن نہیں رہ سکتا تھا۔

پہلی ٹکر کی ذمہ دار اس کی طمع زر تھی۔ اس نے ایک یہودی سے ساز باز کر کے غیر قانونی ذرائع سے خوب روپیہ کمایا۔ کچھ دنوں بعد دونوں چوروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ والٹیر اور یہودی میں مقدمہ بازی ہوئی۔ یہودی ہار گیا لیکن والٹیر کا کردار بھی بے داغ ثابت نہ ہو سکا۔ سب جانتے تھے کہ اس نے اپنا مقدمہ مضبوط بنانے کے لیے جعلی کارروائی کی تھی۔

فریڈرک بہت غصہ ہوا۔ "اگر تمہیں سازشوں کا شوق ہے تو بہتر ہوگا اگر تم کہیں اور چلے جاؤ" وہ چلایا فریڈرک اسے علیحدہ کرنا چاہتا تھا لیکن ایک بار پھر فرانسیسی شاعری درمیان میں آگئی کچھ ہفتے گذرنے پر وہی نوازش خسروانہ ہونے لگی۔

لیکن والٹیر کا راستہ ابھی صاف نہ تھا۔ فریڈرک کے دربار میں کئی اور فرانسیسی تھے جو اس کے آنے سے خوش نہ تھے۔ ان سب میں بہا سربرآوردہ ایک سائنسداں ماپرتوئی تھا۔ جسے فریڈرک نے اپنی برلن اکادمی کا

صدر بنایا تھا۔ اس کی شہرت کی بنیاد چند تجربوں پر مبنی تھی جو اس نے سفر لیپ لینڈ کے دوران میں کئے تھے۔ ان تجربوں کے ذریعہ اس نے نیوٹن کے نظریہ (کہ قطبین پر زمین چپٹی ہے) کی تائید کی تھی۔ اس کے علاوہ ماپرتوی فن مجلس سے واقف تھا۔ اس کی گفتگو خاصی دلچسپ اور ظریفانہ ہوتی تھی۔ غرضکہ ماپرتوی اپنی جگہ ایک کامیاب سائنسداں اور کامیاب درباری تھا۔

فریڈرک کے دسترخوان پر دونوں کی آنکھیں ملیں۔ ماپرتوی نے جان لیا کہ دربار میں ایک ایسا آدمی آگیا ہے جو اس کے امتیازی مقام کو چھین لے تو کچھ تعجب نہیں۔ ادھر والٹیر نے دیکھا کہ اس سے کم درجہ کا ایک آدمی اس سے فائق رتبے پر متمکن ہے۔ دونوں کامیابی، شہرت اور رتبے کے حریص تھے۔ ایک دوسرے کو کیسے برداشت کرتے ٹکر ہونا لازمی تھی۔

پہلا اقدام ماپرتوی کی طرف سے ہوا۔ والٹیر کے آنے سے ماپرتوی شاہی حلقہ کا مرکز تھا وہ باتیں کیا کرتا تھا اور سب سنا کرتے تھے اور ہنستے تھے لیکن والٹیر جس کا شمار انسانی تاریخ کے بہترین باتیں کرنے والوں میں ہوتا ہو اس کے سامنے ماپرتوی کی بات کون سنتا۔ ماپرتوی کو اپنے پیروں تلے کی زمین کھسکتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس نے اظہار عداوت کے لئے ایک ایسے شخص کو اپنی پناہ میں لے لیا جو والٹیر کا دشمن تھا یہ گویا اعلان جنگ تھا۔

والٹیر کو بھی بہت جلد حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔

ماپرتوی کا دعویٰ تھا کہ اس نے ریاضی کا ایک اہم اصول "اصول عمل اقل" معلوم کیا ہے۔ ایک سوئیس سائنسداں نے جو کہ برلن اکادمی کا رکن تھا اس دعوی کا رد کیا اور بتلایا کہ یہ اصول بہت پہلے معلوم کیا جا چکا ہے۔ ماپرتوی نے بجائے اس کے کہ اعتراض کا مناسب جواب دے ایک نہایت قابل اعتراض رویہ اختیار کیا۔ اس نے اکادمی کا اجلاس طلب کیا اور ممبروں پر دباؤ ڈال کر سوئس سائنسداں کے خلاف ایک قرارداد پاس کرا دی اور اسے اکادمی کی رکنیت سے علیحدہ کر دیا۔

والٹیر کے لئے حملہ کرنے کو اس سے بہتر اور کون سا موقع مل سکتا تھا۔ دشمن کے محاذ کا سب سے کمزور

لہ برلن اکادمی۔ فرانس کی مشہور پیرس اکادمی کی نقل اور جواب میں فریڈرک نے برلن اکادمی قائم کی تھی۔ برلن اکادمی پر اسے بہت ناز تھا اور اسے اپنے کارناموں میں شمار کیا کرتا تھا۔

مقام اس نے پا لیا تھا۔ کچھ دنوں بعد اخباروں میں سوئس سائنسداں کی تائید میں ایک گمنام زوردار مضمون نکلا جو اتنا زوردار تھا کہ والٹیر کے علاوہ کوئی لکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ماپرٹوی کی تمام شہرت اس مضمون نے خاک میں ملا دی۔ ماپرٹوی کی پشت پر فریڈرک تھا۔ اس پر حملہ گویا فریڈرک پر حملہ تھا۔ ماپرٹوی کو فریڈرک نے سب سے بڑا علمی اعزاز بخشا تھا یعنی اپنی اکادمی کا صدر بنایا تھا۔ اس کی علمیت کی ہنسی اڑائی گئی تھی۔ اس کی ہنسی اڑانا گویا فریڈرک کی ہنسی اڑانا تھی۔ فریڈرک نے خود ماپرٹوی کی طرف سے ایک رسالہ لکھا جس میں اس کی حد سے زیادہ تعریف کی گئی لیکن جب والٹیر مقابلہ پر آتا تھا تو پیچھے ہٹنا نہیں جانتا تھا۔ بادشاہ کی شرکت نے اس کی ضد کو اور بڑھا دیا۔

شامت اعمال کہ ماپرٹوی نے اس دوران میں ایک اور کتاب لکھ ماری۔ والٹیر نے اس پر ایک مفصل تنقید لکھی جو طنز اور ہجو کا بہترین شاہکار ہے۔ اس تنقید نے گویا ماپرٹوی کی حماقتوں کو لافانی بنا دیا۔ لطف یہ کہ والٹیر اس کتاب کا مسودہ فریڈرک کو دکھا چکا تھا۔ فریڈرک نے اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے بعد اس کی اشاعت کو منع کر دیا تھا۔ والٹیر نے فریڈرک کے صریح احکام کے خلاف اس کو شائع کر دیا۔ والٹیر کی ہمت کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ فریڈرک اعظم پروشیا کا خود پرست، خود رائے سخت گیر بادشاہ جس کی مخالفت مول لینے سے یورپ کی پرانی حکومتیں بھی گھبراتی تھیں، والٹیر نے خاص اسی کے احاطہ مملکت میں اس کی نافرمانی کی۔ والٹیر کے پاس سوائے قلم اور دماغ کے کچھ بھی نہ تھا۔ یہ تھی کردار کی وہ قوت جسے فریڈرک اب تک نہ سمجھ سکا تھا۔

کتاب کے سب نسخے فریڈرک کے حکم سے ضائع کر دیئے گئے لیکن ہالینڈ کے چھاپہ خانوں سے اس کے ایڈیشن پر ایڈیشن نکل رہے تھے جو خفیہ طور سے جرمنی میں بکثرت فروخت ہو رہے تھے۔ پورا یورپ آگاہ ہو چکا تھا کہ برلن اکادمی کے صدر کی علمی حیثیت کیا ہے۔ خود صدر اکادمی کو اس کا اتنا صدمہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ فریڈرک نے اظہار غصہ کے لئے کتاب کے سب نسخے جمع کر کے پبلک میں سپرد آتش کرا دیئے۔ والٹیر نے جواب میں شاہی خلعت واپس کر دی جو استعفا دینے کے مترادف تھا۔ لیکن اس کے لئے فریڈرک تیار نہ تھا۔ اس نے مختلف طریقوں سے والٹیر کو روکنا چاہا۔ اس ردوکد میں تین ماہ گذر گئے۔ لیکن والٹیر کو اندازہ ہو چکا تھا کہ فریڈرک سے اس کا نباہ مشکل ہے۔ مارچ ۱۷۵۳ء میں وہ برلن سے آخری بار رخصت ہو گیا۔

پروشیا سے نکل کر والٹیر نے سوئٹزرلینڈ کا رخ کیا۔ اس کا ارادہ سوئٹزرلینڈ میں مستقل قیام کا تھا چنانچہ اس نے وہاں پہونچتے ہی اپنے خطوں پر سوئٹسانی والٹیر لکھنا شروع کر دیا وہ سمجھتا تھا کہ یہاں اس کو وہ آزادی میسر ہوگی جس سے وہ ہر جگہ محروم رہا ہے۔ لیکن اس کی خوش آیند امیدیں بہت جلد ختم ہو گئیں۔ اس کا ایک ڈراما اسٹیج کیا گیا جسے پادریوں نے بہت ناپسند کیا۔ اس کے بعد والٹیر سے اور وہ ایک ایسی فروگذاشتیں ہوئیں کہ اس کی مخالفت برابر بڑھتی رہی۔

والٹیر کی زندگی اب تک انھیں پریشانیوں میں گذری تھی۔ فرانس میں لوئی پانزدہم ہمیشہ اس کے درپے رہتا تھا۔ پروشیا میں وہ فریڈرک سے بگاڑ کر چکا تھا۔ اب سوئٹزرلینڈ میں آیا تو وہاں کے پادری اس سے ناخوش ہو گئے اس مسلسل کشاکش سے بچنے کے لئے اس نے ایک ترکیب سوچی جو واقعی کارگر ثابت ہوئی۔ فرانس اور سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر دو مکان فروخت ہو رہے تھے اس نے دونوں خرید لئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اب ذرا سے خطرہ پر وہ فرانس سے سوئٹزرلینڈ اور سوئٹزرلینڈ سے فرانس میں پناہ لے سکتا تھا۔

فرنی والٹیر کے آنے سے پہلے ایک غیر آباد مقام تھا۔ اس کے آنے کے تھوڑے عرصہ بعد ہی وہ ایک آباد، پر رونق شہر میں بدل گیا۔ والٹیر کی عمر اب ساٹھ سال کی تھی۔ اس کی تندرستی ویسی ہی تھی جیسی کہ پیدائش کے وقت تھی یعنی یہ کہ عنقریب مرنے والا معلوم ہوتا تھا لیکن وہ غیر معمولی قوت عمل جو قدرت نے اسے بخشی تھی عمر کے ساتھ زیادہ ہوتی گئی۔ فرنی کو اس کی کوششوں نے بدل کر رکھ دیا۔ اس نے اپنے مکان کے قریب ایک گرجا اور ایک تھیٹر تیار کرایا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی عمارتیں تیار کرائیں۔ اس نے پاس کے علاقہ کو کاشت سے سرسبز بنا دیا۔ اس نے جنیوا سے بہت سے گھڑی ساز بلوا کر فرنی میں گھڑی کی صنعت کو فروغ دیا۔ جب وہ کسی دوست کو خط لکھتا تو آخر میں یہ بھی لکھ دیتا کہ یہاں گھڑیاں بہت اچھی بنتی ہیں ایک بار آ کر دیکھو۔ فرنی کا نیا جنم والٹیر کی غیر معمولی قوت عمل اور صلاحیت تنظیم کا جیتا جاگتا شاہکار تھا۔

فرنی میں والٹیر نے اپنی زندگی کے آخری بیس سال گذارے تاریخی حیثیت سے یہ اس کی زندگی کا سب سے اہم حصہ ہے یہیں بیٹھ کر اس نے ذہنی آزادی کی اس تحریک کو چلایا جس کے ساتھ اس کا نام ہمیشہ وابستہ رہے گا یہیں اس نے وہ تصانیف کیں جن پر آج اس کی ادبی شہرت غیر متزلزل کھڑی ہے۔ والٹیر

جب فرنی آیا تھا تو وہ محض اپنے زمانے کا مشہور ترین شخص تھا۔ جب وہ وہاں سے آخری بار رخصت ہوا تو اسے خلعت دوام مل چکی تھی۔

فرنی میں والٹیر نے اپنا مشہور ڈراما "کینڈڈے" لکھا۔ یہ بلاشبہ اس کی سرتاج تصنیف ہے۔ شیکسپیر کی تمثیلوں کی طرح یہ انسانی فطرت کے ایک پہلو کو پیش کرتا ہے۔ اسی لئے یہ انسانی فطرت کی طرح لافانی ہے فنی اعتبار سے بھی اس کا درجہ بہت بلند ہے۔

فرنی میں والٹیر نے اور بہت سی چھوٹی چھوٹی تصانیف سرانجام دیں جن میں اس کی کہانیوں کو خاص امتیاز حاصل ہے مستقل تصانیف کے علاوہ بہت سے پمفلٹ، بہت سے مضامین اور بے شمار خطوط اس زمانے کی یادگار باقی ہیں۔ والٹیر کا شمار دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے کامیاب صحافت نگاروں میں ہے۔ اس کو فرانس کی رائے عامہ پر غیر معمولی اثر حاصل تھا۔ اسی سبب سے لوئی پانزدہم نے اسے کبھی پیرس نہ آنے دیا۔ شاید یہ اس کے لئے اچھا ہی ہوا۔ والٹیر اگر کہیں پیرس پہونچ جاتا تو وہاں کی حسین سوسائٹی اور دلچسپ صحبتوں میں پھنس کر رہجاتا وہاں کی گرمی محفل کا شکار ہوجاتا اور سب سے زیادہ یہ کہ وہاں اس کی زبان بند ہوجاتی۔ اس کی خوش قسمتی نے پیرس کا دروازہ اس پر بند کر دیا۔ فرنی کے مسلسل قیام نے اس کے نام کو لافانی بنا دیا۔

والٹیر کو فرانس میں جو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اس میں اس کی تصانیف سے زیادہ چند واقعات کا حصہ ہے۔ ان واقعات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اولاً تو ان سے اس دور کے فرانس کی حالت کا صحیح اندازہ ہوگا ثانیاً ان سے والٹیر کے کردار کا ایک اہم پہلو اجاگر ہوتا ہے یعنی اس کی حق پرستی۔

شہر تولوز کے ایک پروٹسٹنٹ تاجر ژاں کیلے کے لڑکے مارک انتائن نے خودکشی کرلی کسی نے افواہ اڑادی کہ مارک کیتھولک ہونا چاہتا تھا اور اس کے باپ نے تعصب میں اسے مار ڈالا۔ واقعات عدالت تک پہونچے۔ وکیل استغاثہ کوئی صحیح ثبوت مہیا نہ کرسکے لیکن جج صاحبان کیتھولک تھے اور ملزم پروٹسٹنٹ۔ اٹھارویں صدی کے فرانس میں ایسے ملزم کے خلاف کسی ثبوت کی کیا ضرورت تھی۔ ملزم کے لئے سزائے موت کا حکم ہوگیا۔ ملزم کو پہلے لوہے کی سلاخوں سے مار مار کر لہولہان کیا گیا اس کے بعد تعذیبی پہیے کے ذریعہ اسے آہستہ آہستہ مار ڈالا گیا۔

والٹیر کو جب یہ خبر پہونچی تو وہ طیش میں آگیا اس کے بعد مسلسل چار سال تک وہ ججوں کے فیصلہ پر نظر ثانی کرانے

کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے تمام یورپ میں ایک تہلکہ سا مچا دیا۔ ہر جگہ اسی کا چرچا تھا حکومت کے سامنے ججوں کے وقار کا سوال تھا لیکن والٹیر کی کوششیں رائیگاں نہ گئیں۔ مرحوم کیلے کی بے گناہی تسلیم کر لی گئی۔ کیلے کے لئے تو یہ اب بیکار تھا لیکن اس واقعہ نے یورپ میں انصاف پرستی کا نیا جذبہ پیدا کر دیا۔

اس قسم کے کئی اور واقعات ہوئے۔ والٹیر نے ہر مرتبہ حکومت اور ججوں کے فیصلے کے خلاف آواز بلند کی اور ہر بار آخری اپیل میں اس کی آواز سنی گئی۔

آخر عمر میں یورپ کے ہر گوشہ اور ہر طبقہ میں والٹیر کے رتبہ کو مان لیا گیا تھا۔ وہ گویا یورپ کا ذہنی باپ بن گیا تھا فریڈرک نے پانچ سال کی خموشی کے بعد پھر خط و کتابت شروع کر دی تھی اور دونوں میں پھر وہی پہلے سے مراسم ہو گئے تھے۔ روس کی نامور ملکہ کیتھرین کو بھی اس سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی اور ان دونوں کے تعلقات آخر تک اچھے رہے

والٹیر کی عمر ۸۳ سال کی تھی کہ وہ دوستوں اور عزیزوں کے اصرار پر فرنی سے پیرس کو روانہ ہوا۔ اس کا سفر ہنگامہ خیز استقبالوں کا ایک سلسلہ تھا لوگ اسے دیکھنے آتے اور خوش ہوتے نوجوان اس کی خدمت کرنا فخر سمجھتے۔ پیرس میں نہایت شاندار استقبال ہوا پورا شہر اسے خوش آمدید کہنے میں شریک تھا جہاں بھی جاتا لوگ اسے دیکھ کر چلاتے والٹیر! والٹیر زندہ باد!! والٹیر نے پیرس پہنچ کر اپنا ایک نیا ڈرامااسٹیج کرایا جسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔

لیکن پیرس آتے ہی والٹیر کی صحت خراب ہو چلی تھی شاید سفر اور قیام پیرس کے ہنگاموں نے اس کی صحت کو نقصان پہونچایا ہو۔ پیرس آئے ہوئے اسے چند ہفتے ہی ہوئے تھے کہ وہ بخار میں مبتلا ہو گیا اور چند روز بعد انتقال کر گیا

نئے یورپ کی تعمیر میں والٹیر کا بہت اہم حصہ ہے۔ روایاتی مذہب اور نظام قدیم پر کاری ضربیں لگا کر اس نے انقلاب فرانس کا راستہ صاف کر دیا۔ انقلاب فرانس کا سب سے قوی محرک وہاں کی زبوں حالی نہ تھی بلکہ احساس زیاں تھا اور اسی احساس کو ابھارنے میں والٹیر کا بڑا حصہ ہے۔

والٹیر روایاتی عیسائیت کا سخت ترین دشمن تھا کلیسا کو شاید ہی کبھی اتنے سخت مدمقابل کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ پادری اس کا نام سن کر ایسے گھبراتے تھے جیسے بچے ہوا کے نام سے ڈرتے ہیں۔ وہ اسے انسانی شیطان تصور کرتے تھے۔ والٹیر نے اپنی طنز اور پھبتی کی تمام قوتیں اس محاذ پر لا کر جمع کر دی تھیں کبھی وہ توریت کی ایک روایت کو دوسری روایت سے ٹکرا کر ان کا بطلان ثابت کرتا کبھی کلیسا کے پوشیدہ کونوں کو اپنی طنز کی تیز روشنی سے پبلک کے سامنے اجاگر کرتا انقلاب عظیم کے دوران میں کلیسا کے خلاف جس نفرت اور غصہ کا اظہار ہوا تھا وہ ایک بڑی حد تک والٹیر کا ہی ابھارا ہوا تھا۔ اسی

جاتا ہے۔ لامذہبیت ...کا متضاد لقب ملا ہے گو اس کی کلیسا دشمنی کو لامذہبیت کے نام سے یاد کرنا مبالغہ ہے چنانچہ پیرس کے آخری قیام ... ایک نوزائیدہ بچے کو والٹیر کے پاس دعا کے لئے لایا گیا تو اس نے بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔۔ خدا اور آزادی۔

والٹیر کو بجا طور سے دور جدید کی ذہنی آزادی کے سب سے بڑے پیش روؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے فرانس میں ایک نئی سائنٹفک تحریک کا راستہ تیار کیا۔ اس نے ان تمام اداروں کی نہایت سخت نکتہ چینی کی جو آزادی رائے کی راہ میں حائل تھے۔ اس معاملے میں اس کا جذبہ تعصب کی حد تک پہونچ گیا تھا۔ وہ نئے خیالات کے لئے آزادی اور رواداری مانگتا تھا لیکن پرانے خیالات کے لئے وہ ذرا سی رواداری کا بھی حامی نہ تھا۔ خود ان پر بڑی بیرحمی اور سختی سے تنقید کرتا تھا۔ اس کی ذمہ داری کسی قدر والٹیر کی ذاتی سختی طبع تھی لیکن دراصل اس قسم کی کمزوریاں ہر اصلاحی دور کے ابتدائی مراحل میں پائی جاتی ہیں۔ پہلا ردعمل ہمیشہ سخت ہوتا ہے

ادب میں والٹیر کی ایک دو تصانیف ایسی ہیں جو ہمیشہ یادگار رہیں گی اور ان کے علاوہ چند ایسی تصانیف ہیں جو بعض حلقوں میں اب بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں لیکن وہ بہت سے ڈرامے جنہیں پیرس اسٹیج پر دیکھ کر دیوانہ ہوجاتا تھا اب انہیں کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ دراصل والٹیر کی تمام تحریرات صحافتی رنگ لئے ہوئے ہیں اور صحافت اور شہرت دوام کی ہمیشہ سے ان بن رہی ہے۔ صحافت اس شمع کی طرح ہے جس کی روشنی قریب قریب تو خوب تیز ہو لیکن دور پہونچ کر دھندلی پڑجاتی ہو۔ یہی سبب ہے کہ والٹیر کی بے شمار تصانیف میں سے اب صرف گنی چنی کتابیں باقی ہیں باقی سب بھلا دی گئیں۔

والٹیر کو کسی بڑے مفکر کا رتبہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس کا علم وسیع تھا لیکن گہرا نہ تھا۔ اس نے روسو کی طرح کوئی بنیادی سوال نہیں اٹھایا۔ اس نے جو کچھ کہا وہ اسی عصر کے لئے محدود تھا۔ نہ اس نے ہیوم کی طرح انسانی علم کی بنیادوں کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ دراصل نہ وہ کسی غیر معمولی فطانت کا مالک تھا اور نہ گہری نظر کا۔ اسی لئے آج اس کے خیالات اور تصانیف کا کوئی اثر باقی نہیں۔ اب اس کی اہمیت زیادہ تر تاریخی ہے۔ اس کا نام اس لئے یاد کیا جاتا ہے کہ اس نے اٹھارویں صدی میں ذہنی باستیل کی دیواریں مسمار کرکے ایک نئے دور کی آمد کیلئے راستہ ہموار کردیا تھا۔ اسی لئے ذہنی آزادی اس کے نام سے ہمیشہ کے لئے منسوب ہوگئی ہے۔ آج اس کے نام کے ساتھ کوئی سیاسی نظریہ یا اصول فلسفہ یا سائنٹفک انکشاف وابستہ نہیں اور اس کا نام صرف ایک نشان ہوکر رہ گیا ہے۔ آزادی کا نشان! لیکن یہ کیا کوئی معمولی کارنامہ ہے؟

[illegible]

جان ڈیوی کا نظریہ جمہوریت

جمہوریت کا سب سے پہلا علمبردار افلاطون تھا جس نے نظام حکومت کا ایک ذہنی خاکہ اپنی معرکہ آرا تصنیف "ریاست" میں پیش کیا۔ وہ حکومت کو افراد کی بہبود و فلاح کا ضامن ٹھہراتا ہے اور تعلیم کو حکومت کے اہم ترین فرائض میں شمار کرتا ہے اور ریاست کو ایک اخلاقی جمعیت مانتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب افلاطون کی "ریاست" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

"افلاطون سے پہلے بھی عام طور سے یونانیوں میں ریاست کو ایک اخلاقی جمعیت مانا جاتا تھا یعنی ایسی جمعیت جو ایک مشترک متاع روحانی و اخلاقی کی مالک ہو۔ اس لئے ریاست کے فرائض لازمی میں سے یہ تھا کہ وہ اس مشترک متاع روحانی میں اپنے سب ارکین کو حصہ دار بنانے کا اہتمام کرے یعنی اپنے آپ کو ایک تعلیمی ادارہ بنا دے جس میں رہ کر ہر شخص اپنی صلاحیتوں کو پوری ترقی دے سکے اور اس مشترک متاع روحانی کے ذریعہ دوسرے افراد سے رشتہ اتحاد پیدا کرے۔ اس متاع مشترک سے مراد وہ لکھے اور بے لکھے قوانین تھے جن پر عمل پیرا ہونا جماعت کی فلاح اور حسن اخلاق کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ افلاطون بھی جماعت کے اس تعلیمی مقصد کا قائل ہے۔ وہ بھی جانتا ہے کہ ریاست میں حکومت کا کام تعلیم ہے اور تعلیم کا کام افراد کو جمعیت کے مقاصد سے آشنا کرنا اور انھیں جسم سیاسی کا صحیح عضو بنانا ہے" صفحہ ۱۸۔

افلاطون کی سرکردگی و قیادت میں یورپ کے بڑے بڑے فلاسفر و مفکرین نے قدم اٹھایا جس میں روسو، پستالوزی، فروبل اور ڈیوی وغیرہ خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ ڈیوی بیسویں صدی میں جمہوریت کا سب سے بڑا علمبردار ہے اور اس کے نشے سے سرشار ہے کہ افراد کو وہ کسی حالت میں جماعت سے جدا نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اپنے عجیب مضمون تخلیقی جمہوریت (Creative Democracy) میں جو مال ہی میں جریدہ یونٹی (Unity) میں شائع ہوا ہے لکھتا ہے۔

> جمہوریت اخلاقی زندگی کا طریق عمل ہے جو نہ صرف تمام انسانی فطرت کے عقیدہ کا تابع ہے بلکہ اس کا انحصار اس یقین پر ہے کہ اگر صحیح حالات و ماحول فراہم کر دیے جائیں تو انسانی قوت مناسب امتیاز اور عمل کر سکے گی مجھ پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ مجھ کو فطانت اور ارتباط تعلیم و فطانت میں دیہی یقین ہے لیکن اس عقیدہ و ایمان کے ایجاد کا سہرا میرے سر نہیں ہے میں نے تو اس کو اس ماحول و گرد و پیش سے حاصل کیا ہے جس میں جمہوریت ایک پیکر مجسم اور جیتی جاگتی تصویر ہے عقیدۂ جمہوریت کیا ہے؟ اور کس شے کا نام ہے؟ وہ ذہانت کی اس قوت میں مضمر ہے جس سے ایک معمولی انسان اپنی معمولی عقل اور سوچ بچار سے واقعات و خیالات مروجہ کا جواب دینے پر اعتماد کامل رکھتا ہو۔ اور یہ آزاد تحقیق و تفتیش۔ آزاد آئین مجلس اور آزاد آمد و رفت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے

آج جب ہم بیرونی ممالک کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں جہاں عورتوں اور مردوں کو مخبر اور جاسوس کا خوف ہر وقت دامنگیر رہتا ہے اور جہاں دوستوں سے گفت و شنید بھی باعث خطر ہے اور جہاں اجتماعی حیثیت سے اکٹھا ہونا بھی جرم و تقصیر ہے تو ہم کو اس عقیدہ میں اور زیادہ استحکام اور پختگی ہو جاتی ہے کہ جمہوریت ہی میں آزاد طور پر امیر و غریب، شہری و دیہاتی، جاہل و عالم سب لوگ مکان کے اندر اور باہر گفتگو اور بات چیت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جمہوریت اس کی اجازت ہرگز نہیں دیتی کہ اس میں تعصب، ترشگوئی ہتک عزت یا ذاتی بدنامی جس سے مذہبی، سیاسی، معاشی اختلاف برپا ہو یا جس سے رنگ نسل، دولت اور تمدن کا افتراق ہو سراہا جائے۔ وہ ان تمام چیزوں کو بغاوت و سرکشی کے مترادف تصور کرتی ہے حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ شے جو آزادی آمد و رفت اور آزادی گفت و شنید کی ترقی میں مانع ہوتی ہے، بنی نوع انسان کو تفرقوں، ٹولیوں، فرقوں اور قبیلوں میں تقسیم کرتی ہے اور متضاد جماعتوں میں تصادم پیدا کرتی ہے۔ زندگی کے جمہوری طور و طریقہ کی عمارت کو متزلزل کرتی ہے۔ شہری و ملکی آزادی مثلاً آزاد خیالی، آزادی رائے، آزادی اجتماع صرف قانونی ضمانت و کفالت سے سودمند نہ ہوگی اگر روزمرہ زندگی یعنی آزادی آمد و رفت، آزادی خط و کتابت، آزادی لین دین، آزادی عمل و تجربات میں باہمی بدگمانی و شبہ، سخت کلامی، خوف اور بغض و عناد سد راہ ہو جائیں یہ تمام چیزیں جمہوری طرز معاشرت کی اہمیت کو برباد کرتی ہیں اور ان کی بربادی و تباہی ظاہری جبر و استبداد سے زیادہ مہلک ثابت ہوتی ہیں اس کا

بین ثبوت اور عملی مثال موجودہ آمری اور استبدادی حکومتوں میں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب افراد کے دماغ میں عناد و بدگمانی اور تعصب گھر کر جاتی ہے تو وہ بہت پرخطر ہو جاتے ہیں۔

جمہوریت بحیثیت زندگی کی راہ و روش و طریق عمل کے ذاتی عقیدہ کی تابع ہے اور روزمرہ کے اشتراک عمل پر مبنی ہے۔ جمہوریت وہ عقیدہ ہے جہاں ہر فرد کے لئے ضروریات اور نتائج و ثمرات جدا جدا ہوتے ہیں اور برادرانہ تعاون اور اشتراک کی عادت خود ہی زندگی کے لئے ایک گران مایہ اضافہ کرتے ہیں جیسا کہ کھیل کود میں لاگ ڈاٹ اور مقابلہ کا درجہ ہوتا ہے۔ ہر اس فساد اور جھگڑے کو جو پیدا ہوتے ہیں اور جن کا پیدا ہونا لازمی ہے صباحتہ کا رنگ دیدیا جائے، جہاں ذہانت کا مظاہرہ ہو اور اخوت و برادری جذبہ کارفرما ہو۔ حقیقی جمہوری امن و آشتی کیا ہے؟ کیا وہ ایک فرقہ کا دوسرے فرقہ پر بالجبر دباؤ ڈالنے کا نام ہے؟ کیا وہ دباؤ یا انسداد کسی نہ کسی صورت میں متشددانہ ہے، چاہے وہ بجائے ظاہری قید و بند کے نفسیاتی طور پر یعنی استہزا، مذاق، سخت کلامی اور دھمکی سے ہو؟ نہیں! امن اس ایمان و یقین پر مبنی ہے کہ جس کی رو سے جھگڑے فسادات اور اختلافات کا ردعمل میل جول، بھائی چارہ اور اشتراک عمل سے کیا جائے اور جس میں دونوں فریق ایک دوسرے کو خیالات کے ظاہر کرنے اور عمل کو پیش کرنے کا موقع دے سکیں۔ اختلاف رائے کو اس لئے باہمی اور متحدہ طور پر موقع دینا کہ اظہار رائے اور اظہار اختلاف نہ صرف دوسروں کا حق ہے بلکہ شخصی تجربات زندگی کو وسیع کرنے کا ایک کامیاب ذریعہ و وسیلہ بھی ہے۔ یہی روح جمہوری زندگی کے طریق عمل میں کارفرما ہے اور اس کی جبلت و فطرت ہے۔ وہ اخلاقی نصب العین ہے اور اس کا حصول روزمرہ کی زندگی ہے

جمہوریت ایک عقیدہ ہے انسانی تجربہ کی لیاقت و صلاحیت کا جو مقاصد و ذرائع کی افزائش کرتا ہے۔ اور جس سے جدید تجربے منظم طور پر ترقی کرتے ہیں۔ ہر اخلاقی و معاشری عقیدہ کی تشکیل و تنظیم اس خیال پر مبنی ہے کہ تجربہ کو کسی نہ کسی موقع پر اور کسی نہ کسی صوری و ظاہری چیز کا یا کسی حاکم کا جو احاطہ تجربہ سے باہر ہو تابع ہونا چاہئے۔ جمہوریت وہ ایمان ہے جس کی رو سے تجربہ کا عمل بہ نسبت کسی نتیجہ کے زیادہ اہمیت رکھتا ہے تاکہ مخصوص نتائج جو حاصل ہوتے ہیں اعلیٰ اقدار کے ہوں اور ان سے متحرک عمل کی تشکیل و تعمیر ہو۔ چونکہ یہ عمل تعلیمی ہے اس لئے جمہوریت میں عقیدہ رکھنا تجربہ اور تعلیم کے عقائد کے مترادف ہے۔ تمام نتائج و اقدار جو حرکت و ترقی کرنے

دا سے میں محکم و پائدار ہو جاتے ہیں اور حاصل شدہ چیزیں استحکام پیدا کرنے کی جد وجہد کرتے ہیں اور نئے اور بہتر تجربات ان کی رہبری کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس سلسلہ میں دریافت کرے کہ تجربہ کیا ہے تو میں یہ جواب دونگا کہ انسانی افراد اور گرد و پیش کے حالات کے تفاعل کا نام ہے۔ ماحول انسانی ہونا چاہئے جو ضروریات و خواہشات کی تکمیل کرے اور اطمینان و تسکین بخشے اور جو ہماری معلومات میں اضافہ کرے۔ مروجہ حالات کا علم آمد و رفت اور اشتراک عمل کی بنا ہے۔ علاوہ ازیں آمد و رفت سے مراد چند لوگوں کا دوسروں کی ذاتی رائے کی غلامی اور پیروی ہے۔ احتیاج، ضرورت اور خواہش ہمت و قوت کی افزائش کرتی ہے۔ یہ دائرہ ہستی سے ارفع و بلند تر ہے اور اسی وجہ سے علم و سائنس کے دائرہ عمل سے باہر ہے۔

جمہوریت کا اگر زندگی کے دیگر طریق عمل سے مقابلہ کیا جائے تو وہ معیشت و زیست کا وہ طریقہ ہے جو تجربہ کے عمل پر کامل یقین رکھتا ہے اور وہ خود ہی راہ خود ہی منزل، آپ ہی ابتدا ہے اور آپ ہی انتہا ہے اور جو سائنس کی افزائش و ترقی کے قابل و لائق ہے اور جس کا حقیقی انحصار مزید تجربہ کی رہنمائی کرنے پر ہے اور جو جذبات، حاجات و خواہشات کو آزاد کرتا ہے اور ایسی چیزیں مہیا کرتا ہے جن کا ماضی میں وجود تک نہیں ہوتا کیونکہ زندگی کی ہر راہ جو جمہوریت کے معیار تک نہیں آتی اتصال مبادلہ، آمد و رفت اور تفاعل کو جن سے استقلال، استحکام و پائداری ہوتی ہے محدود کرتی ہے۔ آزادی و تونگری کا کام ایسا ہے جس کا روزانہ انجام دینا لازمی ہے۔ چونکہ وہ لا متناہی ہے اور اس کا منتہائے مقصود تجربہ کی اکملیت و انتہا ہے، اس لئے جمہوریت کا ہمیشہ یہ فرض ہے کہ وہ زیادہ آزاد اور بہتر انسانی تجربہ کی تخلیق کرے جس میں ہر شخص کو باہم حصہ ملے اور ہر شخص معین و شریک ہو۔

ضیاء الدین احمد صاحب الہ آبادی

بھید

(ترجمہ کینڈڈا، مصنفہ برنارڈ شا)

(کینڈڈا، برنارڈ شا کے مشہور ترین ڈراموں میں سے ہے۔ اس کا نام بھید اس لئے ترجمہ کیا گیا ہے کہ اگر کینڈڈا کا کوئی دوسرا نام ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے۔ یہ ڈرامہ برنارڈ شا کے اشتراکی عقائد کے زمانے کی چیز ہے۔ اس میں ازدواجی زندگی پر اشتراکی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے ضمناً یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ مذہبی پادری بھی اشتراکی خیالات کو کس طرح اور کس حد تک قبول کر سکتے ہیں) (مترجم)

افرادِ ڈرامہ

جیمس میور ماریل	ایک پادری	مخفف نام ج
یوجین مارچ بنکس	ایک لڑکا	〃 م
کینڈڈا	پادری کی بیوی	〃 ک
برگیس	پادری کا خسر	〃 ب
مس گارنٹ پراززر پائن	ٹائپسٹ	〃 پ
الیگزینڈر لیکسی مِل	پادری کا معین	〃 ل

پہلا ایکٹ

لندن کا شمالی مشرقی حصہ، اکتوبر ۱۸۹۴ء کی ایک صبح۔ ایک نہایت وسیع محلہ۔ اوسط طبقہ کے لوگوں کی آبادی سڑکیں خوب کشادہ، آبادی خوب گنجان۔ جگہ جگہ وہی پرانے پیشاب خانے۔ جا بجا کلب۔ سڑکوں پر ٹرام کے زرد تند ڈبے برابر دوڑتے پھرتے ہوئے۔ سڑکوں کے کنارے مکانات، ان کے آگے چھوٹے چھوٹے باغیچے اور ان میں سبزہ نہایت تر و تازہ اور صاف بیچ میں ایک پگڈنڈی جو لوگوں کی آمد و رفت کی وجہ سے گھر کی چوکھٹ سے لے کر پھاٹک تک بن ہی جاتی ہے۔ سڑکوں پر ایک ہی طرز کے سیکڑوں

بھدے بھدے سنگین اور ان کے سامنے سیاہ چار دیواریاں۔ ہر جگہ وہی پتھریلے صحن، سلیٹ کی چھتیں۔ لوگ نہایت اچھی خاصی طرح یا نہایت بری طرح، خراب لباسوں میں ملبوس نکلتے چلے جا رہے ہیں۔ پیچ پیچ سے واقف۔ انتہائی غور و فکر میں ڈوبی ہوئی شکلیں لیکن اپنے متعلق کم، دوسروں کے متعلق زیادہ۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے گویا کسی خاص کاروباری پہلو پر عمیق نظر ہے۔ کبھی کبھی پولیس کی وردیاں یا کلیسائی پادریوں کی شکلیں بھی نظر آتی ہیں۔ آج سورج خوب چمک رہا ہے کہرو بھی نہیں ہے اور وہ دھواں بھی جو کسی کو چکنے نہیں دیتا (خواہ چونے گارے کا کام ہو یا کسی کا صاف چہرہ) آج اس قدر تکلیف دہ نہیں ہے

لیکن یہ غیر دلچسپ یکرنگ ریگستان اپنے میں ایک نخلستان بھی چھپائے ہوئے ہے۔ ہیکنی روڈ کی دوسری جانب ۱۲ ایکڑ کا ایک کشادہ میدان ہے جس کے چاروں طرف سینخچے لگے ہوئے ہیں۔ لوہے کے نہیں بلکہ لکڑی کے۔ اندر گھاس بکثرت ہے۔ درخت بھی بہت ہیں۔ نہانے والوں کے لئے ایک جھیل بھی بنا دی گئی ہے۔ چمن کی آرائش لندن کے بہترین مالیوں کے ہاتھ میں ہے۔ بچوں کے کھیلنے کے لئے ریت کا ایک تودہ بھی ایک جگہ سمندر کے کنارے سے لایا گیا ہے لیکن اب مختلف محلوں کا کوڑا خانہ ہو جانے کی بدولت منتقل کر دیا گیا ہے۔ ایک چبوترہ بینڈ باجہ والوں کے لئے۔ ایک سیدھا سادا پلیٹ فارم مذہبی یا لا مذہبی یا سیاسی مقررین کی مشق فصاحت کے لئے کرکٹ کھیلنے والوں کی بھی ایک طرف چھوٹی سی زمین ہے۔ کسرت اور جمناسٹک کرنے والوں کا گوشہ الگ ہے۔ پتھر کی ایک پرانے قسم کی چھوٹی سی بارہ دری بھی بنی ہوئی ہے۔ غرضکہ یہ سب چیزیں اس پارک کی خاص زیبائشوں میں سے ہیں۔ جہاں کہیں درختوں کا سایہ زیادہ ہے گھاس خوب پھیلی ہوئی ہے۔ وہ نہایت دلچسپ مقامات ہیں برخلاف اس کے جہاں کہیں زمین چٹیل چلی گئی ہے یا کائی خوردہ ہے یا جہاں چمنیاں اور دھواں ہے وہاں سناٹا ہے اور ویرانی۔

لیکن وکٹوریہ پارک کا بہترین منظر سینٹ ڈومنی کے گھر کی کھڑکی سے ہے کیونکہ وہاں سے چمنیاں یا مکانات وغیرہ نظر نہیں آتے۔ بس پارک ہی پارک اور اس کی دلفریبیاں صرف دکھلائی پڑتی ہیں۔ پادری کا مکان پارک سے بس ذرا سے فاصلہ پر بنا ہے۔ سامنے ایک غلام گردش ہے اور اس کے

آگے ایک باغیچہ۔ ملاقاتی اور کاروباری لوگ نیز گھر کے افراد اس دروازہ پر ہو کر جاتے ہیں جو ناشتہ کے کمرے سے (لیکن جہاں سب ہی کھانے کھائے جاتے ہیں) ملا ہوا ہے۔ باورچی خانہ پشت پر ہے۔ زینہ چڑھ کر یعنی نیچے کے ہال کی چھت پر ڈرائنگ روم ہے۔ سامنے ایک بڑی سی کھڑکی ہے جس میں سے پارک بالکل صاف نظر آتا ہے۔ اس کمرے میں جو لڑکوں بچوں کی چپقلش یا کھانوں کے رکھ رکھاؤ سے بچا ہوا ہے پادری جیمس میوماریل اپنا کام کیا کرتا ہے کھڑکی کے سامنے ایک بہت بڑی اور لمبی میز کے اختتام پر ایک بہت بڑی گھومنے والی کرسی پر پادری بیٹھا ہوا ہے۔ بائیں طرف سے پارک کا منظر بالکل صاف نظر آتا ہے۔ میز کے دوسرے کنارے پر اور اسی سے بالکل ملی ہوئی اس سے تقریباً نصف لمبی چوڑی ایک اور میز بچھی ہوئی ہے جس پر ٹائپ رائٹر رکھا ہوا ہے۔ ٹائپسٹ اپنی کرسی پر جمی ہوئی بیٹھی ہے کھڑکی کی طرف پیٹھ کئے ہوئے بڑی میز پر مختلف قسم کے رسالے، اخبار اور خطوط بکھرے ہوئے ہیں۔ ایک آفس ڈائری بھی دھری ہوئی ہے اور خطوط تولنے کی مشین وغیرہ وغیرہ۔ بیچ میں ایک کرسی ان لوگوں کے لئے پڑی ہوئی ہے جو پادری کے پاس کسی ضرورت سے ملنے آئیں۔ پادری کے دائیں جانب اور اس کی دسترس پر ایک چھوٹا سا اسٹیشنری کیس رکھا ہوا ہے اور ایک فریم کی ہوئی تصویر۔ پیچھے دیوار میں الماریاں لگی ہوئی ہیں جن میں کتابیں باقاعدہ جمی ہوئی ہیں۔ پادری کے مذاق کا پتہ اس کے کتابوں کے انتخاب سے چل سکتا ہے۔ ایک طرف تو مابعد کے مضامین ہیں مذہبی، دوسری طرف براؤننگ کی نظموں کا مکمل سٹ۔ مذاق سیاسی کے اندازہ کے لئے زرد رنگ کی "ترقی و افلاس" کی ایک جلد مضامین فرقہ خیابانی "خواب جان بال" اور کارل مارکس کی "سرمایہ" نامی کتابیں ہیں۔ کمرے کے دوسری جانب بالکل سامنے ٹائپ رائٹر کے قریب دروازہ ہے۔ آتشدان کے پاس ایک کونے پر ایک کتابدان رکھا ہوا ہے۔ قریب ہی ایک صوفہ بچھا ہے۔ آتشدان میں آگ نہایت فیاضی سے جل رہی ہے اور اس کے ایک طرف تو ایک آرام کرسی پڑی ہوئی ہے اور ایک سیاہ کوئلہ دان جس پر جاپانی پھول بنے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف بچوں کے لئے ایک چھوٹی کرسی پڑی ہے۔ آتشدان کی کانس وارنش شدہ لکڑی کی ہے جس میں بہت خوبصورت چھوٹے چھوٹے چوکھٹے بنے ہیں اور ان میں چھوٹے چھوٹے آئینے لگے ہوئے ہیں۔ ایک سفری گھڑی بھی چمڑے کے

کمیں میں لگی ہوئی ہے۔ دیوار پر...... اوپر ایک بڑی تصویر مشہور مصور طیلیان کی بنائی ہوئی تصویر ہم ہے۔ نہایت [illegible] نظر ہے غرضکہ تمام کمرے کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کمرہ کسی سلیقہ مند نگراں کے تحت میں ہے۔ حالانکہ جہاں تک میز کا تعلق ہے وہاں تو کسی غیر موزوں شخصیت سے شکست کھا گیا ہو ورنہ باقی باتوں میں کمرہ تمام تر آئینہ ہے۔ فرنیچر اور اسکی آرائش کا جہاں تک تعلق ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قریب ہی کے معمولی فرنیچر کو خرید لیا گیا ہے لیکن کمرے میں کوئی چیز بیکار یا دکھاوے کے طور پر نہیں ہے کیونکہ پادریوں کے گھر میں اور خصوصاً وہ بھی مشرقی حصۂ شہر کے باشندوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں کہ اسے نمائشی تکلف میں صرف کیا جائے۔

جیمس میومارل ایک اشتراکی عیسائی ہے جو کلیسائے انگلستان سے تعلق رکھتا ہے۔ اور انجمن سینٹ میتھو کا ایک نہایت سرگرم رکن اور ساتھ ہی ساتھ اشتراکی یونین کا ایک سرگرم ممبر بھی ہے۔ چالیس سال کی عمر مضبوط، نہایت توانا، وجیہ چست، خوش مزاج، بے تکلف، نیز نہایت صاف دل، صاف باطن، نہایت مستحکم و مضبوط جسم، پاک و صاف لہجہ جس کے ذریعہ وہ جلسوں میں نہایت پُر اثر اور پرزور طریقہ پر اثر ڈالتا ہے۔ قوت اظہار اور وسعت افکار پر قابو۔ غرضکہ نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا پادری ہے۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اور جس کسی سے کہنا چاہتا ہے نہایت آسانی سے کہہ لیتا اور سمجھا لیتا ہے غلطیوں پر بیدھڑک ٹوک دیتا ہے اور کبھی کوئی ناراض نہیں ہوتا۔ اور اکثر تو دوسروں کے معاملات میں جا الجھتا ہے لیکن کوئی برا نہیں مانتا۔ اس کا جوش اور جذبہ ہمدردی کبھی اس سے جدا نہیں ہوتے۔ اس عمر میں بھی وہ خوب کھانے کھاتا ہے اور بڑے اطمینان سے سوتا ہے تاکہ دوسرے دن کے لئے جتنی کسل ہو گئی ہے نکل جائے اور وہ اپنے دن بھر کے کام کو ختم کرنے کے لئے پھر تیار ہو جائے۔ پھر بھی وہ ایک بڑا گگو تھا بچہ کہا جا سکتا ہے جو لائق معافی طور پر اپنے کمالات پر نازاں ہے اور نادانستہ طور پر اپنے سے خوش ہے۔ چہرہ نہایت بشاش، کشادہ پیشانی بھری بھری کچھ بھوری آنکھیں روشن اور مشتاق، بھدی سی ناک اور منہ محکم لیکن اسکی کاٹ کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہے۔ اور خوب بھرے ہوئے ہونٹ تھے جو ایک ڈرامائی خطیب کے لئے کافی موزوں ہیں لیکن کر اس کے جسم پر کسی طور پر سبک نہیں کہا جا سکتا۔

(اُپسٹ مس پرازر پائین گارنیٹ ایک نہایت تیز مگر مختصر قسم کی عورت ہے عمر تقریباً تیس سال معمولی اوسط درجہ کی ہے لباس معمولی لیکن صاف۔ سیاہ مرینے کی قمیص اور بلاوز، نہایت منہ چڑھی، زبان کی تیز، اخلاقاً زیادہ خلیق نہیں لیکن نہایت حساس اور بہت خیر خواہ۔ وہ اپنی مشین پر نہایت اطمینان سے بیٹھی کھٹ پٹ کر رہی ہے۔ مورَیل اپنی صبح کی ڈاک کا بنڈل کھولتا ہے اور ان کے مضامین کا مفہوم سمجھ کر ایک نہایت مایوسانہ سانس بھرتا ہے لیکن اس انداز سے کہ دیکھ کر ہنسی آجائے)

پرازر پائن۔ کیوں کیا کوئی اور لیکچر؟

ماریل۔ پاکستن فرقہ آزادی والے چاہتے ہیں کہ اتوار کی صبح کو ان کے ہاں لیکچر دوں (لفظ "اتوار" کو خاص طور پر زور دے کر کہتا ہے، کیونکہ یہ شرط ذرا ٹیڑھی ہے)

پ۔ یہ کون لوگ ہیں؟ جہاں تک میرا خیال ہے یہ لوگ اشتمالی نراجی ہوں گے۔

م۔ بالکل نراجی، کہ یہ جانتے ہی نہیں کہ اتوار کو بھلا ایک پادری کیسے آسکتا ہے۔ ان کو لکھ دو کہ اگر وہ میرا وعظ ہی سننا چاہتے ہیں تو بہتر ہے میرے گرجے میں آجائیں۔ یہی ان کے لئے مناسب بھی ہوگا۔ ان کو لکھ دو کہ میں محض دوشنبہ اور جمعرات ہی کو آسکتا ہوں۔ کیا تمہارے پاس وہاں ڈائری ہے؟

پ۔ جی ہاں (ڈائری کو اٹھاتے ہوئے)

م۔ ذرا دیکھنا مجھے آئندہ دوشنبہ کو کہیں لیکچر دینے جانا تو نہیں ہے؟

پ۔ (ڈائری دیکھتے ہوئے) ہاں ٹاور ہیملٹس ریڈیکل کلب میں۔

م۔ اچھا جمعرات کو؟

پ۔ انگلش لینڈ رسٹوریشن لیگ۔

م۔ اس کے بعد اور؟

پ۔ انجمن سینٹ میتھو دوشنبہ کو آزاد مزدور پارٹی، گرینوچ شاخ جمعرات کو، سماجی ڈیموکریٹک فیڈریشن مائیل اینڈ شاخ دوشنبہ کو، پہلا کنفرمیشن کلاس جمعرات کو (تنگ آکر) میرے خیال میں بہتر یہی ہے کہ میں ان کو لکھ دوں کہ آپ تشریف نہیں لا سکتے۔ ایک آدھ درجن تو آدمی ہیں۔ جاہل سترہ سے پچیس پانچ ٹکے تو ان کے

پاس نکلیں گے نہیں۔

م۔ (رے ایسا نہ کہو وہ سب ہمارے نہایت عزیز رشتہ دار ہیں۔

پ۔ (حیرت سے منہ تکتے ہوئے) آپ کے رشتہ دار؟

م۔ ہاں ہم سب کا باپ وہی ایک ہے آسمانوں والا۔

پ۔ (مطمئن ہو کر) بس یہی رشتہ داری ہے نا؟

م۔ (ذرا اداسی کے ساتھ، لیکن جو مایہ نطف ہے ایک ایسے شخص کے لئے جو اس کو نہایت خوبصورتی سے ادا کر سکتا ہے) افسوس تم اسے یقین نہیں مانتیں ہر ایک یہی کہتا ہے کوئی اس میں یقین نہیں کرتا۔ کوئی بھی نہیں (تیزی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہوتے ہوئے) اچھا خیر مس پرآزربائن جلد ان لوگوں کے لئے کوئی تاریخ مقرر کر دو پھر نس کیسی رہے گی؟ پرسوں تو خالی تھی۔

پ۔ (ڈائری دیکھتے ہوئے) خالی نہیں ہے۔ فیبیان سوسائٹی۔

م۔ ہٹاؤ بھی فیبیان سوسائٹی! اٹھائیسویں؟

پ۔ شہر میں ڈنر کو جانا ہے۔ فاؤنڈرس کمپنی نے مدعو کیا ہے۔

م۔ ٹھیک ہے بس، اس کے بجائے میں پاکستن فرقۂ آزادی کو جاؤں گا (وہ خاموشی سے اس تاریخ کو درج کر لیتی ہے لیکن چہرہ سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ پاکستن نراجیوں کو ذلیل سمجھ رہی ہے۔ ماریل ایک رسالۂ اصلاح کلیسا نامی کو جو ابھی ڈاک سے آیا ہے اٹھاتا ہے اور مسٹر اسٹوارٹ میڈلام کے اڈیٹوریل اور انجمن سینٹ میتھو کی خبروں کو دیکھنے لگتا ہے! اتنے میں اس کے ماتحت الیگزینڈر ملل کی صورت دکھائی دیتی ہے اور یہ خشک مشغولیت بامزہ ہو جاتی ہے۔ ملل ایک نوجوان آدمی ہے جس کو ماریل نے وہیں لندن یونیورسٹی سے حاصل کر لیا ہے وہ آکسفورڈ کا باشندہ ہے اور مشرقی لندن کو اپنی تعلیمات سے فائدہ پہونچانے آیا تھا کہ ماریل نے اس کی خدمات حاصل کر لیں نہایت بانکپن لیکن نیک اور پرجوش حالانکہ اپنے کام میں ہنوز ناپختہ۔ بولتا خدا ہونٹوں کو دبا کے ہے۔ محض اس لئے کہ الفاظ ذرا خاص یونیورسٹی کے پاکیزہ لہجوں میں نکلیں ایک قسم کی شان کے ساتھ جس کو وہ صفائی کہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس طرح شہری سکے غیر تعلیم یافتہ لوگوں کا مذاق پاک و صاف ہو جائے گا۔ ماریل (جس کو اس نے سنگ نا وفاداری کی بت

سے خوب مولم کر لیا ہے۔ اصلاح کلیا سے نظار تھا کر اس کی طرف نہایت نظلمت سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے)

م۔ کہو لیکسی آج پھر دیر!

ل۔ غالباً! کیا کروں، چاہتا تو بہت ہوں لیکن سویرے سے آنکھ ہی نہیں کھلتی۔

م۔ (اپنی سحر خیزی پر نازاں ہوکر خوب! خوب!! (دمن میں) شب بیداری کیا کرو، نمازیں پڑھا کرو، لیکسی نمازیں پڑھا کرو

ل۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے (ایک مناسب جواب سوچ کر) لیکن میں کیسے شب بیداری کر سکتا ہوں یا نمازیں پڑھ سکتا ہوں جبکہ میں سوتا ہی رہتا ہوں کیوں مس پرازی؟ (آتشدان کی طرف جاتا ہے)

پ۔ مہربانی سے مجھے مس گارنٹ کہا کیجئے۔

ل۔ معاف کیجئے گا مس گارنٹ۔

پ۔ آج آپ کو تمام دن کام کرنا ہوگا۔

ل۔ (آتشدان کے پاس سے) کیوں؟

پ۔ کیوں ویوں جانے دیجئے۔ کھانا کھانے سے پہلے بہتر یہ ہے کہ کھانا کھایا جائے جیسا کہ میں کرتی ہوں آیئے کاہلی نہ فرمایئے آپ کو اپنے گشتی کام پر جانے میں آدھ گھنٹہ کی دیر ہو چکی ہے۔

ل۔ (پریشان ہوکر) کیا یہ صحیح کہہ رہی ہے مسٹر ماریل؟

م۔ (خود کو نہایت ارفع محسوس کرتے ہوئے، آنکھیں جھپکتی ہوئیں) ہاں، اس لئے کہ آج میں کاہلی کرنے جا رہا ہوں۔

ل۔ آپ! لیکن آپ تو یہ جانتے ہی نہ تھے۔

م۔ (اٹھتے ہوئے) ہا! ہا! خوب! میں جانتا ہی نہیں؟ آج اس صبح کو میں اپنی صبح بنانا چاہتا ہوں یعنی میری بیوی آج واپس آرہی ہے۔ وہ یہاں ٹھیک پونے بارہ بجے پہنچ جائے گی۔

ل۔ (متعجب ہوکر) واپس آرہی ہیں! بچوں سمیت؟ میرا خیال تھا کہ وہ سب کم از کم ایک مہینہ بعد آئیں گے۔

م۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن وہ اکیلی صرف دو دن کے لئے آرہی ہے جیمی کے لئے کچھ فلالین کی چیزیں لینا ہیں اور یہ دیکھنے کے لئے کہ ہم لوگ اس کے بغیر گھر کا کام کس طرح چلا رہے ہیں۔

ل۔ (پریشانی سے) لیکن مسٹر ماریل جیمی اور فلفی کو تو سرخ بخار آیا تھا میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے کہ۔۔۔

م۔ سرخ بخار، مثلاً محض خسرہ تھا بلکہ وہ تو میں خود پانی کرافٹ اسکول سے لایا تھا۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ایک پادری ایک ڈاکٹر کی طرح ہوتا ہے وہ متعدی امراض کا مقابلہ اسی طرح کرتا ہے جس طرح ایک سپاہی گولیوں کا (لیکسی کی پیٹھ نہایت پدرانہ شفقت کے ساتھ تھپتھپاتا ہے) اگر تم میں کچھ ہمت ہے تو ذرا خسرہ کہیں سے لگا لاؤ میری بیوی تمہاری تیمارداری کرے گی۔ اور یہ موقع تمہارے لئے کیا نایاب ہوگا! کیوں نا؟

ل۔ (دبی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ) مسٹر ماریل کے متعلق آپ کی باتیں کچھ سمجھ میں نہیں آتیں۔

م۔ میرے بچے شادی کر شادی! (محبت سے) پہلے ایک کسی نیک عورت سے شادی کر لو تب تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔ وہ آسمانی حکومت جو ہم زمین پر قائم کرنا چاہتے ہیں ایسی شادی اس جنت ارضی کا تمہیں قبل از وقت لطف بخش دے گی اور تمہاری کاہلی بھی اس سے قطعی دور ہو جائے گی۔ ہر سمجھ دار آدمی جو خود سے مطمئن اور اپنی حالت سے خوش ہے اس کو ہر گھنٹہ کی زکوٰۃ ایسا کام کر کے دینا چاہئے جس سے دوسرے خوش ہو سکیں۔ ہم کو کوئی حق نہیں ہے کہ ہم اس کا مصرف تو کریں لیکن اسے پیدا نہ کریں۔ بالکل اسی طرح کہ ہم روپیہ خرچ تو کریں لیکن کمائیں نہیں۔ ایک بیوی تلاش کرو بالکل میری کینڈیڈا کی سی، اور تم خوشیوں کی زکوٰۃ کبھی پوری تمادا کر پاؤ گے (لیکسی کو نہایت محبت سے تھپتھپاتا ہے اور باہر جانے کا ارادہ کرتا ہے)

ل۔ ذرا ٹھہرئیے! میں بالکل بھول گیا (ماریل رکتا ہے اور دروازہ کا دستہ پکڑتے ہوئے اس کی طرف مڑتا ہے) آپ کے قبلہ خسر صاحب آپ سے ملنے تشریف لا رہے ہیں۔ (ماریل متعجب ہوتا ہے اور کچھ خوشی کا اظہار نہ کرتے ہوئے دروازہ کو پھر بند کر دیتا ہے اور لہجہ میں ذرا تبدیلی آ جاتی ہے)

م۔ مسٹر برگیس؟

ل۔ جی ہاں مجھے وہ پارک میں ملے تھے کسی سے مباحثہ میں مصروف تھے۔ مجھ سے کہہ دیا کہ میں آپ سے ان کی آمد کے متعلق عرض کر دوں۔

م۔ (نیم اعتباری سے) لیکن وہ تو یہاں تین سال سے نہیں آئے لیکسی کیا تمہیں بالکل یقین ہے۔ مذاق تو نہیں کر رہے ہو لیکسی؟

ل۔ (نہایت صاف دلی سے) نہیں صاحب میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔

م (کچھ سوچتے ہوئے) ہوں! خیر ابھی وقت ہے کہ وہ کینڈڈا کو کچھ دن اور دیکھ لے، ورنہ بعد میں وہ شاید اس کی سمجھ سے باہر ہو جائے (آنے والی آفت پر صبر کر لیتا ہے اور باہر چلا جاتا ہے)

(لیکسی اس کی طرف نہایت ہی عقیدتمندانہ نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔ مس گارنٹ چونکہ لیکسی کو بات چیت میں شکست نہ دے سکی تھی اس لئے جھنجھلاہٹ ٹائپ رائٹر پر برابر اتار رہی تھی)

ل۔ کس قدر عمدہ آدمی ہے! کتنی محبت والا!! (وہ مارل کی جگہ پر آ کر بیٹھ جاتا ہے اور نہایت اطمینان سے سگریٹ پینے لگتا ہے)

پ۔ (نہایت گھبراہٹ سے اس خط کو نکالتے ہوئے جس کو کہ وہ ٹائپ کر رہی تھی اور پھر موڑتے ہوئے) ہوں! اہر شخص کو ایسا نہ چاہئے کہ اپنی بیوی سے محبت تو رکھے لیکن ہر جگہ خواہ مخواہ اس کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرے۔

ل۔ چونک کر! آئیں! مس پرازی!

پ۔ (اسٹیشنری کیس میں سے ایک لفافہ نکالتی ہے اور اس میں خط رکھتے ہوئے) یہاں کینڈڈا، وہاں کینڈڈا، ہر جگہ کینڈڈا ہی کینڈڈا (لفافہ کے گوند کو ہونٹوں سے تر کرتی ہے) آخر کوئی حد بھی ہے۔ آدمی سنتے سنتے بوکھلا جائے (لفافہ کے پرت کو زور سے جاتے ہوئے کہ خوب جم کر چپک جائے) آخر یہ کونسی بات ہے کہ ایک عورت کی اس قدر تعریفیں کی جائیں، اور پھر وہ بھی کوئی خاص بات بھی تو ہو۔ سوائے اس کے کہ ذرا بال اچھے ہیں اور صورت شکل کسی قدر غنیمت ہے۔

ل۔ (مجروح ہو کر سنجیدگی سے) مس گارنٹ میرا تو یہ خیال ہے کہ وہ نہایت خوبصورت ہے (وہ اس کی تصویر اٹھا لیتا ہے، اس کو دیکھنے لگتا ہے اور پھر اور بھی یقین کے ساتھ کہتا ہے) نہایت ہی خوبصورت آنکھیں کس قدر عمدہ ہیں!

پ۔ آنکھیں! اس کی آنکھیں قطعی میری آنکھوں سے بہتر نہیں ہیں۔ (وہ تصویر نیچے رکھ دیتا ہے اور نہایت سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھنے لگتا ہے) لیکن تم تو مجھے یہی سمجھتے ہو گے کہ غریب ہے بھدی ہے محض دوسرے درجہ کی۔

ل۔ (اپنی جگہ سے نہایت آن سے اٹھتے ہوئے) خدا نہ کرے کہ میں خدا کی کسی مخلوق کے متعلق ایسا خیال رکھوں۔

(وہ نہایت اطمینان سے اٹھ کر کتابوں کے کیس کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے)

پ۔ شکریہ! آپ کا یہ جملہ نہایت عمدہ ہے اور بہت تسکین دہ۔

ل- ان کی کم ظرفی سے رنجیدہ ہو کر کہ مجھے اس امر سے قطعی ناواقفیت تھی کہ آپ کو مسز مارٹیل سے کوئی خاص شکایت ہے

پ- (خفا ہو کر) مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے، وہ نہایت ہی عمدہ عورت ہے۔ نہایت نیک۔ نہایت شریف مجھے اس سے بے حد محبت ہے بلکہ میں اس کی جتنی قدر کر سکتی ہوں اور کرتی ہوں اتنی کوئی مرد نہیں کر سکتا (وہ اپنا سر افسردگی سے ہلاتا ہے وہ اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اس کے پاس نہایت طنطناتی ہوئی آتی ہے) تم میری بات کا یقین نہیں کرتے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں حاسد ہوں؟ مسٹر لیکسی تم تو انسانی فطرت کے بڑے ماہر معلوم ہوتے ہو، تم کو جیسے عورت کی کمزوریاں خوب معلوم ہی تو ہیں! مرد ہونا بھی کس قدر دلچسپ ہوتا ہوگا کہ ایسی دور رس عمیق نگاہیں رکھے، نہ کہ ہم لوگوں کی طرح جو محض جذبات ہیں اور پھر کس قدر آسانی سے فرض کر لیتے ہو کہ چونکہ ہم تم لوگوں کی طرح رومانی مغالطے میں نہیں پھنستے۔ اس کا سبب محض حسد ہوگا (اسے چھوڑ کر گردن ہلاتی ہوئی آتشدان کے پاس جا کر تاپنے لگتی ہے، گویا کہ پالا مار لیا)

ل- مس پرازی اگر اسی قدر علم تم کو مرد کی طاقت کا ہوتا جیسا کہ اس کی کمزوریوں کا ہے تو پھر مسئلہ نسواں اٹھتا ہی نہیں۔

پ- (ہاتھ سینکتے ہوئے گردن گھما کر) تم نے مارٹیل کا یہ کہنا کہاں سے سنا؟ یہ خود تمہارا جملہ ہرگز نہیں ہے، تم اتنے سمجھدار نہیں ہو کہ ایسا جملہ سوچ سکو۔

ل- ہاں! یہ بالکل ٹھیک ہے اور مجھے قطعی اعتراف ہے کہ اکثر حقائق مجھے اس سے حاصل ہوئے ہیں۔ ہاں اس نے یہ جملہ آزادی نسواں فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس کے موقعہ پر کہا تھا۔ ایک بات کہئے تو اور بتا دوں، وہ یہ کہ اس جملہ کو وہاں کسی نے پسند نہ کیا تھا سوائے ایک مرد کے یعنی میں نے (کتابوں کے کیس کی طرف پھر مڑ جاتا ہے یہ خیال کر کے کہ بس اب اس نے اس کو کچل ہی ڈالا۔ ایسی شکست دیدی ہے کہ اب کیا منہ کھولے گی)

پ- (مینٹل پر جو آئینہ رکھا تھا اس میں اپنے بال ٹھیک کرتے ہوئے) خیر لیکن جب کبھی آپ مجھ سے باتیں کیجئے تو بہتر یہ ہے کہ اپنے ہی خیالات کا اظہار کیا کیجئے جیسے کچھ ہوں نہ کہ دوسروں کے جب تم مارٹیل کی نقل پر آجاتے ہو تو تم پر ذرا بھی نہیں کھبتا۔

ل- (چڑ کر) میں اس کے نقش قدم پر ضرور چلنے کی کوشش کروں گا حالانکہ اس کی نقل بالکل نہیں کرتا۔

پ۔ (پھر اس کے پاس سے گذر کر اپنے کام پر جاتے ہوئے) نہیں، تم نقل ضرور کرتے ہو، غلطی کرتے ہو! تم اپنی چھتری کیوں ان کی طرح اپنی بائیں بغل میں دبا لیتے ہو اور جس طرح اور لوگ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں کیوں اسی طرح نہیں لیجاتے! تم اپنی ٹھوڑی اٹھا کر کیوں چلتے ہو۔ اور آنکھوں میں وہی ترحم کی نظریں کیوں ظاہر کرتے ہو۔ تم جو کہ کبھی سویرے ساڑھے نو بجے سے پہلے اٹھتے ہی نہیں! جب گرجا جاتے ہو تو وہاں علم کو بہت گہری آواز سے کیوں کہتے ہو۔ سیدھی سادی طرح کیوں نہیں کہتے جیسے یہاں آپس میں بولتے ہو۔ جائیے بھی آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے معلوم ہی نہیں (ٹائپ رائٹر کے پاس چلی جاتی ہے) آئیے اب اپنے کام پر بیٹھئے! ہم لوگوں نے کافی وقت خراب کر ڈالا ہے۔ یہ لیجئے آج کی ڈائری کا کام ہے (وہ ایک یادداشت حوالے کرتی ہے)

ل۔ (نہایت ہی چڑ کر) لائیے، شکریہ! (وہ اسے لے لیتا ہے اور اس کی طرف پیٹھ کئے ہوئے میز کے پاس کھڑا ہو کر پڑھنے لگتا ہے، پرازی شارٹ ہینڈ کو ٹائپ کرنے لگتی ہے اور اس کے احساسات کی تکلیف کا بالکل خیال کرنا نہیں چاہتی)

(دروازہ کھلتا ہے اور مسٹر برگس بغیر اطلاع کے اندر تشریف لے آتے ہیں۔ کوئی ساٹھ کی عمر ہو گی۔ معمولی کاروبار میں پڑ کر ضروری خود غرضی نے اس شخص کو نہایت ابتر اور اچھی طبیعت کا بنا دیا ہے۔ اور پھر پُرخوری اور کاروباری کامیابی نے موٹاپا، کاہلی اور انانیت پیدا کر دی ہے۔ ایک نہایت ہی جاہل، اوچھا اور طامع آدمی ہے ان لوگوں سے تو نہایت حقارت اور تکبر سے ملتا ہے جن کی آمدنی کم ہو لیکن جن کے پاس روپیہ ہو یا جو کسی مرتبہ کے آدمی ہوں ان کی تو ہمہ وقت نہایت ہی ادنیٰ خدمت کو تیار رہتا ہے لیکن دراصل نہ اِن کا ہے نہ اُن کا دنیا یا قسمت نے اسے اور کوئی کام نہیں دیا سوائے اس کے کہ وہ ایک کارخانہ کا نہایت ظالم مالک ہو جائے اور چنانچہ وہ خاصا ورندہ ہو گیا ہے لیکن خود اس کو اس بات کا علم نہیں، اور نہایت سچے دل سے سمجھتا ہے کہ اس کاروبار کی فروغ و کامیابی محض صلاحیت لیاقت، دیانتداری، محنت، تجربہ اور دور بینی کا لازمی نتیجہ ہے ایک ایسے انسان کا اپنی نجی زندگی میں نہایت خوش باش، نیک ہمدرد ہے اور خوش طبع تو اس قدر ہے کہ ضرورت سے زیادہ جسمانی حالت آپ کی یہ ہے کہ نہایت چھوٹے موٹے سے آدمی ہیں، ناک کی نوک تمتمی ایک سپاٹ چہرے پر نہایت لمبی چلی گئی ہے۔ بھدی ڈاڑھی جس میں ٹھوڑی کے نیچے سفید بالوں کا دائرہ چھوٹی چھوٹی آنکھیں کٹکیلی جن سے لجاجت آشکارا ہے اور جس کو وہ اپنی آواز میں منتقل کر لیتا ہے کیونکہ اپنے جے نہایت شان سے ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے)

نورالحسن ہاشمی

بنیادی تعلیم کی دوسری کانفرنس

ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ زندگی کی جتنی جیتی جاگتی تصویریں شاعر یا ادیب کا قلم بنا سکتا ہے، اتنی مصور کی رنگ آمیزیوں یا چنگ و رباب کے دلکش نغموں میں بھی ممکن نہیں۔ زندگی کی مصوری کی قلمرو میں شاعر اور ادیب کی حکمرانی میں کوئی اس کا برابر کا شریک نہیں، لیکن اس بیسویں صدی نے جہاں صدہا دوسرے بنے بنائے اصولوں کو تہ و بالا کر دیا وہاں شاعر اور ادیب کی یہ مسلمہ حکمرانی بھی کسی اور کو سونپ دی۔

اب یہ کہنا کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، اتنا صحیح نہیں جتنا یہ کہنا کہ "تعلیم زندگی کا آئینہ ہے"۔ بلکہ اب تو ہم شاید زیادہ آسانی سے یہ تک کہہ سکتے ہیں کہ تعلیمی دنیا ہی ہماری دنیا ہے، دنیا کے تیزی سے بدلتے ہوئے نظام کا اثر زندگی میں اور کہیں اتنا نظر نہیں آتا، جتنا تعلیمی نظام میں۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ جس انقلاب آفریں زمانہ کی کروٹیں، خطرات کو بھی بہت پیچھے چھوڑ کر، زندگی کو خدا جانے کہاں سے کہاں لئے جا رہی ہیں، اس میں بیچارے شاعر یا ادیب کا کہاں گذر، اس کا قلم اس تیز روی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ آج کے بنائے ہوئے نقوش کل اتنے پھیکے نظر آنے لگتے ہیں کہ زندگی کی تصویر دھندلی ہوتے ہوتے تاریک ہو جاتی ہے۔

لیکن بیسویں صدی کی تعلیم چاہتی ہے کہ زندگی اس میں سما جائے اور وہ زندگی میں۔ تعلیم اور زندگی میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔ امریکہ، جرمنی، روس، آسٹریا، انگلستان اور جاپان ہر جگہ پچھلے ۲۵ - ۳۰ برسوں سے زندگی اور تعلیم کو ایک دوسرے سے اتنا قریب لانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مدرسے دنیا کی رنگین اور متنوع زندگی کا ایک چھوٹا موٹا نمونہ بن جائیں۔ ان میں سے پڑھ کر نکلنے والے بچے زندگی کا صحیح مفہوم سمجھنے کے قابل ہوں۔ وہ زندگی کو اپنا سمجھ سکیں۔ زندگی انھیں اپنا بنا سکے، ان کی بنائی ہوئی دُنیا اور زمانے کی پیدا کی ہوئی دنیا میں بیر نہ رہے۔ زندگی انھیں آگے بڑھانے اور وہ زندگی کو "زندگی" سے ان کی زندگی رنگین ہو اور اُن سے

" زندگی تر یادہ رنگین بنے۔ یہ ہے " نئی تعلیم" اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ تعلیم زندگی کا آئینہ ہے۔"
تعلیم اور زندگی دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔

ہندوستانی اپنی غلامی کے ہاتھوں جہاں زندگی کی دوسری دوڑوں میں ساری دنیا سے پیچھے ہے، وہاں تعلیم کی راہوں میں بھی وہ سب سے بچھڑا ہوا ہے۔ اس کا احساس کچھ آزاد دماغوں نے وقتاً فوقتاً کیا تو لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ ہندوستان میں بھی تعلیم اور زندگی کو ایک بنایا جائے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ تعلیم میں زندگی کا رنگ بھرا جائے اس خیال نے عملی جامہ اس وقت سے پہنا جب اب سے کوئی تین سال پہلے ہندوستان کے مختلف حصّوں میں "بنیادی تعلیم" کا تجربہ شروع ہوا۔ ایک سال کے تجربہ کے بعد ۱۹۳۹ء کے آخر میں پونا میں بنیادی تعلیم کی پہلی کانفرنس ہوئی۔ اس تجربہ کو چلانے والے جگہ جگہ سے آکر یہاں جمع ہوئے۔ اپنے تجربوں سے دوسروں کو سکھایا، دوسروں کے تجربے سے خود سیکھا۔ کامیابیوں پر خوش ہوئے، ناکامیوں کو دور کرنے کی ترکیبیں سوچیں اور پھر ملک کے مختلف حصوں میں پھیل کر اپنے کام کو نئے تجربوں کی نئی روشنی میں چلانا اور آگے بڑھانا شروع کیا۔ پہلی کانفرنس نے بتایا تھا کہ تعلیم سچ مچ اب زندگی سے قریب آرہی ہے۔ اس کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ کوئی سوا سال گذر گیا نئی تعلیم کا تجربہ کرنے والے پھر اپنے اپنے تجربے کی شمعیں لے کر جمع ہوئے۔ کچھ سیکھا، کچھ سکھایا اور یہ بتا کر کہ تعلیم نے زندگی کی طرف ایک قدم اور بڑھا لیا ہے، سب پھر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے یہ بنیادی تعلیم کی دوسری کانفرنس تھی۔

بنیادی تعلیم کی دوسری کانفرنس ۱۱ اپریل سے ۱۴ اپریل ۱۹۴۱ء جامعہ نگر میں ہوئی۔ گجرات، بنگال، ممالک متوسط، بہار، اڑیسہ، ممالک متحدہ، جنوبی ہند، کشمیر، حیدرآباد، اندور اور راجپوتانہ سے تقریباً سو سرکاری اور غیر سرکاری معلم کانفرنس میں شریک ہونے اور اپنے تجربے کو ایک قدم اور آگے بڑھانے آئے تھے۔ کانفرنس کا افتتاح ۱۱ اپریل کو شام کے ۵ بجے بابو راجندر پرشاد نے کیا۔ بابو راجندر پرشاد کے خطبے سے پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے مہمانوں کا استقبال

کرتے ہوئے پہلی اور دوسری کانفرنس کا فرق بتایا اور کہا کہ پہلی کانفرنس ایک صوبے کی امیر حکومت نے بلائی تھی اور آج کی کانفرنس ایک غریب قومی ادارے کی دعوت پر ہو رہی ہے۔ اس فرق کو دیکھ کر ہی ہمارا دھیان اس طرف جاتا ہے کہ بنیادی تعلیم کے کام کو سنبھالنا آزاد اداروں کے بس کی بات نہیں، یہ کام تو حکومت ہی کو سنبھالنا ہوگا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ایسی حکومت ہمیں خود ہی پیدا کرنی ہے۔ ہم اپنی کوششوں سے ایک آزاد حکومت بنائیں گے، وہ اس کام کو سنبھالے گی۔ ہم اپنے اپنے آزاد تجربوں سے حکومت کا ہاتھ بٹائیں گے۔ حکومت کو یہ کام سونپ کر ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتے۔ ہمارا کام تو حکومت کے کام کے بعد بھی جاری رہے گا۔ اس سلسلے میں ذاکر صاحب نے کہا کہ

"میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی تعلیم کا کام ریاست کا کام ہے۔ یہ اتنا بڑا اور اتنا پھیلا ہوا کام ہے کہ نجی کوششیں اسے سمیٹ نہیں سکتیں، لیکن اگر ریاست کسی ایک فرقے یا ایک گروہ کی حکومت کا نام ہے تو یہ ایسی چلتی پھرتی چھاؤں ہے کہ تعلیم اس کے ہاتھ میں کبھی زیادہ دیر تک ٹھیک راستے پر نہیں چل سکے گی۔ ہاں، ریاست اگر سماجی زندگی کی اس تنظیم کو کہتے ہیں جس کی بنیاد انصاف پر ہے۔ جو خود روز بروز اپنی اس بنیاد کو مضبوط کر کے اخلاقی ترقی کرتی جاتی ہے اور دن بدن اپنے شہریوں کی کوشش سے ہر گروہ اور ہر طبقے کیا ہر آدمی کی شخصیت کی ترقی کا راستہ اس میں سہل سے اور سہل ہو جاتا ہے تو پھر تعلیم ایسی ریاست کا سب سے ضروری کام ہے اس لئے کہ خود اس کی اخلاقی ترقی اس کام سے ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی ریاست کامل بے عیب ریاست نہیں ہو سکتی مگر بعض ریاستوں کی بنیاد اخلاق اور نیکی پر ہوتی ہے بعض کی نہیں ہوتی۔ بعض اخلاقی بہتری کی طرف چلتی ہیں بعض نہیں چلتیں۔ بعض عدل کے قریب ہونا چاہتی ہیں، بعض نہیں ہونا چاہتیں۔ بعض میں سب کے لئے ترقی کی راہیں کھلی ہوتی ہیں، بعض میں کچھ کے لئے کھلتی جاتی ہیں اور کچھ کے لئے اور

بند ہوتی جاتی ہیں۔ بنیادی تعلیم کا کام پہلی قسم کی ریاست کا کام ہے۔ دوسری قسم کی ریاست کے ہاتھ میں یہ نہ پہنچے تو اچھا۔ ہمارے ملک میں ابھی اس اخلاقی ریاست کا بننا باقی ہے۔ پھر جب تک وہ نہیں بنتی کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟ نہیں جس طرح آزاد اور اچھے آدمیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ جلد سے جلد اپنی سماجی زندگی کی بنیاد ایسی اخلاقی ریاست پر رکھیں جس کا میں نے ابھی ذکر کیا، اسی طرح ہر سچے تعلیمی کام کرنے والے کا فرض ہے کہ وہ ایسی ریاست کے بننے میں اپنے کام سے پوری مدد دے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا کام اس ریاست میں بہت مشکل ہوگا لیکن اس وجہ سے اُسے چھوڑا تو نہیں جا سکتا۔ ہاں یہ ضرور جاننا چاہیے کہ کھودنا بہت ہوگا اور پانی بہت کم نکلے گا۔ مگر کیا عجب ہے کہ اس محنت ہی سے لوگوں کا دھیان کچھ چلے، اور ہمارے ملک میں وہ ریاست وجود میں آجائے جو ہمارے کام کو ایک ہی ہلے میں کہیں سے کہیں پہنچا دے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین نے راجندر بابو سے مخاطب ہو کر کہا کہ وہ ان کی طرف سے ملک کے سیاسی رہنماؤں کی خدمت میں یہ التجا پیش کر دیں کہ

خدا کے لئے اس ملک کی ریاست کو سدھاریئے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی بنیاد ڈالئے جس میں قوم قوم پر بھروسا کر سکے۔ کمزور کو زور آور کا ڈر نہ ہو۔ غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے۔ جس میں تمدن تمدن امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھل پھول سکیں اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اُجاگر ہوں۔ جہاں ہر ایک وہ بن سکے جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہے اور وہ بن کر اپنی ساری قوت کو اپنے سماج کا چاکر جانے۔ میں جانتا ہوں کہ ان باتوں کا کہہ دینا سہل ہے اور کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ میں اتنی ہے جتنی کہ پہلے کبھی نہ تھی کہ کچھ سمجھ کچھ

سمجھاکر، کچھ مان کر، کچھ منوا کر، ایسی ریاست کی بنیاد رکھ دیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہم تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابل رحم ہے۔ ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں؟ کب تک شبہ اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کا دم گھٹ گھٹ کر سسکتے دیکھیں، کب تک ہم اس ڈر سے کانپتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محنت اور عمر بھر کی محبت کو کوئی ایک سیاسی حماقت اور سیاسی ضد مٹادے گی، تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈھیں؟ کیا اس سماج میں جس میں بھائی، بھائی ایک دل نظر نہیں آتے، کوئی قدر آخری قدر معلوم نہیں ہوتی۔ جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں، کوئی تیوہار نہیں جو سب مل کر منائیں، کوئی شادی نہیں جسے سب مل کر رچائیں، کوئی غم نہیں جسے سب بٹائیں۔ ہماری یہ مشکل دور کیجئے اور جلد کیجئے اب بھی بہت دیر ہو چکی ہے، اور دیر نہ جانے کیا دن دکھائے۔

اور آگے چل کر ذاکر صاحب نے بنیادی تعلیم کے اصولوں کا مختصر ذکر کیا اور اس سلسلے میں "تعلیمی کام" کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ

ہر کام تعلیمی کام نہیں ہوتا۔ کام تعلیمی کام جب ہی ہو سکتا ہے کہ اُس کے شروع میں ذہن کچھ تیاری کرے۔ جس کام میں ذہن کو دخل نہ ہو وہ کام مردہ مشین بھی کر سکتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کام سے پہلے کام کا نقشہ، کام کا خاکہ ذہن میں بنانا ضروری ہے۔ پھر دوسرا قدم بھی ذہنی ہوتا ہے۔ یعنی اس نقشے کو پورا کرنے کے ذریعے سوچنا۔ تیسرا قدم ہوتا ہے ان میں سے کسی کو لینا، کسی کو چھوڑ دینا اور چوتھا قدم ہے کیے ہوئے کو پرکھنا۔ کہ جو نقشہ بنایا تھا، جو کرنا چاہا تھا وہی کیا اور جس طرح کرنے کا ارادہ کیا تھا، اسی طرح کیا یا نہیں۔ اور نتیجہ اس قابل ہے یا نہیں کہ اسے کیا جاتا۔ یہ چار منزلیں نہ ہوں تو تعلیمی کام ہو ہی نہیں سکے گا لیکن اگر یہ چاروں ہوں بھی۔ تب بھی ہر کام تعلیمی نہیں ہو جاتا۔ ہر ایسے کام سے کچھ

ہنرمندی ضرور پیدا ہو جاتی ہے، چاہے ہاتھ کی ہنرمندی ہو، چاہے ذہن کی چاہے زبان کی۔ لیکن ہنرمندی تعلیم نہیں تعلیم پائے ہوئے آدمی کی جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اس میں خالی ہنرمندی کا رنگ نہیں ہوتا...... تعلیمی کام وہی کام ہو سکتا ہے جو کسی ایسی قدر کی خدمت میں کیا جائے جو خود غرضی سے پرے ہو۔"

ڈاکر صاحب نے ان الفاظ پر اپنا خطبہ ختم کیا۔

خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنے کو کام سے اُس کا اچھا چاکر بنا سکیں، اُس سے دُعا ہے۔ ہمیں سیدھی راہ دکھائے۔ ان لوگوں کی راہ جن پر اس نے انعام کیا اور ان کی راہ سے بچائے جو سیدھے راستے سے بھٹک گئے اور جن سے وہ ناخوش ہوا۔"

ذاکر صاحب کے بعد بابو راجندر پرشاد کانفرنس کا افتتاح کرنے کھڑے ہوئے اور فرمایا بنیادی تعلیم کی ابتدا ملک کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے اب سے بہت پہلے ۱۹۲۱ء میں گاندھی جی نے کی تھی۔ یہ تجربہ ان دنوں تو کچھ کامیابی نہ حاصل کر سکا، لیکن پچھلے بیس برس میں اندر سیاسی بیداری اور سماجی ضرورتوں سے لوگوں کے دل میں تعلیم کی ازسرِنو تنظیم کی ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا ہے اور اس نے جب ۱۹۳۷ء میں بنیادی تعلیم کو قومی بنانے کا سوال ملک کے سامنے آیا تو بہت سے لوگوں نے اسے پسند کیا، کچھ اب بھی شبہ اور بدگمانی میں مبتلا رہے، کچھ نے اس کی مخالفت بھی کی۔ لیکن تین سال کے تجربے نے مخالفتوں میں بھی کمی کر دی ہے۔ شبہ اور بدگمانی کی بدلیاں بھی اب ویسی گھنگھور نہیں رہیں، اور لوگوں کے دل میں یقین اور بھروسا بھی اب پہلے سے زیادہ پکا ہو گیا ہے۔ لیکن کامیابی کی خوشی میں خاموش بیٹھ رہنا دانائی نہیں ہے۔ ہمیں اس اسکیم کو اور زیادہ تجربے کی روشنی میں پرکھنا ہے۔ اپنی محنت اور لگن [illegible] سے اسے آگے سے اور آگے بڑھانا ہے۔ مخالفتوں کو کم اور شبہوں

دور کرنا ہے۔ ہماری کامیابی اسی میں ہے۔

۱۲ اپریل کی صبح کو سکریٹری نے اپنی رپورٹ پڑھی۔ مختلف صوبوں کے نمائندوں نے اپنے اپنے صوبے کی بنیادی تعلیم کی ترقی کا حال بیان کیا، اسی دن شام کو مسٹر جے جی وائس چانسلر آگرہ یونیورسٹی نے بنیادی تعلیم کی نمائش کا افتتاح کیا۔ دوسرے دن صبح کو پھر مختلف جگہوں کی بنیادی تعلیم کی ترقی کی رپورٹیں پیش کی گئیں

اس تین سال کے تجربے کی روشنی میں ہمیں جو خاص خاص باتیں معلوم ہوئیں ان کا اندازہ کچھ اس طرح کا ہے۔

جب مختلف مقامات پر بنیادی تعلیم کا تجربہ شروع کیا گیا تو مختلف گروہ کے لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ دیہاتی اسے ایک بالکل انوکھی سی چیز سمجھ کر اس سے دور بھاگے۔ انھیں اس اسکیم میں کسی چھپے ہوئے خطرے کا احساس ہوتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ تعلیم ان کی کئی کئی نسلوں کی بنی بنائی رسموں کو مٹانے آئی ہے۔ انھیں اندیشہ تھا کہ یہ تعلیم بچوں کو ان کی گھریلو زندگی سے دور رکھ کر ایک خیالی دنیا میں بسا دے گی، جہاں کھیل کود اور باتوں کے سوا کام کاج کا گزر بھی نہیں، انھیں یہ بھی ڈر تھا کہ یہ تعلیم ان کی سکھ چین کی زندگی میں بے چینی اور کھلبلی پیدا کر دے گی۔ سیدھے سادے دیہاتی، جو اپنے دل کی باتوں کو چھپانا نہیں جانتے جو سوچتے ہیں، وہ کہہ دیتے ہیں۔ جو کہتے ہیں وہ کر بیٹھتے ہیں۔ اس لئے جو چیز انھیں پسند نہ آئی جس میں انھیں ڈر لگا، اسے ویسا ہی کہہ دیا۔ لیکن سب کے دل تو آئینہ کی طرح نہیں ہوتے، خصوصاً حکومت اور سیاست دل کے آئینوں پر زنگ لگا دیتی ہے اس آئینہ میں ہر شکل بدلی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔ دل کچھ چاہتا ہے زبان کچھ کہتی ہے، یہاں دھوکا اور بناوٹ ہی سب کچھ ہے، نہ کچھ کرکے بھی دوسروں کو یہ جتانا کہ ہم سب کچھ کر رہے ہیں دشمن ہو کر بھی دوست دکھائی دینا، حکومت اور سیاست کا پہلا سبق ہے۔ اس لئے حکومتوں نے بھولے بھالے دیہاتیوں کی ایک آدھ صوبے کو چھوڑ کر یہ تو کہیں بھی نہیں کہا

سین ایب [illegible] ہے۔ دیہاتی اس اسکیم کو پسند کرنے لگے ہیں۔ اس کے چلانے میں ہر طرح کی مدد دے رہے ہیں، اس کے بند ہونے پر انھیں بہت رنج ہوتا ہے۔ اس میں انھیں بہت سی چیزیں ایسی نظر آنے لگی ہیں جن میں اُن کے اور ان کے بچوں کے لیے بھلائی ہے۔ استاد ان کے دوست اور بھلا چاہنے والے ہیں، وہ ان کے کہنے پر چلتے ہیں۔ زندگی کو دن بدن اچھے سے اور اچھا بنا رہے ہیں۔ عام مخالفت کرنے والوں نے بھی اسکیم میں کچھ اچھائیاں دیکھی ہیں اور جہاں دلوں میں تعصب اور ہٹ دھرمی نہیں، وہاں مخالفت کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے، بالکل بند ہو گئی ہے۔
حکومتوں نے بھی کہیں کہیں اسے بالکل اپنا لیا ہے، اور اسے آگے بڑھانے میں ہر طرح کی مدد دے رہی ہیں۔ یہ تو ہوا بڑوں کا حال۔ بچوں کی حالت کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے، ہر جگہ کے بچے ہر لحاظ سے اب پہلے کے بچوں سے کہیں زیادہ اچھے نظر آتے ہیں۔ ان کے دل خوش ہیں اور ان کے چہروں پر چمک ہے، ان کے دماغ روشن ہیں اور زبانیں پہلے سے زیادہ تیز وہ سوچ بھی سکتے ہیں اور جو کچھ سوچتے ہیں اسے کہہ بھی سکتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں پھرتی پاؤں میں تیزی اور بدن میں چستی ہے۔ وہ اب صحیح معنوں میں زندہ ہیں، وہ زندگی کا لطف لینے لگے ہیں، انھیں قدرت میں دلکشی محسوس ہوتی ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ زندگی کیسے آگے بڑھتی ہے اور وہ اسے آگے بڑھانے میں کس طرح حصّہ لے سکتے ہیں۔ وہ پڑھنے میں کھیلتے ہیں اور کھیلنے میں زندگی کا سبق سیکھ کر، اُسے آگے بڑھا رہے ہیں۔ انھیں اپنے دیس اور اس کی چیزوں سے محبت ہے۔ انھیں اس کی آزادی پیاری ہے، انھیں اپنی آزادی پیاری ہے، اور وہ اپنی آزادی سے اپنے دیس کی آزادی کو زیادہ قریب لانے

دور کرتا ہے۔ ہماری کامیابی اسی میں ہے۔

۱۲ اپریل کی صبح کو سکریٹری نے اپنی رپورٹ پڑھی۔ مختلف صوبوں کے نمائندوں نے پھر اپنے اپنے صوبے کی بنیادی تعلیم کی ترقی کا حال بیان کیا، اسی دن شام کو مسٹر جے۔ بی۔ وائس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھانے والوں کو جن مشکلات کا آج کل سامنا کرنا پڑتا ہے، ان کی بنا پر وہ اس بحث میں بڑی شد و مد سے حصہ لیتے ہیں۔ بغیر کسی جھجک کے اپنے شبہوں کو دور کرکے تعلیم کی راہ کو رکاوٹوں سے پاک کرتے ہیں۔ مربوط پڑھائی پر جو گفتگو ہوئی اس میں خواجہ غلام السیدین صاحب کے خیالات خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ مربوط پڑھائی کی بحث کو شروع کرتے وقت سیدین صاحب نے فرمایا کہ بنیادی تعلیم کا نصاب بنانے والوں کے سامنے دو باتیں تھیں۔ پہلی تو یہ کہ بچے کا تعلق اس کے آس پاس کی زندگی سے بہت گہرا ہوتا ہے اور اسکول کا ہر مضمون ایک کھڑکی ہے جس میں سے ہو کر وہ اس زندگی کے کسی نہ کسی پہلو میں داخل ہوتا ہے، دوسری بات یہ کہ بچہ مکمل حقیقت ہے اور اس لئے اس کے نصاب کو بھی مکمل ہونا چاہیے، چونکہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرح اسکول کے مضمون بھی کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ اس لئے انھیں آپس میں ملا جلا کر پڑھانا چاہیے۔ انھیں الگ الگ کرکے پڑھانا، زندگی کی ہم آہنگی اور ترنم میں فرق ڈالنا ہے۔ آگے چل کر پروفیسر سیدین نے فرمایا کہ زندگی میں وسعت اور تنوع ہے۔ تعلیم نے اس سے پہلے کبھی اس بات کو محسوس نہیں کیا۔ نئی تعلیم زندگی کی آئینہ دار ہے۔ اس لئے ہماری اسکیم کا نصاب جان بوجھ کر پھیلا ہوا اور بڑا رکھا گیا ہے۔ پہلا نصاب بہت گھرا ہوا تھا اور اس سے زندگی کی مختلف راہوں کی کھڑکیاں بچے کے سامنے پوری طرح نہیں کھلتی تھیں۔ لیکن اس بڑے نصاب کو دیکھ کر خوف زدہ نہیں ہو جانا چاہیے۔ اس لئے ربط کا اصول اس بظاہر بہت پھیلے ہوئے اور قابو میں نہ آنے والے نصاب کو ہمارے لئے بہت آسان بنا دیتا ہے۔ ہم اگر ربط صرف بنیادی دستکاری ہی سے پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ بچے کی ضرورتوں، اس کی خواہشوں اس کے احساس کے

ایک بصیرت افروز تحریر میں ار۔ ر۔

اور تباہیوں، بربادیوں کی حکومت ہے اور یہی زمانہ ہے جب تعلیم کی ذمہ داریاں، عام دنوں سے بھی کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ تعلیم کا کام ہے تہذیب اور تمدن کو زندہ رکھنا اور اسے ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانا۔ امن کے زمانہ میں یہ کام آسانی سے ہوتا رہتا ہے۔ جنگ کے بادل امن کی راہوں کو تنگ و تاریک بنا دیتے ہیں اور اس زمانہ میں صرف تعلیم کی روشنی اس تنگی میں وسعت اور تاریکی میں نور پیدا کرتی ہے، اس زمانہ میں انسانیت کی قسمت کا فیصلہ گویا تعلیم ہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

پہلے زمانہ میں، بچوں کو تعلیم اس طرح دی جاتی تھی کہ وہ زندگی کے کاموں میں شریک رہ کر ایسے بن سکیں کہ آئندہ زندگی میں سماج کو آگے بڑھانے میں مدد دے سکیں۔ اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب سب کچھ کتابوں ہی سے پڑھایا جانے لگا۔ کھیتی، باڑی، دستکاری، سائنس ہر چیز گویا صرف کتابیں ہی پڑھ کر سیکھی جا سکتی ہے۔ کتابوں کے راج میں تعلیم اور زندگی ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں۔ جوں جوں یہ راج پھیلا زندگی اور تعلیم کی دوری بھی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ تعلیم میں زندگی کی ہلکی سی جھلک بھی باقی نہ رہی اور اب ہم نے یہ سوچنا شروع کیا کہ تعلیم کا یہ طریقہ صحیح نہیں۔ زندگی اور بچے کی تعلیم کے بیچ میں کتاب کو ایک روک بنا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ بچے کچھ کر کے، کاموں میں شریک ہو کے ہی کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ان کی اپنی کوشش اور اپنا تجربہ ہی سچی تعلیم ہے۔

یہی اصول بنیادی تعلیم کی بنیاد ہے۔ صرف یہی نہیں۔ تعلیم کو عام، مفت اور لازمی ہونا چاہیے۔ تعلیم کم سے کم سات سال تک دی جائے، مادری زبان میں دی جائے اور کسی دستکاری کے

دور کرنا ہے۔ ہماری کامیابی اسی میں ہے۔

۱۲ اپریل کی صبح کو سکریٹری نے اپنی رپورٹ پڑھی۔ مختلف صوبوں کے نمائندوں نے ہر اپنے اپنے صوبے کی بنیادی تعلیم کی ترقی کا حال بیان کیا، اسی دن شام کو مسٹر جی وائس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھانے والوں کو [illegible] بہت فرمایا کہ لوگوں کا یہ خوف "یہ تعلیم مدرسوں کو کارخانے بنا دے گی" قطعی بے بنیاد ہے۔ ہمارے تین سال کے تجربے نے ہمیں بتایا کہ نئی تعلیم نے بچوں کو ہر حیثیت سے پہلے سے کتنا اچھا بنا دیا ہے۔ ہمیں تو ہر خطرے کے خیال سے نڈر ہو کر میل جول، یقین اور استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہنا چاہیے۔

۱۴ اپریل کو کانفرنس کا آخری دن تھا۔ صبح کے اجلاس میں پھر مربوط پڑھائی پر تقریریں اور بحثیں ہوئیں۔ شام کے اجلاس میں استادوں کی ٹریننگ کے متعلق کئی مضمون پڑھے گئے اور ان پر دلچسپ بحث ہوئی۔ چونکہ ابھی کام باقی تھا اس لئے رات کے وقت بھی ایک اجلاس ہوا۔ پہلے ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں صاحب نے بنیادی تعلیم میں آرٹ کی اہمیت پر ایک بیحد دلچسپ اور مفید تقریر کی اور اس سلسلے میں بتایا کہ جب تک ہم تعلیم میں آرٹ کا نقطۂ نظر نہیں پیدا کریں گے اس وقت تک بنیادی تعلیم کے صحیح نصب العین کا حاصل کرنا غیر ممکن ہے۔

اس کے بعد کانفرنس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے کانفرنس کے سامنے وہ نتیجے پڑھ کر سنائے جو مختلف اجلاسوں میں بحث مباحثوں کے بعد مرتب کئے گئے تھے۔

کانفرنس کے نمائندے دور سے اور پاس سے، نئی امیدیں اور نئی آرزوئیں لے کر، کچھ سیکھنے، کچھ سکھانے کے لئے ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔ چار دن کی لگاتار محنت کے بعد، کچھ سیکھا، کچھ سکھایا، اور پھر نئی امیدیں لے کر، اپنے کام کو ایک قدم اور آگے بڑھانے چلے گئے۔ "آزاد فضا میں رہ کر کامیابیوں اور ناکامیوں کے جو سبق سیکھے جاتے ہیں، ان میں امیدوں کا سہارا سب سے بڑا سہارا ہوتا ہے۔" تین سال کے تجربے نے ہمیں یہ سکھایا ہے اور زیادہ تجربہ ہمارے کام کے لئے اور بڑا سہارا بنے گا۔" یہ ہمیں یاد رکھنا ہے۔

سید وقار عظیم

دور کرنا ہے۔ ہماری کامیابی اسی میں ہے۔

۱۲ اپریل کی صبح کو سکریٹری نے اپنی رپورٹ پڑھی۔ مختلف صوبوں کے نمائندوں نے اپنے اپنے صوبے کی بنیادی تعلیم کی ترقی کا حال بیان کیا، اسی دن شام کو مسٹر جے بی دالس

ہے یہی وجہ ہے کہ بڑھاپے [illegible]